ISSN : 2455-0248

ششماہی ریسرچ اور ریفریڈ جرنل

13

ادبِ و ثقافت

ستمبر 2021

مرکز مطالعاتِ اُردو ثقافت

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

9 اپریل، 2021 : پروفیسر محمد ظفرالدین، ڈائرکٹر، مرکز مطالعات اردو ثقافت اور ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز، مدیر، ''ادب و ثقافت''، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے سانحۂ ارتحال پر مرکز کی جانب سے منعقدہ آن لائن تعزیتی نشست میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے شرکا: اوپر دائیں جانب سے پروفیسر فاطمہ پروین، پروفیسر مظفر علی شہ میری، پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر صدیقی محمد محمود، پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، پروفیسر بیگ احساس، ڈاکٹر احمد خان، پروفیسر ابنِ کنول، ڈاکٹر شمس الہدیٰ، پروفیسر فاروق بخشی، ڈاکٹر اسلم پرویز، پروفیسر فہیم اختر، پروفیسر محمد کاظم، پروفیسر علیم اشرف جائسی، ڈاکٹر محمد ریاض احمد اور پروفیسر محمد خالد مبشر الظفر۔

ششماہی ریسرچ اور ریفریڈ جرنل

ادب و ثقافت

ستمبر 2021

مدیر اعلیٰ

پروفیسر صدیقی محمد محمود

مدیر

ڈاکٹر احمد خان

مرکز مطالعاتِ اردو ثقافت

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Centre for Urdu Culture Studies
Maulana Azad National Urdu University

Adab-o-Saqafat

(Bi-Annual Research & Refereed Journal)
Issue: 13 September, 2021
ISSN : 2455-0248

مرکز مطالعاتِ اردو ثقافت کا تحقیقی اور ریفریڈ جریدہ

ششماہی **ادب و ثقافت** حیدرآباد

ناشر	:	مرکز مطالعاتِ اردو ثقافت مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی گچی باؤلی، حیدرآباد - 500032 (تلنگانہ)
طباعت	:	سن رائز پیپر پروڈکٹس، حیدرآباد
تزئین و آرائش	:	ڈاکٹر محمد زبیر احمد
سرورق	:	ڈاکٹر ظفر احمد (ظفر گلزار)
رابطہ	:	+919868701491
ای میل	:	*adabosaqafatcucs@gmail.com* *cullcmanuu@gmail.com*
آن لائن	:	*manuu.edu.in/University/Centre/CUCS/Journal*

مقالہ نگاروں کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

سرپرست اعلیٰ

پروفیسر سید عین الحسن

شیخ الجامعہ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ایڈیٹوریل بورڈ

پروفیسر عبدالستار دلوی، ممبئی

پروفیسر قاضی افضال حسین، علی گڑھ

پروفیسر شارب ردولوی، لکھنؤ

پروفیسر عتیق اللہ، نئی دہلی

پروفیسر بیگ احساس، حیدرآباد

پروفیسر اشرف رفیع، حیدرآباد

پروفیسر م۔ن۔سعید، بنگلور

پروفیسر شہپر رسول، نئی دہلی

پروفیسر انور پاشا، نئی دہلی

پروفیسر ارتضیٰ کریم، نئی دہلی

پروفیسر محمد نسیم الدین فریس، حیدرآباد

پروفیسر محمد فاروق بخشی، حیدرآباد

فہرست

شذرات	مدیر	6-11
گوشہ پروفیسر محمد ظفرالدین		12-139
1. سوانحی کوائف	پروفیسر شہزاد انجم	13-17
2. قطعہ تاریخ وفات	پروفیسر سید مسعود سراج	18-18
3. پروفیسر محمد ظفرالدین: ایک ادیب، اعلیٰ منتظم اور بلند کردار شخصیت	پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ	19-21
4. ظفرالدین: میرے عزیز شاگرد	پروفیسر شارب ردولوی	22-27
5. وہ شکریہ جوادا نہ ہوسکا	پروفیسر مظفر علی شہ میری	28-30
6. پروفیسر محمد ظفرالدین۔ایک شعلۂ مستعجل	پروفیسر بیگ احساس	31-35
7. سامان سو برس کا ہے کل کی خبر نہیں (پروفیسر محمد ظفرالدین کی یاد میں)	پرفیسر علی احمد فاطمی	36-46
8. میرے بھائی جان: پروفیسر محمد ظفرالدین	پروفیسر شہزاد انجم	47-66
9. آہ پروفیسر محمد ظفرالدین: اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں	پروفیسر نسیم الدین فریس	67-72
10. پروفیسر ظفرالدین یاد کے دریچے سے	پروفیسر محمد فاروق بخشی	73-75
11. میرے ساتھی پروفیسر محمد ظفرالدین: کچھ یادیں کچھ باتیں	پروفیسر پی فضل الرحمٰن	76-79
12. ظفر بھائی کی یاد میں	ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی	80-87
13. ظفر صاحب: میرے بھائی میرے دوست	ڈاکٹر سید محمود کاظمی	88-97

14. پروفیسر محمد ظفرالدین کی تصنیف 'نیاز حیدر: شخصیت اور شاعری'-ایک مطالعہ	ڈاکٹر بی بی رضا خاتون	98-111
15. ظفر بھائی— خاک میں مل گئے نگینے لوگ	ڈاکٹر فیروز عالم	112-120
16. پروفیسر محمد ظفرالدین: ایک جہاں دیدہ شخصیت	ڈاکٹر احمد خان	121-128
17. میرے پیارے ابو جان	محترمہ ثانیہ ظفر	129-139

دیگر مضامین

18. صوبہ مدراس میں اردو مثنوی نگاری کی روایات	پروفیسر قاضی حبیب احمد	140-152
19. دہلی سلطنت کے عہد کا تمدن اور علم و ادب	پروفیسر محمد فہیم اختر	153-174
20. اکبرالہ آبادی کی قرأتِ نو	پروفیسر ابوبکر عباد	175-185
21. حبیب تنویر کا شاہکار ڈراما 'آگرہ بازار' (ایک تجزیاتی مطالعہ)	پروفیسر محمد کاظم	186-205
22. ناول ''امراؤ جان ادا'' کا نشاطیہ آہنگ	ڈاکٹر مظہر احمد	206-225
23. آزمائش، تعینِ قدر اور سوال سازی کے بنیادی تصورات	ڈاکٹر زبیر شاداب خان	226-248
24. اسلوب مجتبیٰ کے تشکیلی عناصر	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	249-263
25. مملکتِ آصفیہ میں تعلیمِ نسواں کا آغاز و ارتقاء	ڈاکٹر آمنہ تحسین	264-279
26. مولانا ابوالکلام آزاد کا سیاسی اور قومی نظریہ	ڈاکٹر محمد اختر	280-301
27. تانیثیت اور نسائی حسیت: مماثلت و افتراقات	ڈاکٹر محمد جابر حمزہ	302-317
28. سوشل میڈیا اور ہماری تہذیب	ڈاکٹر وقار النساء جناب جہانگیر عالم	318-334
29. تقسیم ملک، فسادات اور اردو ناول	جناب ریحان احمد	335-355
30. ہمارے قلمکار (اشاریہ ادب و ثقافت)	ادارہ	356-364
31. فہرست مطبوعات	ادارہ	365-368

شذرات

وہ ستارہ جو غروب ہو گیا!

پروفیسر محمد ظفرالدین کا سانحہ ارتحال دنیائے اردو اور ہم سب کے لیے نا قابلِ تلافی نقصان ہے۔موصوف ایک قابل منتظم، سنجیدہ اور مستقل مزاج شخصیت کے مالک تھے۔ان میں بلا کی قائدانہ صلاحیت تھی۔وہ کسی کی دل آزاری سے گریز کرتے اور محبت سے پیش آتے تھے۔ان کی طبیعت میں انکساری اور خاکساری تھی۔ وہ ظاہرداری اور جھوٹی شان وشوکت سے پرہیز کرتے تھے۔انھیں مرکز مطالعات اردو ثقافت سے جذباتی لگاؤ تھا۔وہ مرکز کے اغراض ومقاصد سے بخوبی واقف تھے اوران کی تکمیل کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتے تھے۔ان کا خواب تھا کہ 'مرکز مطالعات اردو ثقافت' ہندوستان میں اردو تہذیب وثقافت کے ایک مثالی مرکز کے طور پر جانا جائے۔مرکز کے تحت ادبی وثقافتی پروگرام، ورک شاپ اور سمینار کے اہتمام میں وہ خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔انھیں انتظامیہ کی جانب سے مولانا آزاد ورچوئل میوزیم کی ذمہ داری بھی دی گئی تھی۔ششماہی مجلّہ ''ادب وثقافت'' انھیں بہت عزیز تھا۔اس کی تیاری اوراشاعت میں وہ گہری دلچسپی لیتے تھے۔

پروفیسر محمد ظفرالدین کی ناگہانی موت کے بعد یہ پہلا شمارہ ہے جو ان کی ادارت کے بغیر شائع ہورہا ہے۔وہ ہر مضمون کو انتہائی توجہ سے پڑھتے تھے۔اگر ضرورت ہوتی تو مضمون نگار سے صلاح و مشورہ کرتے اور پھر اس میں ترمیم واضافہ کرتے تھے۔ان کی کوشش تھی کہ مجلّے کا معیار ہمیشہ بلندی کی جانب مائل رہے۔وہ بزرگ اساتذہ کے ساتھ ساتھ نئے قلم کاروں کو بھی موقع دیتے تھے۔وہ ہمہ وقت اچھے مضامین کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ادب وثقافت کا مقصد مالی منفعت نہیں بلکہ اردو زبان و ادب اور تہذیب وثقافت کو فروغ دینا ہے۔اس کی کاپیاں اعزازی طور پر ملک کے تمام کتب خانوں، اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور دیگر محبانِ اردو کو فراہم کی جاتی ہیں۔اب ظفر صاحب ہمارے درمیان نہیں

ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ یہ مجلّہ اپنی آن بان سے شائع ہوتا رہے جس شان سے ان کی زندگی میں نکلتا تھا۔ہم مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا گو ہیں۔

☆☆☆☆☆

پروفیسر محمد ظفرالدین کی مجلّہ 'ادب وثقافت' سے وابستگی اور خدمات کے پیش نظر اس شمارے میں ''گوشۂ پروفیسر محمد ظفرالدین'' پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ مرکز مطالعات اردو ثقافت اور مجلّے کے ایڈیٹوریل بورڈ کی جانب سے ان کے لیے ایک خراجِ عقیدت ہے۔اس گوشے میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے نائب شیخ الجامعہ پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ کا ایک مختصر مضمون بعنوان ''پروفیسر محمد ظفرالدین:ایک ادیب، اعلیٰ منتظم اور بلند کردار شخصیت'' شامل ہے جس میں انھوں نے پروفیسر محمد ظفرالدین کی انتظامی خدمات پر جامع گفتگو کی ہے۔ پروفیسر شارب رودولوی نے اپنے مضمون بعنوان ''ظفرالدین: میرے عزیز شاگرد'' میں ظفرالدین کی دہلی یونیورسٹی میں طالب علمانہ زندگی اور گھریلو وابستگی کے متعلق انتہائی مؤثر انداز میں روشنی ڈالی ہے۔انھوں نے موصوف کی نیک نفسی اور تعلیمی لیاقت پر خصوصی توجہ کی ہے۔ پروفیسر محمد ظفرالدین کے چھوٹے بھائی پروفیسر شہزاد انجم،صدرِ شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ،نئی دہلی نے اپنے مضمون بعنوان ''میرے بھائی جان: پروفیسر محمد ظفرالدین'' میں موصوف کے سوانحی کوائف،تعلیم وتربیت، شخصیت وکردار اور ادبی وعلمی خدمات کے متعلق انتہائی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس مضمون کی حیثیت ایک تاریخی دستاویز کی ہے۔ پروفیسر مظفر علی شہ میری نے اپنے مضمون ''وہ شکریہ جو ادا نہ ہوسکا'' میں موصوف کے متعلق اپنے جذبات اور تاثرات کا بیان انتہائی درد انگیز پیرائے میں کیا ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنے مضمون میں ظفرالدین کی انتظامی خدمات پر خصوصی گفتگو کی ہے اور اس جانب اشارہ کیا ہے کہ موصوف کی انتظامی مصروفیت کے سبب ادبی سرگرمیاں متاثر ہوئیں۔

مذکورہ قلم کاروں کے علاوہ پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر نسیم الدین فریس، پروفیسر فاروق بخشی، ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی، ڈاکٹر سید محمود کاظمی، ڈاکٹر بی بی رضا، ڈاکٹر فیروز عالم، ڈاکٹر احمد خان اور محترمہ ثانیہ ظفر نے بھی پروفیسر محمد ظفرالدین کے متعلق اپنے تاثرات،تعلقات اور احساسات وجذبات کا اظہار انتہائی مؤثر پیرائے میں کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

ادب وثقافت کے اس شمارے میں دیگر مضامین کے تحت متعدد تنقیدی، تحقیقی اور تجزیاتی مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں۔ پروفیسر قاضی حبیب صاحب نے ''صوبہ مدراس میں مثنوی کا آغاز و ارتقا'' پر تاریخی، تنقیدی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ ایک انتہائی معلوماتی مضمون ہے جو اردو مثنوی کی تحقیق میں گراں قدر اضافہ کرتا ہے۔

پروفیسر فہیم اختر نے اپنے مضمون میں دہلی سلطنت کی علمی، تہذیبی اور ثقافتی صورت حال کو تاریخی تناظر میں پیش کیا ہے۔ اس مضمون کے ذریعے دہلی سلطنت میں تعلیمی اداروں کے قیام، علمی فضا، فنِ تعمیرات، صنعت وحرفت اور تہذیبی وثقافتی عناصر کو نمایاں کیا گیا ہے۔ پروفیسر ابوبکر عباد نے اپنے مضمون میں اکبرالہ آبادی کی شاعری کی ایک نئی قرأت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ موصوف کے مطابق اکبرالہ آبادی اپنی شاعری میں مبلغ یا مفکر کی صورت میں نہیں بلکہ قوم وتہذیب کے مبصر، مترجم اور معلم کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

پروفیسر محمد کاظم نے حبیب تنویر کے ڈرامے ''آگرہ بازار'' کا مؤثر پیرائے میں تجزیہ پیش کیا ہے۔ جس کے تحت آگرہ بازار کی سماجی، تاریخی، تہذیبی، ادبی اور اقتصادی تصویر نمایاں ہوجاتی ہے۔ تجزیہ کار نے مذکورہ ڈرامے کو ایک نئے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر مظہر احمد نے ہادی رسوا کے شاہکار ناول 'امراؤ جان ادا' کے نشاطیہ آہنگ کی تصویر کشی کی ہے۔ موصوف نے ان تمام معاملات کو زیر بحث رکھا جن سے ناول کی مزاحیہ، طنزیہ اور طربیہ کیفیت نمایاں ہوتی ہے۔ ڈاکٹر زبیر شاداب خان نے اپنے مضمون ''آزمائش، تعین قدر اور سوال سازی کے بنیادی تصورات'' میں عالمانہ، معلوماتی، اصولی اور تجزیاتی گفتگو کی ہے۔ موصوف نے زیرِ بحث موضوع کی پیچیدگی کو انتہائی سہل انداز میں نمایاں کردیا ہے۔

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے مجتبیٰ حسین کے اسلوب کے تشکیلی عناصر کو انتہائی باریک بینی سے پیش کیا ہے۔ اس مضمون میں مجتبیٰ حسین کے اسلوب میں بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی، فقرے بازی، برجستگی، معنی خیزی، طنز ونشتر، ظرافت، محاورے، کہاوتیں اور ذومعنی الفاظ وغیرہ جیسے عناصر کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر آمنہ تحسین کا مضمون مملکت آصفیہ میں تعلیم نسواں کا آغاز وارتقا، تاریخی نقطۂ نظر سے اہمیت کا حامل ہے۔ محترمہ نے مذکورہ عہد میں عورتوں کی تعلیم اور تعلیمی اداروں کے قیام کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر محمد اختر نے اپنے مضمون میں مولانا ابوالکلام آزاد کے افکار ونظریات کے متعلق سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ انھوں نے مولانا کے سیاسی وتعلیمی نظریات کو خصوصی طور پر زیرِ بحث رکھا ہے اور ایک ایسے شخص کی

تصویر پیش کی ہے جس نے ایک متحدہ ہندوستان کا خواب دیکھا تھا جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ ڈاکٹر محمد جابر حمزہ نے اپنے مضمون ''تانیثیت اور نسائی حسیت: مماثلت وافتراقات'' میں تانیثیت اور نسائی حسیت کی تعریف و تفہیم، اوصاف و خصائص اور آغاز وارتقا پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ڈاکٹر وقارالنساء اور ڈاکٹر جہانگیر نے مشترکہ طور پر ایک مضمون بعنوان ''سوشل میڈیا اور ہماری تہذیب'' پیش کیا ہے جس میں انھوں نے عصر حاضر میں سوشل میڈیا کے مثبت ومنفی اثرات کو انتہائی تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے اور ساتھ ہی موجودہ دور میں ہماری تہذیب سوشل میڈیا سے کس قدر متاثر ہو رہی ہے، اسے بھی زیرِ بحث رکھا ہے۔ جناب ریحان احمد نے اپنے مضمون ''تقسیم ملک، فسادات اور اردو ناول'' پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس مضمون میں تقسیم ہند کے اسباب، سیاسی جماعتوں کے کردار، فسادات کے خونچکاں واقعات اور اردو ناولوں پر ان کے اثرات کو مؤثر پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔

☆☆☆☆☆

کسی بھی زبان کی ایک تہذیبی وثقافتی شناخت ہوتی ہے۔ دراصل ایک زبان، لفظیات، جملے کی ساخت، لہجہ، تلفظ، ادائیگی، زبان کی لوچ، شیرینی، شگفتگی، سادگی، جاذبیت، محاورات، ضرب المثل، کہاوتیں، قواعد، فصاحت، بلاغت، روایات، رسم ورواج، عقائد، آداب واطوار، خوردونوش، تفریح وتفنن، لباس وزیورات، صنعت وحرفت اور دیگر فنی عناصر سے مرکب ہوتی ہے۔ اردو زبان کا بھی ایک منفرد تہذیبی وثقافتی تشخص ہے۔ اردو صرف ایک زبان ہی نہیں بلکہ تہذیب کی داعی بھی ہے۔ ادب ایک ایسا وسیلہ ہے جس میں اردو کی تہذیب ہر رنگ میں نظر آتی ہے۔ اردو، ہندوستان میں پیدا ہوئی، پلی بڑھی اور پروان چڑھی۔ نئی زبانوں سے رابطہ کیا، اثرات قبول کیے اور اپنا نشان چھوڑتی گئی۔ گنگا میں غسل کیا، جمنا میں وضو کی، ہولی کے رنگوں میں سرابور ہوئی، دیوالی کے چراغاں سے منور ہوئی، گنگا جمنی تہذیب کی بنیاد رکھی اور مشترکہ تہذیب کو پروان چڑھایا۔

جس زبان کا تفریحی اور عوامی ادب جتنا توانا اور مستحکم ہوگا، اس زبان کا عوام سے رشتہ اتنا ہی گہرا ہوگا۔ ہر زمانے میں تفریح وتفنن کا اپنا مذاق ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب لوگ واقعات بیانی سے محظوظ ہوا کرتے تھے۔ اس کے بعد قصہ گوئی وداستان گوئی کا دور آیا۔ بھانڈ، بھگتیے اور بہروپیوں نے اس روایت کو مزید آگے بڑھایا۔ اس کے ساتھ ہی رہس، ڈراما، مجرا اور نوٹنکی کی مقبولیت بڑھی۔ خاص وعام میں مشاعرے اور قوالی کا بھی رواج رہا، عزاداری کا اہتمام جوش و

خروش سے ہوتا رہا۔تھیٹر نے اپنی جانب لوگوں کو متوجہ کیا۔سنیما کی ابتدا نے تفریح کے تمام عناصر کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔اب یہاں لوگوں کو بیک وقت رقص،موسیقی،نغمہ،کہانی،اداکاری اور متحرک تصویریں وغیرہ دیکھنے کو ملنے لگیں۔ہندوستان میں سنیما کا جب آغاز ہوا تو اردو کے متعدد ناموراد با وشعرا اس سے منسلک رہے۔کسی نے کہانی لکھی،تو کسی نے اسکرین پلے اور مکالمے لکھے۔کسی نے نغمہ لکھا تو کسی نے فلم سازی اور ہدات کی۔غرض یہ کہ سنیما سے ان کی نہ صرف گہری وابستگی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ سنیما کے سنہری دور میں پیش پیش تھے۔موجودہ دور میں سنیما سے اردو والوں کی نمائندگی رفتہ رفتہ کم ہوتی جارہی ہے۔اردو زبان،تہذیب اور ثقافت کے فروغ کے لیے اس وقت سب سے طاقتور میڈیم سنیما ہے۔لہٰذا آج ضرورت ہے کہ اردو اور سنیما کے رشتے کو مزید مستحکم اور استوار کیا جائے۔اس ضمن میں ٹیلی ویژن اور سوشل میڈیا کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔علاوہ ازیں دیگر فنون کو بھی پیش نظر رکھنے کے ضرورت ہے جن کا تعلق ادب،گائکی،موسیقی،نغمہ،تھیٹر اور عوامی فنون سے ہے۔اردو زبان کو جدید ٹکنالوجی اور اطلاعات کے دور میں نئے چیلنجیز سے مقابلہ کرنے کے لیے بھی خود کو تیار رکھنا ہوگا۔کہیں ایسا نہ ہو کہ اردو زبان اس الیکٹرانک دور میں دیگر زبانوں کے مقابلے پیچھے رہ جائے۔

☆☆☆☆☆

پروفیسر سید عین الحسن نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی،حیدرآباد کے شیخ الجامعہ کا عہدہ 28؍جولائی،2021 کو سنبھالا۔پروفیسر عین الحسن،سینٹر فار پرشین اینڈ مڈل ایسٹ اسٹڈیز،جواہر لعل نہرو یونیورسٹی،نئی دہلی سے وابستہ رہے ہیں۔وہ سینٹر کے صدر اور اسکول آف لینگویج،لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز کے ڈین بھی رہ چکے ہیں۔عصرِ حاضر میں موصوف کا شمار فارسی زبان وادب کے ایک ممتاز اسکالر کے طور پر ہوتا ہے۔وہ آل انڈیا پرشین اسکالر اسوسی ایشن کے صدر ہیں اور فل برائٹ فیلوشپ کے تحت رٹجر اسٹیٹ یونیورسٹی،نیوجرسی،امریکہ میں وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔

پروفیسر سید عین الحسن،فارسی ادب کے ایک جید عالم ہیں۔دنیائے فارسی میں ان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔کلاسیکی اور جدید فارسی پر ان کی گہری دسترس ہے۔ان کا تقابلی ادب،تہذیب و ثقافت اور ہندوستانیات میں خصوصی اختصاص ہے۔ہند۔ایران اور ہند۔عرب تعلقات،تاریخ وتہذیب اور فارسی زبان وادب پر انھیں ایک ماہر کی حیثیت حاصل ہے۔ان کی تیرہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔انھوں نے مرزا غالب کی مشہور فارسی تصنیف 'دستنبو' کا ہندی ترجمہ کیا ہے۔یہ کتاب اٹھارہ سوستاون کے

انقلاب کا روز نامچہ ہے۔ ان کی دوسری تصنیف 'ستونہای شعرِ نو' جدید فارسی شعر و ادب میں ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے جس میں جدیدیت کے عمل اور فارسی کی قدیم روایت کے مابین تصادم اور اس کے نتیجے میں نئی شاعری کے آغاز و ارتقا اور جدید فارسی شعرا کو زیر بحث رکھا گیا ہے۔ انھوں نے فارسی قواعد پر ایک کتاب تصنیف کی ہے جسے جے این یو کے مرکز برائے مطالعاتِ تاریخ کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ متعدد ایسی کتابیں ہیں جنھیں فارسی ادب میں تحقیقی و تنقیدی نقطۂ نظر سے خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ فارسی ادب اور تہذیب و ثقافت پر ان کے متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے قومی و بین الاقوامی سمیناروں اور کانفرنسوں کا انعقاد کیا، وافر تعداد میں مقالے پیش کیے اور متعدد اجلاسوں کی صدارت کی۔ ان کے زیرِ نگرانی بڑی تعداد میں ریسرچ اسکالرز نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔

پروفیسر سید عین الحسن ایک معروف دانشور اور صاحبِ بصیرت شخصیت ہیں۔ اردو یونیورسٹی کی یہ خوش بختی ہے کہ اسے ایک ایسا وائس چانسلر ملا ہے جو زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کا ایک ممتاز اور بین الاقوامی شہرت یافتہ شخصیت کا حامل ہے۔ اردو یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد میں یہ شامل ہے کہ اردو زبان، ادب، تہذیب، ثقافت اور اردو ذریعۂ تعلیم کو استحکام اور فروغ کے لیے کام کیا جائے۔ اردو یونیورسٹی میں مرکز مطالعات اردو ثقافت کے قیام کا مقصد بھی اسی مشن کو فروغ دینا ہے۔ محترم وائس چانسلر پروفیسر سید عین الحسن کے علمی اختصاص اور اردو یونیورسٹی کے اغراض میں ایک قدرتی ہم آہنگی ہے۔ لہٰذا خدا کی ذات سے کامل یقین ہے کہ موصوف کی سرپرستی میں اردو یونیورسٹی ترقی کی راہ میں ایک نئی تاریخ رقم کرے گی۔

ڈاکٹر احمد خان

مدیر، ادب و ثقافت

اسوسی ایٹ پروفیسر، مرکز مطالعاتِ اردو ثقافت

گوشہ پروفیسر محمد ظفرالدین

پیدائش: 11/اکتوبر1964ء

وفات: 5/اپریل2021ء

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:13-17
Prof. Shahzad Anjum, Sawanehi Kawaef

شہزاد انجم

سوانحی کوائف

نام	:	**محمد ظفر الدین**
والد	:	محمد قمر الدین، قلمی نام: قمر نظامی
والدہ	:	زاہدہ خاتون
آبائی وطن	:	محلّہ معروف گنج، گیا (بہار)
وطن ثانی	:	حیدر آباد (تلنگانہ)
پتہ	:	ایولون اپارٹمنٹس 1012, Avalon Appartments، نانل نگر، حیدر آباد 500028
پیدائش	:	11/اکتوبر 1964ء مطابق 4/جمادی الآخر 1384ھ، اتوار، 4 بجے صبح، اپنی نانیہال باڈم بازار، ہزاری باغ موجودہ ریاست جھارکھنڈ
رسم بسم اللہ	:	25/رجب 1389ھ مطابق 8/اکتوبر 1969ء بروز چہار شنبہ بمقام بڑی مسجد معروف گنج، گیا، زیر نگرانی: والد محترم
ختم کلام پاک	:	23/محرم 1392ھ مطابق 10/مارچ 1972ء، بروز جمعہ، زیر نگرانی: والد محترم
داخلہ اسکول	:	12/جنوری 1973ء مطابق 6/ذی الحجہ 1392ھ، بعد نماز جمعہ، ہادی ہاشمی ہائی اسکول، گیا (بہار)، درجہ پنجم میں
ہائی اسکول (میٹرک)	:	12/جولائی 1980ء، بہار اسکول اکزامنیشن بورڈ، پٹنہ، سکنڈ ڈویژن
داخلہ انٹرمیڈیٹ	:	20/ستمبر 1980ء (آئی ایس سی)، مرزا غالب کالج، گیا (بہار)
انٹرمیڈیٹ میں کامیابی	:	26/اکتوبر 1982ء، سکنڈ ڈویژن

تعلیم اور تلاش معاش کے لیے دہلی روانہ: 28/اگست 1982ء

پہلی ملازمت: بحیثیت استاد یکم ستمبر 1982ء، تعلیم بالغان (شبینہ اسکول)، نانگلوئی، دہلی،
تنخواہ: دوسوروپے

ملازمت : بحیثیت کاتب، ہفتہ وارنئی دنیا، نئی دہلی، 1983ء، دہلی، تنخواہ: چھ سوروپے

روزنامہ قومی آواز دہلی سے وابستگی: 1983ء بحیثیت کاتب، ستمبر 1989ء میں رپورٹر کے عہدے پر فائز۔

بی اے (اردو آنرز): ذاکر حسین ایوننگ کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی، 1986ء، فرسٹ ڈویژن

ایم اے (اردو): دہلی یونیورسٹی، فرسٹ ڈویژن (گولڈ مڈلسٹ)، 1990ء

ایم فل (اردو): دہلی یونیورسٹی، فرسٹ ڈویژن، 1993ء
موضوع: نیاز حیدر: شخصیت اور شاعری
نگراں: پروفیسر قمر رئیس

پی ایچ۔ڈی (اردو): دہلی یونیورسٹی، دہلی 1996ء
موضوع: اردو ناول کے فن اور تکنیک کا تنقیدی مطالعہ مابعد پریم چند تا حال
نگراں: پروفیسر قمر رئیس

بیچلر ان پبلک ریلیشنز: ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، حیدرآباد

ایم اے ماس کمیونیکیشن اینڈ جرنلزم: الگپا یونیورسٹی، کرائی کوڈی

سرٹیفکیٹ کورس ان پرشین: دہلی یونیورسٹی (فرسٹ ڈویژن)

(یہ واضح رہے کہ دوران تعلیم بھائی جان گھریلو معاشی تنگی کی وجہ سے ملازمت بھی کرتے رہے اور والدین کو گھریلو اخراجات کے لیے پابندی سے رقم بھی بھیجتے رہے۔)

حیدرآباد میں قیام: مارچ 1998ء سے تا مرگ

سرکاری ملازمت: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
(اسسٹنٹ پبلک ریلیشنز آفیسر، 16/مارچ 1998ء)

- ریڈر، ڈیپارٹمنٹ آف ٹرانسلیشن
(مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد، 13/ستمبر 2004ء)
- پروفیسر، ڈیپارٹمنٹ آف ٹرانسلیشن، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

- ہیڈ، ڈپارٹمنٹ آف ٹرانسلیشن
(مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد [تین معیاد])
23/نومبر 2005 سے 3/دسمبر 2008ء
4/دسمبر 2011ء سے 3/دسمبر 2014ء
4/دسمبر 2014ء سے 26/اپریل 2015ء
- ڈین، اسکول آف لینگویجز، لینگوسٹک اینڈ انڈولوجی، 6/اگست 2011ء سے 5/اگست 2014ء
- ڈین، اسکول آف ماس کمیونیکیشن اینڈ جرنلزم، 12/اگست 2014ء سے 18/فروری 2015ء
- ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز، 8/جنوری 2016ء سے تا مرگ
- ایڈیٹر شش ماہی رسالہ ''ادب وثقافت'' مرکز مطالعات اردو وثقافت، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد (ابتدا تا مرگ) ان پوسٹوں کے علاوہ پروفیسر محمد ظفرالدین صاحب مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں مختلف اہم عہدوں پر فائز رہے۔ جن میں پراکٹر، میڈیا کوآرڈینیٹر، آنریری ویجی لینس آفیسر، آنریری ڈائرکٹر، سید حامد سنٹرل لائبریری، آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی اکزامنیشن، آفیسر ان اسپیشل ڈیوٹی ڈائرکٹوریٹ آف ڈسٹنس ایجوکیشن، کوآرڈی نیٹر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سٹے لائٹ کیمپس لکھنؤ، پبلک ریلیشن آفیسر، چیف وارڈن، سیکوریٹی انچارج، ہیڈ شعبہ ہندی، ہیڈ شعبہ اسلامک اسٹڈیز وغیرہ وغیرہ۔

وفات : 5/اپریل 2021ء بروز پیر، 10 بجے دن، Olive Hospital نانل نگر، حیدرآباد۔500028

نماز جنازہ : 6/اپریل 2021ء، بروز منگل بعد نماز فجر، مسجد قبا، نانل نگر، حیدرآباد۔500028

تدفین : 6/اپریل 2021ء بروز منگل، سات بجے صبح، قبرستان سرائے الٰہی، کاچی گوڑہ، حیدرآباد

علمی و ادبی خدمات

کتابیں :

- نیاز حیدر: شخصیت اور شاعری (تحقیق وتنقید)
(1995، ناشر: پرنٹ آرٹ، 910 شیش محل، آزاد مارکیٹ، دہلی۔110006)
- پروفیسر قمر رئیس: آثار و احوال (مرتبہ)، 2011 (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)
- سرّی ادب اور ابن صفی (مرتبہ)، 2016 (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)

دیگر ادبی کارنامے:

- مختلف رسائل وجرائد اور خبارات میں تقریباً ایک سو مضامین شائع ہوئے۔
- چند کتابوں میں مختلف موضوعات پر دس باب شائع ہوئے۔
- تین کتابوں کا ترجمہ کیا۔
- SLM کے لیے اپنی نگرانی میں 42 کتابیں مرتب کیں۔
- یونیورسٹی میں اپنی نگرانی میں پندرہ قومی اور بین الاقوامی سمینار منعقد کیے۔
- متعدد ورکشاپ میں حصہ لیا۔
- انھوں نے مختلف یونیورسٹیوں میں کئی اہم موضوعات پر متعدد لکچر دیے۔
- پندرہ بین الاقوامی اور قومی سمیناروں میں شرکت کی اور مقالات پیش کیے۔
- انھوں نے یو جی سی کا میجر ریسرچ پروجیکٹ مکمل کیا۔
- ان کی نگرانی میں سات طلبا نے ایم۔فل اور چار اسکالرز نے پی ایچ۔ڈی کے تحقیقی مقالات لکھے اور انھیں ڈگری تفویض کی گئی۔

نگراں ایم۔فل:

(1) محمد حبیب اللہ، رابندر ناتھ ٹیگور کے اردو تراجم کا تجزیاتی مطالعہ، 2013ء

(2) محمد عامر بدر، صحافتی ترجمہ نگاری اور یو این آئی کی خدمات، 2013ء

(3) محمد نظام الدین، اردو ترجمہ نگاری کے فروغ میں مولانا آزاد کے صحافتی تراجم کا حصہ، 2013ء

(4) محمد یوسف صدیق، اردو ویب جرنلزم میں خبروں کا ترجمہ وادارت، 2014ء

(5) سید انعام الرحمٰن، برطانوی سرکار کے قائم کردہ مراکز تراجم اوران کے اثرات، 2016ء

(6) محمد مظہر، دکن میں سیرۃ النبی کے عربی سے اردو میں تراجم، 2016ء

(7) کے۔ رحمت اللہ، کنڑ فکشن کے اردو تراجم، 2019ء

نگراں پی ایچ۔ ڈی:

(1) محمد حبیب اللہ، ٹیگور کے اردو تراجم میں ان کے فکر وفن کی منتقلی، 2018

(2) محمد عبدالواسع، اردو ترجمہ نگاری میں صنائع وبدائع

(3) محمد عتیق الرحمٰن، اردو میں ہندو مذہب سے متعلق شعری ونثری تراجم

(4) سید یوسف صدیق، قرآن کریم کے اردو تراجم کے مقدموں میں ترجمے سے متعلق مباحث کا جائزہ۔

اہلِ خانہ:

شادی : 11/اکتوبر 1992، بروز اتوار

شریک حیات: مسرت جہاں (نیلو) بنت عبدالقیوم، ساکن محلّہ معروف گنج، گیا، بہار
(ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)

اولادیں :

1. شبیع ظفر (پیدائش 28/دسمبر 1993 امطابق 14/رجب المرجب 1414ھ بروز منگل)
2. ثانیہ ظفر (پیدائش 6/دسمبر 1995 مطابق 5/رجب المرجب 1416ھ بروز بدھ)
3. شبیب ظفر عرف فرقان (پیدائش 15/اپریل 1999 مطابق 27/ذی الحجہ 1419ھ بروز جمعرات)

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

❒ **Prof. Shahzad Anjum**
Head, Department of Urdu
Jamia Millia Islamia, New Delhi-110025
Mobile: 9871487550 Email: sanjum2@jmi.ac.in

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:18-18
Prof. Syed Masood Siraj, Qata-e-Tareekh-e-Wafat

سید مسعود سراج

قطعہ تاریخ وفات

پروفیسر محمد ظفر الدین مرحوم، ڈائرکٹر، مرکز مطالعاتِ اردو ثقافت
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد

بہت ہی نیک، مخلص، نکتہ پرور
بہت کم ایسے ہوں گے سرزمیں میں
پئے تاریخ میں نے کہہ دیا ہے
''ظفر ناجی ہیں فردوس بریں میں''
2021 عیسوی

بہت ہی حسن و خوبی سے نبھایا اپنے منصب کو
ظفر نے جو کیے ہیں کام وہ ہیں قابل تحسیں
ملے ہیں ایک ہی مصرع میں ہجری اور مسیحی سنہ
ارم میں زیب مسند ہیں ''جناب عالی ظفر الدین''
1442 ہجری

جناب عالی ظفر الدین سے 1442ھ برآمد ہوتے ہیں اور پورے مصرع سے 2021ء نکلتے ہیں۔

❒ **Prof. Syed Masood Siraj**
Former Head, Department of Urdu
Mysore University, Mysore
Mobile: 9845435540 Email: profsmsiraj@rediffmail.com

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:19-21
Prof. S. M. Rahmatullah, Prof. Mohd. Zafaruddin: Ek Adeeb, Ala Muntazim aur Buland Kirdar...

ایس ایم رحمت اللہ

پروفیسر محمد ظفرالدین: ایک ادیب، اعلیٰ منتظم اور بلند کردار شخصیت

پروفیسر محمد ظفرالدین، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے اولین عملہ میں شامل تھے۔ یونیورسٹی میں ان کا پہلا تقرر 13/مارچ، 1998 میں بحیثیت اسسٹنٹ پبلک ریلشن آفیسر ہوا جہاں انھوں نے اپنی ذمہ داری انتہائی حسن وخوبی کے ساتھ 12/ستمبر، 2004 تک نبھائی۔ پروفیسر ظفرالدین، انتہائی سنجیدہ، محنتی اور خوش گفتار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ کسی کی دل آزاری نہیں کرتے تھے۔ عموماً ان کا رشتہ ہر کسی سے مثبت اور صحت مند تھا۔ ان میں انتظامی، قائدانہ اور ادبی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ وہ اپنے رفقائے کار کے ساتھ بہت شفقت سے پیش آتے تھے۔ ان کی یہ کوشش رہتی تھی کہ ان کی ذات سے دوسروں کی مدد ہو سکے۔ وہ اپنی محنت، لگن اور بے لوث خدمت کی بدولت یونیورسٹی میں روز افزوں ترقی کی منزلیں طے کرتے گئے۔ مانو میں ان کا دوسرا تقرر شعبۂ ترجمہ میں بحیثیت ریڈر 13/ستمبر، 2004 میں ہوا۔ یہیں سے ان کا تدریسی سفر کا آغا ہوا۔ ان کی نگرانی میں متعدد ریسرچ اسکالرز کو پی ایچ ڈی کی ڈگریاں عطا ہوئیں۔ شعبۂ ترجمہ میں ہی وہ 4/مارچ، 2008 کو پروفیسر بنے۔ انھوں نے اس شعبے میں تین بار (2005, 2011 &2014) صدر کی خدمات انجام دیں۔

پروفیسر محمد ظفرالدین کو 27/اپریل، 2015 کو ''مرکز برائے اردو زبان، ادب اور ثقافت'' میں ڈائرکٹر کی ذمہ داری دی گئی جس کا موجودہ نام ''مرکز مطالعاتِ اردو ثقافت'' ہے۔ انھیں 2016 میں ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز کا ڈائرکٹر بنایا گیا۔ وہ تادم حیات دونوں مراکز کے ڈائرکٹر رہے۔ انھوں نے اسکول برائے السنہ، لسانیات اور ہندوستانیات (14-2011) اور اسکول برائے ترسیل عامہ وصحافت (15-2014) میں بحیثیت ڈین خدمات انجام دیں۔ علاوہ ازیں وہ یونیورسٹی میں متعدد اضافی اور اعزازی عہدوں پر فائز رہے جن میں پراکٹر (13-2010)، میڈیا کوآرڈ نیٹر (13-2012)،

وجلینس آفیسر(15-2014)،ڈائرکٹر،سید حامد سینٹرل لائبریری،اوایس ڈی،امتحانات برانچ(2009)، اوایس ڈی ، ڈائرکٹوریٹ آف ڈسٹینس ایجوکیشن (2015) ،کوآرڈنیٹر،مانو سیٹلائٹ کیمپس لکھنؤ (14-2012)،ڈائرکٹر،نظامت فاصلاتی تعلیم(2015)،کنٹرولر امتحانات، پبلک ریلیشن آفیسر، چیف وارڈن،صدر شعبۂ ہندی(2014)،صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز(2014)،صدر شعبۂ عربی وغیرہ شامل ہیں۔انھوں نے تقریباً23برس تک یونیورسٹی میں انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی خدمات انجام دیں۔ انتظامی لیاقت کے ساتھ ساتھ ان کا تعلیمی سفر بھی کافی تابناک رہا ہے۔انھوں نے بی اے(آنرس)، ایم اے(اردو) اورایم فل(اردو) فرسٹ ڈویژن کے ساتھ دہلی یونیورسٹی سے مکمل کیا تھا۔وہ ایم اے میں گولڈ میڈلسٹ تھے۔علاوہ ازیں انھوں نے ماس کمیونکیشن میں ایم اے بھی کیا تھا۔انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری1996میں دہلی یونیورسٹی سے بعنوان’’اردو ناول کے فن اور تکنیک کا تنقیدی مطالعہ:مابعد پریم چند تا حال‘‘تفویض ہوئی تھی۔

پروفیسر ظفرالدین کو یو جی سی سے ایک میجر پروجیکٹ بعنوان’’معاصر صحافت کا تنقیدی مطالعہ:ترجمہ اور اصطلاحات کی روشنی میں‘‘(2011-2009) ملا تھا۔اس کے علاوہ انھوں نے یو جی سی سے بین شعبہ جاتی ریسرچ اور تدریس کے پروگرام کے تحت42لاکھ کا پروجیکٹ بھی حاصل کیا تھا۔انھوں نے ریاستی وقومی سطح پر متعدد سمیناروں میں شرکت کی اور تحقیقی مقالے پیش کیے۔علاوہ ازیں متعدد اجلاس کی صدارت کی اور کلیدی خطبہ پیش کیا۔انھوں نے بحیثیت ریسورس پرسن مختلف ورک شاپس میں شرکت کی اور اپنے خطبات پیش کیے۔ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں اردو ترجمہ:حقائق وامکانات(2007)، نیاز حیدر:شخصیت اور شاعری(1995) اور پروفیسر قمر رئیس:آثار واحوال (2011) انتہائی اہمیت رکھتی ہیں۔ان کے علاوہ انھوں نے تین کتابوں کا ترجمہ کیا ہے اور متعدد کتابیں مرتب کی ہیں۔ان کے 25 سے زائد تحقیقی مقالے منظر عام پر آچکے ہیں۔اخبارات اور رسائل میں 50 سے زائد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔انھوں نے بی اے اور ایم اے کی سطح پر نصاب کی تشکیل میں بھی حصہ لیا اور سیلف لرننگ میٹریل کے تحت بہت سے مضامین تیار کیے۔وہ مختلف اداروں کی گورننگ باڈی کے ممبر اور بورڈ آف اسٹڈیز کے چیئرمین بھی رہے۔انھوں نے اپنی حیات کے ایام آخر میں دوقومی سمینار کا انعقاد بھی کیا تھا۔پہلا سمینار ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز کی جانب سے 11-10رفروری 2021 کومنعقد ہوا تھا۔دوسرا سمینار مرکز مطالعاتِ اردو ثقافت کے زیر اہتمام 16-15رفروری 2021

کو عمل میں آیا تھا۔ مجھے بھی ان دونوں سمیناروں کے افتتاحی اجلاس میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ یقیناً یہ کامیاب سمینار تھے جن میں ملک کے مختلف یونیورسٹیوں سے معزز ادبا نے شرکت کی تھی۔

پروفیسر محمد ظفرالدین کی حیثیت انتظامی نقطۂ نظر سے ایک انجمن یا ادارے کی تھی۔ یونیورسٹی کے وہ ایک فعال اور سرگرم رکن تھے۔ وہ جس عہدے پر فائز رہے، انتہائی محنت اور لگن سے کام کرتے تھے۔ وہ اپنی شفقت اور محبت سے ماتحت عملہ کا دل جیت لیتے تھے۔ اس طرح وہ آفس کے نظم و نسق کو انتہائی خوبصورتی سے انجام دیتے تھے۔ ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے اپنی ذمہ داریوں سے کبھی رو گردانی نہیں کی۔ وہ کسی بھی کام کو قبل از وقت مکمل کرنے میں یقین رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یونیورسٹی کے بیشتر وائس چانسلرز کی نگاہ میں ان کی بڑی قدر تھی۔ وہ یونیورسٹی کے ایک معتبر اور معتمد شخصیت تھے۔ یونیورسٹی میں ان کی حیثیت منفرد اور نمایاں تھی۔ وہ معاملات فہمی اور حکمت عملی میں یکتا اور نادر تھے۔ ان سے ذاتی طور پر میرا تعلق بہت پرانا ہے جس کے باعث ہمیں ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کا خاطر خواہ موقع ملا۔ وہ یقیناً ایک نیک صفت انسان تھے۔ وہ اپنے بڑوں کی قدر کرتے اور عزیزوں سے شفقت سے پیش آتے تھے۔ اب وہ درخشاں چراغ ہمارے درمیان نہیں رہا، ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔ ان کی ناگہانی موت سے یقیناً اہل خانہ، یونیورسٹی اور دنیائے اردو کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ اس خلا کو آسانی سے پُر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ انھیں یاد کر کے دل مغموم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ ہر نفس کو موت کا مزا چکھنا ہے۔ زندگی کا یہی حاصل اور یہی انجام ہے۔

❒ **Prof. S. M. Rahmatullah**
Pro-Vice Chancellor
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad-500032 Telangana
Mobile: 9490377817
Email: smrahmatullah@manuu.edu.in

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:22-27
Prof. Sharib Rudaulvi, Zafaruddin: Mere Azeez Shagird

شارب ردولوی

ظفرالدین: میرے عزیز شاگرد

ظفرالدین میرے عزیز شاگردوں میں تھے۔ دہلی یونیورسٹی سے ہی انہوں نے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں، میں اس وقت دہلی یونیورسٹی میں ہی تھا۔ میرے شاگروں میں خودساز وکامیاب انسان کی اگر کوئی مثال میرے سامنے ہے تو وہ ظفرالدین کی ہے۔ وہ ایک بے حد محبت اور عزت کرنے والے طالب علم تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے طالب علمی کے زمانے میں بھی اپنے والدین پر اپنی تعلیم کا بوجھ نہیں ڈالا۔ وہ روزنامہ ''قومی آواز'' میں سب ایڈیٹر تھے اور اسی سے اپنی تعلیم کے ساتھ دیگر گھریلو اخراجات پورے کرتے تھے۔ ظفر اپنے ہر استاد کا بے حد ادب کرتے تھے، یہ صرف میرے ساتھ ان کا برتاؤ نہیں تھا۔ ایسے مہذب اور نستعلیق طالب علم کسی استاد کو اس کی زندگی میں کم ہی ملتے ہیں۔ ظفر سے میرا ایک خاص رشتہ تھا، وہ میرے گھر کے ایک فرد کی طرح تھے۔ اس کا سبب یہ بھی تھا کہ وہ میرے ہی گھر کے ایک حصے میں اپنی بیوی نیلو(ڈاکٹر مسرت جہاں، شعبہ اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد) کے ساتھ رہتے تھے جن کی شمیم نکہت (پروفیسر شمیم نکہت، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی) کے پاس ہر وقت آمدورفت رہتی تھی۔ وہ نئی نئی ''گیا'' سے دہلی آئیں تھیں اس لیے اس وقت کچھ فطری حجاب مانع تھا اور کچھ بہار کے لہجے اور زبان کی شرم تھی۔ وہ پڑھی لکھی تھیں لیکن انہیں ایک احساس اس کا ضرور تھا کہ وہ اس طرح گفتگو نہیں کر پاتیں ہیں جو ہم لوگوں کا انداز ہے۔ لیکن شمیم ایک Feminist تھیں، انہوں نے نیلو کو ایسا صیقل کیا کہ چند ماہ میں وہ بالکل بدل گئیں۔ سب سے پہلے تو انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ ''تم پڑھو، شادی کے بعد تم نے تعلیم کیوں چھوڑ دی؟'' پھر کئی طرح کے بہاری کھانے انہوں نے نیلو سے خود سیکھے اور لکھنؤ کے کھانے انہیں سکھائے بھی، پکا کر کھلائے بھی۔ ان باتوں کی وجہ سے ظفر اور نیلو ہم لوگوں سے بالکل گھل مل گئے۔

ظفرالدین بنیادی طور پر بہت ذہین اور بہت اچھے حافظے کے مالک تھے۔ان کی ایک خوبی اور تھی کہ ان کا خط بہت اچھا تھا۔اس لیے مجھے یہ آرام ہوگیا تھا کہ میں اپنے مضامین جو عام طور پر جلدی میں لکھتا تھا، Fair کرنے کے لیے انہیں دے دیتا تھا۔ابھی بھی میری فائل میں بعض مضامین ان کی تحریر میں مل جائیں گے۔فرصت کے اوقات میں وہ میرے پاس آجاتے تھے میری لائبریری اور پڑھنے کا کمرہ باہر کے دروازے سے ملا ہی ہوا تھا اس لیے جن مسائل میں انہیں کوئی دشواری ہوتی تھی ان پر اسی وقت تفصیل سے گفتگو ہوتی تھی۔انہیں اخبار کی ضرورت کے تحت اکثر ترجمہ کرنا پڑتا تھا۔ایسے میں مشکل لفظ یا جملہ آجائے تو وہ فوراً مجھے فون کرتے ،ان کے ایڈیٹر ایک کشمیری تھے کبھی کبھی وہ بھی فون کرتے تھے۔وہ عام طور پر اپنی ہر بات میں مجھ سے مشورہ کرتے تھے۔اپنے چھوٹے بھائی شہزاد انجم (پروفیسر شہزاد انجم، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) کو انھوں نے دہلی یونیورسٹی کے ایک ہاسٹل میں رکھا تھا۔ایم فل کرنے کے بعد ایک دن آئے اور خاموش بیٹھ گئے، میں نے خیریت دریافت کی تو انھوں نے مختصر سا جواب دیا ''جی سر اچھا ہوں۔''میں خود نہیں سمجھ پارہا تھا کہ ایسے تو وہ آکر کبھی نہیں بیٹھے تھے۔میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن کہہ نہیں پارہے ہیں۔میں نے سوچا کہ شاید کچھ پیسوں کی ضرورت ہو اور وہ اس کا اظہار نہ کر پارہے ہوں تو میں نے اپنی طرف سے کہا ''ظفر تمہیں کوئی ضرورت ہے؟ پیسے ویسے تو نہیں چاہئیں، تم بتاؤ کیا ہے؟ میں نے ان کی پیٹھ تھپتھپا کر کہا۔

''سر میں قمر رئیس سر کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتا ہوں۔'' میں ہنسنے لگا، میں نے کہا اس بات کے کہنے میں تمہیں اتنی دیر کیوں لگی۔''سر میں اصل میں پریم چند کے بعد اردو ناول کے فن اور تکنیک پر کام کرنا چاہتا ہوں اور پریم چند کے ناول پر ان کا کام بہت اہم ہے۔اس لیے میری خواہش ہے کہ میں یہ کام ان کے ساتھ کرتا۔'' میں نے کہا'' مجھے اس کی خوشی ہے کہ تم نے ایک اچھے موضوع اور اچھے سپروائزر کا انتخاب کیا ہے۔''

''سر یوں بھی شہزاد انجم کو تنقید سے بہت دلچسپی ہے، وہ آپ کے ساتھ ہی ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے کے خواہش مند ہیں۔اس لیے آپ کی اجازت چاہتا تھا۔'' میں نے کہا'' ظفر! شہزاد انجم کس کے ساتھ پی ایچ ڈی کریں گے یہ بعد کی بات ہے۔تم جانتے ہو کہ قمر رئیس صاحب سے ہمارے تعلقات اس وقت سے ہیں جب ہم لوگ لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔یوں تو وہ کہنے کے لیے قانون کے طالب علم تھے لیکن رہتے ہر وقت ہم لوگوں کے ساتھ تھے اور آج بھی وہی قربت ہے۔میرا تقرر اس شعبے میں انہی کی ہیڈ شپ میں ہوا۔تم اتنی چھوٹی سی بات کے لیے پریشان تھے۔خدا تم کو مبارک اور کامیاب کرے۔''

ظفر کا میرے گھر آنا جانا اسی طرح رہا۔شعاع کی شادی کی ساری ذمہ داری ظفر،شہزادانجم، ظل ھما،عطیہ، کہکشاں وغیرہ پر تھی اور جس خوش اسلوبی سے ہمارے اور شمیم کے شاگردوں نے مل کر سارے انتظامات کیے وہ شاید ہم لوگ خود کرتے تو کبھی نہ کر پاتے۔شمیم نکہت کو اپنا ہر طالب علم بہت عزیز تھا اور وہ سب بھی ان سے ایسی ہی محبت کرتے تھے لیکن شمیم ظفر اور نیلو کو بہت چاہتی تھیں۔وہ کئی مرتبہ اپنے کسی پروگرام سے یا میرے ساتھ حیدرآباد گئیں تو ہمیشہ ان کا اصرار ہوتا تھا کہ مانو کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہریے گا۔اپنی شدید بیماری کے عالم میں کہ جب وہ Dialysis پر تھیں تو بار بار کہتی تھیں میری ڈائی لیسس دو دن بعد ہوتی ہے اس لیے ایک دن ڈائی لیسس کے بعد یہاں سے حیدرآباد چلیں دو دن ظفر کے ساتھ گیسٹ ہاؤس میں رہیں گے اور دوسرے دن شام کو واپس آجائیں گے۔ہم لوگ جب بھی حیدرآباد جاتے تھے تو ظفر اور نیلو کا زیادہ وقت گیسٹ ہاؤس میں ہم لوگوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ظفر صبح سویرے گھر سے ناشتہ لے آتے تھے۔رات کو کھانے کے لیے ہم لوگ ان کے گھر چلے جاتے،اس طرح ایک جشن رہتا تھا۔1993 میں مجھے دہلی یونیورسٹی چھوڑ کر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی جانا پڑا۔اس وقت تک شہزادانجم کا پی ایچ ڈی کا کام مکمل نہیں ہوا تھا۔تکنیکی طور پر اب میں ان کا نگراں نہیں رہ سکتا تھا اس لیے انہیں پروفیسر شمیم نکہت کو منتقل کر دیا کہ اس طرح میں ان کے کام کی نگرانی کرتا رہوں گا۔میں جے این یو میں پروفیسر ہو گیا لیکن میں نے اپنے رہنے کی جگہ تبدیل نہیں کی۔میرے لیے روز جے این یو جانے آنے کا سفر ساٹھ کلومیٹر کا تھا۔چونکہ شمیم دہلی یونیورسٹی میں تھیں اور قیام گاہ سے ان کا شعبہ محض پانچ سات منٹ کی چہل قدمی پر تھا اس لیے ان کی سہولت کی وجہ سے میں نے وہ جگہ نہیں چھوڑی۔اس طرح ہمارے اور ظفرالدین کے درمیان جو رشتہ قائم ہوا تھا وہ اس وقت تک باقی رہا جب تک وہ حیدرآباد نہیں منتقل ہو گئے۔اس کے لیے بھی انہوں نے ایک دن مجھ سے دریافت کیا۔

’’سر ڈاکٹر شمیم جیراج پوری صاحب کا تقرر اردو یونیورسٹی کے بانی وائس چانسلر کے طور پر ہوا ہے۔وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔’’قومی آواز‘‘ کی مستقل ملازمت چھوڑ کر میرے لیے جانا مناسب ہے یا نہیں؟‘‘ میں نے پوچھا ’’پوسٹ کیا ہے؟ تم بات کر لو اگر پرسنل اسسٹنٹ کی پوسٹ ہے تو موجودہ ملازمت چھوڑنا مناسب نہیں ہے اور اگر یونیورسٹی کی کوئی پوسٹ ہے تو ٹھیک ہے۔‘‘ دو دن بعد انہوں نے جواب دیا ڈپٹی پی آر او یا اسسٹنٹ پی آر او (اب مجھے یاد نہیں) کی جگہ ہے۔’’ضرور چلے جاؤ اس میں کوئی حرج نہیں ہے‘‘ میں نے کہا۔

ظفر کی اصل لیاقت اور صلاحیت کو پھلنے پھولنے کا موقع حیدرآباد میں ملا۔جہاں یونیورسٹی بنی تھی

وہاں اس وقت تک پہاڑوں کے سوااور کچھ نہیں تھا۔میرا اسی زمانے میں ایک کام کے سلسلے میں سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد جانا ہوا تو ظفر نے مجھے بھی وہ پہاڑیاں دکھائیں جو بہت بڑے اور گول گول، تلے اوپر رکھے ہوئے پتھروں سے اس طرح آراستہ تھیں جیسے انہیں کسی نے سجایا ہو۔اس وقت تک کل تین لوگوں کا ہی یونیورسٹی میں تقرر ہوا تھا، وائس چانسلر، پی آر او اور ڈپٹی پی آر او۔ظفر ہر وقت وائس چانسلر کے ساتھ ہی رہتے تھے۔انہوں نے ضرورت کے مطابق اپنی تعلیمی صلاحیتوں کو بھی بڑھایا اور پبلک ریلیشن میں ڈگری حاصل کی تا کہ وہ اپنے فرائض منصبی کو بہتر طور پر ادا کرسکیں۔

ظفرالدین کو اگر ہم ادبی حیثیت سے دیکھیں تو انہوں نے اس سلسلے میں بہت وقیع کام کیے ہیں۔اپنے تحقیقی مقالے کے علاوہ انہوں نے ایک ایسے ترقی پسند شاعر پر کام کیا جس کو سب بھول چکے تھے۔نیاز حیدر ان لوگوں میں ہیں جو پہلی نسل کے ترقی پسندوں اور ڈراما نگاروں میں تھے۔وہ ایک ایسے سیماب صفت انسان تھے جس نے اپنی کوئی چیز کبھی احتیاط سے نہیں رکھی۔وہ جس کاپی یا کاغذ پر لکھتے تھے وہ کچھ دنوں تک ان کے ہاتھ میں دبا رہتا تھا اور پھر اپنی ''جھونک'' میں وہ اسے کہیں چھوڑ دیتے تھے۔حافظہ اچھا تھا اس لیے بڑی سے بڑی نظم بھی ان کو زبانی یاد رہتی تھی ،اس کے لیے کاغذ دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ایسے شخص کی تحریریں جمع کرنا،نظمیں اور اشعار تلاش کرنا بہت مشکل کام تھا لیکن ظفرالدین نے پرانے رسائل سے اور جو کاغذات ان کی بہن سے مل گئے ان کی مدد سے نیاز حیدر کا کلام جمع کیا اور ایک بہت اچھی کتاب ان کے فن اور شخصیت کے بارے میں لکھی۔اسی سلسلے میں پروفیسر قمر رئیس نے ایک جلسہ نیاز حیدر کی یاد میں کیا جس میں پہلا (اور آخری)'' نیاز حیدر یادگاری خطبہ'' میں نے دیا تھا۔ظفر کو قمر رئیس سے بھی بے حد محبت تھی چناچہ قمر صاحب کے انتقال پر انہوں نے ایک سمینار مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے تحت کیا تھا جس میں کلیدی خطبہ میں نے پیش کیا تھا۔اسی سمینار میں شمیم (پروفیسر شمیم نکہت) نے قمر رئیس پر جو تاثراتی مضمون پڑھا تھا وہ اس قدر پر اثر تھا کہ لوگوں کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ظفرالدین نے اس سمینار میں پڑھے جانے والے تمام مضامین کو بڑے سلیقے سے شائع کیا،اس میں قمر رئیس پر خود ان کا بھی مضمون تھا جس میں انہوں نے بڑی خوب صورتی سے قمر صاحب کی زندگی اور ان کے علم و دانش کا احاطہ کیا تھا۔اس کے ساتھ ہی قمر رئیس مرحوم پر ظفرالدین کی اہلیہ ڈاکٹر مسرت جہاں کا تحقیقی مقالہ بھی کتابی صورت میں منظر عام پر آچکا ہے۔

نیاز حیدر پر میں نے ظفرالدین کے تحقیقی کام کا ذکر کیا،اس کے علاوہ انہوں نے اسی طرح کا ایک اور کام کیا،فکشن کا ایک عہد ہمارے یہاں ایسا گزرا ہے جس میں جاسوسی ناولوں کا بہت زور تھا اور اسی سلسلے

میں الہ آباد سے ہر ماہ ''ماہنامہ جاسوسی دنیا'' اور ماہنامہ نکہت کی ''عمران سیریز'' کے ناول شائع ہوتے تھے۔ یہ ناول مشہور جاسوسی ناول نگار ابن صفی کے زور قلم کا نتیجہ ہوتے تھے۔ ابن صفی کی شہرت دن بہ دن بڑھتی گئی اور ان کی اس مقبولیت کی وجہ سے دہلی اور لکھنؤ میں نہ جانے کتنے ہی جاسوسی ناول نگار پیدا ہو گئے اور اردو کا ہر پبلشر ان ناولوں کی اشاعت میں لگ گیا۔ اردو کے ناقدوں اور ادیبوں نے ان ناولوں کو مقبول عام ادب میں تو شمار کیا لیکن ان کو ادبی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں دی۔ حالانکہ ابن صفی کے ناول زبان و بیان اور طنز و ظرافت میں ایسے ہوتے تھے کہ کسی بھی اچھے ناول کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ بعض بڑے معتبر ادیب و ناقد ابن صفی کے ناولوں کو پڑھتے تھے جن میں قاضی عبدالودود صاحب نے خود مجھ سے اس کا ذکر کیا کہ ابن صفی کا ہر ناول انہوں نے پڑھا ہے اور یہ سبھی ناول ان کے پاس موجود ہیں۔ پروفیسر سید اعجاز حسین صدر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی بھی بڑے شغف سے ان ناولوں کو پڑھتے تھے لیکن ان سب کے باوجود ابن صفی کے ان ناولوں کی ادبی و فنی حیثیت و اہمیت کے بارے میں کسی نے قلم نہیں اٹھایا یا قلم اٹھانے میں سبکی محسوس کی۔ ڈاکٹر محمود کاظمی نے بتایا کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے ''مرکز برائے اردو زبان، ادب وثقافت'' نے ابن صفی پر دو روزہ قومی سمینار کا انعقاد کیا جس میں ملک بھر سے مشاہیر علم و ادب اور ماہرین ابن صفی نے شرکت کی۔ اس سمینار کے کنوینر شعبہ اردو مانو اور اس وقت کے ڈائرکٹر مرکز اردو زبان و ادب وثقافت پروفیسر خالد سعید مرحوم تھے جو اس سمینار کے بعد ہی ملازمت سے سبک دوش ہو گئے اور ان کے بعد بحیثیت ناظم مرکز پروفیسر ظفر الدین نے اس سمینار میں پڑھے گئے تمام مقالوں کو جمع کیا اور ایک انتہائی دیدہ زیب کتاب کی صورت میں اسے شائع کیا۔ اس طرح انہوں نے اردو زبان و ادب پر ابن صفی کے احسانات کا قرض اتارنے کی ایک مثبت و کارآمد کوشش کی۔

محمد ظفر الدین کا تعلق مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ ترجمہ سے تھا۔ ترجمے پر ان کا اتنا کام ہے کہ اگر اس کا ذکر کیا جائے تو ایک اور مضمون کی ضرورت ہوگی۔ وہ بنیادی طور پر عملی ترجمے سے وابستہ تھے، وہ ''قومی آواز'' میں ترجمے کا کام بھی کیا کرتے تھے لیکن کبھی اس کو انہوں نے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ انہوں نے ترجمے کا عملی کام اتنا کیا ہے کہ اگر وہ سارا کام سامنے آجائے تو تعجب ہوگا کہ کیسے ایک تنہا شخص نے اتنا کام کر لیا۔ ترجمے کے فن پر ان کی کتاب ''ترجمہ حقائق اور امکانات'' زیادہ تر لوگوں کی نظر سے گزری ہوگی، انہوں نے ان امکانات کو نہ صرف یہ کہ روشن تر کیا بلکہ اردو میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے اپنے یہاں ترجمے کا شعبہ قائم کر کے ترجمے کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی اور ظفر الدین نے اپنے ترجموں سے شعبہ کو فعال بنایا۔

پروفیسر ظفر الدین کا ایک بڑا تاریخی کام ''ادب وثقافت'' کا اجرا ہے۔ وہ مرکز برائے اردو زبان، ادب وثقافت کے ڈائرکٹر تھے،اس وقت 2015ء میں انھوں نے اس ششماہی تنقیدی وتحقیقی مجلّہ کی اشاعت کی بنیاد ڈالی۔ مجھے نہیں یاد ہے کہ اب تک اس کے کتنے شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ مجھے خود بھی انہوں نے اس کی مجلس مشاورت میں رکھا تھا۔ ہر شمارے میں ان کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ ثقافت اور تاریخ سے متعلق مضامین ضرور ہوں۔انہوں نے اپنی زندگی میں اسے عام رسائل کی طرح کبھی شائع نہیں کیا، پہلے ہی شمارے میں انھوں نے قومی زبان کے مسئلہ پر پروفیسر عبدالستار دلوی اور ہندوستانی تہذیبی روایت پر پروفیسر عتیق اللہ کا مضمون، ثقافتی اور قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو زبان کا حصہ، پروفیسر رحمت یوسف زئی اور ہندوستانی موسیقی کے فروغ میں امیر خسرو کا حصہ، ڈاکٹر حبیب نثار کے مضامین شائع کر کے اس بات کو ظاہر کر دیا تھا کہ یہ عام رسائل سے مختلف ہے اور اس انفرادیت کو انھوں نے اپنی ادارت میں شائع ہونے والے آخری شمارے تک قائم رکھا۔ یہ کام آسان نہیں تھا اور آج کے قحط الرجال میں جب تنقیدی وتحقیقی مضامین یا ادب وسماج وثقافت پر نگاہ رکھنے والے لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، مضامین فراہم کرنا ایک بڑا کام تھا۔ ظفر کا پس منظر چونکہ ادارت، ترجمہ اور طباعت سے وابستہ رہا ہے اس لیے انھوں نے اس مجلّہ کو ادبی وثقافتی اہمیت کے ساتھ صوری طور پر بھی دیدہ زیب بنایا۔ یہ مجلّے جو انھوں نے شائع کیے وہ آج ایک حوالہ جاتی اور تاریخی اہمیت رکھتے ہیں جن کی ضرورت ادب کے طالب علم کو ہمیشہ پیش آئے گی۔

اپنی تمام ادبی وتخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ظفر الدین میرے عزیز شاگردوں میں تھے۔اپنی اس مختصر سی زندگی میں وہ بڑے ذمہ دار عہدوں پر رہے۔ میں جانتا تھا کہ ایک دن وہ مانو کے وائس چانسلر کی حیثیت سے مجھے نظر آئیں گے لیکن افسوس کہ زندگی نے ان کے ساتھ وفا نہیں کی۔ اس کے باوجود وہ اتنے کام کر گئے کہ اردو ادب انہیں فراموش نہیں کر سکتا۔ میں نیلو (ڈاکٹر مسرت جہاں) اور ان کے بچوں کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے اہل خانہ، عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں کو صبر کی طاقت عطا فرمائے۔

❐ **Prof. Sharib Rudaulvi**
Former Head, Centre for Indian Languges
School of Language, Literature and Culture Studies
Jawaharlal Nehru University, New Delhi-110067
Mobile: 8840038282
Email: sharibrudaulvi@yahoo.com

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:28-30
Prof. Muzaffar Ali Shahmiri, Wo Shukriya Jo Ada Na Ho Saka

مظفر علی شہ میری

وہ شکریہ جو ادا نہ ہو سکا

میں پروفیسر ظفر الدین مرحوم سے پہلی بار کہاں ملا؟ ٹھیک سے یاد نہیں۔ غالباً ممبئی یونیورسٹی کے ایک سمینار میں اُن سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ کہہ نہیں سکتا کہ یہ کوئی یادگار ملاقات تھی۔ بس سرسری طور پر ہم ملے تھے۔ جب ہم حیدرآباد لوٹے تو انھوں نے مجھے تنقید پر ایک اکائی لکھنے کو کہا اور میں نے اپنی سمجھ کے مطابق لکھ کر انھیں دے دیا اور مطمئن ہو گیا کہ میں نے اپنا کام سلیقے سے کر دیا ہے۔ مگر ایک رات میں نے انھیں اپنے گھر کی طرف خراماں خراماں آتے ہوئے دیکھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ کیوں کہ اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی اور اُن کی خشمگیں نگاہیں میرے دل میں چبھ رہی تھیں۔ انھوں نے آتے ہی اکائی میرے سامنے رکھی اور کہا کہ کیا مضمون ایسا لکھتے ہیں؟ اور مزید یہ جملہ ازراہِ محبت نوازا کہ ''یہ مضمون ویسا تو نہیں ہے جیسا آپ نے ممبئی کے سمینار میں پڑھا تھا۔'' میں سمجھ گیا کہ مجھ سے لکھنے میں کہیں چوک ہوگئی ہے۔ بعدازاں میں نے اُن کی ہدایات کے مطابق دوسری اکائی لکھ کر دے دی۔ اُس وقت میری سمجھ میں آیا کہ پروفیسر ظفر الدین اپنا کام کتنی ذمے داری سے کرتے ہیں۔ اُس کے بعد انُھوں نے جو بھی کام دیا میں نے اُسے کچھ زیادہ ہی احتیاط سے سرانجام دیا۔

اُن کے حزم و احتیاط کا ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ایک دن اُن کا فون آیا کہ میں ''ادب و ثقافت'' کے لیے کوئی مقالہ بھیجوں۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے پاس دو مقالے ہیں؛ ایک متنازعہ فیہ ہے اور دوسرے میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ آپ جو چاہیں لے لیں۔ مرحوم نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا کہ دوسرا والا ہی دے دیجیے کہ متنازعہ فیہ کے مقابلے میں اختلافی مقالہ بہتر ہوگا۔ میں نے انھیں اپنا مقالہ ''اردو ہندی تنازعہ: تاریخ کی روشنی میں' میل کیا جسے مرحوم نے ادب و ثقافت کے ستمبر 2016 والے شمارے میں شائع کیا۔ میں نے ایک دن اُن سے پوچھا کہ انھیں مقالہ کیسا لگا تو انھوں نے

تعریف کی اور یہ کہا کہ انھوں نے اس مقالے پر تین اہلِ نظر کی رائے لی تب کہیں جا کے اِسے چھاپا۔ یقیناً ظفر مرحوم بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔

جب دوستی پرانی ہوگئی تو میں انھیں چھیڑا کرتا تھا۔ خاص طور پر اُس وقت جب وہ مجھ سے کوئی کام لینا چاہتے ہوں۔ جب وہ مجھ سے کسی کام کی فرمائش کرتے تو میں یہ شرط رکھتا کہ کام کے بعد اُن کے مکان پر فلاں چیز کھلا ئیے تو مقالہ ملے گا یا یہ کہ سمینار میں حصہ لوں گا ورنہ نہیں۔ وہ مسکرا کر کہتے کہ ''بھائی پہلے آپ حیدرآباد آئیے، دعوت بھی ہو جائے گی۔'' معاملہ یہ تھا کہ ایک روز میں نے اُن کے کوارٹر میں بڑی پُر تکلف دعوت کھائی تھی اور میں اکثر انھیں اس دعوت کے حوالے سے چھیڑا کرتا تھا۔ آج یاد کرتا ہوں تو منہ کڑوا ہو جاتا ہے۔

جب میں نے ڈاکٹر عبدالحق اُردو یونیورسٹی، کرنول، آندھرا پردیش کے وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالا تو بسا اوقات پروفیسر ظفر الدین مرحوم سے فون پر میری گفتگو ہوتی تھی۔ کبھی یوں بھی ہوا کہ میں یونیورسٹی چلا گیا اور اُن کے کمرے میں ان کے روبرو بیٹھ کر درس و تدریس کے مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔ ایک ایسا ہی موقع تھا جب ہم بڑی سنجیدگی سے محوِ گفتگو تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ اردو میڈیم کی کتابیں کیوں کر حاصل کی جائیں؟ اور یہ کہ اُن کے شعبے سے ہمیں کیا مدد مل سکتی ہے؟ ایک سوال یہ بھی ہمارے سامنے تھا کہ کتابیں فراہم ہونے تک ہم وہاں اردو میڈیم کی کلاسیں کیسے چلائیں؟ پروفیسر ظفر الدین نے دیگر باتوں کے ساتھ طلبہ کو Hand outs فراہم کرنے کا مشورہ دیا۔ مزید یہ بتایا کہ یہ امریکی طریقِ تدریس ہے اور اس کے فائدے بے شمار ہیں۔ کرنول جا کر میں نے اور میرے رفقائے کار نے Hand Outs کو ذولسانی طرزِ تدریس پر حتمی شکل دی اور اُسے ''دستی پرچے'' کے نام سے یونیورسٹی میں رائج کر دیا۔ جس سے آج بھی طلبہ فیض یاب ہو رہے ہیں۔

میں نے امسال فروری کے مہینے میں منعقدہ قومی ورک شاپ میں پروفیسر ظفر الدین کو کرنول آنے کی دعوت دی۔ ارادہ یہ تھا کہ میں یونیورسٹی کے دوستوں اور طلبہ کے سامنے ان کا شکریہ ادا کروں کہ دستی پرچے کا طریقہ ان ہی کی دین ہے۔ لیکن آخری اجلاس میں وہ میرے بازو میں بیٹھے ہوئے تھے اور جیسا کہ ہوتا آیا ہے چراغ تلے اندھیرا، میں نے سب کا شکریہ ادا کیا مگر انھیں بھول گیا۔ جب ہم ورک شاپ کا آخری اجلاس ختم کر کے آ رہے تھے تو میرے پیچھے سے آواز آئی ''آپ مجھے بھول گئے۔'' میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو ظفر الدین تھے۔ کیا بتاؤں مجھ پر کیا گزری! ہوش و حواس یوں غائب ہوئے جیسے

انھیں بجلی نے اُچک لیا ہو۔ میرا فوری ردعمل یہ تھا کہ میں نے ان سے معذرت چاہی۔ وہ مسکراتے رہے اور شاید میری بے بسی کا لطف لیتے رہے؛ میں تھا کہ اندر ہی اندر گڑھا جا رہا تھا حتیٰ کہ وہ اپنی کار میں بیٹھ کر حیدرآباد کے لیے نکل گئے اور میں اپنے گھر۔ ورک شاپ کی کامیابی کا سارا نشہ کافور ہو چکا تھا۔

شاید ظفرالدین کو میری پشیمانی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اُنھوں نے حیدرآباد پہنچ کر یہ میسیج کیا جو میرے فون میں محفوظ ہے۔ لکھا ہے: ''السلام علیکم! انتہائی کامیاب اور بامعنی ورک شاپ کے انعقاد کے لیے دلی مبارک باد قبول کیجیے۔ آپ نے اس موقع پر مجھے مدعو کیا۔ اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔ اللہ آپ کو اور ڈاکٹر عبدالحق اُردو یونیورسٹی کو مزید شان دار مستقبل عطا کرے۔ ظفرالدین، مانو'' میں اس کے جواب میں اور کیا لکھتا سوائے اس کے کہ مجھے اپنے کیے پر ندامت ہے۔ چناں چہ میں نے لکھا: ''آپ کا قرض مجھ پر رہا۔ میں کسی مناسب موقع پر ادا کر دوں گا۔ مجھے اس غفلت کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔'' دوسرے ہی لمحے اُن کا جواب آیا کہ ''جانے دیجیے جناب''۔ اُن کا جواب پڑھتے ہوئے میں اپنے چشمِ تخیل سے اُن کے مسکراتے ہوئے چہرے کو بھی پڑھ رہا تھا؛ اطمینان ضرور ہوا مگر دل کا بوجھ کم نہ ہوا۔

میرا خیال تھا کہ جب مانو سے ہماری یونیورسٹی کا معاہدہ ہو گا تو وہ اس اجلاس میں تشریف لائیں گے۔ میں نے انھیں دعوت دی کہ وہ بھی ہمارے ساتھ شریک رہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر انھیں بلایا جائے گا تو وہ ضرور مجھ سے ملنے آئیں گے۔ مگر اُنھیں دعوت نہیں دی گئی۔ مجھے بڑا افسوس ہوا کہ اہلِ مجلس کے روبرو اُن کا شکریہ ادا کرنے کا ایک اور موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

مجھے کرنول سے حیدرآباد لوٹے ہوئے دو دن ہی ہوئے تھے اور میں اپنے لڑکے کے ساتھ کہیں جا رہا تھا کہ خبر ملی کہ ظفرالدین ہمیں داغ مفارقت دے گئے ہیں۔ میں سیدھے ان کے مکان پر پہنچا۔ اُن کا دیدار کرتے ہوئے بس یہی زبان سے نکلا ؎

موت کو موت کیوں نہیں آتی　　　کیسے کڑیل جواں کو تاکا ہے

❒ **Prof. Muzaffer Ali Shahmiri**
Former Vice Chancellor
Dr. Abdul Haq Urdu University
Kurnool - 518001, A.P.
Mobile: 9949422786　Email: shahmirihcu@gmail.com

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:31-35
Prof. Baig Ehsas, Professor Mohd. Zafaruddin-Ek Shola-e-Mustajil

بیگ احساس

پروفیسر محمد ظفرالدین۔ایک شعلۂ مستعجل

اردو یونیورسٹی کے قیام کے لیے حیدرآباد کا انتخاب کیا گیا اور اس کے پہلے وائس چانسلر، پروفیسر شمیم جئے راج پوری حیدرآباد تشریف لائے تو ان کے ساتھ دو نوجوان بھی تھے۔ایک ان کے اسکالر فضل الرحمٰن اور دوسرے محمد ظفرالدین، جو پی۔آر۔او تھے۔جس وقت یہ لوگ آئے اردو یونیورسٹی ایک خواب تھی۔ یہ بھی پتہ نہ تھا کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر بھی ہوگا یا نہیں۔ یونیورسٹی کی کیا صورت گری ہوگی۔ کون کون سے شعبے قائم ہوں گے۔کس جگہ یہ تعمیر ہوگی کچھ بھی واضح نہ تھا۔ برنداون کالونی میں ایک عمارت کرائے پر حاصل کی گئی یہ یونیورسٹی کا عارضی آفس تھا۔ یہ لوگ عثمانیہ یونیورسٹی اور یونیورسٹی آف حیدرآباد کے شعبے اردو سے ربط میں تھے۔فضل الرحمٰن سے تو ملاقات کم ہی ہوتی تھی لیکن محمد ظفرالدین سے ملاقات ہو جاتی۔ان سے پہلی بار ملاقات ہوئی تو انھیں بے حد سنجیدہ پایا۔قدرے فربہ جسم،متوسط قد، بہت دھیمے لہجے میں گفتگو کرتے تھے۔ چہرے کے نقوش سے لگتا تھا سخت محنت کے عادی اور مستقل مزاج آدمی ہیں۔ یہ نوجوان بہتر مستقبل کی تلاش میں حیدرآباد آئے تھے مستقبل ابھی دھند میں تھا۔

پروفیسر سلیمان صدیقی بحیثیت رجسٹرار، عثمانیہ یونیورسٹی سے ڈیپوٹیشن پر آئے۔ کچھ عارضی تقررات کیے گئے۔ یونیورسٹی کی سرگرمیاں شروع ہوئیں اور اس کے متعلق اخباروں میں خبریں چھپنے لگیں۔ محمد ظفرالدین نے اردو اخبارات سے ربط قائم کیا۔اچھے اور مضبوط تعلقات بنائے۔انھوں نے جو روایت قائم کی اس سے آج بھی یونیورسٹی فیض اٹھا رہی ہے۔یونیورسٹی کی ہر خبر اردو اخبارات میں شائع ہوتی ہے۔

ریاستی حکومت نے گچی باولی میں یونیورسٹی کے لیے زمین الاٹ کی۔ پھر اس پر عمارت تعمیر ہوئی۔ یونیورسٹی کی اصل صورت گری پٹھان صاحب کے زمانے میں ہوئی۔ شعبے قائم ہوئے۔تقررات

ہوئے۔عمارتیں تعمیر ہوئیں۔یونیورسٹی کو فنڈز جاری ہوئے۔

محمد ظفرالدین یونیورسٹی کے بنیاد گزاروں میں سے تھے۔دیکھتے ہی دیکھتے وہ ٹیچنگ میں آ گئے اور تیزی سے بلندیاں سر کرنے لگے۔وہ شعبہ ترجمہ میں لکچرار، ریڈر اور پروفیسر بنے اور پھر ہم نے انھیں ڈین کے عہدے پر بھی فائز دیکھا۔

محمد ظفرالدین نے یونیورسٹی کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔کوئی سمینار ہو، کانوکیشن ہو یا کوئی اور پروگرام اس کے پس منظر میں وہ ضرور ہوتے تھے۔وہ ذمہ داری سے گھبراتے نہیں تھے۔انھیں جو بھی ذمہ داری دی گئی اسے انھوں نے بخوبی نبھایا۔انھوں نے کبھی کام کے بوجھ کی شکایت نہیں کی۔ دوسری یونیورسٹیز کے پروفیسروں سے بھی ان کے خوشگوار تعلقات تھے۔

محمد ظفرالدین نے خاکسار سے ہمیشہ ایک اپنائیت قائم رکھی۔وہ تعلقات میں توازن رکھتے تھے۔نہ غیر معمولی گرم جوشی کا اظہار کرتے اور نہ سرد مُہری سے پیش آتے۔محمد ظفرالدین کی وجہ سے اردو یونیورسٹی سے ایک خاص لگاؤ محسوس ہوتا تھا۔

محمد ظفرالدین سے میرے تعلقات شروع سے خوش گوار رہے۔امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کے اسباق لکھنے کی بات ہو یا مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے فاصلاتی تعلیم کی کتابوں کی تیاری ہو۔محمد ظفرالدین اور مسرت جہاں کو میں نے اور مجھے ان دونوں نے بھی نہیں بھلایا۔ان سے برادرانہ تعلقات تھے، جس میں اپنائیت اور خلوص شامل تھا۔مجھے یاد نہیں کہ محمد ظفرالدین نے کوئی سمینار کیا ہو اور مجھے شامل نہ رکھا ہو۔

جس میں عثمانیہ یونیورسٹی سے حیدرآباد یونیورسٹی آیا تو ڈاکٹر سید احتشام حسنین، وائس چانسلر تھے۔احتشام صاحب کو شعبۂ اردو سے خاص لگاؤ تھا۔ان کی اجازت اور تعاون سے میں نے شعبے میں کئی یادگار پروگرام کیے۔مولانا آزاد پر سمینار کر کے ٹام آلٹر کو بلایا۔مولانا روم پر انٹرنیشنل سمینار کروایا۔شہریار صاحب اور انتظار حسین صاحب کے اعزاز میں تقریب منعقد کی اور بھی کئی سمینار اور ورک شاپ کروائے۔ محمد ظفرالدین اکثر سمیناروں میں شرکت کرتے۔احتشام حسنین صاحب سے ان کے خاص تعلقات تھے لیکن انھوں نے کبھی ان تعلقات کا بے جا فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اپنی جانب سے ہر سہولت فراہم کرتے رہے۔

احتشام صاحب ایک مشاعرہ کرنے کے خواہش مند تھے حیدرآباد یونیورسٹی کی فضا مشاعرے کے لیے مناسب نہیں تھی۔ پھر یہ طے ہوا کہ مولانا آزاد یونیورسٹی کے اشتراک سے یہ مشاعرہ کیا جائے۔ ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں دونوں یونیورسٹیز کے عہدہ دار اور اساتذہ شامل تھے۔ مشاعرہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں رکھا گیا۔ شہریار صاحب کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ مشاعرے کے انتظامات محمد ظفرالدین نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیے۔ اسٹیج کی سجاوٹ سے لے کر شاعروں کی ضیافت تک !! سارے کام سلیقے سے نبھائے۔ شہر سے کافی لوگ مشاعرہ سننے کے لیے آئے اور یہ ایک شاندار مشاعرہ رہا۔ ہمارے شعبے میں Leave Vacancy پر تقرر ہونا تھا۔ محمد ظفرالدین بحیثیت ایکسپرٹ آئے۔ امیدوار کو یقین تھا کہ اسی کا تقرر ہوگا۔ اس نے کئی سوالوں کے جواب نہیں دیئے۔ محمد ظفرالدین نے اس سے کہا ایک بات یاد رکھیے کہ ''ایک ہوتا ہے Deserve کرنا اور ایک رعایت میں کسی کام کا ہونا ۔۔۔ کوشش کیجیے کہ خود کو اہل ثابت کرسکیں''۔

محمد ظفرالدین، اپنے استاد شارب رودلوی صاحب کا بہت احترام کرتے تھے۔ شارب صاحب ایک سلیکشن کمیٹی میں ہماری یونیورسٹی آئے۔ میٹنگ ختم ہونے کے بعد ظفرالدین انہیں اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ پہلی باران کا گھر دیکھا۔ برنداون کالونی میں تین منزلہ مکان تھا۔ بعد میں وہ کیمپس منتقل ہوگئے۔ علی احمد فاطمی صاحب حیدرآباد آئے۔ ہم انھیں ناشتے پر لے گئے۔ انھوں نے کہا واپسی میں انھیں ظفرالدین کے مکان پر چھوڑ دیا جائے۔۔۔ ظفرالدین یونیورسٹی کے کشادہ بنگلے میں مقیم تھے۔ وہ بڑے تپاک سے ملے۔ اپنا باغ دکھایا۔ انھوں نے آم اور مختلف پھلوں کے درخت لگا رکھے تھے۔ انھوں نے ایک ایک درخت اور اس کے پھلوں کی تفصیل بتائی۔ جب ہم واپس ہوئے تو کچھ پھل بھی ساتھ کردیے۔ اردو کے پروفیسروں سے ان کے بہترین تعلقات تھے۔

''ادب وثقافت'' شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ محمد ظفرالدین اس کے مدیر تھے۔ انھوں نے ایڈیٹوریل بورڈ میں مجھے بھی شامل کیا۔ اس رسالے پر وہ محنت کرتے۔ پروف ریڈنگ بڑی احتیاط سے کرتے۔ یہ رسالہ کمپوزنگ کی غلطیوں سے پاک ہوتا۔ انھوں نے اس کا ایک معیار بنایا۔ ہندوستان بھر کے لکھنے والوں سے ان کا ربط تھا۔ انھوں نے معیار سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ لکھوائی، چھپوائی کے ساتھ ساتھ مواد کے اعتبار سے بھی یہ ایک عمدہ رسالہ ہے۔ چند ہی دنوں میں لکھنے والے اس میں چھپنا ایک اعزاز سمجھنے لگے۔

انھوں نے زندگی میں معیار کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ چاہے وہ کوئی فنکشن ہو، سمینار ہو، رسالہ ہو یا رہائش کا معاملہ۔۔۔وہ ایک خاص معیار کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ بچے بڑے ہوگئے تو کیمپس سے شہر منتقل ہوگئے اور پاش فلیٹ خریدا۔ نئے فلیٹ میں آئے تو احباب کی دعوت کی۔ وہ حفظ ومراتب کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ دوستوں کو الگ الگ گروپ میں مدعو کیا۔ ہمیں بھی منتخب احباب کے ساتھ دعوت پر بلایا۔ ان کی اسی اپنائیت پر جان دینے کو جی چاہتا تھا۔

لڑکی کی شادی شاندار پیانے پر کی۔ مہمانوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ ظفرالدین اس بات کی پوری کوشش کررہے تھے کہ مہمانوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ مجھے وی۔سی صاحب اور دیگر عہدہ داروں کے ساتھ بیٹھایا۔ حالانکہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کون کس کے ساتھ بیٹھا ہے لیکن یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ کتنی عزت کرتے تھے ہر شخص کا کس طرح خیال رکھتے تھے۔

مرکز مطالعاتِ اردو وثقافت میں ڈائرکٹر بن کر آئے تو ایک کمیٹی بنائی اس کا ممبر بھی خاکسار کو بنایا۔ آن لائن میٹنگ رکھی گئی، مجھ سے کہا کہ آپ سنٹر آجایئے اور یہیں سے میٹنگ میں شرکت کیجیے۔ میں ان کی کوئی بات ٹال نہیں سکتا تھا۔ مرکز چلا گیا۔ ان کی اسی اپنائیت نے دل جیت لیا تھا۔ انھوں نے ہر موقع پر خیال رکھا اسی کا اظہار کرنا مقصود ہے۔ اسی شعبے کے تحت ایک سمینار ''اردو زبان کے تہذیبی وثقافتی ادارے'' پر کیا۔ مجھے کہا کہ کلیدی خطبہ دینا ہے۔ صدارت، مہمان خصوصی، کلیدی خطبے کے لیے افراد کا انتخاب بڑے سلیقے سے کرتے تھے۔ افتتاحی تقریب میں پہنچا تو سب آچکے تھے۔ ماس کمیونکیشن سنٹر پہنچا تو میری سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ رحمت اللہ صاحب، انچارج وائس چانسلر نے کہا کہ آپ کی سانس پھول رہی ہے۔ ظفرالدین نے بڑے اطمینان سے کہا ابھی ٹھیک ہوجائیں گے۔ ظفرالدین کے اس اعتماد نے حوصلہ بڑھایا ورنہ میں بھی گھبرایا ہوا تھا۔ کلیدی خطبہ طویل تھا لیکن ظفرالدین کے خلوص کے سہارے میں پورا خطبہ پڑھ ڈالا۔ انسانوں کے احساسات وجذبات سمجھنے کا انھیں ملکہ حاصل تھا وہ سچویشن سنبھالنے کے ماہر تھے۔

مجتبیٰ حسین صاحب کے انتقال کے بعد ہم نے انھیں مسلسل چالیس دن تک خراج عقیدت پیش کیا۔ روزانہ ایک مضمون سنایا جاتا۔ اس آن لائن پروگرام میں ظفرالدین اور مسرت جہاں دونوں نے حصہ لیا۔ دونوں نے مضامنین پیش کیے۔ وہ پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ بعد میں ہم نے ہفتہ واری

پروگرام ''بازگشت'' شروع کیا تو اس میں بھی انھوں حصہ لیا۔

مارچ کے آخری ہفتے میں وہ اچانک گھر آئے۔ مسرت ساتھ تھیں۔ دونوں کہیں سے لنچ کر کے لوٹ رہے تھے۔ مغرب کے بعد تک بیٹھے رہے۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں ان کا اس طرح خلوص سے گھر آنا اچھا لگا۔ جاتے ہوئے کہنے لگے اب ہم لوگ بار بار آیا کریں گے۔ کسے معلوم تھا کہ وہ آخری ملاقات ثابت ہوگی۔

5/اپریل کو ان کے انتقال کی خبر ملی تو دل بیٹھ گیا۔ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح اچانک ہمیں چھوڑ جائیں گے۔ میں نہ ان کے گھر جانے کی ہمت جٹا پایا، نہ نمازِ جنازہ میں شرکت کی، نہ تدفین پر جاسکا۔ جب بھی ظفرالدین کا تذکرہ ہوتا ہے گلہ بھر آتا ہے۔ الفاظ گم ہوجاتے ہیں۔ صائحہ (ہماری بیگم) تقریباً روزانہ مسرت کو فون کر کے خیریت پوچھتی ہیں۔ مجھ سے فون پر بات بھی نہیں کی جاتی۔ وہ روزانہ یاددلاتی ہیں کہ ہمیں مسرت کے گھر جانا ہے۔ انھیں پرسہ دینا ہے۔ میں آج تک خود کو تیار نہ کرسکا۔ مسرت کو تنہا دیکھنے کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا۔

ظفرالدین ایک شعلۂ مستعجل تھے۔ جس تیزی سے انھوں نے ترقی کی۔ لوگوں کے دلوں میں گھر بنایا۔ حالات درست کیے۔ اپنی مرضی کی زندگی گزاری۔ ان پر رشک آتا تھا لیکن اب سمجھ میں آیا کہ وہ بہت کم عمر لکھوا کے لائے تھے، کم وقت میں انھیں بہت سے کام کرنے تھے۔ اللہ نے ان سے کام لیا پھر وقت مقررہ پر انھیں بلالیا۔ مشیت ایزدی کے آگے ہم سرخم کرتے ہیں لیکن اس درد کو کیا کریں جو رہ رہ کر اٹھتا ہے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔

❒ **Prof. Baig Ehsas**
Former Head, Department of Urdu
University of Hyderabad, Hyderabad
Mobile: 9849256723
Email: baigehsas@gamial.com

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:36-46
Prof. Ali Ahmad Fatami, Saman sau baras ka hai kal ki khabar nahin: Prof. Mohd. Zafaruddin ..

علی احمد فاطمی

سامان سو برس کا ہے کل کی خبر نہیں

(پروفیسر محمد ظفرالدین کی یاد میں)

سفر کو وسیلۂ ظفر کہا جاتا ہے لیکن میں ظفر کو وسیلۂ سفر کہتا ہوں۔ اس لیے کہ جب میں پروفیسر محمد ظفرالدین کی شخصیت اور کارناموں کو دیکھتا ہوں تو مجھے ظفر اور سفر باہم گھلے ملے نظر آتے ہیں۔ ظفر کا مطلب کامیابی اور سفر کا مطلب جفاکشی۔ تو جو جتنا جفاکشی کرے گا، محنت کرے گا، وہ ظفر تو ہوگا ہی۔ گذشتہ دنوں ایک کامیاب اور بھری پُری زندگی جیتے ہوئے ہمارے دوست اور اردو یونیورسٹی کے پروفیسر محمد ظفرالدین جب زندگی کی جنگ ہار گئے اور ملک عدم کا سفر کر گئے تو اندازہ ہوا کہ سفر ہو یا ظفر دونوں کی ڈور اور ڈگر کہیں اور ہے اور میں ماضی کا سفر کرنے پر مجبور ہو گیا۔

ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے بعد جس ترقی پسند ادیب سے سب سے زیادہ قربت اور محبت نصیب ہوئی وہ قمر رئیس تھے اور ظفر ان کے محبوب شاگرد۔ یوں تو ظفر کا وطن گیا (بہار) تھا اور علمی گھرانہ بھی تھا اور والد قمر نظامی صوبۂ بہار کے مشہور کاتب تھے۔ جید ناقد کلیم الدین احمد کی بیشتر کتابیں لکھیں۔ کلام حیدری کے کام بھی انجام دیتے تھے۔ غرض کہ گیا اور پٹنہ کے ادبی حلقہ میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ ان کے گھر میں شاعروں وادیبوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ ظاہر ہے کہ جب گھر کا ایسا ماحول ہو باپ کی قدر ومنزلت ہو تو لائق اولادوں پر اس کا اثر پڑنا ہی تھا چنانچہ ظفر ہوں یا شہزاد گیا میں ابتدائی تعلیم کے بعد دونوں بھائیوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے دہلی کا سفر کیا۔ ظفر نے دہلی یونیورسٹی سے بی۔اے۔ اور ایم۔اے۔ دونوں ہی درجات کو امتیازی نمبروں سے پاس کرتے ہوئے گولڈ میڈل بھی حاصل کیا۔ اس درمیان وہ قمر رئیس کے قریب آئے جو شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر تو تھے ہی ایک بڑے ادیب وناقد کی حیثیت

سے بھی اردو دنیا میں اہم مقام رکھتے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستگی کی وجہ سے ان کی حیثیت ایک عالمِ باعمل کی تھی۔ شعر و ادب کی پرکھ کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کی پرکھ پر بھی غیر معمولی نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے اِرد گرد نوجوانوں، طالب علموں، ادیبوں کا ایک جمگھٹا سا رہتا۔ انھیں میں ایک ظفر بھی تھے۔

ظفر نے قمر رئیس کی نگرانی میں ایم. فِل اور پی. ایچ. ڈی. کی گراں قدر سندیں حاصل کیں۔ ایم. فِل کا موضوع ''نیاز حیدر کی شخصیت اور شاعری'' تھا اور پی ایچ. ڈی. کا موضوع اردو ناول کے فن اور تکنیک کا تنقیدی مطالعہ مابعد پریم چند تا حال''۔ یہ دونوں ہی قمر رئیس کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ظفر جیسے محنتی نوجوان کے یہ تحقیقی و تنقیدی کارنامے کس نوعیت کے رہے ہوں گے۔ نیاز حیدر پر تو کتاب شائع ہوگئی لیکن پی. ایچ. ڈی. کا مقالہ شائع نہ ہو سکا۔ کم از کم میری نظر سے نہیں گذرا۔ دہلی یونیورسٹی سے ظفر نے فارسی سرٹیفکیٹ کورس بھی کیا اور ساتھ ہی والگپا یونیورسٹی کرائے کڈی سے ماس کمیونیکیشن اور جنرلزم کا ماسٹر کورس بھی مکمل کیا اور کچھ دنوں وہ اخبارات سے وابستہ رہے۔

ظفر دہلی میں طالب علم تھے تو میرا اکثرت سے دہلی جانا ہوتا تھا لیکن پتہ نہیں کیوں ابن کنول، ارتضیٰ کریم، ریاض، ندیم، رضی الرحمٰن، سراج اجملی وغیرہ کے مقابلے میری ملاقاتیں ظفر سے کم ہوئیں۔ اگرچہ میں ان دونوں بھائیوں سے واقف تھا۔ بہر حال ظفر سے باقاعدہ ملاقاتیں اس وقت سے شروع ہوئیں جب حیدرآباد میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی قائم ہوئی اور اس کے پہلے وائس چانسلر پروفیسر شمیم جے راجپوری مقرر ہوئے اور ظفر ان کے پی. آر. او. مقرر ہوئے۔ اس طرح ظفر نے ایک اور سفر کیا دہلی سے حیدرآباد کا سفر۔ اولاً مشرق سے شمال اور شمال سے جنوب۔ یہ وہ ابتدائی دن تھے جب یونیورسٹی کے نام پر صرف ایک عمارت تھی، جس میں وائس چانسلر کا دفتر تھا اور کچھ اور کمرے۔ حیدرآباد سے کافی دور پہاڑ کے پتھروں کو کاٹ کر بنائی گئی ناہموار پتھریلی زمین کو برابر کرنا بھی اپنے آپ میں ایک مشکل کام تھا اور اس اوبڑ کھابڑ مقام پر یونیورسٹی چلانا بھی اپنے آپ میں پہاڑ کھودنے کے برابر تھا۔ بہر حال یہ بے حد مشکل کام انجام دیا شمیم صاحب نے اور ظفر ان کے ساتھ برابر سے مصروفِ کار رہے۔ فنڈ کی بھی کمی اور طالب علموں کی بھی کمی۔ وائس چانسلر نے ان شہروں کے سفر کرنے شروع کئے جو اردو کے مرکز سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ شمیم صاحب الہ آباد بھی آئے ان کے ساتھ ظفر بھی تھے۔ ظفر نے مجھے مطلع کر دیا تھا، لہٰذا میں

نے ایک جلسہ شعبۂ اردو میں رکھا اور دوسرا شہر میں۔شہر کے جلسہ میں کافی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ رات میں ڈنر بھی ہوا۔غرض یہ سب دیکھ کر ظفر تو خوش اور مطمئن ہوئے ہی ساتھ ہی شمیم صاحب بھی خوش ہوئے۔اس سفر میں میں نے ظفر کی ذمہ داری اور بُردباری کو قریب سے دیکھا تو اچھا لگا۔ یہ لوگ واقعی دل سے اردو اور اردو یونیورسٹی کے لیے مشنری انداز سے کام کر رہے تھے۔ یقیناً اردو یونیورسٹی کو ایسے ہی ذمہ داروں اور جانبازوں کی ضرورت تھی۔

مجھے یاد ہے کہ کچھ ہی دنوں کے بعد میرا حیدرآباد جانا ہوا۔اردو یونیورسٹی بھی گیا۔ظفر اور شمیم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ مجھے یہ دیکھ حیرت ہوئی کہ دہلی کے رہنے والے یہ دونوں حضرات ایسی ویران اور سنسان جگہ پر کس طرح رہ رہے ہیں۔ میں نے بھی اپنی زندگی کے دن جدوجہد سے گذارے ہیں اسی لیے ان حضرات کی جدوجہد، محنت و لگن دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی، ظفر کو دیکھ کر بطور خاص۔اب وہ صرف پی.آر.او.نہ تھے بلکہ کئی دیگر انتظامی ذمہ داریاں بھی ان کے سر آ چکی تھیں اور وہ سب کہ سب نہایت ذمہ داری سے نبھا رہے تھے۔اس کا صلہ تو انھیں ملنا تھا اور ملنا بھی چاہیے۔جلد ہی وہ تدریس میں آ گئے۔شعبۂ ترجمہ سے وابستہ ہو گئے ساتھ ہی پراکٹر بھی تو کہیں کسی شعبہ کے ڈائرکٹر بھی۔ یہ سب تو ہوا اور ظفر پوری سنجیدگی سے ذمہ داریاں نبھاتے بھی رہے۔ یونیورسٹی کی خدمات انجام دیتے رہے لیکن اکیڈمک کام کہیں پس پُشت چلا گیا جب کہ وہ اس کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے لیکن یہ ذمہ داری بھی بڑی تھی۔ایک بڑا کام تھا اور ایک بڑی یونیورسٹی کا قیام تھا۔ وائس چانسلر تو وائس چانسلر ہوتا ہے کریڈٹ تو اسے ہی ملتا ہے لیکن کوئی بھی وائس چانسلر اپنے ذمہ دار اور فعال عملہ کے بغیر کامیاب نہیں ہوتا۔ یہ شمیم صاحب کی خوش قسمتی تھی کہ انھیں ظفر جیسا ذمہ دار افسر ملا لیکن ساتھ ہی ظفر کی بھی خوش قسمتی تھی کہ ان کے وی.سی.نے ان پر بھروسہ کیا اور اس کا صلہ بھی دیا اور وہ افسر سے پروفیسر ہو گئے۔

الہ آباد کے سفر اور جلسوں کی کامیابیوں سے شمیم صاحب کو الہ آباد پسند آیا اور ساتھ ہی میں بھی۔شمیم صاحب نے بطور اردو پروفیسر حیدرآباد آنے کی دعوت بھی دے ڈالی اور میں کچھ دیر کے لیے خوش بھی ہوا لیکن میں اس طرح کا کوئی قدم قمر رئیس کی اجازت کے بغیر نہیں اُٹھاتا تھا۔ان سے ذکر کیا تو انھوں نے سختی سے منع کر دیا۔ابتداً مجھے حیرت ہوئی۔اس لیے کہ میں اس وقت تک پروفیسر نہیں ہوا تھا اور الہ آباد یونیورسٹی بھی اس وقت تک صوبائی یونیورسٹی ہی تھی لیکن قمر صاحب نے یقین دلایا کہ تم جلد ہی

الہ آباد میں پروفیسر ہو جاؤ گے اور یونیورسٹی بھی مرکزی ہو جائے گی۔ جہاں دیدہ قمر رئیس کی دونوں باتیں پوری ہوئیں۔تب ظفر نے ایک بات پیار سے کہی تھی کہ جب آپ پروفیسر نہیں تھے تب بھی دوسرے پروفیسروں سے زیادہ جانے جاتے تھے۔ظاہر ہے کہ یہ بات مجھے اچھی لگی تھی۔

میرا حیدر آباد نہ جانے کا فیصلہ شمیم صاحب کو پسند نہیں آیا اور ظفر بھی مایوس ہوئے۔شاید اس لیے کہ بیگم کو لے کر ان کے کچھ منصوبے تھے جو میرے جانے سے پورے ہو سکتے تھے، لیکن بعد میں وہ منصوبے میرے نہ جانے کے باوجود پورے ہوئے اس لیے کہ ظفر کی دور بیں نگاہیں دور تک سفر کرتی تھیں اور وہ ایک منصوبے کے ساتھ کام کرتے تھے اور اکثر میں کامیاب بھی ہوتے تھے، لیکن اس کے پیچھے سچ پوچھئے تو ظفر کی غیر معمولی سوجھ بوجھ، محنت اور سنجیدگی کام کرتی تھی۔ وہ محنت جو لوگوں کو کم دکھائی دیتی ہے۔میں تو صاف طور پر محسوس کرتا ہوں کہ اردو یونیورسٹی کے بنیاد گذار وائس چانسلر شمیم صاحب ضرور تھے لیکن اسے خون پسینے سے سینچنے والے جو چند لوگ تھے ان میں یقیناً ظفر کا نام اہم ہے۔

2007ء میں جب پورا ہندوستان 1857ء کی ڈیڑھ سو سالہ یادگار منا رہا تھا۔اردو یونیورسٹی نے بھی ایک بڑی تقریب کا اہتمام کیا۔ظفر نے اپنے استاد قمر رئیس اور مجھے بھی مدعو کیا اور ہم دونوں غالباً پروفیسر شارب رودولوی کو بھی جہاز سے آنے کی دعوت اور سہولت دی۔ میں دہلی گیا اور دہلی سے قمر صاحب کے ساتھ حیدر آباد کا سفر کیا۔ یہ سفر ان معنوں میں بے حد اہم تھا کہ ہم نے آتے جاتے، اٹھتے بیٹھتے ترقی پسند ادب سے متعلق بڑے بڑے منصوبے تیار کیے اور بعد میں اس پر عمل بھی کیا۔ درمیان میں رومانی باتیں بھی ہوتیں کہ اس کے بغیر قمر صاحب کی شخصیت ادھوری سی لگتی۔ان کے کام بھی ان کے رومان کا حصہ ہوتے۔ میں پروفیسر ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود قمر صاحب کے سامنے میری حیثیت ایک طالب علم کی سی تھی اگر چہ وہ دوست کی طرح نوازتے اور ہر طرح کی بے تکلف باتیں کرتے جس میں حسن و جمال بھی شامل رہتے۔ظفر اس وقت پروفیسر نہیں ہوئے تھے لیکن شعبۂ ترجمہ کے صدر ضرور تھے۔شاید اسی کے آس پاس ترجمہ اور اشاعتی ادارے کے ڈائرکٹر بھی مقرر ہو چکے تھے اور وہ یہ سارے کام اتنی خوبی اور تندہی سے انجام دے رہے تھے کہ سچ پوچھئے تو پورے ادارے میں ان کی ایک بڑی اور ضروری حیثیت بن چکی تھی جسے دیکھ کر ہم دونوں بہت خوش ہوئے۔ حالانکہ قمر رئیس کہتے تھے کہ ظفر پڑھنے لکھنے میں اچھا ہے لیکن حسنِ انتظام اور انتظامیہ میں اس کی دلچسپی زیادہ ہے۔علم و ادب کے بجائے وہ نظم و ضبط میں اُلجھ

گئے ہیں۔ شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ 2008ء میں پروفیسر ہو گئے اور ان کی اہلیہ مسرت جہاں جنھوں نے قمر رئیس کے علمی کارناموں پر پی. ایچ. ڈی. کی تھی وہ لکچرر ہو گئیں۔ شاید یہی کام مجھ سے ظفر لینا چاہ رہے تھے اور میں خوشی خوشی کر بھی دیتا اس لیے کہ مسرت ہر اعتبار سے حقدار تھی۔ پڑھتی لکھتی تھی۔ اب ظفر اور مسرت دونوں ہی سے رشتے اور رابطے مزید مضبوط ہو چکے تھے۔ شاید یہ سارے کام شمیم صاحب کے بعد پٹھان صاحب کے دور میں انجام پا سکے۔ پٹھان صاحب بھی ایک کامیاب وی. سی. تھے۔ انھیں تو کامیاب ہونا ہی تھا، تجربہ تھا اور وہ دکن کے بھی تھے اور ظفر شمال کے۔

29/ اپریل 2009ء کو ہم سبھی ایک بڑے حادثے کا شکار ہوئے۔ ہم سب کے محبوب استاد اور ادب کے بڑے نقاد قمر رئیس مختصر سی علالت کے بعد ہم سب کو چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ شاگردان و محبانِ قمر رئیس کے لیے یہ ایک بڑا حادثہ تھا، جس سے ہم سب دوچار ہوئے۔ اشکبار ہوئے۔

5/ نومبر 2009ء کو ظفر نے اردو یونیورسٹی میں قمر رئیس کی علمی و ادبی خدمات پر ایک بڑے سمینار کا اہتمام کیا۔ ہم سبھی اس میں شریک ہوئے۔ پروفیسر شارب رودلوی نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے بھی بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ صدارت ایکٹنگ وائس چانسلر ڈاکٹر آر. کے. اقبال نے کی۔ افتتاحی اجلاس میں جیلانی بانو نے بھی شرکت کی۔ اس کے علاوہ پروفیسر یوسف سرمست، پروفیسر شمیم نکہت، پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر فاطمہ پروین، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر خالد سعید، ڈاکٹر حبیب نثار، ڈاکٹر مسرت جہاں کے علاوہ شاگردانِ قمر رئیس کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی جن میں شہزاد انجم، ڈاکٹر ندیم احمد، ڈاکٹر رضی الرحمٰن، ڈاکٹر توقیر احمد خاں وغیرہ بطور خاص شامل ہوئے۔ یہ ایک اعلیٰ پائے کا سمینار تھا اور ہم سبھی نے بھرپور طریقہ سے قمر صاحب کو یاد کیا اور خراج تحسین پیش کیا۔ یہی نہیں چند ماہ کے بعد ظفر نے شعبۂ ترجمہ کی طرف سے سمینار میں پڑھے گئے تمام مقالات کو کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا (2010ء)۔ یہ سب کچھ ظفر کے حسنِ عمل کا نتیجہ تھا۔ کتاب کی ابتدا میں عرضِ مرتب کے طور پر لکھتے ہوئے ظفر نے حقِ شاگردی ادا کیا۔ پہلے روشخصی طور پر لکھا:

> ''وہ جہاں جہاں گئے اپنی علمی صلاحیت سے وہاں کے حلقے میں مقبول ہوئے۔
> لکھنؤ گئے تو ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے شناخت قائم کی۔ علی گڈھ پہنچے تو
> پریم چند شناس کی حیثیت سے اُبھرے۔ دہلی یونیورسٹی کا رُخ کیا تو مثالی استاد

بن کر دکھایا اور ازبیکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو بہترین مترجم اور شاعر بن کر اُبھرے۔ ان کی شخصیت کی اس تہہ داری نے معاصر ادیبوں کی جماعت میں انھیں مقبول وممتاز بنادیا۔''

علم ونقد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''قمر رئیس کی تنقید کی خوبی یہ تھی کہ ان میں اعتدال پسندی کی نمایاں جھلک تھی اوران میں سائنٹفک انداز ورجحان پایا جاتا ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ ادب سماج کا آئینہ ہے، اسی لحاظ سے ادب میں سماج کی جڑیں پیوست ہونی چاہئیں۔''

اس مقدمہ میں ظفر نے قمر رئیس کی پریم چند شناسی اور شاعری کی طرف بھی عمدہ اشارے کیے ہیں۔ ان تحریروں کو بغور ملاحظہ کیجیے ایک متوازن اور سنبھلا ہوا لہجہ ملے گا۔ نہ جذباتیت نہ عقیدت، راست طور پر صداقت اور حقیقت اور پوری سادگی کے ساتھ اس کا بیان جو ظفر کی سادہ شخصیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اپنے استاد کے حوالے سے ظفر نے ایک بڑا اور کام یہ کروایا کہ اپنی بیگم مسرت جہاں کو قمر صاحب کی خدمات پر پی. ایچ. ڈی کروائی۔ یہ کتاب شائع بھی ہو چکی ہے۔

2011ء کے آس پاس ایک ناقابلِ یقین سا واقعہ رونما ہوا۔ اردو یونیورسٹی میں کوئی مستقل وائس چانسلر نہ تھا، میں کسی سلسلہ میں دہلی گیا ہوا تھا شاید جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کوئی سمینار تھا۔ بہر حال وہاں عزیز دوست پروفیسر وہاج الدین علوی سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ وہ سرچ کمیٹی کے ممبر ہیں۔ اردو یونیورسٹی کے لیے جو تین نام منتخب ہوئے ہیں ان میں ایک میرا نام بھی ہے۔ یہ سن کر میں حیران ہوا، اس لیے کہ میں نے کبھی وائس چانسلر بننے کے بارے میں خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ میں تو کسی ادارے کے چیئر مین، ڈائریکٹر وغیرہ بننے سے گھبراتا ہوں چہ جائیکہ وائس چانسلر۔ باقی دوسرے ناموں میں جامعہ ملیہ کے ہی محمد میاں تھے اور ایک کوئی کشمیر کے پروفیسر۔ بہر حال میں حیران تھا کہ میرا نام کیسے اور کس طرح شامل ہوا۔ ابھی میری حیرانی زیرِ غور تھی کہ حیدرآباد سے ظفر کا فون آیا کہ آپ کا نام ہے اور سنجیدگی سے کوشش کیجیے لیکن میں کیا کوشش کرتا، کس سے ملتا کہ اسی درمیان ہندی یونیورسٹی وردھا کے وائس چانسلر وی. این. رائے کا فون آیا میں ہندی یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل کا ممبر تھا، انھوں نے مجھے وردھا بُلایا اور بتایا کہ وہاں واقعی آپ کا نام ہے۔ آپ ان سے ملیے۔ لیکن میں نے ان سبھی دوستوں سے صاف کہہ دیا کہ میں کسی سے ملوں گا نہیں۔ اگر عزت سے عہدہ ملے گا تو قبول کروں گا، خوشامد اور سفارش

سے ہرگز نہیں۔ رائے صاحب نے اپنے طور پر کوشش کی لیکن مجھے معلوم تھا کہ میرا نہیں ہونا ہے چنانچہ نہیں ہوا اور محمد میاں وی.سی. ہو گئے اور میں نے راحت کی سانس لی۔ محمد میاں کس طرح وی.سی. ہوئے کس کی سفارش پر ہوئے یہ اطلاعیں مجھے ملتی رہیں۔ میں کسی کو کچھ کہنے کا حق نہیں رکھتا۔ ہر ایک کو حق ہے کہ وہ اپنے طور پر کوشش کرے۔ میرا اپنا مزاج یہ ہے کہ اس طرح سے اگر مجھے وزارت بھی ملے تو میں ٹھکرا دوں۔ یہ بات زعم میں نہیں، خاکساری میں کہہ رہا ہوں۔ میں احتشام حسین کا شاگرد ہوں، جنھوں نے کشمیر یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ کے آفر کو ٹھکرا دیا تھا۔ میں سید محمد عقیل کا شاگرد ہوں جنھوں نے یو.پی. اردو اکادمی کا چیئر مین بننا منظور نہیں کیا۔ عقیل صاحب کہا کرتے تھے کہ ہر کام ہر آدمی نہیں کرسکتا۔ ان دنوں وائس چانسلر بننے کے لیے قلم کی نہیں تکڑم کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر اک کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے بھی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر ایک کے پاس نہیں ہوتی ہے۔ شاعر مجاز نے نہ صرف ''آوارہ'' نظم کہی بلکہ وہ خود بھی آوارگی کے شکار تھے لیکن اگر یہ آوارگی اور شب بیداری نصیب میں نہ ہوتی تو وہ ''آوارہ'' جیسی عمدہ نظم نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ آوارگی بھی ہر اک کے بس کی بات نہیں۔ جوش کے بس کی بھی نہ تھی۔

میرے وی.سی. نہ ہونے کی جتنی خوشی مجھے ہوئی اتنا ہی ملال ظفر کو ہوا۔ ظاہر ہے کہ وہ بہت کچھ سوچ رہے تھے اور ان کا سوچنا غلط بھی نہ تھا، اس لیے کہ انھوں نے اردو یونیورسٹی کی دل سے خدمت کی تھی۔ شاید میں آجاتا تو اور بھی بہت کچھ کر سکتے تھے، ایسا ان کا خیال تھا۔ اگر میرا حافظہ غلط نہیں ہے تو مجھے یاد آرہا ہے کہ پروفیسر محمد میاں کے دور میں میں ایک بار بھی اردو یونیورسٹی نہیں گیا۔ حالانکہ میں سینٹرل یونیورسٹی میں دو ایک بار پی.ایچ.ڈی کا وائیوا لینے گیا جہاں میرے دوست پروفیسر بیگ احساس صدر شعبہ تھے۔ پروفیسر مظفر شہمیری، پروفیسر حبیب نثار وغیرہ سے تعلقات ہوئے۔ یہ وہی شعبہ ہے جہاں سب سے پہلے الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر گیان چند جین صدر ہو کر آئے اور اپنے ساتھ مجاور حسین رضوی کو بھی لے کر آئے۔ پھر تو گیان چند کا گیان بڑھا اور مجاور حسین کی دانشوری۔ رحمت یوسف زئی اور انوار الدین اسی دور کی یادگار ہیں۔

اس درمیان بھی ظفر مصروف کار تو رہے لیکن یہ مصروفیات انتظامی زیادہ تھیں جس کی اب مجھے بھی شکایت ہونے لگی تھی، لیکن اس شکایت میں محبت تھی اس لیے کہ ظفر کا تعلیمی کیریئر بہت اچھا تھا اور

وہ علم وادب کے شعبہ میں بہت کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے لیکن کسی حد تک یہ شکایت اس وقت دور ہوئی جب مرکز مطالعاتِ اردو ثقافت سے رسالہ ''ادب و ثقافت'' کا اجراء ہوا۔ ظفر نے مجھے ساری اطلاعیں دیں اور مضمون کی فرمائش کی لیکن کسی وجہ سے پہلے شمارہ میں مضمون نہ دے سکا لیکن پورے اہتمام اور شان سے رسالہ منظرِ عام پر آیا تو مجھے خود اپنی کمی کھلی۔ میں نے پوری سادگی سے اس کمی کو ظفر کے سامنے رکھ دیا۔ وہ بڑی محبت سے سنتے رہے پھر کہا کہ آپ کو ایک Viva لینے آنا ہے، میں آپ کا ایک لکچر بھی رکھنا چاہتا ہوں۔ میں خوشی خوشی تیار ہو گیا۔ ۲۰۱۵ء کے آخر میں ایک لکچر ہوا اور وائیوا بھی۔ ''راجیند رسنگھ کے افسانے میں عورت'' خطبہ کا موضوع تھا۔ بعد میں یہی مقالہ ''ادب و ثقافت'' کے دوسرے شمارہ میں شامل ہوا۔ اس سفر میں ظفر اور مسرت نے بھرپور ضیافت کی۔ ان دنوں ظفر یونیورسٹی کیمپس میں ہی رہتے اور انھیں کے سامنے میرا عزیز شاگرد محمود کاظمی کا بھی مسکن تھا جو شعبۂ ترجمہ میں ظفر کا معاون تھا۔ ذہین طالب علم اور اب استاد۔

2013ء میں علی سردار جعفری کی صدی منائی جا رہی تھی۔ خواجہ محمد شاہد جو سردار جعفری کی بیوی سلطانہ جعفری کے بھتیجے ہیں ان دنوں وہاں رجسٹرار تھے اور شاید قائم مقام وائس چانسلر بھی۔ میں نے اس میں شرکت کی اور ظفر کے ساتھ اچھا وقت گذرا۔ سچ پوچھیے تو ان دنوں اردو یونیورسٹی اور حیدرآباد کا مطلب ہی ہو گیا محمد ظفرالدین۔

میں جب بھی حیدرآباد جاتا، اردو یونیورسٹی کے کسی پروگرام میں شرکت کرتا۔ صاف محسوس ہوتا کہ ظفر کی پوزیشن میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اگرچہ وہ پروفیسر ہو گئے تھے، اہلیہ بھی اسسٹنٹ پروفیسر۔ بچے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے اور شہر میں بھی ایک عمدہ فلیٹ لے لیا تھا۔ آرام وسکون کے سبھی آثار تو تھے لیکن میرا آزار یہ تھا کہ ظفر کی کوئی کتاب کیوں نہیں آ پا رہی ہے۔ ظفر عمدہ تنقیدی مقالے کیوں نہیں لکھ رہے ہیں جس کا احساس ظفر کو بھی تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ یونیورسٹی کی انتظامیہ میں اس قدر ڈوب چکے تھے کہ ان سب سے نکلنا ان کے لیے مشکل ہو رہا تھا اگرچہ وہ رسالہ کے ذریعہ سرگرم تھے، لیکن یہاں بھی ان کے اصول آڑے آئے اس لیے وہ سوائے اداریہ کے کچھ اور نہ لکھتے کہ سرکاری رسالہ کسی طرح کا الزام نہ لگ جائے۔ وہ ان سب معاملات میں محتاط رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی کسی الزام کی زد میں نہیں آئے۔ رسالہ کے اداریوں کو ہی ملاحظہ کیجیے۔ وہ بڑے سلیقے سے کسی نہ کسی ادبی موقف کو ظاہر کر جاتے۔ پہلے ہی

شمارہ کے اداریہ کے چند جملے ملاحظہ کیجیے:

''ادب انسانی تہذیب کا نتیجہ ہے اور ادب وثقافت کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ ادب ایک جانب تہذیب و ثقافت سے ماخوذ ہوتا ہے تو دوسری طرف وہ تہذیب وثقافت کے تحفظ، ترسیل، ترویج اور ترقی کا ضامن ہوتا ہے۔ ادب اپنے معاصر عہد کی تہذیب وثقافت کا معتبر وسیلہ ہے۔ امیر خسرو، قلی قطب شاہ، غالب اور اقبال کی تخلیقات اس کی بہترین مثالیں ہیں۔''

اسی طرح تقریباً ہر شمارے میں کسی نہ کسی نکتے پر مختصر اظہارِ خیال کرتے اور مشمولات کے بارے میں بھی اپنی رائے ظاہر کرتے۔ اس طرح اپنی زندگی میں انھوں نے ''ادب وثقافت'' کے بارہ شمارے ترتیب دیے۔ بارہواں شمارہ مارچ 2021ء میں شائع ہوا۔ اس کے اداریہ میں ''اردو میں معلوماتی ادب'' کے متعلق جو باتیں کیں وہ بے حد قیمتی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

''معلوماتی ادب سے مراد وہ ادب ہے جو خالص اردو ادب مثلاً فکشن، شاعری، ڈرامہ وغیرہ کے علاوہ ہوتا ہے۔ دیگر علوم سے متعلق پیش کی جانے والی تحریریں خواہ وہ اصل ہوں یا ترجمہ شدہ وہ معلوماتی ادب کے زمرے میں آتی ہیں۔ سائنس انفارمیشن ٹکنالوجی، ایجوکیشن، صحافت، سماجی علوم، معاشیات، انتظامیہ غرض کہ کسی بھی مضمون سے متعلق علمی ادب کو ہم معلوماتی ادب کے دائرے میں شامل تصور کرتے ہیں۔''

کچھ عرصہ قبل میں نے رسالہ کے تعلق سے مشورہ دیا کہ آخر میں چند اہم کتابوں پر تبصرہ ہو تو کیا حرج ہے۔ میرے اس مشورے کو انھوں نے بخوشی قبول کیا اور انھوں نے ''کتب بینی میری فطرت ہے لیکن......'' کے عنوان سے تبصرے کرنے شروع کیے۔ پہلی قسط میں انھوں نے میری ہی دو کتابوں پر تبصرے کیے لیکن سچ یہ ہے کہ یہ تبصرے کم تھے تعارف زیادہ۔

ظفر کے تعلقات بنگلور کے ن م سعید سے بہت اچھے تھے اور لوگوں سے بھی تھے۔ کرناٹک اردو اکادمی نے سرسید پر سمینار کیا۔ مہمان شرکاء میں شافع قدوائی، مولا بخش، ظفر الدین اور راقم شامل تھے۔ ظفر کا مقالہ سرسید کی صحافت پر تھا اور عمدہ مقالہ تھا۔ میں نے جب اس کی تعریف کی تو وہ شرما گئے کہنے

لگے ''آپ لوگوں کے مقابلے کچھ بھی نہ تھا۔'' جب کہ یہ سچ نہ تھا۔ وہ بے حد تکلف اور تہذیب کے انسان تھے جو گیا جیسے چھوٹے شہر میں ہی پائی جاتی ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ دہلی اور حیدر آباد جیسے بڑے شہروں میں آنے، بسنے کے باوجود قصباتی تہذیب کا نازک مادّہ ظفر نے بچا رکھا تھا۔ اگر چہ ان بڑے شہروں نے انھیں روشنی دی، سمجھ داری دی اور تھوڑی سی دنیاداری بھی لیکن تہذیب کا ایک ننھا سا دیا جو ان کے والدین اور گیا کے تہذیبی ماحول نے روشن کیا تھا ظفر نے بجھنے نہ دیا اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ ان کا مہذب رویّہ اور محنت بھرا نظریہ۔

کچھ دنوں کے بعد وہ مجھے لکھنؤ کے ایک سمینار میں نظر آئے۔ ان کو دیکھ کر یک گونہ مسرت ہوئی۔ دن بھر ساتھ رہا۔ اس کے آگے پیچھے اردو یونیورسٹی میں سلیکشن کمیٹی ہوئی۔ ڈاکٹر اسلم پرویز اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو چکے تھے۔ بڑی محبت سے بطور اکسپرٹ مجھے یاد کیا۔ دوسرے اکسپرٹ شمیم حنفی اور صغیر افراہیم تھے۔ پروفیسرز میں فاروق بخشی ہی سب سے بہتر تھے۔ چنانچہ ان کا انتخاب ہو گیا لیکن اسی سلیکشن کمیٹی میں مسرت بھی امیدوار تھی وہ جونیئر تھی اس لیے ان کا انتخاب ممکن نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ ظفر اور مسرت کہیں برا نہ مانیں لیکن اس وقت مجھے خاصی طمانیت ہوئی جب وہ دونوں ہی ویسے ہی ملے جیسے کہ ملتے تھے۔ ذرا بھی ناراض نہ تھے۔

پروفیسر فاروق بخشی نے رضیہ سجاد ظہیر پر سمینار کیا، مجھے مدعو کیا۔ میں نے ظفر کو اپنی آمد کی اطلاع دی تو انھوں نے اس بار زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی۔ مذاکرے میں بھی وہ کھڑے کھڑے آئے کچھ دیر پیچھے بیٹھے اور جلد ہی چلے گئے۔ تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی۔ میں نے فون کیا تو گیسٹ ہاؤس آئے اور اپنے گھر لے گئے۔ ساتھ کھانا کھایا انھیں کے گھر سے ائیر پورٹ چلا گیا۔ وہ بہت سنجیدہ اور گہرے انسان تھے۔ دل کی بات آسانی سے زبان پر نہ لاتے۔ آسانی سے کسی کی شکایت بھی نہ کرتے۔ ہر یونیورسٹی کی طرح اردو یونیورسٹی میں بھی سیاست تھی۔ کہیں کچھ کہیں کچھ۔ تعلیمی اداروں اور تعلیم یافتہ انسانوں میں چھوٹی چھوٹی سیاست کچھ کچھ عجیب سی لگتی ہے، لیکن آدمی کو انسان بننے میں صدیاں گذر جاتی ہیں پھر بھی اکثر وہ اندر سے آدمی ہی ہوتا ہے۔ غالب نے غلط نہیں کہا تھا۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

گذشتہ سال ڈیڑھ سال سے کرونا وباء کی وجہ سے آنا جانا بند رہا۔فون پر باتیں ہوتیں۔ وہ فون پر بھی باتیں کم کرتے بلکہ فون ہی کم کرتے ،بس کبھی کبھی میسیج کرتے۔ آج میں سوچتا ہوں کہ خدا نے ہر طرح سے ظفر کو نوازا تھا لیکن مادّی دنیا کی آسائشیں اور انتظامی عہدوں کی عظمتیں ایک حد تک سرشار کرتی ہیں، روح کے مطالبے تو کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔ ایک اسٹیج پر آ کر ہر انسان کو احساس ہوتا ہے کہ وہ کیا ہے؟ کہاں کھڑا ہے؟ اور اس کی اصل شناخت کیا ہے؟ یہ سوال تو ہمارے سامنے بھی ہے کہ اتنا پڑھنے لکھنے کے بعد آج ہی ملک و معاشرہ میں ہماری حیثیت کیا ہے۔ پھر یہ معاشرہ ہی کیا ہے کیسا شور و خروش ہے؟ اقبال نے بھی کہا تھا۔

زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش

کوئی پل دو پل میں ختم ہو جاتا ہے، مر جاتا ہے یا مار دیا جاتا ہے۔جیل میں بند کر دیا جاتا ہے یا اس کا مسکن مسمار کر دیا جاتا ہے۔کوئی شمشان میں تو کوئی قبرستان میں۔ اچانک ظفر کے موت کی اطلاع ملی تو سارے سوالات سر اُٹھانے لگے۔ زندگی کی ناپائیداری مسکرانے لگی۔ کسی استاد کا شعر ذہن میں گونج گیا۔

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا ہے کل کی خبر نہیں

یہ تو سب کے ساتھ ہے۔ ظفر کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ظفر نے بہت کچھ کیا اور بہت کچھ کر گذرنے کا حوصلہ تھا۔ اردو یونیورسٹی کی بنیاد ڈالنے میں اس کے خون پسینے کا ایک یادگار رول تو ہے ہی جنھوں نے نہیں دیکھا وہ آسانی سے تسلیم نہیں کریں گے لیکن میں تو ہر پل کا گواہ ہوں۔ آج یونیورسٹی کی جو شاندار عمارتیں جگمگا رہی ہیں اس کی روشنی میں ظفر کا خون پسینہ بھی شامل ہے۔ یہ بات اردو والے مانیں یا نہ مانیں لیکن خود اردو یونیورسٹی تو اس کی گواہ ہے۔ اس کی فضاؤں میں اس کا کام اور نام گونجتا رہے گا۔ الوداع ظفر تمھاری محبتیں و محنتیں ہمیشہ یاد آتی رہیں گی۔

❒ **Prof. Ali Ahmed Fatami**
Former Head, Department of Urdu
Allahabad University, Allahabad
Mobile: 9415306239
Email: Aliahmad.fatmi@yahoo.com

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:47-66
Prof. Shahzad Anjum, Mere Bhai Jaan: Prof. Mohd Zafaruddin

شہزادانجم

میرے بھائی جان: پروفیسر محمد ظفرالدین

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

5/اپریل 2021ء کی اُس دل دہلا دینے والی صبح کو شاید میں زندگی بھر نہ بھلاسکوں۔ میں جامعہ جانے کی تیاری ہی کرر ہا تھا کہ ساڑھے نو بجے حیدرآباد سے میرے چھوٹے بھائی منہاج اصغر کا ایک نہایت ہی پریشان کن فون آیا۔ وہ بدحواسی کے عالم میں بول رہے تھے، بھائی جان کو شدید ہارٹ اٹیک ہوا ہے، آپ جلد حیدرآباد آجایئے۔ وہ نہایت افسردہ تھے۔ ان کے لہجے میں دردناکی تھی۔ اس بے چین کردینے والی خبر سے میں ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ آدھے گھنٹے کے بعد ان کا دوسرا فون آیا۔ وہ رقّت بھرے لہجے میں بول رہے تھے ''بھائی جان چل بسے، انّا للہ و انّا الیہ راجعون۔'' میں پریشان ہوگیا۔ مغفرت کی دعا کی اور جواب دیا۔ ''میں جلد پہنچتا ہوں، تم اپنے آپ کو سنبھالو، بھابھی اور بچوں کو سنبھالو، حوصلہ رکھو، ہمت سے کام لو، میں خاندان کے تمام لوگوں کو خبر کرتا ہوں...'' وغیرہ وغیرہ۔ پتہ نہیں میں بدحواسی میں کیا کیا کہتا چلا گیا۔ فون منقطع ہو چکا تھا۔ میں بے خیالی کے عالم میں صوفے پر دھم سے گر پڑا۔ بچوں نے پانی کا گلاس مجھے دیا۔ میں ایک ایک گھونٹ پیتا رہا۔ میری آنکھیں آسمان کی طرف تھیں۔ اے خدا ہم تیری رحمت کے طلب گار ہیں۔ بھلا ایسے بھی کوئی جاتا ہے۔ ان کی ابھی عمر ہی کیا تھی؟ اچھے خاصے صحت مند تھے۔ خوش باش، خوش اخلاق، خوش مزاج۔ آخر انھیں اچانک کیا ہوگیا تھا؟ اب بھابھی اور بچوں کا کیا ہوگا؟ میں بھابھی کا سامنا کیسے کروں گا؟

درد کی گہری ٹیس میں ڈوبا میں اپنے نہایت ہی شفیق و مہربان بھائی جان کی ایک ایک خوبیوں

کو یاد کرتا رہا۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اس روز جامعہ میں ایک اہم میٹنگ تھی۔ چھٹی کی درخواست بھی جمع کرنا تھی، میں اپنے شعبہ پہنچا۔ فیس بک اور واٹس ایپ کے ذریعے خبر تیزی سے ادبی حلقوں میں پھیل چکی تھی۔ شعبہ میں ڈاکٹر جاوید حسن اور ڈاکٹر ثاقب عمران موجود تھے۔ آفس کے ملازمین جے رام ستی اور اختر بھی موجود تھے۔ میں نے چاروں کو اپنے قریب بلایا اور اطلاع دی کہ میرے بھائی جان اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ آپ لوگ ان کی مغفرت کی دعائیں کریں۔ سبھی حیران و پریشان مجھے تک رہے تھے۔ مغفرت کی دعائیں بھی کرتے رہے، میں خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا، وہ لوگ بھی بیٹھے رہے، میں اپنے کمرے کی چھت کو بے خیالی میں تکتا رہا۔ آہستہ آہستہ میرے کمرے میں میرے شعبے کے ساتھی خالد جاوید، کوثر مظہری، شہپر رسول، احمد محفوظ، ندیم احمد، عبدالرشید، سرورالہدیٰ، عمران احمد عندلیب، خالد مبشر، مشیر احمد، محمد مقیم، عادل حیات، ساجد ذکی فہمی، تنویر حسین سب جمع ہو گئے۔ میرے موبائل فون کی گھنٹی لگاتار بج رہی تھی۔ ہر شخص حیران و پریشان تھا۔ الٰہی یہ کیسے ہو گیا۔ وہ تو بالکل اچھے بھلے تھے۔ مختلف شعبوں کے اساتذہ بھی میرے کمرے میں بھاگے بھاگے آئے۔ عبدالماجد قاضی، فوزان احمد، عبدالحلیم، محمد محسن، کلیم اصغر اور بھی بہت سے احباب؛ مجھے تو اب یاد بھی نہیں ہے۔ سہیل احمد فاروقی، پروفیسر خالد محمود اور ان کی بیگم تسنیم فاطمہ بھی آئیں۔ میں فون پر مستقل لوگوں سے باتیں بھی کر رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا۔ میں جانتا تھا کہ میرے بھائی جان، میرے لیے کیا تھے۔ میرے مربّی، محسن، دوست، غم گسار، مخلص، غم خوار ــــ مجھے لگا اچانک میرا سب کچھ کھو گیا۔ شام کی فلائٹ سے میں اپنے بھانجے ڈاکٹر غضنفر علی خاں (شاداب) کے ساتھ حیدرآباد پہنچا۔ چھوٹے بھائی منہاج اصغر جو کہ حیدرآباد میں ہی اسسٹنٹ کمشنر (پرویڈنٹ فنڈ) ہیں۔ انھوں نے اپنی گاڑی ایرپورٹ بھیج دی تھی۔ میں Avalon اپارٹمنٹ، ناگل نگر، حیدرآباد پہنچا۔ اس اپارٹمنٹ کے فلیٹ نمبر 1016 میں میرے چھوٹے بھائی اور 1012 میں بھائی جان رہتے تھے۔ میں جب Avalon اپارٹمنٹ پہنچا تو میرے چھوٹے بھائی منہاج نیچے صدر دروازے پر ہی ہم دونوں کے منتظر تھے۔ ان کی آنکھیں نم تھیں۔ چہرے پر ایک عجیب سی افسردگی، دردانگیزی، پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ہمیں اپنے فلیٹ میں لے گئے جہاں میرے وطن گیا (بہار) سے میرے دوسرے چھوٹے بھائی منصور رضا، بھائی جان کے سمدھی محمد طاہر صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ کی آمد ہو چکی تھی، پونے سے تشریف لائے میری بھابھی کے چاروں بھائی پرویز، اختر، اعجاز، فیروز

کے علاوہ چند دوسرے مہمان بھی موجود تھے، سبھی غمزدہ تھے مگر اُن سبھوں کے درمیان بھائی جان کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ میری آنکھیں انھیں تلاش کررہی تھیں، اس سے قبل جب بھی میں حیدرآباد پہنچا، وہ خود ایرپورٹ پہنچتے یا اپنے کسی نمائندے کو مجھے گھر تک لانے کی ذمہ داری دیتے۔ میری خاطر داری، تواضع میں پیش پیش رہتے۔ وہ میری پسند و ناپسند کا حد درجہ خیال رکھتے۔ وہ مجھ سے خوب باتیں کرتے۔ ہر طرح سے دل جوئی کرتے۔ مگر اب وہ کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ میں نے بے چین ہوکر اپنے چھوٹے بھائی سے پوچھا، بھائی جان کہاں ہیں؟ وہ مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے، خاموش رہے۔ میں نے اصرار کیا کہ مجھے بھائی جان سے ملنا ہے، وہ کہاں ہیں؟ انھوں نے کہا، چلیے میرے ساتھ، وہ مجھے گراؤنڈ فلور پر لائے، میں اور میرے دوسرے رشتہ دار بھی خاموشی سے میرے ساتھ چلتے رہے۔ وہ مجھے گراؤنڈ فلور کے گوشے میں ایک کشادہ ہال میں لے گئے، باہر کرسیاں لگی ہوئی تھیں، متعدد لوگ خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ حافظ شاہد، عمر فاروق، ایوالون سوسائٹی، آس پاس اور یونیورسٹی کے افراد بھی موجود تھے۔ ہال میں بھائی جان کی میت رکھی ہوئی تھی۔ میرے بھانجے، سیف جو بنگلور سے آئے تھے، وہ اپنے ماموں جان کے پاس بیٹھ کر ان کی مغفرت کی دعا کررہے تھے اور حسرت سے انھیں تکے جارہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ دوڑ کر باہر سے چند کرسیاں اندر لے آئے۔ میں بھائی جان کے پاس بیٹھ کر قرآن کی چند آیتیں پڑھتا رہا، انھیں بخشتا رہا، اللہ ان کی مغفرت فرمائے، اپنے جوار رحمت میں اعلیٰ مقام دے، انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، ان کے تمام گناہوں کو بخش دے، خاموشی سے دل ہی دل میں دعائیں کرتا رہا۔ ہم لوگ دیر تک وہاں بیٹھے رہے، میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ سبھی نم دیدہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ میں ہال سے باہر نکلا، منہاج سے کہنے لگا، بھابھی کہاں ہیں؟ مجھے بھابھی سے ملنا ہے۔ انھوں نے کہا، چلیے، وہ مجھے بھائی جان کے فلیٹ 1012 میں لے گئے۔ میں اندر کے کمرے میں آگیا، چند رشتہ دار اور اپارٹمنٹ کی چند عورتیں بھی وہاں موجود تھیں، میں بھابھی صاحبہ کے پاس گیا۔ ان کے پاس خاموش بیٹھا رہا۔ آج کوئی لفظ میرا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ لبوں پہ مہر لگی تھی۔ ایک سکوت طاری تھا۔ بہت ہمت کی کہ دو چار جملے بولوں، انھیں حوصلہ اور ہمت دوں، مگر میں اتنی ہمت نہیں جٹا پایا۔ ایک عجیب سی یاسیت، غم و اندوہ کی فضا میں ہم لوگ بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ اچانک وہ رونے لگیں۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہوگئے۔ میں بھی خاموشی سے رونے لگا۔ ہائے یہ کیسی بے بسی

تھی، میں نے ایک جملہ بھی ادا نہیں کیا اور تیزی سے کمرے سے نکل آیا، معنوں میں خود کو سنبھال نہیں پاؤں گا اور کہیں سارے گھر میں رونے کی آواز بلند نہ ہو جائے۔ دیر رات تک بھائی جان کی بیٹی ثانیہ اور داماد ثاقب بھی قطر سے آچکے تھے۔ دوسرے دن یعنی چھ اپریل 2021 کو بعد نماز فجر مسجد قبا، نائل نگر، ایولون اپارٹمنٹ کے سامنے، بھائی جان کی نماز جنازہ پڑھائی گئی، جس میں کثیر تعداد میں لوگ موجود تھے۔ وہاں سے میت کے ساتھ گاڑی سے ہم لوگ سرائے الٰہی، کاچی گوڑہ، حیدرآباد کے قبرستان پہنچے، قبرستان کے دروازے پر حضرت سیّدی کمال اللہ شاہ (المعروف) حضرت مچھلی والے شاہؒ کا بورڈ آویزاں تھا۔ اندر قبرستان میں تقریباً ساری قبریں پختہ تھیں۔ ان میں سے بیشتر قبریں برسوں پرانی تھیں۔ قبرستان میں پیر رکھنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ اسی قبرستان کے وسط میں ہم لوگ کسی طرح پہنچے، قبر تیار تھی۔ بھائی جان کے دونوں بیٹے شبیع اور فرقان، بہت سارے رشتہ دار، حیدرآباد اور وہاں کی یونیورسٹیوں کے احباب موجود تھے۔ تقریباً سات بجے صبح تدفین ہوئی۔ قبر پر منوں مٹی ڈالی جاچکی تھی۔ میں حیران و پریشان تکتا رہا۔ میں ہی کیا، وہاں موجود سارے لوگ غم و اندوہ سے ڈوبے ہوئے کبھی قبر، کبھی قبرستان، کبھی ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ فرقان نے حد درجہ ضبط سے کام لیا۔ مگر شبیع قبر کے قریب بیٹھ کر روتے رہے۔ ہم لوگوں نے انھیں دلاسا دیا۔

بھائی جان کا انتقال اچانک کیسے ہو گیا، کسی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پوری ادبی دنیا سوگوار تھی۔ اردو دنیا میں یہ خبر تیزی سے پھیل چکی تھی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی، عتیق اللہ، محمد زماں آزردہ، شہاب الدین ثاقب، محمد علی جوہر، سہیل انجم، ریاض احمد، شارب ردولوی، علی احمد فاطمی، احمد کفیل، آفتاب احمد آفاقی، دبیر احمد، احمد خاں، مشتاق احمد گنائی، ارشاد نیازی، یوسف وانی، محمد اسلم، اعظم ایوبی، رشید انجم، انجم عثمانی، مشرف عالم ذوقی۔ رضوان قیصر، مولابخش، راشد انور راشد، قمرالہدیٰ فریدی، غیاث الدین، فاطمہ بیگم، فضل اللہ مکرم، محمد احمد، ابن کنول، نجمہ رحمانی، ابوبکر عباد، محمد کاظم، خواجہ محمد اکرام الدین، شیخ عقیل احمد، رضا حیدر، ہمایوں اشرف، زین رامش، حسین الحق، عبدالصمد، ان کے علاوہ متعدد احباب، رشتہ داروں، ادیبوں، شاعروں کے فون آتے رہے۔ سبھی انگشت بدنداں تھے کہ اچانک یہ کیسے ہو گیا؟

انتقال سے چند روز قبل انھیں بخار آ رہا تھا۔ نزلہ اور کھانسی کی شکایت بھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹروں نے دوائیں دی تھیں۔ وہ اچھے تھے مگر غیر مطمئن۔ انتقال سے ایک دن قبل یعنی چار اپریل کو انھوں نے فیملی

گروپ پر ایک پیغام لکھا تھا:

''اٹھارہ مارچ سے میری طبیعت خراب ہے۔ بخار چڑھتا اترتا رہتا ہے۔ ایکسرے کے بعد ڈاکٹر نے لنگس انفکشن بتایا۔ پھر خون جانچ کے بعد ڈاکٹر نے کہا، گھبرانے کی ضرورت نہیں، دو چار دن دوا کھا لیجیے، ٹھیک ہو جائیں گے، یکم اپریل کو ہمت کر کے یونیورسٹی گیا اور تین اپریل کو قریب کے ایک شاپنگ مال... دونوں دن واپسی پر بخار آ گیا۔ کمزوری بہت ہے۔ بلغم کھانسی کا سلسلہ رک گیا ہے، مگر ہانپنے کا احساس باقی ہے۔ آج اٹھارہ دن ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ یہ وراثت ہے کیا! گروپ کے سبھی ممبران سے دعا کی درخواست ہے۔''

پانچ اپریل کی صبح تقریباً ساڑھے آٹھ بجے انھیں شدید ہارٹ اٹیک ہوا۔ میرے چھوٹے بھائی منہاج، بھائی جان کے دونوں بیٹے شبیع اور فرقان، میرے بھانجے سیف انھیں فوری طور پر قریب کے ایک اسپتال Olive Hospital لے گئے۔ ڈاکٹروں نے فوری توجہ دی اور ان کی صحت یابی کی بھرپور کوشش کی مگر اُن کی طبیعت زیادہ بگڑتی جا رہی تھی۔ دل کے دورے پڑ چکے تھے۔ اس اسپتال میں آئی سی یو بیڈ خالی نہیں تھا۔ مشورہ ہوا کہ کسی دوسرے اسپتال میں اُن کا داخلہ فوری طور پر کرایا جائے۔ بھائی جان کو ایمبولینس سے لے کر میری بھابھی، مسرت جہاں صاحبہ اور بھائی جان کے بڑے بیٹے شبیع ظفر دوسرے اسپتال کی طرف جا ہی رہے تھے کہ راستے میں ایمبولینس پر ہی بھائی جان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور وہ اس جہانِ فانی سے تقریباً دس بجے دن ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ سبھی لوگ ششدر رہ گئے۔ پورے خاندان پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ خدا اُن کی مغفرت فرمائے۔ آمین

رہنے کو سدا دہر میں آتا نہیں کوئی
تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی (کیفی اعظمی)

بھائی جان سے میرا رشتہ کس قدر محبتوں، اپنائیت اور خلوص سے بھرا ہوا تھا اسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ انسانی خوبیوں سے بھرے پُرے وہ ایک غیر معمولی انسان تھے۔ جنھوں نے پورے خاندان کی سرپرستی کی، انھیں سجانے، سنوارنے اور آگے بڑھانے میں بھرپور مدد دی۔ وہ حد درجہ بااصول، وضع دار، محبت کرنے والے، جفاکش و محنتی اور ایماندار انسان تھے۔ میری ذات پر ان کے بے شمار

احسانات ہیں۔ میری تعلیم و تربیت اور ترقی و کامرانی میں انھوں نے ہمیشہ غیر معمولی دلچسپی لی۔ والد صاحب کا انتقال ۲۱/مارچ ۲۰۱۰ کو دہلی میں اچانک حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے ہوگیا تھا۔ وہ فوراً بھابھی اور بچوں کے ساتھ دہلی آئے۔ جامعہ قبرستان میں والد صاحب کی تدفین ہوئی۔ وہ حد درجہ مغموم تھے۔ ہمارے چار بھائیوں میں وہ سب سے بڑے تھے۔ ابّا کے گزر جانے کے بعد اب وہ باقاعدہ ہم بھائیوں کے سرپرست اور مربّی بن گئے۔ انھوں نے اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی سمجھا اور نبھایا۔ میں اپنے دوستوں سے پتہ نہیں کیوں، یہ بات کہتا ہوں، ممکن ہے میری بات غلط بھی ہو، مگر یہاں بھی اسے لکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنے رشتہ داروں اور حلقے میں بہت سے بھائیوں کو دیکھا ہے مگر جو خلوص اور محبت کا جذبہ میں نے اپنے بھائی جان میں دیکھا، وہ دوسروں کے یہاں بہت کم نظر آیا۔ ان کا جذبہ صادق تھا اور وہ غیر معمولی انسان تھے۔ وہ ہمیشہ ہر طرح کی مدد کرنے کو تیار رہتے۔ والد صاحب بہار کے مشہور خطاط تھے، مگر ان کی آمدنی بہت کم تھی۔ بھائی جان نے ہوش سنبھالتے ہی ابّا کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ وہ بھی کتابت سیکھ گئے۔ بہنوں کی شادیاں، بھائیوں کی تعلیم، روزمرہ کے اخراجات میں بھرپور تعاون دینے لگے۔ نوعمری سے ہی وہ گھریلو ذمہ داریاں اٹھانے لگے۔ وہ والدین کے نہایت ہی سعادت مند اور فرماں بردار بیٹے تھے۔ بھائی اور بہنوں کے نہایت ہی شفیق و مہربان، مخلص اور بے ریا بھائی تھے۔ خواجہ الطاف حسین حالی کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین، جو حالی کے سرپرست بھی تھے، ان کا جب انتقال ہوا تو حالی شدید صدمے سے دوچار تھے۔ انھوں نے اپنے بھائی خواجہ امداد حسین کے انتقال کے بعد ان کا ایک مرثیہ لکھا تھا۔ اس مرثیے کے الفاظ سے میرے جذبات کی عکاسی ہو رہی ہے۔ اس مرثیے کے چند اشعار آپ بھی پڑھیں:

آئے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی بچھڑتے
موت ایک کے آگے ہے ضرور ایک کو آنی
پر بھائی ہو جس شخص کا حالؔی کا سا بھائی
غم بھائی کا، مرجانے کی ہے اس کے نشانی
جس بھائی نے بیٹوں کی طرح بھائی کو پالا
سوکھی ہوئی کھیتی میں دیا باپ کی پانی

جس بھائی کی آغوش میں ہوش اس نے سنبھالا
جس بھائی کے سائے میں کٹی اس کی جوانی
شفقت نے دیا جس کو بھلا، مہرِ پدر کو
دی آنے کبھی دل پہ نہ بھائی کے گرانی
جیتا بھی رہا بھائی، اگر بھائی کے پیچھے
لذت نہیں جینے کی نصیب اس کی اٹھانی
دل مردہ ہو حالؔی کی طرح جس کا عزیزو!
کیا ڈھونڈتے ہو اس کی طبیعت میں روانی
باقی رہے گا داغ سدا بھائی کا دل پر
ہر چند کہ فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی

بھائی جان چل بسے، عجیب اتفاق ہے بہت سارے احباب اور بزرگ جنھوں نے بھائی جان کی رحلت پر مجھ سے تعزیت کی تھی۔ ان میں سے کئی اچانک کورونا وبا کے زمانے میں چند ہی دنوں کے اندر دیکھتے ہی دیکھتے داغ مفارقت دے گئے۔ ان افراد میں پروفیسر شمیم حنفی، جناب انجم عثمانی، پروفیسر رضوان قیصر، پروفیسر مولا بخش، مشرف عالم ذوقی اور ڈاکٹر رضا حیدر وغیرہ کے نام خصوصی طور پر ذہن میں آ رہے ہیں۔ اس کورونا وبا کے زمانے میں کیسے کیسے لعل و جواہر اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ ان سب کا ذکر حد درجہ تکلیف دہ ہے۔ جب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب، پروفیسر ظفر احمد صدیقی اور میرے استاد پروفیسر افصح ظفر اس جہان فانی سے رخصت ہوئے تو میں تڑپ اٹھا تھا۔ ان کے بعد تو جیسے ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہائے، کیسے کیسے قیمتی لوگ ہم سے بچھڑ گئے۔

اٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
روئیے، کس کے لیے، کس کس کا ماتم کیجیے

سوانح و شخصیت:

میرے والد محترم قمر نظامی صاحب اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں:

’’میرا سلسلۂ پدری عظیم آباد (پٹنہ) ہے اور مادری ضلع مونگیر، نسبتاً آباو اجداد

صدیقی النسب اور والدہ کا روہیلہ پٹھان ہے۔ میرے خاندان کے بعض افراد
نے سادات میں بھی شادیاں کیں۔ سلسلۂ نسب یوں ہے:
محمد قمرالدین عرف قمر نظامی ابن عبداللطیف ابن محمد باقر علی ابن طوفانی میاں ابن
بختیاور حسین، ساکن محلّہ لودی کٹرہ (پٹنہ) بہار۔ 1920 میں میرے والد صاحب
نے خاندانی جھگڑے کی وجہ کر پٹنہ کو چھوڑ کر مستقل گیا میں سکونت اختیار کی۔''
میرے والد صاحب اپنی تاریخ پیدائش کے تعلق سے اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں:
''میں جمعہ کے دن 27/رمضان المبارک 1353ھ مطابق 4/جنوری 1935ء
محلّہ معروف گنج گیا (چھوٹی مسجد سے ملحق ایک مکان) میں پیدا ہوا۔ جمعۃ الوداع،
صبح صادق کا وقت تھا۔''

میرے والد کی شادی حاجی شفیع اللہ خاں (ہیڈ ماسٹر) ساکن ہزاری باغ موجودہ ریاست جھارکھنڈ، کی دوسری صاحب زادی زاہدہ خاتون سے 20/مئی 1957ء مطابق 19/شوال 1377ھ بروز پیر ہوئی۔

میرے بھائی جان (پروفیسر محمد ظفر الدین صاحب) جنھیں میں ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی صرف بھائی جان کہہ کر مخاطب کرتا رہا، کبھی ان کا نام زبان پر نہیں لایا۔ وہ میرے والد محترم کی چھٹی اولاد تھے۔ پہلے دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ اس کے بعد اللہ نے اولاد نرینہ سے نوازا۔ ان کا نام شاہد رکھا گیا۔ مگر چند ہی دن بعد وہ فوت ہو گئے۔ ان کے بعد ایک بیٹی کی پیدائش ہوئی۔ بیٹی کی پیدائش کے بعد پھر ایک بیٹا پیدا ہوا۔ ان کا نام عارف رکھا گیا۔ مگر چند دنوں کے بعد اس بیٹے کا بھی انتقال ہو گیا۔ بفضلہٖ تعالیٰ تینوں بیٹیاں حیات تھیں۔ مگر دونوں بیٹے کے انتقال کے بعد والدہ صاحبہ افسردہ تھیں۔ ان دو بیٹوں کے انتقال کے بعد میری نانی صاحبہ حد درجہ فکرمند ہوئیں۔ بھائی جان کی پیدائش سے قبل میری نانی صاحبہ نے میری والدہ محترمہ کو اپنے پاس ہزاری باغ (موجودہ ریاست جھارکھنڈ) میں بلا لیا۔

میرے بھائی جان (پروفیسر محمد ظفر الدین) کی پیدائش ان کی نانیہال ہزاری باغ میں 11/اکتوبر 1964ء مطابق 4/جمادی الآخر 1384ھ بروز اتوار، چار بجے صبح ہوئی۔ ان کی پرورش و پرداخت بے حد لاڈ پیار سے اسلامی ماحول میں ہوئی۔ بھائی جان سے بڑی تین بہنیں تھیں، دو بھائیوں کا

انتقال ہو چکا تھا۔اس لیے یہ سبھی کی آنکھوں کا تارہ تھے۔والدہ انھیں حد درجہ مانتی تھیں۔جب یہ پانچ برس کے ہوئے تو ان کی رسم بسم اللہ والد صاحب نے ہی بڑی مسجد معروف گنج گیا (بہار) کے صحن میں 25/رجب 1389ھ مطابق 8/اکتوبر 1969ء بروز چہارشنبہ کرائی۔میرے والد صاحب صوبۂ بہار کے مشہور خطاط تھے۔وہ اردو، فارسی اور عربی زبان پر اچھی دسترس رکھتے تھے۔انھوں نے مدرسہ انوار العلوم معروف گنج، گیا میں تعلیم حاصل کی تھی مگر باقاعدہ فراغت حاصل نہیں کی تھی۔خاندان اور محلے کے بچوں وبچیوں کو اردو، فارسی اور عربی پڑھانا ان کا شوق تھا۔ان کی نگرانی میں خاندان اور محلے کے متعدد بچوں اور بچیوں نے قرآن پاک ناظرہ ختم کیا تھا۔قرآن اور اردو پڑھانا ابا کا شغل تھا۔ابا کو انگریزی اور ہندی زبان کی بھی واقفیت تھی۔وہ سبھی بچوں کو اپنی بساط بھر انگریزی اور ہندی زبان پڑھایا کرتے تھے۔پورے گیا شہر اور اطراف میں ان کی بڑی عزت تھی۔اپنے فن خطاطی کی وجہ سے وہ پورے بہار میں بہت مقبول تھے۔کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، کلام حیدری، وہاب اشرفی، سید محمد حسنین، جمیل مظہری، مثنیٰ رضوی اور متعدد ادیبوں وشاعروں کی سیکڑوں کتابوں اور مجموعوں کی کتابت انھوں نے کی تھی۔صبح کے وقت قرآن اور اردو پڑھنے کے لیے ہمیشہ ان کے پاس بچے بھرے رہتے۔بھائی جان نے ابتدائی تعلیم والد صاحب سے ہی حاصل کی۔قرآن شریف بھی ابّا سے ہی مکمل کیا۔بھائی جان نے ختم کلام پاک 23/محرم 1392ھ مطابق 10/مارچ 1972ء بروز جمعہ کیا۔ان کے رسم بسم اللہ اور ختم کلام پاک کے موقعے پر بھی بچوں میں اور محلے میں مٹھائیاں تقسیم ہوئیں۔والدہ گھر پر ہی شکر پارے بنالیتی تھیں جسے تقسیم کیا جاتا۔سبھی لوگ اسے پسند کرتے اور شوق سے کھاتے تھے۔

بھائی جان کا داخلہ 12/جنوری 1973ء مطابق 6/ذی الحجہ 1392ھ بعد نماز جمعہ ہادی ہاشمی ہائی اسکول، سوراج پوری روڈ، گیا (بہار) میں پانچویں کلاس میں ہوا۔اسی اسکول سے انھوں نے میٹرک (دسویں) کا امتحان 1980ء میں سکنڈ ڈویژن سے پاس کیا۔اس کے بعد بھائی جان کا انٹرمیڈیٹ آف سائنس (I.Sc) میں داخلہ مرزا غالب کالج گیا (بہار) میں 1980ء میں ہوا۔ابّا کثیرالاولاد تھے۔گھر کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔معاشی پریشانی کا انھیں ہر وقت سامنا کرنا پڑتا تھا۔بھائی جان کی فیس کی ادائیگی کرنا ان کے اختیار میں نہیں تھا۔کالج انتظامیہ نے فیس کی رقم میں خصوصی رعایت کردی۔1969ء میں مرزا غالب کے صدی سال کے موقعے پر شہر گیا کے معززین نے اقلیتوں کی تعلیم کے لیے مرزا غالب کالج،

گیا قائم کیا تھا۔ جہاں اس کے قیام سے اب تک غریب وکمزور بچوں کا داخلہ مفت یا رعایت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہ کالج شہر گیا اوراس کے اطراف میں مقیم اقلیتوں کی تعلیم کا بڑااوراہم مرکز ہے۔اس کالج سے بھائی جان نے آئی ایس سی کا امتحان 1982ء میں سکنڈ ڈویژن سے پاس کیا۔ وہ زمانہ میرے خاندان اور والد محترم کے لیے عسرت اور تنگ دستی کا زمانہ تھا۔ اس وقت ہم لوگ چھ بہنیں اور چار بھائی تھے۔ والد صاحب گھر کے اکیلے کمانے والے فرد تھے۔ والد صاحب کاتب تھے۔ان کی آمدنی محدود تھی اور وہ ایک دائمی مرض میں بھی مبتلا تھے۔ پورے گھر کا خرچ چلانا ان کے لیے بے حد مشکل تھا۔ ابّا کے مدرسے کے ایک نہایت ہی مخلص دوست عبدالمنان شکوری صاحب جوان دنوں دہلی میں مقیم تھےاور کتابت وپرنٹنگ کا کام کرتے تھے، انھوں نے مشورہ دیا کہ بھائی جان کو دہلی تعلیم اور روزگار کے لیے ان کے ساتھ بھیج دیا جائے۔ بھائی جان گھر کے بڑے بیٹے تھے، والدہ کو بے حد عزیز اور پیارے تھے۔ والدہ اپنے لخت جگر کو اپنی نظروں سے اتنی دور بھیجنا نہیں چاہتی تھیں۔اس زمانے میں دہلی واقعی دور تھی۔ بہت کم ٹرینیں چلا کرتی تھیں۔ ہوائی جہاز کا تو سوچنا بھی محال تھا۔ سفر بھی کم ہی لوگ کرتے تھے۔کوئی دہلی جاتا یا آتا تھا، تو شور ہوتا کہ فلاں صاحب دہلی سے آنے والے ہیں، یا فلاں صاحب دہلی جانے والے ہیں۔ہفتوں پہلے سے ان کے آنے جانے کی تیاری ہوتی۔ وہ زمانہ ٹیلی فون اور موبائل کا زمانہ بھی نہیں تھا۔ دہلی پہنچنے کی خبر ہفتوں بعد خط سے ملا کرتی۔ان حالات میں والدہ محترمہ اپنے آنکھوں کے تارے کو نظروں سے دور نہیں بھیجنا چاہتی تھیں مگر والد صاحب کے اصرار اور بیٹے کے روشن مستقبل کے پیش نظر والدہ راضی ہوگئیں اور بھائی جان نے 28/اگست 1982ء کو اپنے آبائی وطن گیا (بہار) کو الوداع کہا کسے خبر تھی کہ ان کا یہ سفر ایک ایسا سفر ثابت ہوگا جو ان کی اور پورے خاندان والوں کے لیے وسیلۂ رحمت ثابت ہوگا۔

بھائی جان نے محض اٹھارہ برس کی عمر میں گیا شہر کو الوداع کہا۔ وہ 29/اگست 1982ء کو دہلی پہنچے۔ یکم ستمبر 1982ء کو تعلیم بالغان، شبینہ اسکول، نانگلوئی، دہلی میں دوسو روپے ماہانہ پر انھوں نے اپنی پہلی نوکری جوائن کی۔ بھائی جان بے حد محنتی، جفاکش، ایماندار اور بااصول انسان تھے۔ وہ والد محترم سے کتابت کا فن بھی سیکھ چکے تھے۔ میرے چچا عبدالمنان شکوری گیاوی کی کوششوں سے بھائی جان کو روزنامہ ’قومی آواز‘ نئی دہلی میں 1983ء میں بحیثیت کاتب ملازمت مل گئی۔ ان دنوں بھائی جان عبدالمنان چچا کے گھر 412، مادی پور، نئی دہلی میں رہا کرتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد 1983ء میں ہی

شاہد صدیقی صاحب کے اخبار ہفتہ وار 'نئی دنیا' میں بھی بھائی جان کو بحیثیت کاتب چھ سو روپے ماہانہ پر ملازمت مل گئی۔ بھائی جان شبینہ اسکول چھوڑ چکے تھے۔ اسی دوران انھوں نے ذاکر حسین ایوننگ کالج دہلی میں بی ایس سی میں داخلہ لیا۔ کالج کی پڑھائی روزنامہ 'قومی آواز' اور ہفتہ وار 'نئی دنیا' کی نوکری بیک وقت تین ذمہ داریوں کے بوجھ تلے وہ پریشان ہو گئے۔ وہ بی ایس سی کے پہلے سال کو مکمل نہیں کر سکے۔ اساتذہ اور دوستوں کے مشورے سے انھوں نے دوسرے سال سائنس کی بجائے اردو آنرز میں اسی کالج میں داخلہ لے لیا۔ اردو زبان و ادب کا انھیں بچپن سے چسکا لگا تھا۔ میرے گھر پر ہمارے بچپن میں اردو کے متعدد رسائل، جرائد اور اخبارات آتے تھے۔ نیا دور، آج کل، نور، بتول، الحسنات، کھلونا۔ رسائل کے علاوہ پٹنہ سے شائع ہونے والے اخبارات 'صدائے عام' اور 'سنگم' بھی والد صاحب ذوق و شوق سے پڑھتے تھے۔ والد صاحب 'کھلونا' اور 'نور' ہم لوگوں کے لیے پابندی سے خریدتے تھے۔ سہ روزہ 'دعوت' بھی وہ دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ بڑی مسجد معروف گنج میں ہم لوگوں کے پاس کرائے کا ایک کمرہ تھا۔ اس کے سامنے ایک نیم کا درخت تھا۔ مسجد کی آغوش میں چھتنار نیم کے درخت کے نیچے پڑھتے، کھیلتے ہم لوگوں کا وقت گزرا۔ والد صاحب کاتب تھے، شہر میں ان کی غیر معمولی عزت تھی۔ پورے شہر اور اطراف کے ادبا، شعرا، علما کتابت کی غرض سے ابّا کے پاس آتے تھے۔ کیسی کیسی جیدّ شخصیات کو میں نے اپنے اس مسجد والے کمرے میں ابّا کے پاس بیٹھے دیکھا۔ حضرت مولانا قاری فخر الدین صاحب، مولانا عبدالصمد صاحب، وہاب اشرفی، کلام حیدری، ش اختر، تاج انور، حسین الحق، ناوک حمزہ پوری، علیم اللہ حالی، سید محمد حسنین، طیب ابدالی، حسن آزردہ، حفیظ بنارسی، طلحہ رضوی برق، عبدالصمد، فرحت قادری کس کس کا نام لیا جائے۔ علماء رمضان کے جدول کی کتابت کی غرض سے تشریف لاتے تھے۔ بھائی جان اور میرے بھی ذہن پر اس ماحول کا خاصا اچھا اثر ہوا۔ اردو زبان و ادب کی طرف ہمارا بھی ذوق و شوق تھا۔ بھائی جان نے اردو آنرز کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ وہ 1986ء میں ذاکر حسین ایوننگ کالج، دہلی یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن سے پاس ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے ایم اے اردو میں داخلہ لیا۔ اردو زبان و ادب سے ان کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ بھائی جان نے 1990ء میں دہلی یونیورسٹی سے ایم اے امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ انھوں نے نہ صرف فرسٹ ڈویژن حاصل کیا بلکہ ان کا انتخاب گولڈ مڈل کے لیے ہوا اور وہ گولڈ مڈلسٹ ہوئے۔ اس موقعے پر یہ لکھنا از حد ضروری ہے کہ دوران تعلیم وہ روزگار سے بھی

وابستہ رہے۔ بھائی جان کی محنت، سلیقہ مندی، علم دوستی کو دیکھتے ہوئے روزنامہ 'قومی آواز' کے ایڈیٹر موہن چراغی نے انھیں ستمبر 1989ء میں رپورٹر کے عہدے پر فائز کر دیا۔ بھائی جان اپنی محنت سے جو بھی کماتے اس کا ایک بڑا حصہ والد محترم کے پاس بھیجتے۔ اس سے ہمارے گھر کی معاشی حالت بہتر ہونے لگی۔ وہ ابّا کے پاس پابندی سے ہر ماہ ایک اچھی رقم بھیجتے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی بڑی اور چھوٹی بہنوں کی شادیوں کے لیے بڑی رقم ابّا کو دی جس سے ابّا کو بڑی آسانی ہوگئی۔ وہ نہایت سعادت مند، نیک اور وفا شعار بیٹے تھے۔ ابّا کا بوجھ انھوں نے اپنے کاندھے پر اٹھانے کی بھرپور کوشش کی۔ مگر میرے والد صاحب خود بے حد محنتی اور اصول پسند انسان تھے۔ ان کی دعا تھی کہ خدا کبھی کسی کا محتاج نہ بنائے۔ جب تک سانس ہو قلم چلتا رہا۔ گھریلو فضا میں ایک آسودگی، طمانیت اور ہلکی ہلکی مسرت کی آمد ہونے لگی تھی۔ ایک زمانہ ہمارا وہ بھی تھا کہ ایک وقت کا کھانا پکتا اور اگلے وقت کے لیے اللہ پر بھروسہ رہتا۔ اب گھر میں پریشر کوکر، گیس چولہا، مکسر گرینڈر، نئی چادریں، نئے برتن کی آمد ہوئی تو سبھی کے چہرے پر خوشی کی لکیریں آتی گئیں۔ یہ سب بھائی جان کی محنت سے ہوا۔ بھائی جان کے بعد ہم تینوں چھوٹے بھائیوں نے بھی اتنی ہی یا ان سے کچھ کم ضرور محنت کی اور گھریلو ماحول کو بہتر بنانے میں تعاون دیا، لیکن ہمارے محرّک بھائی جان تھے۔ انھوں نے گھر کی فضا ہی بدل دی۔ بھائی جان نے ۱۹۹۱ء میں ایم فل میں دہلی یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ان دنوں میں بھی مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا سے ایم۔ اے کر چکا تھا۔ انھوں نے مجھے بھی حوصلہ دیا اور اپنے پاس دہلی بلا لیا۔ انھوں نے میرا بھی داخلہ اپنے ساتھ ہی ایم۔ فل (اردو) میں دہلی یونیورسٹی میں کرا دیا۔ گویا یہ کہ ہم دونوں بھائی کلاس فیلو بھی ہوگئے۔ اب ہم دونوں بھائی دہلی یونیورسٹی کے قریب ایک محلّہ وجے نگر کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں ساتھ رہنے لگے اور تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ روزگار سے بھی وابستہ رہے۔ دہلی آمد پہ بھائی جان سب سے پہلے مادی پور میں رہے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ وہ نانگلوئی میں رہے۔ نانگلوئی میں اُن کا قیام بہت ہی مشکلوں بھرا تھا۔ نانگلوئی دہلی کے تقریباً باہر ہے۔ لمبی مسافت اور متعدد پریشانیوں کا سامنا تھا۔ وہ ایک عجیب سا دور تھا۔ میں اس زمانے میں بھی دہلی آیا تھا، لیکن ان تمام صعوبتوں سے گھبرا کر میں واپس وطن چلا گیا تھا۔ مگر بھائی جان ڈٹے رہے۔ وہ سخت محنت کرنے اور پریشانی اٹھانے کے عادی ہو چکے تھے۔ نانگلوئی کے بعد بھائی جان مادی پور میں اپنے دوست انتظار حسین صاحب کے ساتھ رہنے لگے۔ یہاں ان کی رہائش اچھی تھی۔ ان دنوں بھائی جان 'قومی آواز' اخبار میں

ملازمت بھی کر رہے تھے اور ان کا تعلیمی سلسلہ بھی جاری تھا۔'قومی آواز' کے دفتر میں ان کے ایک بزرگ دوست محمد احمد صاحب بھائی جان کے بڑے قدرداں تھے۔محمد احمد صاحب 1042، کشن گنج تیلی واڑہ چوک، دہلی۔6 میں رہتے تھے۔محمد احمد صاحب حافظ قرآن اور نہایت ہی شریف انسان تھے۔انھوں نے بھائی جان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ اپنے مکان میں تنہا رہتے ہیں اگر وہ بھی ان کے ساتھ قیام کریں تو اچھا ہو،مگر ساتھ میں یہ بھی شرط رکھی کہ کرایہ کچھ بھی نہیں دینا ہوگا۔بھائی جان تذبذب میں پڑ گئے مگر محمد احمد صاحب کے پیہم اصرار پر وہ ان کے ساتھ پرانی دہلی کے ان کے مکان محلّہ کشن گنج میں ساتھ رہنے پر راضی ہو گئے۔محمد احمد صاحب بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔'قومی آواز' میں ملازمت کے علاوہ کتابوں کی اشاعت کا بھی ان کا کاروبار تھا۔اس زمانے میں کتابوں کی اشاعت کا ''پرنٹ آرٹ'' کے نام سے ان کا ادارہ خاصا مشہور تھا۔محمد احمد صاحب دین دار، ایمان دار، بااصول اور مخلص انسان تھے۔آج بھی محمد احمد صاحب پرانی دہلی کے اپنے اسی مکان میں قیام پذیر ہیں۔انھوں نے بھائی جان کا خاصا خیال رکھا۔بھائی جان ان کی ذات وصفات سے متاثر تھے۔بھائی جان نے بھی ان کا احترام کے ساتھ بھرپور تعاون دیا۔چند برس وہاں قیام کے بعد بھائی جان دہلی یونیورسٹی کے قریب کرایے کے فلیٹ میں وجے نگر میں آ گئے۔میں بھی ان کے ساتھ رہنے لگا۔

بھائی جان نے پروفیسر قمر رئیس صاحب کی نگرانی میں ایم فل کا مقالہ ''نیاز حیدر: شخصیت اور شاعری'' موضوع پر لکھا اور انھیں 1993ء میں ایم فل کی ڈگری عطا کی گئی۔ایم فل میں بھی انھوں نے فرسٹ ڈویژن حاصل کیا۔ایم فل کی تعلیم کے دوران دو اہم واقعات ہوئے۔میری والدہ محترمہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہو گئیں اور 31/جولائی 1992ء کو وہ اس جہان فانی سے رخصت ہو گئیں۔بھائی جان اماں کے بے حد قریب تھے۔ایک روز پہلے ہی دہلی سے گیا پہنچے تھے۔دیر رات تک والدہ کے پاس بیٹھے رہے۔اماں شدید تکلیف اور کرب میں تھیں۔دوسرے دن صبح ہی اماں کا انتقال ہو گیا۔والدہ کی رحلت کا ان پر شدید اثر پڑا۔دوسرا اہم واقعہ یہ ہے کہ گھریلو حالات کے پیش نظر والد محترم نے یہ فیصلہ کیا کہ بھائی جان کی جلد شادی کرا دی جائے۔ہماری خالہ زاد اور چچا زاد بہن مسرت جہاں نیلو سے بھائی جان کا رشتہ اماں کی زندگی میں ہی لگ بھگ طے ہو چکا تھا۔اماں کی خواہش تھی کہ بھائی جان کی شادی خاندان میں ہو۔لہٰذا 11/اکتوبر 1992ء بروز اتوار میرے خالو اور چچا بھی، عبدالقیوم صاحب کی صاحب زادی مسرت جہاں

سے بھائی جان کی شادی محلّہ معروف گنج میں ہی منعقد ہوئی۔ شادی کے بعد بھائی جان کی زندگی میں رونق اور بہار آئی۔ وہ بھابھی کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ ان کے بغیر زندگی کا کوئی بھی لمحہ ان کے لیے بے معنی تھا۔ سچائی یہ ہے کہ انھوں نے بھابھی کو دیوانہ وار چاہا۔ بھابھی بھی ان کی مزاج داں اور حد درجہ خیال رکھنے والی تھیں۔ زندگی کی گاڑی خوبصورتی سے آگے بڑھتی رہی۔ ایم فل کی تعلیم کے دوران ہی مجھے دہلی یونیورسٹی کے جوبلی ہال (ہاسٹل) میں کمرہ نمبر ننانوے الاٹ ہو گیا۔ اب ہم دونوں بھائی ایک ساتھ ہاسٹل میں رہنے لگے۔ کمرے میں ایک ہی تخت تھا۔ بھائی جان اس پر سوتے اور میں فرش پر آرام کرتا۔ اکثر میرے ساتھ میرے دوست سدھیر کمار سنگھ اور ذوالفقار بھی ہوتے۔ وہ ہمہ وقت بھابھی کا ذکر کرتے۔ ان کے غائبانے میں ہمارے دوست تفریح کرتے کہ بیگم کو چاہنے والا ایسا شخص ہونا چاہیے۔ ندیم، ریاض، جے کشن، سجیت بھی ان کا ساتھ دیتے۔ میں تھوڑا شرارتی تھا۔ اکثر مجھے ڈانٹتے، سمجھاتے۔ وہ گیارہ بجے رات تک قومی آواز دفتر سے واپس آتے تھے۔ ہم لوگوں کے لیے اکثر کھانے کی کچھ چیزیں بھی لاتے جسے ہم لوگ شوق سے کھاتے۔ بھائی جان نے پروفیسر قمر رئیس صاحب کی نگرانی میں پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ ''اردو ناول کے فن اور تکنیک کا تنقیدی مطالعہ: مابعد پریم چند تا حال'' موضوع پر لکھا۔ جس پر انھیں دہلی یونیورسٹی سے 1996ء میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ وہ اب یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے جے آر ایف (JRF) کے لیے منتخب بھی ہو چکے تھے۔ ان ہی دنوں یو پی پی ایس سی کے ذریعے میں لکچرر اردو کے لیے منتخب ہوا۔ میں نے اگست 1995ء میں گورنمنٹ ویمنس پی جی کالج رام پور (اتر پردیش) میں جوائن کر لیا۔ اب بھائی جان دہلی میں اکیلے رہ گئے تھے۔ ہم سب کے محترم استاد پروفیسر شارب ردولوی صاحب اپنی بیگم پروفیسر شمیم نکہت صاحبہ کے ساتھ دہلی یونیورسٹی کے سرکاری فلیٹ مورس نگر میں رہتے تھے۔ تقریباً ایک سال پہلے شارب صاحب کی اکلوتی بیٹی شعا فاطمہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ لوگ بالکل تنہا تھے۔ انھوں نے بھائی جان کو اپنے ساتھ مورس نگر میں رہنے کی دعوت دی۔ شارب صاحب کے نہایت ہی عمدہ اور کشادہ فلیٹ سے ملحق ایک چھوٹا سا کمرہ مع غسل خانہ تھا۔ بھائی جان اب شارب ردولوی صاحب اور شمیم نکہت میڈم کے ساتھ اس کمرے میں رہنے لگے۔ کچھ دنوں کے بعد میری بھابھی صاحبہ بھی اپنے وطن سے دہلی آ گئیں اور وہ لوگ ہنسی خوشی اس ایک کمرے کے چھوٹے سے فلیٹ میں رہنے لگے۔

بھائی جان روزنامہ ''قومی آواز'' کی ملازمت سے مطمئن نہیں تھے۔ انھوں نے ایم فل اور

پی ایچ ڈی کی تھی۔ وہ جے آر ایف بھی تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ کسی کالج یا یونیورسٹی میں لکچرر کے عہدے پر فائز ہوں اور ان کے اندر جو صلاحیتیں ہیں اسے بروئے کار لایا جائے۔

حیدرآباد میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام جنوری 1998ء میں ہوا۔ اس کے پہلے وائس چانسلر پروفیسر محمد شمیم جیراج پوری صاحب بنائے گئے۔ نئی یونیورسٹی اور وہ بھی حکومت ہند کی جانب سے قائم کردہ پہلی اردو یونیورسٹی کے قیام کے بعد اسے کئی مرحلوں سے گزرنا تھا۔ شمیم جیراج پوری صاحب مشہور سائنس داں، دور اندیش انسان اور اچھے منتظم تھے۔ وہ ہمہ وقت یونیورسٹی کی ترقی، اس کے فروغ اور قیام کے مختلف مراحل کے بارے میں غور وخوض کرتے رہتے تھے۔ ان ہی ایام میں وہ دہلی تشریف لائے، شمیم جیراج پوری صاحب کو یونیورسٹی کے لیے ایک فعال، متحرک، شریف النفس اور ایمان دار اسسٹنٹ پبلک ریلیشن آفیسر کی تلاش تھی جو اردو وانگریزی زبانوں کا ماہر ہو، اعلیٰ تعلیمی استعداد رکھتا ہو اور اسے کچھ تجربہ بھی ہو۔ ڈاکٹر شاہد پرویز صاحب کے توسط سے ان کی ملاقات بھائی جان سے ہوئی۔ شمیم جیراج پوری صاحب بھائی جان سے پہلے سے واقف تھے، انھوں نے بھائی جان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی حیدرآباد چلیں۔ شمیم جیراجپوری صاحب نے فرمایا کہ وہاں آپ جیسے محنتی اور قابل انسان کی ضرورت ہے۔ بھائی جان کے لیے یہ اچھا آفر تھا، مگر سینکڑوں میل دور حیدرآباد میں نوکری کرنا اور بسنا، سوچ کر وہ فکرمند تھے۔ انھوں نے والد صاحب، شارب ردولوی صاحب، بھابھی صاحبہ اور مجھ سے مشورہ لیا۔ ہم سبھی کی یہ رائے تھی کہ وہ مولانا آزاد اردو یونیورسٹی، حیدرآباد ضرور جوائن کریں۔ نئی یونیورسٹی ہے، جہاں ترقی کے بے حد امکان ہیں۔ انھوں نے شمیم جیراج پوری صاحب کو اپنی رضامندی دے دی۔ یونیورسٹی سے خط آیا اور بھائی جان نے 16/ مارچ 1998ء کو مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی میں بحیثیت اسسٹنٹ پبلک ریلیشن آفیسر جوائن کرلیا۔ ان دنوں یونیورسٹی صرف ایک عمارت میں سمٹی ہوئی تھی۔ اس کے بعد یہ شہر کی چار عمارتوں میں پھیل گئی۔ اس کے دفاتر کے کام بھی تقسیم ہوئے۔ شمیم جیراج پوری ایک عمارت کے اوپری منزل پر رہتے تھے۔ گراؤنڈ فلور پر ان کا دفتر تھا اور اس سے ملحق بھائی جان کے آفس کا کمرہ تھا۔ ان دنوں بھائی جان ٹولی چوکی میں کرائے کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد ریاستی سرکار نے گچی باؤلی میں ایک بڑی اراضی یونیورسٹی کے لیے الاٹ کردی۔ پہلے باؤنڈری کا کام شروع ہوا۔ اس کے بعد مختلف عمارتیں اور دفاتر۔ شمیم جیراج پوری بہت لگن کے آدمی

تھے۔ وہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں یونیورسٹی کے فروغ اوراس کی تشہیر کا کام بھی کررہے تھے۔ بھائی جان ہر سفر میں ان کے ساتھ ہوتے۔ قیام کے ابتدائی دنوں میں یونیورسٹی کوشمیم جیراج پوری صاحب، بھائی جان اور فضل الرحمٰن صاحب نے اپنے خون جگر سے سینچا۔ ان تینوں حضرات نے نہ صرف یہ کہ یونیورسٹی کے فروغ کے لیے شب و روز محنت کی بلکہ یہ یونیورسٹی ایک مثالی اور شاندار یونیورسٹی بنے اس کے لیے ممکنہ حد تک بھرپور کوشش کی۔ ان دنوں میرا بھائی جان کے پاس اکثر جانا ہوا۔ پہلے ٹولی چوکی، پھر یونیورسٹی کے کوارٹر اور اس کے بعد Avalon اپارٹمنٹ۔ یونیورسٹی کے لیے ان کی دیوانگی اور فرزانگی دیکھتے بنتی تھی۔

بھائی جان نے حیدرآباد کو وطن ثانی بنالیا تھا۔ وہاں ایک مکان خریدا، جسے بعد میں فروخت کردیا۔ پھر حیدرآباد کی شاندار سوسائٹی Avalon اپارٹمنٹ، نانل نگر میں یکے بعد دیگرے دو فلیٹ خریدے۔ جس میں وہ پرسکون زندگی بسر کررہے تھے۔

مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی سے بھائی جان کی وابستگی خوشیوں کا بہار لے کر آئی۔ وہ پرسکون آسودہ زندگی بسر کرنے لگے۔ اب ان کی دہلی والی بے اطمینانی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ شمیم جیراج پوری صاحب کے بعد دوسرے وائس چانسلر کی حیثیت سے پروفیسر اے ایم پٹھان صاحب نے 31/مارچ 2004 کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی جوائن کیا۔ پروفیسر پٹھان اعلیٰ منتظم، اصولوں کے پابند، دوراندیش اور اعلیٰ بصیرت والے انسان تھے۔ ان کے زمانے میں یونیورسٹی نے کافی تیزی سے ترقی کی۔ پٹھان صاحب، بھائی جان کے قدرداں اور ان کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ پروفیسر پٹھان نے مختلف مشکل ذمہ داریاں بھائی جان کے سپرد کیں۔ جنھیں بھائی جان نے احسن طریقے سے انجام دیا۔ پروفیسر پٹھان بھائی جان کی کارکردگی سے نہ صرف مطمئن بلکہ حد درجہ خوش تھے۔ انھیں یونیورسٹی میں ایسے ہی اساتذہ اور افسران کی ضرورت تھی۔ پروفیسر پٹھان کے بعد پروفیسر محمد میاں، مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے اور ان کے بعد محمد اسلیم پرویز صاحب نے اردو یونیورسٹی میں وائس چانسلر کی ذمہ داری سنبھالی۔ سبھوں کے ساتھ بھائی جان مل جل کر کام کرتے رہے اور اپنی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی نبھاتے رہے۔ اپنی اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے وہ یونیورسٹی کے تمام حلقوں میں حد درجہ مقبول تھے۔ سخت محنت اور جانفشانی کا انھیں انعام بھی ملا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ترقی کے منازل طے کرنے لگے۔ وہ

31/ستمبر 2004ء کو شعبۂ ترجمہ میں ریڈر بنائے گئے اور پھر پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بھائی جان شعبہ ترجمہ کے تین مرتبہ صدر، کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس کے علاوہ، اسکول آف لینگویجز، لینگوسٹک اینڈ انڈولوجی کے ڈین، اسکول آف ماس کمیونیکیشن اینڈ جرنلزم کے ڈین، ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشن کے ڈائرکٹر، شش ماہی رسالہ ''ادب وثقافت'' کے ایڈیٹر بھی بنائے گئے۔ ان عہدوں کے علاوہ بھائی جان یونیورسٹی کی مختلف پوسٹوں پر فائز رہے جن میں پراکٹر، کوآرڈینیٹر، آنریری ویجلینس آفیسر، او ایس ڈی، ڈائرکٹوریٹ آف ڈسٹنس ایجوکیشن، کوآرڈینیٹر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سٹے لائٹ کیمپس، لکھنؤ، پبلک ریلیشن آفیسر، چیف وارڈن، سیکورٹی انچارج، صدر شعبۂ ہندی، صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز وغیرہ وغیرہ۔ انھوں نے بیک وقت کئی ذمہ داریاں بھی نبھائیں۔ کسی ایک شخص کا یونیورسٹی میں اتنی زیادہ پوسٹوں پر کام کرنا واقعی حیران کن ہے۔ مگر انھوں نے خود کو یونیورسٹی کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ ان کے احساس ذمہ داری سے سبھی اعلیٰ عہدے داران اچھی طرح واقف تھے۔ اس لیے وہ بھائی جان پر حد درجہ اعتماد کرتے تھے۔ وہ یونیورسٹی کی بیشتر کمیٹی کے ممبر ہوتے اور ان کی رائے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ بھائی جان ملک کی مختلف سرکاری کمپنیوں کے نوڈل آفیسر، کنوینر، ممبر اور آبزرور رہے۔ وہ ایک شفاف ذہن کے مالک تھے۔

بھائی جان کی تین کتابیں ''نیاز حیدر شخصیت اور شاعری'' (1995)، ''پرفیسر قمر رئیس: آثار و احوال'' (2011)، سرّی ادب اور ابن صفی'' (2016) منظر عام پر آئیں۔ مختلف رسائل و جرائد میں ان کے تقریباً ایک سو مضامین شائع ہوئے۔ مختلف کتابوں میں ان کے دس ابواب شائع ہوئے۔ انھوں نے تین کتابوں کا ترجمہ کیا۔ SLM کے تحت اپنی نگرانی میں 42 کتابیں مرتب کیں۔ کئی مضامین کا ترجمہ کیا۔ انھوں نے یو جی سی کا میجر ریسرچ پروجیکٹ بھی مکمل کیا تھا۔

بھائی جان کی نگرانی میں سات اسکالرز محمد حبیب اللہ، محمد عامر بدر، محمد نظام الدین، یوسف صدیق، سید انعام الرحمٰن، محمد مظہر اور کے رحمت اللہ نے ایم فل کا مقالہ لکھا۔ جب کہ چار اسکالرز محمد حبیب اللہ، محمد عبدالواسع، محمد عتیق الرحمٰن اور سید یوسف صدیق نے پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھا اور ان تمام اسکالرز کو مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کی طرف سے ڈگریاں تفویض کی گئیں۔

بھائی جان نے مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں میں 28 لکچرز دیے۔ متعدد قومی اور بین

الاقوامی سمیناروں میں شرکت کی اور مقالے پیش کیے۔ صدارت کی ذمہ داری نبھائی۔ مختلف ورکشاپس میں شرکت کی۔ اپنی نگرانی میں انھوں نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں پندرہ قومی اور بین الاقوامی سمینار منعقد کرایا۔ ان کی نگرانی میں مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی اور سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد کے اشتراک سے ایک عظیم الشان مشاعرے کا انعقاد بھی ہوا۔

غرض یہ کہ بھائی جان اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ان کی سانسوں میں بستی تھی۔ وہ ہمہ وقت اس ادارے کے فروغ، فلاح و بہبود کے بارے میں سوچا کرتے، باتیں کرتے۔ اردو یونیورسٹی سے انھیں عشق تھا۔ اس ادارے نے بھی بھائی جان کو خوب خوب نوازا، بھائی جان نے اس ادارے کو اپنے خون جگر سے سینچا تھا۔ بنجر زمین میں پودے اُگے، پھر پیڑ بنے اور پھر چھتنار درخت بننے کا منظر ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ میں جب کبھی یونیورسٹی گیا وہ ایک ایک عمارت کو ذوق و شوق سے مجھے دکھاتے، اس کی تاریخ اور خوبی بتاتے۔ اس موقعے پر وہ بے پناہ خوشی سے سرشار ہوتے، ان کے چہرے پر مسرت کی ایک خاص چمک ہوتی۔

یہ موقع نہیں ہے کہ ان کی ادارت میں شائع ہونے والے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ششماہی رسالے ''ادب و ثقافت'' کی بے پناہ مقبولیت اور ادبی حلقوں میں حدردرجہ پذیرائی کی تفصیل لکھوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ محض چند برسوں میں اس رسالے کی جیسی مقولیت ہوئی۔ ہندوستان کے تمام ادبی حلقوں میں جس قدر ذوق وشوق سے یہ رسالہ پڑھا گیا، تمام یونیورسٹیوں کے جرنل میں جس قدر تیزی سے اس کا دائرہ وسیع ہوا اور اس رسالے نے جو سبقت حاصل کی اس پر ایک علیحدہ مضمون درکار ہے۔ اس رسالے کے تئیں بھائی جان کی غیر معمولی دلچسپی، لگن اور انہماک کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ چوں کہ وہ مسلسل مجھ سے رابطے میں رہتے تھے۔ ہر مسئلے پر مفصل گفتگو کرتے، اس لیے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ مضمون نگاروں کی فہرست بنانا ہو یا پھر رسالہ کن افراد کو بھیجنا لازمی ہے، وہ مشورہ کرتے۔ اس رسالے کو معیاری اور وقیع بنانے کی انھوں نے جی توڑ کوشش کی۔ یہ رسالہ ریفریڈ جرنل بن جائے، یو جی سی کیئر لسٹ میں یہ رسالہ شامل ہو جائے، اس سلسلے میں بھی انھوں نے کافی محنت کی اور آخر کار یہ رسالہ یو جی سی کی کیئر لسٹ میں شامل بھی ہو گیا۔ مضامین عمدہ اور وقیع ہوں، اس سلسلے میں وہ مسلسل سعی کرتے رہتے اور ممتاز ادبا سے رابطے میں رہتے، ان سے مضامین حاصل کرتے۔ دیدہ زیب اور دلکش طباعت ہو، ٹائٹل

اچھے ہوں، اس سلسلے میں ان کا خود اپنا تجربہ تھا اور ذوق بالیدہ تھا۔ اس لیے یہ رسالہ ''ادب وثقافت'' صوری ومعنوی دونوں اعتبار سے حد درجہ لائق تحسین رہا۔ اس رسالے کی ایک بڑی خوبی پابندی سے شائع ہونا، اور متعینہ وقت پر اردو حلقوں تک پہنچنا بھی رہا۔ اتنی سنجیدگی، متانت، حسن اور پابندی سے اردو کے کم ہی رسالے شائع ہوتے ہیں۔ اس لیے اس رسالے کا ادبی حلقوں میں انتظار رہتا اور اس رسالے میں نئے لکھنے والوں کے چھپنے کی ایک خواہش بھی ہوتی۔ بھائی جان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ انھوں نے ممتاز و معروف ادبا کے ساتھ ساتھ نئے قلم کاروں کے مضامین بھی شائع کیے جن سے نئے لکھنے والوں کی پذیرائی ہوئی اور انھیں حوصلہ ملا۔ یہ رسالہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا چہرہ بھی بنا۔ ہندوستان کی بیشتر یونیورسٹیوں اور ادبا کے پاس یہ رسالہ پابندی سے بھیجا جاتا، دراصل یہ رسالہ اردو یونیورسٹی کا ایک خوبصورت، بھرپور تعارف بھی ثابت ہوا۔ یہ سب کچھ ہرگز نہیں ہوتا اگر یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کا بھائی جان کو بھرپور تعاون نہیں ملا ہوتا۔ امید ہے کہ اردو کا یہ مقبول ترین یونیورسٹی کا ریفریڈ جرنل اسی پابندی سے شائع ہوتا رہے گا۔ بھائی جان نے نئی کتابوں پر تبصرے کا سلسلہ ''کتب بینی مری فطرت ہے لیکن'' شروع کیا تھا وہ بھی قائم رہے گا۔

بھائی جان نے 16/ مارچ 1998ء کو مولانا آزاد نیورسٹی جوائن کیا اور 15/ اپریل 2021 کو ان کی رحلت ہوئی۔ ابھی ان کی نوکری کے تقریباً نو سال باقی تھے۔ مجھے وہ منظر یاد ہے جب وہ 14/ مارچ 1998ء کی شام نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر اے پی ایکسپریس ٹرین سے حیدر آباد کے لیے رخصت ہو رہے تھے۔ اسٹیشن پر محمد احمد صاحب، میں اور میرے چھوٹے بھائی منصور رضا انھیں الوداع کہہ رہے تھے۔ ٹرین آہستہ آہستہ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ ہم لوگ پلیٹ فارم پر ہی بینچ پر بیٹھ گئے۔ بھائی جان کی نیکیوں اور خوبیوں کی باتیں کرتے رہے۔ ان کی کامیابی و کامرانی کے لیے دعائیں بھی کرتے رہے۔ پھر وہ مشکل، پُر درد اور افسوس ناک دن بھی آیا جب میں نے دہلی سے جا کر حیدر آباد میں ۱۶/ اپریل کی صبح انھیں سپرد خاک کیا۔ میرے چھوٹے بھائی منصور رضا بھی وطن سے آچکے تھے۔ وہ بھی تدفین میں شامل تھے۔ مٹی دینے کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کو حسرت، پریشانی، افسردگی کے ساتھ دیکھنے لگے۔ قبرستان سے آہستہ آہستہ لوگ باہر نکل رہے تھے۔ بوجھل اور بھاری قدموں کے ساتھ ہم لوگ بھی فاتحہ پڑھنے اور بھائی جان کی مغفرت کی دعا کرنے کے بعد باہر نکل آئے۔

بھائی جان کو اللہ نے بڑی خوبیوں والی، نیک وسعادت مند بیگم، مسرت جہاں کی شکل میں دی۔ اللہ نے انھیں تین بچے شبیع ظفر (پیدائش:28/دسمبر1993ء)، ثانیہ ظفر (پیدائش:6/دسمبر 1995ء) اورشبیب ظفرعُرف فرقان (پیدائش:15اپریل1999ء) عطا کیے۔ یہ لوگ حیدرآباد میں ہی مقیم ہیں۔ خاندان کے تمام افراد ان کی صحت وسلامتی، کامیابی وکامرانی کی دعائیں کرتے ہیں۔ بھائی جان نے حیدرآباد کو اپنا وطن ثانی بنالیا تھا۔ حیدرآباد کے احباب اور یونیورسٹی کے رفقا نے بھی بھائی جان کی ہمیشہ خوب خوب پذیرائی کی ۔ کسے خبر تھی کہ وہ اچانک اور ادھیڑ عمر میں اس جہان فانی سے رخصت ہو جائیں گے۔ ہماری والدہ کریم گنج گیا (بہار) کے قبرستان، والد محترم جامعہ ملیہ اسلامیہ، اوکھلا، نئی دہلی کے قبرستان اور بھائی جان کاچی گوڑہ، حیدرآباد کے قبرستان میں دفن ہیں۔ ایک دوسرے سے سینکڑوں میل دور ـــــ منشائے الٰہی سے ہم ناواقف ہیں، اس کی ہر رضا میں راضی ہیں۔ ہم سب ان کی مغفرت کی دعائیں کرتے ہیں۔ اللہ پاک انھیں اپنے جوار رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

بھائی جان سے اب کبھی ملاقات نہیں ہوگی، بات نہیں ہوگی، یہ سوچ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ وہ میرے مربّی، محسن، دوست، قدرداں، مزاج داں، دکھ سکھ کے ساتھی، ہمت وحوصلہ عطا کرنے والے انسان تھے۔ اب ان کے جیسا میری نظروں میں کوئی نہیں ہے، دور دور تک نہیں۔

یاد سے تیری دل درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

❒ **Prof. Shahzad Anjum**
Head, Department of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025
Mobil: 8800863994
Email: sanjum2@jmi.ac.in

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:67-72
Prof. Naseemuddin Farees, Aah Professor Mohd. Zafaruddin: Ab Jin ke Dekhne ko Aankhein...

نسیم الدین فریس

آہ پروفیسر محمد ظفر الدین

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

ہم جانتے ہیں کہ دنیا سرائے فانی ہے اور ہر انسان کو یہاں سے جانا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر انسان کی موت کا وقت متعین اور اٹل ہے۔ کسی کی موت متوقع اور کسی کسی کی ناگہانی ہوتی ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں وقت موعودہ پر ہی ہوتی ہے جس میں نہ ایک پل کی کمی ہوتی ہے، نہ ایک پل کی زیادتی **لایستا خرون ساعته و لا یستقدمون** ۔اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی جب ہم کسی کی وفات کو ’’بے وقت موت‘‘ کہتے ہیں یا کسی کی رحلت پر کہتے ہیں ’’ابھی مرنے کے دن نہیں تھے‘‘ تو اس کا مطلب قضاوقدر کے فیصلوں کا انکار نہیں بلکہ مرنے والے کے تئیں اپنے شدید لگاؤ اور انسیت کا اظہار ہوتا ہے۔ شاید ایسی ہی نفسیاتی کیفیت کے زیر اثر غالب نے اپنے جواں سال بھتیجے عارفؔ کی وفات پر کہا تھا ؎

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف　　کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

جب میں نے اپنے دیرینہ دوست پروفیسر محمد ظفر الدین کے سانحہ ارتحال کی خبر سنی تو رنج و ملال کی کیفیت کے ساتھ غالبؔ کا یہی شعر ذہن میں گونجنے لگا لیکن قدرے ترمیم کے ساتھ ؎

ہاں اے فلک پیر جواں تھے ظفر الدیں　　کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتے کوئی دن اور

5/اپریل 2021ء کو پیک اجل نے ظفر صاحب کی کتاب زندگانی کا آخری ورق الٹا اور انھوں نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ کسی کو ان کی موت کا یقین نہ آیا تاہم خبر مصدقہ تھی۔ یقین کرنا ہی پڑا۔ لیکن یہ صدمہ اہل خانہ اور احباب کے لیے نہایت غیر متوقع، ناگاہ اور جاں کاہ تھا۔

پروفیسر ظفر الدین سے راقم الحروف کے مہ و سال آشنائی کی مدت کم و بیش دو عشروں پر مشتمل

ہے۔مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے قیام 1998ء کے ساتھ ہی وہ یونیورسٹی کے بانی وائس چانسلر پروفیسر شمیم جیراجپوری کے ساتھ حیدرآباد آئے تھے۔ پروفیسر شمیم جیراجپوری نے محض دو عدد اراکین عملہ کے ساتھ مانو کی صورت گری کی ذمہ داری سنبھالی تھی۔ان دو عدد اراکین عملہ میں ایک پروفیسر پی۔ایف رحمٰن تھے اور دوسرے پروفیسر محمد ظفرالدین۔ یہ دونوں اس وقت پروفیسر نہیں تھے بلکہ ان کا تقرر بھی مستقل نہیں تھا۔یونیورسٹی کے دفاتر ٹولی چوکی کے علاقے میں کرائے کی عمارتوں میں قائم کیے گئے تھے، کیوں کہ سابقہ ریاست آندھرا پردیش کی حکومت نے مانو کو جو زمین الاٹ کی تھی اس پر تعمیرات کا سلسلہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔انتظامی امور کی انجام دہی کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی اور یونیورسٹی آف حیدرآباد سے کچھ اسٹاف کو ڈیپوٹیشن پر لیا گیا۔ پروفیسر سلیمان صدیقی (صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، عثمانیہ یونیورسٹی) کا مانو میں بہ حیثیت اولین رجسٹرار تقرر عمل میں آیا تو کیمپس ایجوکیشن سے قبل فاصلاتی طرز میں گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کے پروگرام شروع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔اس کے لیے ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کے ساتھ یادداشت مفاہمت کر کے کورس مٹیریل (کتابیں) حاصل کی گئیں۔ان کتابوں پر نظر ثانی اور نئی کتابوں کی تیاری کے لیے ٹرانسلیشن ڈویژن قائم کیا گیا۔ان سارے امور کی انجام دہی میں فضل صاحب اور ظفر صاحب میمنہ اور میسرہ کی طرح شیخ الجامعہ پروفیسر شمیم جیراجپوری کی مدد کرتے رہے۔ٹرانسلیشن ڈویژن کے انچارج ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال تھے۔ان کے علاوہ ڈاکٹر سید داؤد اشرف راقم الحروف اور واصف علی خاں بھی اس ڈویژن سے وابستہ تھے۔ یونیورسٹی کے دفاتر مختلف عمارتوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ لائبریری اور ٹرانسلیشن ڈویژن ایک عمارت میں تھے۔ وی۔سی آفس اور دفتر انتظامی ایک علاحدہ عمارت میں۔ فاصلاتی تعلیم کے دفاتر تیسری عمارت میں۔ان عمارتوں کے درمیان اچھا خاصا فاصلہ تھا۔ پروفیسر جیراجپوری اور پروفیسر سلیمان صدیقی ہر روز ساڑھے نو اور دس بجے کے درمیان ان دفاتر کا دورہ کرتے۔ اکثر ان کے ساتھ ظفرالدین صاحب بھی ہوا کرتے تھے۔اس طرح ظفر صاحب سے تقریباً روزانہ ہی علیک سلیک ہوا کرتی تھی۔

ظفر صاحب اپنے کیریر کے ابتدائی دنوں میں اخبار ''قومی آواز'' سے وابستہ تھے۔دہلی کے اہم صحافیوں سے ان کے تعلقات تھے۔مانو میں وہ پبلک ریلیشنز آفیسر مقرر ہوئے تو یہ صحافتی تجربہ ان کے بڑا کام آیا۔مولانا آزاد یونیورسٹی قائم تو ہوگئی لیکن خود اردو والے اس کے وجود سے ناواقف تھے۔ اردو کی

آبادیوں میں مانو کو متعارف کرانا بڑا اہم کام تھا۔اس کے لیے ہندوستان کے کئی شہروں میں جلسے منعقد کیے گئے۔جن کے ذریعے مانو کو عوام سے روشناس کروایا گیا۔ان تعارفی جلسوں کا انعقاد اور انصرام ظفرالدین صاحب کے ذمے تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ انھوں مختلف شہروں کے اکابر اردو سے رابطہ کرنے ، ان سے تعلقات استوار کرنے اور مانو کے جلسوں کے لیے ان کا تعاون حاصل کرنے کے سلسلے میں شب و روز محنت کی۔ان کی ان تھک محنت، انتظامی صلاحیت، سلیقے اور ہنرمندی کے سبب یہ جلسے نہایت کامیاب اور نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔ظفر صاحب حیدرآباد میں اجنبی تھے لیکن بہت جلد انھوں نے حیدرآباد کے علمی و ادبی حلقوں سے واقفیت حاصل کرلی، بالخصوص حیدرآباد کی جامعات کے اساتذہ کو مانو سے جوڑنے میں اہم حصہ لیا۔

مانو کے طلبا کے لیے کورس میٹریل اور امتحانی، پرچوں کی تیاری، امتحانات کے انعقاد، جوابی بیاضات کی جانچ وغیرہ میں مقامی اساتذہ کی خدمات حاصل کرنے میں بھی انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔ ظفرالدین صاحب کے مزاج میں احتیاط پسندی تھی۔ مانو کی کوئی خبر جاری کرنی ہو، کوئی نوٹیفکیشن اخبارات کو بھیجنا ہو یا کوئی اور تحریر ہو وہ مسودہ تیار کرتے اور احتیاطاً نظرثانی کے لیے ٹرانسلیشن ڈویژن روانہ کرتے۔ ہوتا یہ تھا کہ شمالی ہند اور حیدرآباد کی صحافتی زبان میں تھوڑا سا فرق ہے۔حیدرآباد میں فارسی الفاظ کا چلن اب بھی ہے جب کہ شمالی ہند کی صحافت میں یہ اتنا نمایاں نہیں ہے۔جیسے حیدرآباد میں چارج لینا کو جائزہ لینا کہتے ہیں ۔ اسی طرح نیلام کو ہراج ، جھنڈا وندن کو پرچم کشائی ، بجلی کو برقی ، میونسپل کارپوریشن کو بلدیہ، اسامی (پوسٹ) کو جایداد، اسکول کو مدرسہ اور اسکول کی ری اوپننگ کو کشادگی کہتے ہیں۔اس طرح کی لفظیات کو سمجھنے کے لیے کبھی کبھی وہ خود ٹرانسلیشن ڈویژن آتے تھے۔ان میں بات کو سمجھنے کا مادہ تھا۔وہ اپنی بات پر اڑتے نہیں تھے، معقول بات کو فوری قبول کرلیتے تھے۔

جیسے جیسے مانو کو فروغ ملتا گیا ویسے ویسے مانو کے اولین اراکین عملہ یعنی فضل صاحب اور ظفر صاحب بھی ترقی کی منازل سے ہم کنار ہوتے گئے۔ بالآخر یہ دونوں پروفیسر ہوگئے۔ظفر صاحب ٹرانسلیشن ویژن کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔جب اس ڈویژن کو شعبہ ٹرانسلیشن اسٹڈیز میں بدلا گیا تو ظفر صاحب اس شعبے کے اولین صدر شعبہ مقرر ہوگئے۔ظفر صاحب نہایت محنتی ، سلیقہ مند ذہین اور مستعد انسان تھے۔ انھوں نے مانو میں مختلف عہدوں پر خدمات انجام دیں جیسے پبلک ریلیشن آفیسر رہے، ٹرانسلیشن ڈویژن کے ڈائرکٹر رہے، صدر شعبہ اور ڈین اسکول آف لینگویجس، لنگوسٹک اینڈ انڈولوجی

رہے۔ یونیورسٹی کے پراکٹر رہے، ڈائرکٹر آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز اور سنٹر فار اردو کلچر اسٹڈیز کے ڈائرکٹر رہے۔ ہر ذمہ داری انھوں نے نہایت سنجیدگی، جفاکشی اور نظم وضبط کے ساتھ نبھائی۔ وہ کام کرنا بھی جانتے اور ساتھیوں سے کام لینے کے گُر سے بھی واقف تھے۔ وہ یونیورسٹی کے حالات ومعاملات سے پوری طرح باخبر رہتے۔ وہ جس منصب پر فائز رہے اس پر اپنی کارکردگی کی چھاپ چھوڑی۔ سنٹر فار اردو کلچر اسٹڈیز کے ترجمان رسالہ ''ادب وثقافت'' ششماہی کے معیار کو بلند کرنے کے لیے انھوں نے بڑی کوشش اور کاہش کی۔ اس رسالے کے قلمی معاونین کے ساتھ ان کے شخصی روابط تھے جس کی بدولت وہ ان سے اعلیٰ پایے کے مضامین حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے۔ انھوں نے اس رسالے کے ساتھ اتنی محنت کی کہ اس کا اندراج یو جی سی کے مسلمہ رسائل کی فہرست میں ہوگیا۔ ان کی کوشش ہوتی کہ اردو کی ہر اہم شخصیت تک یہ رسالہ پہنچے۔

انتظامی امور کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ وہ علمی وادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ سمیناروں میں اجلاسوں کی صدارت کرتے، مقالے پیش کرتے، بہ حیثیت اکسٹرنل اکزامنر مختلف جامعات میں وائی وا کے لیے بلائے جاتے۔ اپنے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے ریسرچ اسکالروں کی رہنمائی کرتے۔ غرض ان کا اکیڈمک پہلو بھی نہایت مضبوط تھا۔

ظفر صاحب نہایت سیر چشم اور مہمان نواز واقع ہوئے تھے۔ وہ کھانے اور کھلانے کے شوقین تھے۔ حیدرآباد کے تمام معیاری اور بہترین مطعموں سے وہ واقف تھے۔ کوئی بیرونی علمی وادبی شخصیت خصوصاً شعبہ اردو یا شعبہ ترجمہ سے تعلق رکھنے والی شخصیت حیدرآباد آتی تو اکثر ظفر صاحب کی پرتکلف مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتی۔ ہندوستان کی جامعات کا شاید ہی کوئی شعبہ اردو ایسا ہوگا جہاں کے کسی استاد سے ان کے تعلقات نہ رہے ہوں۔

ظفر صاحب سنجیدہ اور متین واقع ہوئے تھے لیکن خشک مزاج نہیں تھے۔ طبیعت میں شگفتگی تھی۔ زور کا قہقہہ نہیں لگاتے تھے لیکن مزاحیہ جملوں پر ہنستے ضرور تھے۔ کبھی کبھی خود بھی ظرافت آمیز فقرے کستے تھے۔ اپنے رفقائے کار کے ساتھ ان کا رویہ ہمدردانہ اور طلبا کے ساتھ مشفقانہ ہوتا تھا۔ وہ ٹھنڈے سبھاو کے انسان تھے۔ صبر وتحمل اور برداشت کے خوگر تھے۔ لوگوں کی ٹیڑھی ترچھی باتوں اور کٹ حجتی پر مشتعل نہیں ہوتے بلکہ ضبط سے کام لیتے تھے۔ وہ سکون اور ٹھہراو کے پیکر تھے۔ یہ ٹھہراو ان کی

شخصیت میں بھی تھا۔ رفتار میں بھی اور گفتار میں بھی ۔ گفتگو ہو یا تقریر وہ جذبات میں نہیں آتے تھے ہمیشہ ٹھنڈے اور ٹھہرے ہوئے لہجے اور مربوط انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔

ظفرالدین صاحب ہر کام کو منظّم اور منصوبہ بند انداز میں اور بروقت انجام دیتے تھے۔ اچھے منتظم، اچھے رفیق کار اور اچھے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اچھے شوہر، اچھے والد، اچھے بھائی اور اچھے فرزند بھی تھے۔ انھوں نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا اور ان کے مستقبل کو سنوارا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انھوں نے اپنی شریک حیات کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ ظفر صاحب سے راقم الحروف کا ایک طرح سے دوہرا تعلق تھا۔ ٹرانسلیشن ڈویژن کے حوالے سے ان سے دیرینہ دوستی تھی پھر جب سے میں شعبہ اردو مانو میں آیا ہوں تب سے ڈاکٹر مسرت جہاں (مسز ظفرالدین) شعبے میں میری کولیگ ہیں۔ اس طرح راقم کو مسٹر اینڈ مسز ظفر سے مخلصانہ روابط کا شرف حاصل ہے۔

میں یہ تو نہیں کہتا کہ پروفیسر ظفرالدین سے میں یا مجھ سے وہ بے تکلف تھے لیکن یہ ہے کہ جب بھی میں ان کے چیمبر میں جاتا یا کبھی کبھی ان کی کار میں لفٹ لیتا تو وہ دنیا بھر کے موضوعات پر بلا کسی ذہنی تحفظ کے اظہار خیال کرتے تھے۔ میں بھی ان سے بہت ساری باتیں بے جھجک کہہ دیا کرتا تھا۔ شاید ہم میں باہمی اعتماد تھا کہ غبار خاطر کا یہ انفجار چیمبر یا کار کی محدود فضا ہی میں تحلیل ہو جائے گا۔ اس کے مرغولے باہر نہیں جائیں گے۔

پتہ نہیں کس کا مصرع ہے ''اک آفتاب ڈوب گیا دوپہر کے وقت'' پروفیسر محمد ظفرالدین کی اچانک رحلت بس ایسی ہی معلوم ہوتی ہے جیسے ابھرتا ہوا سورج خط نصرت النہار پر غروب ہو جائے۔ وہ اپنی محنت، لگن، جستجو اور مستعدی سے اپنے کیریر کی بلندیوں کی طرف مائل پرواز تھے اور ان سے بڑی توقعات تھیں لیکن کاتب تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ظفر صاحب کی وفات ان کے اہل خانہ کے لیے تو ناقابل تلافی نقصان ہے ہی لیکن مانو کے لیے بھی نقصان عظیم ہے کیوں کہ مانو نے اپنے ایک متحرک، فعال اور Proactive آفیسر کو کھویا ہے۔ بہرحال ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد۔ ظفر صاحب کی یاد ہمیشہ آتی رہے گی اور جب وہ یاد آئیں گے دل یہ کہے گا۔

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

قطعہ تاریخ وفات

دوستِ دیرینہ پروفیسر محمد ظفر الدین مرحوم، ڈائرکٹر، مرکز مطالعاتِ اردو ثقافت و ڈائرکٹر، ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

نیک دل ، مخلص و حلیم و ذکی
کیا بیاں ہو فریسؔ شانِ ظفر
خویش و احباب غم میں ڈوب گئے
حسرتا! مرگِ ناگہانِ ظفر
سال فوتش بگوبہ اوج ادب
17
شاد فردوس میں ہے جانِ ظفر
2004 + 17 = 2021
ارزشِ قلم: محمد نسیم الدین فریسؔ

❒ **Prof. Naseemuddin Farees**
Dean, School of Languages Lingusitic & Indology
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 500032
Mobile: 9490784290
Email: drnaseemuddin92@gmail.com

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:73-75
Prof. Mohd. Farooq Bakhshi, Professor Zafaruddin: Yaad ke Dariche se

محمد فاروق بخشی

پروفیسر ظفرالدین: یاد کے دریچے سے

پروفیسر ظفرالدین کے یوں اچانک چلے جانے کا یقین نہیں ہوتا۔ ان کی ناگہانی رحلت کے بارے میں سوچ کر کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ انتقال سے دو روز قبل ان سے ملاقات ہوئی تھی، وبا کی وجہ سے ملاقاتوں کا سلسلہ تھم سا گیا تھا۔ مگر اس دن بینک جانا ہوا تو سوچا ظفرالدین صاحب سے بھی ملاقات کرلیں۔ میں ملاقات کے لیے جاتا تو وہ نہایت خندہ پیشانی سے استقبال کرتے اور مسکراتے ہوئے کہتے، ''آپ اس بلڈنگ میں تشریف لاتے ہیں تو ایک کے بجائے دو دو ظفر سے ملاقات ہوجاتی ہے۔'' انھیں علم تھا کہ ڈاکٹر ظفر گلزار میرے ہم وطن ہیں۔ مگر یہ بات تو خیال و خواب میں بھی نہیں تھی کہ وہ یوں ہم سب کو تنہا کر جائیں گے۔

ظفرالدین صاحب مرحوم سے میری ملاقات بہت پرانی تھی۔ وہ جب دہلی آئے تو بالکل نوجوان دبلے پتلے سانولے سلونے سے تھے۔ ماتھے کو گھیرے ہوئے ان کے گھنگھرالے بال ان کی معصومیت میں اور اضافہ کر دیتے تھے۔ ابتدا میں وہ قومی آواز میں کام کرتے تھے۔ میں قبلہ مہدی نظمی صاحب کے ہمراہ موہن چراغی مدیر قومی آواز سے ملاقات کے لیے جاتا تو ظفرالدین صاحب سے بھی ملاقات ہوتی۔ ان کی ملنساری اور ہر کام میں خوش سلیقگی اس زمانے میں بھی قابل دید تھی۔ بعد کو جیسے جیسے وہ ترقی کی منزلیں طے کرتے گئے ان کی شخصیت اور صلاحیتوں میں نکھار آتا گیا۔ ایم، اے اردو میں امتیازی نمبروں سے پاس ہونے کے بعد انھوں نے مشہور ترقی پسند دانشور اور ڈرامہ نگار بابا نیاز حیدر کے فکر و فن پر ایم فل کا مقالہ لکھنا شروع کیا۔ مشہور ترقی پسند نقاد اور دانشور پروفیسر قمر رئیس کی سرپرستی انھیں حاصل ہوچکی تھی۔ قمر رئیس صاحب کی سرپرستی اور رہنمائی میں انھوں نے پی ایچ ڈی کے لیے پریم چند کے ناولوں کے حوالے سے تحقیقی کام مکمل کیا۔ پروفیسر قمر رئیس سے ان کا تعلق بہت ذاتی نوعیت اور جذباتی قسم کا تھا جیسا ایک استاد اور شاگرد کے درمیان ہونا چاہیے۔ اس کا ثبوت انھوں نے اس وقت دیا جب انھوں نے مولانا

آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں کل ہند قمر رئیس سمینار کا انعقاد کیا۔ بعد ازاں بڑی محنت سے قمر رئیس پر لکھے گئے تمام مقالوں کو مرتب کیا اور اسے کتابی شکل میں ''پروفیسر قمر رئیس: احوال و آثار'' کے عنوان سے شائع بھی کیا۔ پروفیسر ظفر الدین ایک ہمہ جہت اور ہمہ صفات شخصیت کے مالک تھے۔ زندگی نے تجربات کی شکل میں ایک ایسا خزانہ عطا کیا تھا کہ وہ زندگی بھر اپنے تجربات کی روشنی میں اپنا سفر طے کرتے رہے۔ ان کی زندگی میں ایک اہم موڑ اس وقت آیا جب 1998ء میں ایک پارلیمانی ایکٹ کے تحت حکومت ہند نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی قائم کی اور حیدرآباد شہر کو اس کے لیے منتخب کیا گیا۔ یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر کی حیثیت سے شمیم جیراج پوری صاحب کا تقرر عمل میں آیا۔ انھیں کے ہمراہ ظفر الدین صاحب کی بھی حیدرآباد آمد ہوئی۔ وہ یونیورسٹی کے پہلے پبلک ریلیشن آفیسر کی حیثیت سے تعینات ہوئے تھے۔ ان حالات میں یہ ایک اہم عہدہ تھا جب یونیورسٹی کا صرف خاکہ وائس چانسلر کے پاس تھا لیکن ظفر الدین صاحب کی جی توڑ محنت کی بدولت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی عالمی سطح پر متعارف ہوئی۔ ان کا بائیوڈاٹا دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اتنی قلیل مدت یعنی صرف بیس برسوں میں انھوں نے یونیورسٹی کے تمام اعلیٰ عہدوں کو اپنی کارکردگی سے ممنون کیا۔ وہ شعبۂ ترجمہ میں ریڈر اور پروفیسر مقرر ہوئے اور بعد ازاں مرکز مطالعات اردو ثقافت اور ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز کے ڈائریکٹر بنے، جہاں انھوں نے اپنی سرگرمی کا خوب مظاہرہ کیا۔ کووڈ کا زمانہ تھا لہٰذا سب کچھ آن لائن ہی ہو سکتا تھا، اپنے انتقال سے چند ماہ پیشتر انھوں نے دو بڑے کل ہند سمینار منعقد کیے جن میں ہندوستان کے بہت سے قابل ذکر ادیبوں نے شرکت کی، یہ ان کے حسن انتظام کا ایک اور نمونہ تھا۔ مجھے دونوں سمیناروں میں تاکیداً شرکت پر راضی کیا اور مقالہ بھی لکھوایا یہ کہہ کر کہ آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ راجستھان میں گزرا ہے لہٰذا چہار بیت کے ساتھ انصاف بھی آپ ہی کر سکتے ہیں۔ یہ ان کی محبت تھی ورنہ میں اپنی حیثیت سمجھتا ہوں۔ ایک اجلاس کی صدارت کی ذمے داری بھی مجھے سونپی۔ دونوں سمیناروں کی کامیابی پر بہت خوش تھے اور مجھے بڑا جذباتی خط WhatsApp پر تحریر کیا۔ (السلام علیکم، آپ کے بہترین اور بصیرت افروز خطبے کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ کا اظہار خیال انتہائی دانش ورانہ تھا اور آپ کا مقالہ بھی غیر معمولی رہا۔ آپ نے شرکت کر کے ہمارے سمینار کی عزت و وقار میں اضافہ کیا۔ امید ہے کہ آئندہ بھی آپ کا تعاون ہمیں حاصل رہے گا۔) اردو طلبہ کے لیے نصابی کتابوں کی فراہمی ہمیشہ ایک مسئلہ رہی ہے۔ اس کے لیے مختلف لکھنے والوں سے تقریباً تمام موضوعات پر مضامین لکھوائے اور انھیں کتابی شکل میں شائع بھی کروایا۔ میرے ذمہ بھی دو

کتابوں کی تدوین کا کام سونپا۔ کہنے لگے آپ کا میدان ہے آپ کو ہی کرنا ہے۔ دراصل وہ لوگوں کو جوڑنا جانتے تھے، ٹیم ورک میں یقین رکھتے تھے اور اپنی ٹیم بنانے کے ہنر سے واقف بھی تھے۔

میں جب مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں جوائن کیا اور ان سے ملاقات ہوئی تو میں انھیں پہچان نہیں سکا۔ انھوں نے تیزی سے لپک کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میرے ذہن میں تو وہی دبلا پتلا سا شرمیلا نوجوان تھا۔ مگر اب وہ ایک لحیم شحیم تن وتوش کے مالک پروفیسر ظفرالدین تھے۔ میں نے معذرت چاہی تو کہنے لگے آپ کے چہرے پر بھی تو لمبی لمبی مونچھیں ہوا کرتی تھیں آپ بھی ویسے کہاں رہے۔ میں سوچنے لگا ہمیشہ کون ایک سا رہتا ہے۔ وقت کی ندی اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے جاتی ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں ان کا اور میرا کمرہ ایک ہی فلور پر تھا۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح کم گو تھے۔ مگر چائے کا وقت ہوتا تو مجھے شریک کرنا نہیں بھولتے تھے۔ پروفیسر وہاب قیصر بھی موجود ہوتے، ڈاکٹر ظفر گلزار، اسلم پرویز صاحب اور ارشد صاحب کے ساتھ چائے کا لطف لیا جاتا اور دنیا جہان کے قصے سنائے جاتے۔ وہ بے انتہا متواضع انسان تھے۔ اردو کا کوئی بھی ادیب یونیورسٹی میں آتا تو وہ اپنے گھر مدعو کرتے اور پر تکلف ضیافت کا اہتمام کرتے ایسی ایک دو دعوتوں میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملا۔ اپنے اسٹاف کے ساتھ تو ہر ماہ شہر کے کسی نہ کسی ہوٹل میں دعوت لنچ یا ڈنر کا اہتمام کرتے۔ چونکہ اس فلور پر میں اکیلا شعبۂ اردو سے متعلق تھا تو مجھے بھی مدعو کیا جاتا۔ ایک طرح سے انھوں نے مجھے اپنے شعبہ کا حصہ بنا لیا تھا۔ پروفیسر وہاب قیصر تو ہمیشہ موجود ہوتے ہی تھے۔ اب صرف یادیں ہی یادیں ہیں۔ ادب وثقافت کی مجلس ادارت میں میری شمولیت بھی انھیں کے پروپوزل پر ہوئی تھی۔

میں پانچ اپریل 2021ء کی صبح اپنی علالت کے باعث کیئر اسپتال میں تھا کہ ڈاکٹر ظفر گلزار نے روہانسی آواز میں اطلاع دی کہ پروفیسر ظفرالدین نہیں رہے۔ ذہن ماؤف ہوگیا۔ دل یقین کرنے پر آمادہ نہیں تھا مگر مرضیٔ مولیٰ۔ مرحوم نے کل چھپن برس کی عمر پائی۔ 31 اگست 1965ء کو مہاتما بدھ کی سرزمین گیا میں پیدا ہوئے تھے اور 5 اپریل 2021ء کو حیدرآباد کو اپنی آخری آرامگاہ کے لیے منتخب کرلیا۔

باقی رہے نام اللہ کا۔

❐ **Prof. Mohd. Farooq Bakhshi**
Department of Urdu
Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Mobile: 9829808782 Email: dr.farooqbakhshi@gmail.com

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:76-79
Prof. P. Fazlur Rahman, Mere Sathi Prof. Zafaruddin: Kuch yaden Kuch Baten

پی فضل الرحمٰن

میرے ساتھی پروفیسر محمد ظفر الدین: کچھ یادیں کچھ باتیں

زندگی میں انسان نہ جانے کتنے لوگوں سے ملتا ہے۔انہیں میں سے کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو انسان کی زندگی پر دیرپا نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔میرے ساتھی پروفیسر محمد ظفر الدین بھی انہیں شخصیات میں سے ہیں جو اگرچہ دنیائے فانی سے دار جاودانی کوچ کر گئے مگر ان کی رحلت پر یقین نہیں ہوتا۔اردو یونیورسٹی میں تقریباً تئیس سال تک ہم دونوں ساتھ رہے۔یونیورسٹی کے قیام سے لے کر اس کی ترقی کے منازل ایک ساتھ دیکھے مگر افسوس اب وہ نہیں رہے۔

5/ اپریل 2021 کو ساڑھے دس بجے میں نے جیسے ہی فون اٹھایا دوسری طرف سے ایک بھرّائی ہوئی آواز آئی 'میرے ابو اس دنیا میں نہیں رہے'۔ یہ فون پروفیسر محمد ظفر الدین کے بڑے صاحبزادے کا تھا۔یہ خبر میرے لیے کسی صدمہ سے کم نہ تھی۔ مجھے اس پر یقین نہیں آیا کیونکہ ان سے ایک روز پہلے ہی فون پر گفتگو ہوئی تھی جس میں انہوں نے یوں تو اپنی علالت کا ذکر کیا تھا مگر مجھے بالکل نہیں پتا تھا کہ یہ ہماری آخری گفتگو ہوگی۔خبر پر یقین دہانی کے لیے میں نے جب دیگر احباب سے رابطہ کیا تو انہوں نے اپنے غم کا اظہار کرتے ہوئے خبر کی تصدیق کر دی۔ پروفیسر محمد ظفر الدین جو میرے ہم عمر تھے اور جنہیں میں ظفر کہہ کر بلاتا تھا،ان سے دس دن قبل ہوئی ملاقات،اس درمیان ان سے کئی بار فون پر ہوئی گفتگو اور ان کے ساتھ تقریباً تئیس سالہ سفر کی یادیں میرے ذہن میں گردش کرنے لگیں۔

ظفر سے میری پہلی ملاقات 13 مارچ 1998 میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر پروفیسر شمیم جیراجپوری کی رہائش گاہ پر ہوئی تھی جب ظفر نے اسسٹنٹ پبلک ریلیشن آفیسر کی حیثیت سے یونیورسٹی میں جوائن کیا تھا۔پھر ہم دونوں نے ایک ساتھ ایک دوست بن کر تئیس سالہ لمبا سفر

طے کرلیا۔ میں نے اس عرصے میں ان کو نہایت سنجیدہ، ذہین اور محنتی پایا۔

جیسا مجھے معلوم ہے ظفر کی ابتدائی زندگی کئی پریشانیوں سے گزری تھی۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن گیا، بہار میں حاصل کرنے کے بعد روزگار اور تعلیم کے سلسلے میں جب وہ دہلی پہنچے تو انہوں نے اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے کتابت کا کام شروع کیا۔ پھر قومی آواز، نئی دہلی اخبار میں تقریباً پندرہ سال تک رپورٹنگ اور ترجمہ کا کام کرتے رہے۔ اس دوران انہوں نے اپنی تعلیم بھی جاری رکھی اور بی اے، ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی جیسی اعلیٰ تعلیم حاصل کرلی۔

ظفر نے جب اردو یونیورسٹی جوائن کیا تو ابتدائی دور میں ہم دونوں چار سال تک یونیورسٹی کے ایک ہی کمرے میں بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ اردو یونیورسٹی اپنے اس ابتدائی دور میں سبزہ کالونی، ٹولی چوکی، حیدرآباد میں کرایہ کے مکان میں واقع تھی۔ ظفر نے اپنی محنت اور کام کی بنیاد پر اردو یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر پروفیسر شمیم جیراجپوری کا اعتماد حاصل کرلیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وائس چانسلر نے ظفر کو یونیورسٹی کے بارے میں لوگوں تک معلومات فراہم کرنے کی ذمہ داری سونپی تھی۔ وائس چانسلر کی رہنمائی میں ظفر مختلف جگہوں کا سفر کرتے، محبان اردو تک اردو یونیورسٹی کے بارے میں معلومات پہنچاتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مختلف صوبوں، ضلعوں اور شہروں میں سمینار، ورکشاپ اور دیگر پروگرام کے ذریعہ عوام تک اردو یونیورسٹی کے بارے میں معلومات پہنچائی۔ بسا اوقات وائس چانسلر ظفر کے ساتھ ہوتے مگر کبھی کبھی ظفر کو پوری ذمہ داری دے دیتے تھے۔ اس سلسلے میں دہلی، لکھنؤ، اعظم گڑھ، رامپور، پٹنہ، کلکتہ، بھوپال، ممبئی، پونے جیسی جگہوں کا سفر کیا اور اردو یونیورسٹی کے اغراض و مقاصد اور خدمات کے بارے میں عوام کو بتایا۔ اس طرح یونیورسٹی کے بارے میں عوام تک معلومات پہنچانے میں ظفر نے اہم کردار ادا کیا جس کا ذکر پروفیسر شمیم جیراجپوری نے اپنی کتاب 'ابھرتے نقوش' میں بھی کیا ہے۔

اردو یونیورسٹی کا لوگو تیار کرنے کے سلسلے میں بھی ظفر پیش پیش رہے۔ جب وائس چانسلر پروفیسر شمیم جیراجپوری نے ہم دونوں کو اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے یونیورسٹی لوگو کے سلسلے میں رائے مانگی تو ایک بحث کے بعد ہم سب اس نتیجے پر پہنچے کہ لفظ 'اردو' اور 'یونیورسٹی' دونوں کے لیے انگریزی کا 'U' استعمال کیا جائے۔ پھر ہندوستانی پرچم کے تینوں رنگوں کو 'U' میں شامل کرتے ہوئے اشوک چکر کو بھی جگہ دی جائے۔ اردو، انگریزی اور ہندی تینوں زبانوں میں یونیورسٹی کا نام لوگو میں شامل کیا جائے۔ اس طرح

یونیورسٹی کا لوگو تیار کرنے میں پروفیسر شمیم جیراجپوری، میں اور میرے ساتھی ظفر شامل رہے۔

مسلم خواتین کو تعلیم کی طرف توجہ دلانے کے لیے جب پروفیسر شمیم جیراجپوری نے ظفر کو ایک نعرہ تخلیق کرنے کے لیے کہا تو درج ذیل نعرہ وجود میں آیا جسے کم تعلیم یافتہ خواتین بھی سمجھ سکتی ہیں۔

آؤ ایسا کچھ کام کریں گھر بیٹھے بی اے، بی کام کریں

وائس چانسلر کی خواہش پر ظفر نے اپنا مکان یونیورسٹی کے قریب ہی لیا تاکہ وہ یونیورسٹی جلدی پہنچ سکیں۔ روزانہ صبح نو بجے آفس آجاتے مگر واپس جانے کا کوئی وقت متعین نہیں ہوتا۔ اپنی ذمہ داری وہ پوری محنت اور لگن سے نبھاتے۔

یونیورسٹی جیسے جیسے ترقی کرنے لگی ظفر کی ذمہ داریاں مزید بڑھنے لگیں۔ 2002 میں یونیورسٹی کرایہ کے مکان سے کیمپس میں منتقل ہوئی۔ فاصلاتی تعلیم کے بعد ریگولر کورسیز بھی شروع ہونے لگے۔ 2004 میں جب شعبہ ترجمہ قائم ہوا تو ظفر اس شعبے کے بانی کی حیثیت سے جانے گئے۔ اسی شعبے میں انہوں نے چار بار صدر شعبہ کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔

ظفر ان چنندہ لوگوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے اردو یونیورسٹی کو کرایہ کے مکان، پھر صوبائی حکومت سے ملی زمین پر اس کی شروعات سے لے کر ترقی کے دور کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اسسٹنٹ پبلک ریلیشن آفیسر کی حیثیت سے انہوں نے کئی اہم پروگرام بھی منعقد کیے۔ انہوں نے اردو یونیورسٹی کے یوم تاسیس کے انعقاد کی ذمہ داری بھی بخوبی نبھائی۔ یونیورسٹی کی تاسیس کے ابتدائی ایام میں مختلف صوبوں کے گورنرس اور مشہور شخصیات کو بلانا ظفر کی کامیابی کی ضمانت تھی۔ وہ یوم مولانا آزاد کا انتظام بھی دیکھتے تھے۔ اردو یونیورسٹی کی کارکردگی اور کامیابی پر مختلف مضامین شائع کرتے رہتے تھے۔ نہ صرف اردو یونیورسٹی بلکہ ہندوستان کے اردو حلقے سے بھی ان کا کافی رابطہ رہتا تھا۔

پروفیسر محمد ظفر الدین کو جو بھی ذمہ داری دی گئی اس کو انہوں نے بخوبی نبھایا۔ پروفیسر کم ڈائرکٹر، مرکز برائے زبان، ادب وثقافت، ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم، کنٹرولر برائے امتحانات، پروکٹر، میڈیا کوآرڈی نیٹر، وجیلنس آفیسر، اعزازی ڈائرکٹر، لائبریری، کوآرڈی نیٹر لکھنؤ کیمپس، سیکیورٹی انچارج جیسے کئی اہم ذمہ داریوں اور اضافی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی نبھایا۔ یونیورسٹی کی مختلف میٹنگ، اکیڈمک کونسل، ایگزیکیوٹیو کونسل، سلیکشن کمیٹی اور ایڈوائزری کمیٹی وغیرہ میں میں ان کے ساتھ رہا جہاں میں نے دیکھا کہ وہ

اپنی بات بڑی سلیقے سے رکھتے تھے البتہ اجتماعی فیصلہ کی بھی قدر کرتے تھے۔ان کا کام کرنے کا شاید یہی وہ انداز تھا کہ اردو یونیورسٹی کے اب تک کے چاروں وائس چانسلرس کے وہ کافی قریب رہے۔

ظفر نے اردو یونیورسٹی میں ششماہی ریسرچ اور ریفریڈ جرنل 'ادب وثقافت' کو تسلسل کے ساتھ جاری رکھ کر اپنی اہم ادبی شناخت بنائی۔اس جرنل کو معیاری بنانے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہے۔یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے جب اردو کے چند منتخب میگزین کو یو جی سی کیر لسٹ میں شامل کیا تو اس میں ششماہی ریسرچ اور ریفریڈ جرنل 'ادب وثقافت' بھی شامل تھا، جس سے ظفر کی محنت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز کے سیل کاؤنٹر کی شروعات بھی ظفر کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ظفر اپنی ذاتی زندگی میں بھی ایک اچھے انسان تھے۔انہوں نے اپنی شریک حیات کو اعلیٰ تعلیم یافتہ بنانے اور ترقی کے منازل طے کرانے میں اہم کردار نبھایا۔ وہ ایک اچھے شوہر، اچھے والد اور اچھے پڑوسی بھی تھے۔گھر کا ہر کام خود کرتے تھے۔ پڑوسیوں کے حقوق کا ہمیشہ خیال رکھتے۔رشتہ داروں کی مدد سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتے۔غریب افراد کی مسلسل مالی مدد کرتے رہتے تھے۔الغرض ذاتی زندگی میں وہ ایک اچھے انسان تھے۔

وہ نہایت بااخلاق، نرم گو، پرخلوص، زندہ دل، عمیق نظر اور محنتی تھے۔ساتھ ہی وہ لذیذ کھانے اور سیر وسیاحت کے شوقین بھی تھے۔انہیں اپنے آپ پر کافی کنٹرول تھا۔ جب شوگر کی بیماری نے انہیں گرفت میں لیا تو وہ کئی سالوں تک چینی کے بغیر چائے پیتے رہے۔ وہ مثبت سوچ کے مالک تھے۔ہم نے کئی مواقع پر ایسا محسوس کیا کہ بداخلاق یا بدتمیز لوگوں سے دور رہنا ہی وہ اخلاقی طور پر بہتر سمجھتے تھے۔ بڑے بڑے مصائب کو بھی وہ اپنی مزاحیہ باتوں سے کم کردیتے تھے۔ظفر کے ساتھ گزارا ایک ایک لمحہ مجھے یاد آتا ہے۔ان کا ہنستا، مسکراتا چہرہ میری نظروں کے سامنے ابھی بھی گردش کرتا رہتا ہے۔خود کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے درمیاں وہ نہیں رہے مگر دل یقین کرنے سے صاف انکار کردیتا ہے۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

❒ **Prof. P. F. Rahman**
Director, UGC HRD Center
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 500032
Mobile: 9490105324 Email: rahmanf65@gmail.com

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:80-87
Dr. Shamsul Hoda Daryabadi, Zafar bhai ki yaad mein

شمس الہدیٰ دریابادی

ظفر بھائی کی یاد میں

وہ 17 ستمبر 2004 کی خوشگوار صبح تھی میں جالندھر سپر فاسٹ ٹرین کی ایک نشست پر بیٹھا تھا جو ہچکولے لیتی ہوئی پوری رفتار سے پٹریوں پر دوڑ رہی تھی۔ اس وقت میری نگاہیں کھڑکی سے باہر نکھری ہوئی دھوپ میں لہلہاتے ہوئے گنّے کے کھیتوں پر تھیں جب کہ خیال مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے احاطہ میں سرگرداں تھا۔ اسی دوران ٹرین کے جھٹکے سے محسوس ہوا کہ اس نے اپنی رفتار کم کر دی پھر کیا دیکھتا ہوں کہ ٹرین میرٹھ جنکشن کے پلیٹ فارم پر کھڑی ہوگئی۔ میں پلیٹ فارم سے باہر آیا، یہاں سے مجھے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی جانا تھا۔ آٹو رکشہ لینے کے لیے بڑھ ہی رہا تھا کہ نظر ایک ٹیلی فون بوتھ پر پڑی میں نے قدم اسی جانب بڑھائے، ہاتھ میں رسیور لے کر حیدرآباد کا ایک نمبر ڈائل کیا گھنٹی بجی۔

''ہیلو! السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہٗ

میرا نام شمس الہدیٰ ہے۔ کیا میں ڈاکٹر ظفرالدین صاحب سے مخاطب ہوں'

''وعلیکم السلام شمس الہدیٰ صاحب''

دوسری جانب سے آواز آئی

''اخاہ! بڑی خوشی ہوئی آپ نے فون کیا۔ پہلے تو آپ مبارکباد قبول کیجئے کہ آپ کا تقرر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بحیثیت لکچرر ہوا۔ یہ بتایئے ابھی کہاں ہیں؟ کیا مصروفیت ہے۔ شادی ہوگئی۔ بچے ہیں؟''

ایک ہی سانس میں ڈھیروں سارے سوالات پوچھنے والے پروفیسر محمد ظفرالدین سے یہ میرا پہلا رابطہ تھا جو پہلی گفتگو میں ہی میرے مکمل تعارف کے خواہش مند تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ چند سالوں کے

فرق سے ہم دونوں کا زمانہ طالب علمی ایک ہے، وہ دہلی یونیورسٹی اور میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں تھا، دہلی کے علمی وادبی پروگراموں میں ہماری ملاقاتیں یقیناً ہوتی ہوں گی۔ مگر ''گوشۂ عافیت'' والی طبیعت نے مجھے گمنامی میں رکھا۔ ہاں! پی ایچ ڈی کے تحقیقی مواد کے سلسلے میں دہلی یونیورسٹی کی لائبریری اکثر جانا ہوتا تھا مگر میں کام کر کے اپنی سیدھی راہ لیتا ورنہ یہ ممکن نہیں کہ پروفیسر شارب ردولوی و پروفیسر شمیم نکہت کے یہاں حاضری ہوا ور ظفر صاحب سے ملاقات نہ ہو کیوں کہ ان دونوں سے ظفر صاحب کا جو تعلق تھا ہم سب جانتے ہیں البتہ انھوں نے پی ایچ ڈی کا مقالہ پروفیسر قمر رئیس صاحب کی نگرانی میں مکمل کیا تھا۔

4/ اکتوبر 2004 کو جب میں باضابطہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوا تو یہاں پروفیسر ظفر الدین صاحب کی اہلیہ محترمہ ڈاکٹر مسرت جہاں سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی میری طرح اسی دن بحیثیت لکچرر شعبۂ اردو پہنچی تھیں۔ پروفیسر خالد سعید اور ہم دونوں کے ذریعہ باقاعدہ شعبہ کا آغاز ہوا۔ یہاں آنے کے بعد مجھ اجنبی کو اگر کوئی جانتا تھا تو وہ پروفیسر ظفر الدین صاحب تھے جن سے ٹیلی فون پر گفتگو کا تذکرہ آچکا ہے۔ تقرر کے روز دو پہر کو انھوں نے مجھے فون کر کے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ واضح رہے اردو یونیورسٹی اس وقت ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی۔ 1998 میں وزیر اعظم آئی کے گجرال نے پارلیمنٹ میں ایک بل کے ذریعہ یونیورسٹی کے قیام کو منظوری دی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر شمیم جیراجپوری کو حکومت ہند نے پہلا وائس چانسلر مقرر کیا۔ جس وقت وہ حیدر آباد تشریف لائے شروع دن سے ہی ظفر الدین صاحب کو اپنے ساتھ رکھا چنانچہ ابتدائی پانچ سالوں میں ریجنل سنٹر اور اسٹڈی سنٹر کے قیام نیز یونیورسٹی کے تعارف کے لیے ہندوستان کے طول وعرض میں دورانِ سفر وسیلۂ ظفر بن کر ظفر صاحب بھی وائس چانسلر کے رفیق سفر رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو کوئی اردو یونیورسٹی سے واقف تھا وہ پروفیسر ظفر الدین صاحب سے ناواقف نہیں تھا یعنی دونوں لازم وملزوم کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔

میں دو پہر ڈھائی بجے کے قریب پبلک ریلیشنز آفسر (PRO) کے دفتر پہنچا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ خوب بھرا ہوا گول چہرہ، کشادہ پیشانی، موٹی ناک، سر پر سلیقے سے نکلتی ہوئی مانگ لیے سیاہ بال، گورا رنگ، تندرست گر کسی قدر پستہ قد والا ایک دیدہ زیب اور خوش پوشاک شخص کرسی پر بیٹھا بڑے انہماک کے ساتھ فائلوں کی ورق گردانی میں مصروف ہے۔ جی ہاں! یہی ظفر الدین صاحب ہیں جو ابھی پروفیسر نہیں بلکہ ڈاکٹر ظفر الدین پبلک ریلیشنز آفسر (PRO) ہیں۔ میرے سلام کرنے پر وہ متوجہ ہوئے، گرمجوشی سے مصافحہ اور کھڑے ہو کر معانقہ کیا یہ ان سے میری پہلی ملاقات تھی۔

’’آج آپ نے تقرری حاصل کرلی......حیدرآباد کب تشریف لائے؟......‘‘

زیرلب مسکراتے ہوئے انتہائی شیریں اور نرم لہجے میں پوچھا۔

’’جی! ظفر بھائی......آج یونیورسٹی برادری کا میں بھی ایک فرد بن گیا......

یہاں میں پرسوں (حیدرآباد کا پرسوں نہیں) پہنچا ہوں۔ اچھا کس بینک میں

مجھے اپنا کھاتا کھولنا بہتر ہے‘‘

میں ان کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس وقت قدیم ممبئی شاہراہ سے دو کلو میٹر اندر خود رو جھاڑیوں، اڑتی دھول اور بکھری ہوئی چٹانوں کے درمیان اپنے تعمیری طرز اور حُسن میں اردو تہذیب کو سموئے ہوئے ایک طویل وخوبصورت سہ منزلہ عمارت بڑے وقار کے ساتھ کھڑی تھی (بلکہ ہے) جسے آج ہم ’’عمارت انتظامی‘‘ کے نام سے جانتے ہیں۔ یہی یونیورسٹی کی کل کائنات تھی۔ وائس چانسلر، رجسٹرار، ایف او، سی ای او، پی آر او سمیت تمام دفاتر، کتب خانہ، شعبۂ جات، تدریسی عملہ، طلبا و طالبات اور کمرۂ جماعت وغیرہ وغیرہ غرض ہر کسی کو سایہ اور سائبان فراہم کرنے والی یہی عمارت تھی۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ تین چار سالوں کے اندر انتہائی فعال وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان کی کوششوں سے مختلف شعبۂ جات، کتب خانہ، مہمان خانہ، دارالاقامہ، رہائش گاہ، کینٹین، اسٹیڈیم اور ہیلتھ سنٹر نیز بینک اور ڈاک خانہ وغیرہ کی متعدد عمارتیں دیکھتے ہی دیکھتے تیار ہوگئیں اور وہ دن بھی آیا کہ اردو یونیورسٹی کی سرگرمیاں اور پررونق صبح وشام کا منظر ملک بھر کے لوگوں کو بھانے لگا۔

’’شمس الہدیٰ صاحب ابھی کچھ دن ٹھہریے، میں بتاؤں گا کہ کہاں کھاتا کھولنا

مناسب رہے گا۔ اس لیے کہ دو بینکوں میں یونیورسٹی عملہ کے کھاتے موجود

ہیں......‘‘۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگے۔

’’یونیورسٹی آف حیدرآباد کے اسٹیٹ بینک میں اپنا کھاتا کھول لیجیے‘‘

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہماری اردو یونیورسٹی کے اندر انڈین اوورسیز بینک (IOB) کی شاخ آنے سے یہ مسئلہ حل ہوگیا۔ بہر حال میں اپنے ہر چھوٹے بڑے ذاتی مسائل کو ان کے سامنے رکھتا تو وہ نہ صرف مفید مشوروں سے نوازتے بلکہ حتی المقدور معاونت بھی کرتے رہتے۔ اس کی مثال میں اپنے

روزنامچے سے دیتا ہوں چنانچہ 18/اکتوبر 2004 کو صفحہ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''......ظہر کی نماز کے بعد ایم اے کے طلبا کو پڑھایا۔ظفر الدین صاحب نے آج مجھ سے کہا کہ ٹولی چوکی واقع عزیز باغ کالونی ان کے گھر مجھے چلنا ہے تاکہ آپ کے لیے کرایہ کا مکان تلاش کیا جائے۔ چنانچہ ان کے ہمراہ میں روانہ ہوا۔عصر کی نماز ہم نے مسجد میں ادا کی اس کے بعد مکان کی تلاش میں نکلے۔ یہاں حیدرآباد میں یہ رواج ہے کہ جس مکان کو کرایہ پر دینا ہوتا ہے اس پر ایک تختی Tolet لکھ کر لٹکا دیتے ہیں جس پر فون نمبر بھی درج ہوتا ہے تاکہ خواہش مند حضرات رابطہ کرسکیں۔ ہم لوگ ٹہلتے رہے اور اس طرح کے نمبر نوٹ کرتے رہے۔افطار کا وقت قریب ہو رہا تھا۔ظفر صاحب کے گھر پہنچے انھوں نے افطار اور پر تکلف کھانا کھلایا۔پھر یہ کہہ کر رخصت کیا کہ رات کو اطمینان سے تمام جگہ فون کروں گا''

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں اس وقت'' عمارت انتظامی'' (Administrative Building) کے اندر ہی یونیورسٹی سمٹی ہوئی تھی ہم اساتذہ کے کیبن اور کلاس روم تیسری منزل پر واقع تھے۔عموماً خالی اوقات میں وہاں سے اتر کر نچلی منزل ظفر بھائی کے چیمبر پہنچ جاتا کیوں کہ ان کے رویے اور برتاؤ سے خلوص اور اپنائیت ٹپکتی رہتی۔شام کو وہ ڈاکٹر مسرت جہاں کے ساتھ ٹولی چوکی واقع ''عزیز باغ'' کالونی لوٹتے اور میں بھی کسی کے ہمراہ اپنے مستقر روانہ ہو جاتا جو ظفر بھائی کی رہائش گاہ سے قریب ہی تھا۔ وقت کا پہیہ گھومتا رہا گھریلو تعلقات مزید استوار ہونے لگے جس کے دو بنیادی وجوہ تھے ایک تو ان کا اخلاق دوسرے شعبہ اردو سے ان کی بالواسطہ وابستگی۔یہی وجہ ہے کہ ان کے بچوں کے لیے میں اجنبی نہیں تھا اور نہ وہ میرے بچوں کے لیے۔ یہاں یہ کہتا چلوں کہ بڑے شہروں میں ضیافت کے لیے ریسٹورینٹ میں پارٹیوں کا اہتمام تعلقات اور سماجی حیثیت کی نشانی بن گئی ہے مگر گھروں کے باورچی خانے دعوتوں کے لیے اور دیوان خانے استقبال کے لیے استعمال کیا جانا تعلقات ہی نہیں تہذیب کی نشانی سمجھی جاتی تھی جسے موجودہ نسل بوجھ سمجھتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے کئی اسباب بلکہ مجبوری بھی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ظفر بھائی اپنے گھر پر مدعو کرتے رہتے تھے۔ایک یادگار دعوت انھوں نے 9/جنوری 2005 کو کی تھی۔اسی طرح 17/اپریل 2005 کو عشائیہ پر میں نے مدعو کیا تھا تو ظفر بھائی کہنے لگے کہ آپ کے یہاں پائے کھا کر پروفیسر شارب ردولوی کا

دسترخوان یاد آ گیا یہ تو ان کا حسنِ ظن تھا۔ظفر بھائی نے برنداون کالونی میں ایک شاندار وِلا خریدا۔ظاہر ہے ایسے مواقع پر ہر کوئی اپنے احباب کو مدعو کرکے خوشی میں برابر کا شریک کرنا چاہتا ہے۔19/مئی 2006 بروز جمعہ کا وہ دن تھا جب ظفر بھائی نے نئے وِلا میں بکرے ذبح کرائے اور بعد از جمعہ متعلقین کو کھانے پر جمع کیا عین اسی موقعہ پر میرا دہلی کا سفر تھا مگر تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی میں نے شرکت ضرور کی۔ایک مرتبہ پھر ٹھیک دس سالوں کے بعد دسویں منزل پر Avalon رہائشی ٹاور کے اپنے کشادہ فلیٹ میں مدعو کیا۔یہاں 30/جنوری 2016 بروز ہفتہ عشائیہ پر ہم جمع ہوئے۔یونیورسٹی کوارٹر سے وہ یہاں منتقل ہوگئے تھے اپنے آخری سفر پر وہ یہیں سے روانہ ہوئے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ شاید یہ بسیار خور ہے۔اسی لیے دعوتوں کی بات لے کر بیٹھ گیا۔ہاں بھئی! کیا کروں میں تو ان کے ساتھ بیتے ہوئے لمحات کو یاد کرتا رہتا ہوں۔اگر آپ بھی اس میں شریک ہوجائیں تو فبہا۔جہاں تک ان کے علم وفضل اور یونیورسٹی میں ان کی خدمات کی بات ہے اس پر بہت کچھ لکھا جائے گا بلکہ لکھا جاتا رہے گا۔ظاہر ہے دنیا آنے جانے کے لیے ہی ہے مگر جانے کے بعد بھی وہی لوگ یاد کیے جاتے ہیں جو اپنے نشانات قدم کو نمایاں کام کے ساتھ باندھ رکھا اس لیے قدم کے مٹ جانے کے بعد کام باقی رہتا ہے۔ایسے لوگوں میں ظفر بھائی بھی ہیں جن کا کام انہیں یاد کرنے کے لیے کافی ہے۔

مارچ 2008 میں ظفر بھائی شعبۂ ترجمہ میں پروفیسر بنے انھوں نے اس شعبۂ کی صدارت کی ذمہ داری کو بھی بحسن وخوبی نبھایا۔یہ خیال رہے کہ اردو یونیورسٹی میں ''ٹرانسلیشن ڈویژن'' تھا جو کہ کسی بھی ورنا کلر زبان کی یونیورسٹی کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی، سائنٹفک سوسائٹی اور دارالترجمہ اس کی مثالیں ہیں۔اسی سلسلہ کی کڑی ہماری اردو یونیورسٹی کا ٹرانسلیشن ڈویژن بھی تھا جسے 2005 میں ''شعبۂ ترجمہ''(Translation Department) میں بدل دیا گیا۔اس طرح کا شعبہ ہندوستانی جامعات میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور تھا۔اس شعبہ میں رہ کر ظفر بھائی کو کام کرنے کا خوب موقع ملا یہاں ایسے اسکالرس تیار کیے جنھوں نے تراجم کے کام کا احاطہ کیا۔تحقیق کی اور اسے منظر عام پر لے کر آئے۔اس شعبہ میں رہتے ہوئے وہ ایک عرصہ (Term) کے لیے ڈین برائے اسکول السنہ، لسانیات اور ہندوستانیات (Dean School of Languages, Linguistics & Indology) بھی رہے۔اس عہدہ پر رہتے ہوئے وہ اسکول سے وابستہ چھ شعبوں کی ترقی اور معیار کو بلند کرنے کی غرض سے متعلقہ پروفیسر حضرات، دانشوروں اور تعلیمی ماہرین کو

اسکول بورڈ کا ممبر بنا کر ان کی خدمات حاصل کیں۔تقریباً گیارہ سالوں کے بعد Directorate of Translation and Publications (DTP) نام سے جنوری 2016 میں ٹرانسلیشن ڈویژن کا احیا کیا گیا تو ظفر بھائی اس ڈائرکٹوریٹ کے پہلے ڈائرکٹر بنائے گئے۔ان کے کام کی دھن دیکھیے کہ صرف چند سالوں کے اندر مختلف علوم وفنون کی چالیس سے زائد کتابیں اردو میں شائع کیں خود اردو ادب سے متعلق تیرہ معیاری کتابیں ہیں۔ظفر بھائی بیک وقت کئی ذمہ داریاں نبھا رہے تھے۔یونیورسٹی کا ایک اہم سنٹر ''مرکز مطالعاتِ اردو ثقافت'' (Centre for Urdu Culture Studies) ہے،ظفر بھائی اس کے ڈائرکٹر بھی تھے۔اس مرکز کی ایک بیش قیمت لائبریری ہے اردو زبان،ادب اور ثقافت کے فروغ کے لیے یہاں سمینار،سمپوزیم،توسیعی خطبات اور مختلف ادبی پروگرام ہوتے رہتے ہیں بلکہ ان کے انتقال سے صرف ڈیڑھ ماہ قبل DTP اور CUCS جہاں کے وہ ڈائرکٹر تھے کے تحت دو کامیاب سمیناروں کا انعقاد عمل میں آیا۔ان کا ایک بڑا کارنامہ ''مرکز مطالعاتِ اردو ثقافت سے ایک شش ماہی مجلّہ ''ادب و ثقافت'' کا اجرا ہے جو انتہائی معیاری اور یو جی سی کیئر لسٹ جرنل میں شامل ہے جس میں ملک وبیرون ملک کے نامور ادیب وشاعر نقاد ومحقق اور اساتذہ ونمایاں اہل قلم کی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

ظفر بھائی کا ایک بڑا وصف یہ تھا کہ وہ مردم شناس تھے۔کام لینا جانتے تھے،صلاحیتوں کے اعتبار سے وہ کام کو تقسیم کرتے،اسی لیے مقررہ مدت تک کسی کام کی تکمیل کے نشانے کو وہ آسانی سے پورا کرلیا کرتے تھے۔انتہائی شیریں اور نرم گفتگو کرتے،غصہ نام کو نہیں تھا۔سخت سے سخت حالات میں بھی وہ تحمل اور بردباری کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے،ٹھہر ٹھہر کر مسکراتے ہوئے بشاس بشاس چہرے کے ساتھ گفتگو کرتے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی نگرانی میں کام کرنے والے بوجھ یا تکان محسوس نہیں کرتے۔بس کام کرتے جاتے۔یہی وہ خوبیاں تھیں جن سے ان کی انتظامی صلاحیتوں کو جلا ملی اور وہ بڑے بڑے کام کر گئے۔

ظفر بھائی ملک بھر میں سمیناروں میں بھی بلائے جاتے،کبھی مقالہ پڑھنے کے لیے تو کبھی کلیدی خطبہ پیش کرنے کے لیے۔کہیں مہمانِ خصوصی کے طور پر تو کہیں اجلاس کی صدارت کے لیے۔کئی سمیناروں میں میرا بھی ان کا ساتھ رہا ہے۔ایک سمینا بڑا یادگار تھا جو 2،3 اور 4 دسمبر 2018 کو لکھنؤ میں منعقد ہوا۔استادِ محترم پروفیسر شارب ردولوی کی خدمات کو اجاگر کرنے کے لیے ہم شاگردانِ شارب نے اس کا اہتمام کیا تھا۔ہندوستان بھر سے پروفیسر شارب صاحب کے شاگرد جمع تھے۔تمام نے مقالے پڑھے،کلیدی خطبہ پیش کرنے کے لیے ظاہر ہے شارب صاحب کے سینئر شاگرد پروفیسر ظفر الدین

صاحب سے زیادہ کون مناسب تھا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے کانفرنس حال میں سابق وزیر عمار رضوی، جرمنی کے ادیب عارف نقوی اور گورنر اتر پردیش رام نائک وغیرہ کی موجودگی میں انھوں نے سمینار کے تعلق سے کلیدی خطبہ پیش کیا جو بڑا یادگار تھا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں انتقال سے ڈیڑھ ماہ قبل ظفر بھائی نے فروری کے وسط میں دو سمیناروں کا انعقاد کیا تا ان میں ایک سمینار 15 اور 16 فروری 2021 کو ’’اردو زبان کے تہذیبی وثقافتی ادارے‘‘ عنوان سے تھا، اس کے کنوینر ’’مرکز مطالعاتِ اردو ثقافت‘‘ کے اسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر احمد خان تھے انھوں نے مقالہ پڑھنے کے لیے مجھ سے بھی کہا۔ میں نے اپنے لیے مقالہ کا عنوان ’’بھوج پوری بولی اور اس کے گیت‘‘ طے کیا۔ ظفر بھائی کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے کہا:

’’شمس الہدیٰ صاحب آپ کو بھوج پوری گیت سنانے ہوں گے‘‘

15 /فروری کی شام پروفیسر بیگ احساس کے کلیدی خطبہ کے بعد میڈیا سنٹر میں چائے پیتے ہوئے ظفر بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’ہاں! ہاں! کیوں نہیں......‘‘

ظفر بھائی کے چہرے کو دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔

’’ضرور سناؤں گا‘‘۔

اور میں نے بڑی محنت سے گیت گاتے ہوئے مشرقی اتر پردیش کی چند خواتین کی آڈیو ریکارڈ کی، جب میں نے مقالہ پڑھا تو اس کے آخر میں اس آڈیو کلپ کا کچھ حصہ سنایا، آن لائن منسلک مقالہ نگاران بھی اس سے محظوظ ہوئے۔ اس سیشن کے صدارتی پینل میں ظفر صاحب بھی تھے۔ یہ میرے لیے بڑے اچنبھے اور حوصلہ افزائی کی بات تھی جب انھوں نے اپنے تبصرہ میں مقالہ کی حد سے زیادہ تعریف کی۔ افسوس! صد افسوس!! کہاں پتہ تھا کہ یہ ان کی آخری نشست ہے جسے میں سن اور دیکھ رہا ہوں جب کہ ان کی آخری شرکت 18/ مارچ 2021 کو حسینی علم ڈگری کالج کے ایک سمینار کی تھی جس میں میری شرکت نہیں ہو سکی ورنہ ان سے ملاقات ہو جاتی۔ اس کے بعد دو ہفتے تک ظفر بھائی اس فانی دنیا میں رہے۔ سارے کام معمول کے مطابق ہو رہے تھے کوئی ایسی اطلاع بھی نہیں تھی کہ بیمار ہیں۔ 5/ اپریل پیر کے دن ان کا انتقال ہوا اس سے قبل کے تین دن تعطیل کے تھے چنانچہ وہ یکم اپریل کو یونیورسٹی آئے بھی، بہر حال تقدیر کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔

5/اپریل کی صبح میں شعبہ میں تھا کہ اچانک کسی کام سے ٹولی چوکی روانہ ہوا، راستے میں ڈاکٹر بی بی رضا خاتون نے فون پر بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ ظفر صاحب کے بارے میں کچھ خبر ہے۔ ان دنوں روزانہ ایک نہیں کئی کئی اندوہ ناک خبریں سننے کو مل رہی تھیں اس لیے میں نے بھی دل تھام کر پوچھا بتایئے بتایئے! کیا خبر ہے۔

''ظفر بھائی اب اس دنیا میں نہیں رہے!!''

فون منقطع ہو گیا۔ دس بج کر بیس منٹ پر وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ میں ایک دم سکتہ میں آ گیا کہ یا اللہ یہ کیا ہوا۔ ذہن اس بات کو قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے پھر یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑا کہ موت برحق ہے اور قادر مطلق کے سامنے کس کی چلی ہے کہ چلے گی۔ بیٹا محمد سلمان کار چلا رہا تھا کہا فوراً Avelon چلو۔ وہاں پہنچا تو دیکھا یونیورسٹی اور شہر کے احباب جمع ہیں۔ ظفر بھائی (اب مرحوم کہنا پڑ رہا ہے) پر نظر ڈالی جو آنکھ بند کیے ابدی نیند سو رہے تھے سرہانے ڈاکٹر مسرت جہاں گم سم بیٹھی بس ٹکٹکی باندھے اپنے رفیق سفر کو دیکھ رہی تھیں جو انھیں چھوڑ کر تنہا روانہ ہو گیا۔ کچھ دوری پر شبیع اور فرقان بیٹھے تھے ان کے پاس گیا اور تسلی کے کچھ کلمات کہے۔ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ بیٹی ثانیہ قطر میں تھی، اطلاع دی گئی کہ رات میں تدفین ہو گی مگر بعد میں یہ طے پایا کہ فجر کے بعد نماز جنازہ ادا کی جائے گی کیوں کہ قطر سے ثانیہ اپنے والد مرحوم کے آخری دیدار کے لیے پہنچ رہی ہے۔ علی الصبح میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ اسی وقت جنازہ کندھوں پر آ گیا میں بھی کندھا دینے والوں میں شامل ہو کر قریب کی مسجد قبا پہنچا۔ فجر کے نماز کے بعد امام مسجد نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ رہائش گاہ سے بہت دور ایک قبرستان میں جگہ ملی جہاں انھیں سپردِ خاک کیا گیا۔

❒ **Dr. Shamshul Hoda Daryabadi**
Associate Professor
Department of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad - 500032
Mobile: 9032520784
Email: drhodamanuu@gmail.com

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:88-97
Dr. Syed Mahmood Kazmi, Zafar Saheb: Mere Bhai Mere Dost

سید محمود کاظمی

ظفر صاحب: میرے بھائی میرے دوست

جولائی 2004ء کی کوئی تاریخ تھی، میں دفتر سے واپس آیا (واضح رہے کہ اس وقت میں اردو مترجم کی حیثیت سے اپنے شہر الہ آباد میں ہی ملازمت کر رہا تھا)، اخبار دیکھا تو حیدر آباد میں کچھ ہی عرصہ قبل قائم اردو یونیورسٹی کا اعلامیہ برائے ملازمت شائع ہوا تھا۔ یونیورسٹی کے ٹرانسلیشن ڈویژن میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی پوسٹ کے لیے امیدواروں سے درخواستیں طلب کی گئی تھیں۔ شعبہ اردو میں بھی لکچرر کی دو آسامیاں مشتہر ہوئی تھیں۔ 2003ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے مجھے اردو میں پی ایچ ڈی ایوارڈ ہو چکی تھی، اس لیے میں نے دونوں کے لیے درخواست بھیج دی اور انٹرویو کے لیے بلاوے کا انتظار کرنے لگا۔ شعبہ اردو کی پوسٹ کے لیے تو مجھے کال نہیں کیا گیا، جس پر مجھے آج بھی حیرت ہے لیکن ٹرانسلیشن ڈویژن کی پوسٹ کے لیے مجھے بلا لیا گیا۔ انٹرویو 10 ستمبر کو تھا، میں نے فوراً ریزرویشن کرایا اور رخت سفر باندھ لیا۔ پہلی بار حیدر آباد کا سفر کرنا تھا، چار مینار اور سالار جنگ میوزیم دیکھنے کی خواہش اور یونیورسٹی میں ملازمت کی امید لے کر میں اپنے ایک دوست کے ساتھ تن بہ تقدیر گھر سے نکل پڑا۔ یونیورسٹی کیا حیدر آباد میں بھی کسی کو نہیں جانتا تھا، حسن اتفاق سے میرے ایک دوست پرواز العلوم، پروفیسر شاہد پرویز سابق ڈائرکٹر مانو ریجنل سینٹر دہلی کے عزیز تھے۔ ان سے فون نمبر لے کر شاہد صاحب کو فون کیا، انہوں نے خاصی حوصلہ افزائی کی اور مجھے مشورہ دیا کہ میں حیدر آباد ضرور جاؤں۔ جانے میں دو دن باقی تھے کہ استاذ پروفیسر علی احمد فاطمی سے ملاقات ہوئی، میں نے انہیں بتایا کہ میں اردو یونیورسٹی جا رہا ہوں، انہوں نے کہا کہ ”دو لوگوں سے ضرور ملاقات کرنا ایک نصرت محی الدین (مخدوم محی الدین کے صاحبزادے) اور دوسرے ڈاکٹر ظفر الدین۔ ظفر الدین تو تمہیں یونیورسٹی میں ہی مل جائیں گے، نصرت

محی الدین کا فون نمبر میں تمہیں دے رہا ہوں۔''

حیدرآباد اسی دن صبح پہنچا جس دن سہ پہر کو انٹرویو تھا۔اسٹیشن کے قریب ہی ایک ہوٹل میں کمرہ لے کر سامان رکھا اور یونیورسٹی کی طرف چل پڑا۔ وقت بہت کم رہ گیا تھا لہٰذا نہ نصرت صاحب کو فون کیا اور نہ ظفر صاحب سے ہی ملنے کی سعی کی۔ جب انٹرویو ختم ہوگیا تو خیال آیا کہ ظفر صاحب سے تو ملاقات کر ہی لی جائے لیکن دفتر بند ہونے کا وقت ہوگیا تھا اس لیے ان سے ملاقات کی امید کم ہی تھی۔ بہرحال وائس چانسلر آفس سے نیچے آیا تو دیکھا کہ سناٹا ہے اور زیادہ تر لوگ جا چکے ہیں۔ میں بھی باہر نکل ہی رہا تھا کہ سامنے سے ایک صاحب مجھے اپنی طرف آتے نظر آئے، قریب آتے ہی انہوں نے کہا ''ارے بھائی میں آپ کی ہی تلاش میں تھا، مجھے ظفر الدین کہتے ہیں۔ فاطمی صاحب نے مجھے فون کرکے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔'' یہ باتیں انہوں نے انتہائی سادگی سے کہیں، لہجے میں بڑی اپنائیت تھی۔ حالانکہ یہ ہماری پہلی ہی ملاقات تھی لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہم دونوں بہت دنوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ ''انٹرویو کیسا رہا؟'' انہوں نے پوچھا۔ ''اچھا رہا'' میں نے جواب دیا۔ ''آیئے چائے پیتے ہیں''۔ انہوں نے چائے منگوائی، اس دوران ان سے گفتگو ہوتی رہی جو کچھ اردو یونیورسٹی اور کچھ میرے متعلق تھی۔ ان سے اس پہلی ملاقات کا مجموعی تاثر یہ تھا کہ وہ کسی قدر کم گو ضرور ہیں، شاید قدرے محتاط بھی لیکن آدمی اچھے ہیں۔ مجھے اگلے ہی دن رات کی ٹرین سے واپس جانا تھا اور میرا تقرر نہ ہونے کی صورت میں میری ان سے یہ آخری ملاقات ہوسکتی تھی، اس لیے میں نے ان سے کہا ''کبھی الہ آباد آنا ہو تو مجھے ضرور اطلاع کیجیے گا۔'' وہ مسکرائے لیکن کچھ کہا نہیں اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اگلے دن میں چار مینار اور سالار جنگ میوزیم دیکھ کر جب واپس ہوٹل پہنچا تو موبائل پر ان کا پیغام دیکھا، ''خدا کرے آپ کا سفر بخیر وخوبی گزرے، گھر پہنچ کر خیریت کا فون ضرور کیجیے گا۔'' میں گھر پہنچ کر دوسری الجھنوں میں گرفتار ہوگیا اور انہیں فون نہ کرسکا۔ تین دنوں بعد ان کا فون آیا ''حضور آپ تو بھول ہی گئے۔'' یہ ان کا مخصوص انداز تھا، میں شرمندہ ہوگیا اور فون نہ کرنے پر ان سے معذرت طلب کی۔ ''کوئی بات نہیں اپنا خیال رکھیے۔'' انہوں نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا۔

ستمبر 2004ء کے تیسرے ہفتے میں مجھے یونیورسٹی کی طرف سے یہ اطلاع دی گئی کہ ایک ماہ کے اندر آکر جوائن کرلوں۔ اب مجھے سنجیدگی سے سوچنا تھا کہ موجودہ ملازمت برقرار رکھوں یا حیدرآباد جا کر نئی ملازمت اختیار کروں۔ اپنا گھر اور شہر چھوڑ کر جانا اتنا آسان نہیں تھا لیکن ایک بہتر مستقبل کی امید نے جس

طرح پہلی مرتبہ حیدرآباد جانے پر آمادہ کیا تھا،اب اس تعلق سے ایک یقینی صورت حال نے پھر رخت سفر باندھ دیا۔گھر والوں سے مشورہ کیا اور کافی بحث وتمحیص کے بعد یہ طے ہوا کہ موجودہ ملازمت سے عارضی رخصت کے تحت حیدرآباد جا کر یونیورسٹی جوائن کرلوں اور اگر وہاں زیادہ قیام ممکن نہ ہوسکے تو پھر واپس آجاؤں۔جب گھر سے اجازت مل گئی تو میں نے ظفر صاحب کو فون کیا''مبارک ہو''انہوں نے فون ریسیو کرتے ہی مبارک باد دی۔''میں فون کرنے ہی والا تھا کہ آپ کا فون آگیا۔''میں نے کہا''میں تیس ستمبر تک حیدرآباد پہنچ جاؤں گا،اب دیکھیے وہاں کیا صورت بنتی ہے؟''میرے لب ولہجے سے انہیں محسوس ہوا کہ میں پریشان ہوں تو انہوں نے کہا'' آپ بغیر کسی تردد کے فوراً چلے آئیں،انشااللہ سب انتظام ہوجائے گا۔'' میں مزید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ انہوں نے فون رکھ دیا۔مجھے اندازہ ہوا کہ وہ غیر ضروری گفتگو کرنے کے قائل نہیں تھے اور محض چند جملوں میں اپنی بات کہہ کر خاموش ہوجاتے تھے۔شاید انہیں محسوس ہوا کہ میں کچھ اور کہنا چاہ رہا تھا،اس لیے انہوں نے مجھے دوبارہ کال کیا۔''آپ کچھ کہہ رہے تھے؟''میں نے کہا''جی ہاں! مجھے پریشانی اس بات کی ہے کہ فوری طور پر تو مجھے مکان ملے گا نہیں،تو وہاں قیام کی کیا صورت ہوگی؟''ظفر صاحب نے انتہائی پرسکون لہجے میں جواب دیا۔''ہفتے دس دن کے لیے آپ یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں رہ سکتے ہیں،اس دوران یونیورسٹی کے قریب ہی کوئی مکان کرائے پر لے لیا جائے گا۔''

یکم اکتوبر 2004ء کو میں نے یونیورسٹی کے ٹرانسلیشن ڈویژن میں بحیثیت اسسٹنٹ ڈائرکٹر جوائن کرلیا۔ یہ ایک نان ٹیچنگ اکیڈمک پوسٹ تھی۔اس وقت ٹرانسلیشن ڈویژن میں دو اسسٹنٹ ڈائرکٹرز اور دو لکچررز کا تقرر ہوا تھا۔ظفر صاحب اس وقت تک یونیورسٹی کے پبلک ریلیشن آفیسر کے طور پر کام کررہے تھے اور ہم لوگوں کے ساتھ ہی ٹرانسلیشن ڈویژن میں بحیثیت ریڈر اور ڈویژن انچارج ان کا تقرر ہوا تھا۔چونکہ کم گوئی کے باوجود انہوں نے اپنی شرافت اور نیک نفسی کے سبب مجھے بے حد متاثر کیا تھا اس لیے اس بات کی مجھے بہت خوشی تھی کہ اب ہم دونوں ایک دوسرے کے رفیق کار بھی تھے۔حیدرآباد میرے لیے ایک نیا شہر تھا اس لیے مختلف معاملات میں مجھے قدم قدم پر ظفر صاحب کے مشوروں کی ضرورت پڑتی تھی اور وہ انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ میری رہنمائی بھی کرتے تھے اور مدد بھی۔ ایسے ان گنت واقعات ہیں کہ جب میں نے انہیں فون کیا اور وہ فوراً آئے۔ضرورت کا سامان کہاں سے خریدنا ہے،کرائے کا مکان کس جگہ ہو اور اس کا مناسب کرایہ کتنا ہونا چاہیے،کس بینک میں اکاؤنٹ کھولنا

مناسب ہوگا، کھانے کے لیے فی الحال کسی قریبی ٹفن پرووائڈر کی مدد لینی چاہیے یا اس کے لیے کوئی ملازم یا ملازمہ رکھ لی جائے۔ یہ سب وہ ابتدائی مسائل تھے جو کسی بھی شہر میں کسی نو وارد کو درپیش ہوتے ہیں۔ میرے ایسے ہی کتنے مسائل ظفر صاحب کے مشوروں اور مدد سے اس قدر آسانی کے ساتھ حل ہوئے کہ مجھے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ میں ایک نئے شہر میں ہوں۔ میں یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں چند دنوں قیام کے بعد کرائے پر ایک مکان تلاش کر رہا تھا، ظفر صاحب نے مجھے ایسے کئی لوگوں سے ملوایا جو اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے تھے۔ ایک دن کافی دیر مکان کی تلاش میں سرگرداں رہنے کے بعد جب یونیورسٹی کیمپس کی طرف لوٹنے لگا تو بارش ہونے لگی۔ بارش شدید تھی، میں اور میرے ساتھ یونیورسٹی کا ایک سکیورٹی گارڈ، دونوں آٹو رکشہ میں تھے جس کی وجہ سے کپڑے خاصے بھیگ گئے۔ دفتر پہنچا تو ظفر صاحب نے دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے کہا ''اچھا بارش میں تلاش آشیانہ؛ خیر فوراً گیسٹ ہاؤس جا کر کپڑے تبدیل کیجیے، آپ پوری طرح بھیگ گئے ہیں اور یہ نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔'' میں لباس تبدیل کر کے ابھی بیٹھا ہی تھا کہ وہ کمرے میں داخل ہوئے، یونیورسٹی کینٹین کا ملازم لڑکا چائے اور بسکٹ لیے ہوئے ان کے ہمراہ تھا۔ ''لیجیے چائے پیجیے، ہم دونوں نے ساتھ ہی چائے پی اور وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے کہ کوئی ضرورت ہو تو میں انہیں بلا تکلف فون کروں۔ دو دنوں کے بعد مجھے کرائے کا مکان مل گیا لیکن بارش کے پانی نے اپنا رنگ دکھایا اور مجھے بخار آ گیا۔ ظفر صاحب مجھے ڈاکٹر مستان علی کے پاس لے گئے جو وہیں قریب ہی مطب کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب حیدرآبادی تہذیب و شرافت کا مکمل نمونہ تھے، بے حد خوش مزاج اور خوش گفتار۔ اہل حیدرآباد ''بتانا'' بمعنی ''دکھانا'' بولتے ہیں، ڈاکٹر صاحب کہنے لگے ''زبان بتایئے۔'' میں نے کہا ''اردو''۔ ڈاکٹر صاحب ہنسنے لگے، کہا ''اچھا آپ شمال سے تعلق رکھتے ہیں۔'' ظفر صاحب نے برجستگی سے کہا ''لیکن اب مائل بہ جنوب ہیں۔''

ظفر صاحب سے قربت بڑھتی گئی اور ہم ایک دوسرے سے بے تکلفانہ گفتگو کرنے لگے لیکن لحاظ وخیال کی ایک دیوار ہمیشہ ہمارے درمیان موجود رہی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ انہوں نے مجھے کبھی ''تم'' کہہ کر مخاطب کیا ہو اور میں نے بھی ہمیشہ ان کے ساتھ ادب واحترام کا وہی رویہ رکھا جو ایک چھوٹے بھائی کو اپنے بڑے بھائی کے لیے رکھنا چاہیے۔ ہمارے درمیان شاید ہی کبھی کوئی تلخی پیدا ہوئی ہو، اختلاف رائے بیشک ہوا کرتا تھا لیکن ذاتی تعلقات اس سے کبھی متاثر نہیں ہوتے تھے۔ ٹرانسلیشن ڈویژن جب شعبۂ ترجمہ میں تبدیل ہوا تو پہلے مطالعات ترجمہ میں دوسالہ پی جی کورس اور بعدازاں ایم فل اور پی ایچ

ڈی کا آغاز ہوا۔ان تمام مواقع پر ظفر صاحب نے مجھ سمیت شعبہ کے دوسرے تمام اساتذہ کے مشوروں کو ہر حال میں اہمیت دی اور سبھی کام باہمی رضامندی سے ہی انجام پائے۔

جب یونیورسٹی کے کیمپس میں تدریسی اور غیر تدریسی عملے کی رہائش کے لیے مکانات تعمیر ہو گئے تو کم و بیش وہ تمام لوگ جو حیدرآباد سے تعلق نہیں رکھتے تھے،انہوں نے کیمپس میں رہائش اختیار کر لی۔ ظفر صاحب اس وقت باہر رہتے تھے لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ بھی ہم سب کے ساتھ رہنے آ گئے۔کیمپس میں ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے اب دفتر کے اوقات کے علاوہ بھی ملاقاتیں ہونے لگیں اور ہم سب ایک خاندان کی طرح ہو گئے۔ظفر صاحب چونکہ طبعاً بڑے مہماں نواز اور مزاجاً بڑے خلیق تھے اس لیے وہ اکثر اہل کیمپس کی دعوتیں بھی کیا کرتے تھے۔ہم سب ایک جگہ جمع ہوتے اور اچھا خاصا جشن کا سا ماحول ہو جاتا۔ظفر صاحب،ان کی اہلیہ ڈاکٹر مسرت جہاں اور ان کے بچے متبسم چہروں کے ساتھ ہر آنے والے کا استقبال کرتے اور دیر رات تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔کئی سال حیدرآباد میں رہنے کی وجہ سے ظفر صاحب اور میرے تعلقات یونیورسٹی کے حیدرآبادی رفقائے کار کے علاوہ بہت سے مقامی خاندانوں سے بھی ہو گئے تھے۔اکثر و بیشتر ایسا ہوتا کہ شادی بیاہ کے موقعوں پر ہم ایک ہی جگہ مدعو ہوتے۔ہم دونوں ہی اچھے کھانوں کے شوقین تھے اور پھر حیدرآباد کی پر تکلف دعوتوں کا تو کہنا ہی کیا۔جیسے ہی کوئی دعوت نامہ موصول ہوتا،ان کا فون آ جاتا ''کیا فلاں جگہ آپ بھی مدعو ہیں؟'' وہ بڑے ہی پر لطف لہجے میں پوچھتے۔میں جواب دیتا ''جی ہاں مجھے بھی بلایا گیا ہے۔'' یہ سنتے ہی ان کی رگ ظرافت پھڑک اٹھتی ''تب تو آپ ضرور جائیں گے،خیر ناشتہ ذرا ہلکا کیجیے گا۔'' ظفر صاحب کی حس مزاح ایسے موقعوں پر ہمیشہ جاگ اٹھتی تھی اور وہ بڑی ہی متانت کے ساتھ جملے چست کرتے تھے۔ایک شادی میں ہم دونوں ایک ہی میز پر مصروف طعام و کلام تھے کہ انہوں نے آہستہ سے مجھے اپنے بازو میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب کی طرف متوجہ کیا جن کی پلیٹ کے ایک گوشے میں ہڈیوں کا اہرام بڑی تیزی سے تعمیر ہو رہا تھا۔وہ صاحب کافی دیر سے بشمول ہمارے دیگر شرکائے طعام کے صبر و ضبط کا امتحان لے رہے تھے۔جیسے ہی سالن کی کوئی قاب میز کی جانب آتی ہوئی نظر آتی وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر اسے بیرے سے لے لیتے اور پھر اس کا بڑا حصہ اپنی پلیٹ میں منتقل کرنے کے بعد ہی دوسروں کے حوالے کرتے۔یہ سلسلہ کافی دیر سے جاری تھا، ظفر صاحب نے مجھ سے بڑی ہی آہستگی سے کہا'' کچھ کیجیے کاظمی صاحب۔'' یہ سنتے ہی میں نے سامنے رکھی ہوئی وہ قاب اٹھائی جس میں موجود قورمے کا بیشتر حصہ وہ صاحب پہلے ہی اپنے تصرف میں لا چکے

تھے،اور اسے ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا’’حضرت یوں تو کسی کی پلیٹ کی طرف دیکھنا انتہائی بے ادبی ہے لیکن میں بہت دیر سے یہ محسوس کررہا ہوں کہ آپ کھانے کے سلسلے میں انصاف سے کام نہیں لے رہے ہیں، کچھ اور لیجیے۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ وار خالی نہ جائے گا اور وہ صاحب شرمندہ ہوں گے مگر وہ حضرت بھی بلا کے ڈھیٹ نکلے،انہوں نے مسکراتے ہوئے میرا شکریہ ادا کیا اور باقی ماندہ بوٹیاں بھی اپنی پلیٹ کے حوالے کردیں۔ میں نے انتہائی بے بسی سے ظفر صاحب کی طرف دیکھا تو انہوں نے صرف اتنا کہا’’صبر کیجیے۔‘‘بعد میں کئی دنوں تک ہم دونوں اس واقعے کو یاد کر کے ہنستے رہے۔

ظفر صاحب کا ادبی ذوق بے حد نکھرا ہوا تھا،وہ زبان وادب کے اچھے طالب علم رہے تھے اور بے حد معیاری ودل نشیں گفتگو کرتے تھے۔ میں نے ان کی زبان سے کبھی نازیبا اور تہذیب سے گرے ہوئے الفاظ نہیں سنے۔کئی بار ایسا ہوا کہ بعض دفتری معاملات میں انہیں کسی سے کوئی شکایت ہوئی لیکن اس کے اظہار میں ان کا لہجہ ہمیشہ معتدل ہی رہا اور یہ ایک بڑی خوبی ہے ۔ جہاں تک ان کی ادبی سرگرمیوں کا سوال ہے وہ اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکے۔ چونکہ وہ یونیورسٹی کے انتظامی امور میں اپنی ملازمت کے ابتدائی دنوں سے ہی شریک رہے اس لیے ان کی اس مصروفیت نے ان کی ادبی سرگرمیوں کو بڑی حد تک متاثر کیا اور اس کا احساس بھی انہیں ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کئی بار کہا ’’کاظمی صاحب! پڑھنے لکھنے کا وقت نہیں ملتا ،بہت سے مضامین ادھورے پڑے ہیں۔‘‘ میں نے کہا ’’کچھ وقت نکالیے‘‘، انہوں نے کہا’’دیکھیے کوشش کرتا ہوں۔‘‘ لیکن انہیں اس کا وقت نہیں ملا۔ان کی انتظامی مصروفیات اسی طرح ان کی علمی وادبی سرگرمیوں کا راستہ روکتی رہیں چونکہ انہیں خود بھی اس کا احساس تھا اس لیے انہیں جب بھی موقع ملتا وہ اردو زبان وادب اور ترجمہ نگاری کے تعلق سے منعقد کیے جانے والے سمیناروں،کانفرنسوں،سمپوزیموں اور مذاکروں میں ضرور شرکت کیا کرتے تھے۔اس طرح انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنا رشتہ ان ادبی سرگرمیوں سے برقرار رکھا تھا۔اردو یونیورسٹی میں بھی یونیورسٹی یا پھر شعبۂ ترجمہ کے تحت انہوں نے اس طرح کے کئی پروگرام کیے جو بے حد کامیاب ثابت ہوئے۔اسی سلسلے کی ایک کڑی’’پروفیسر قمر رئیس : حیات وخدمات‘‘ کے عنوان سے کیا جانے والا وہ یک روزہ قومی سمینار بھی تھا جس کا انعقاد 5 نومبر 2009 کو شعبہ ترجمہ کے تحت کیا گیا تھا اور جس کے کنوینر ظفر صاحب تھے۔ یہ سمینار انتہائی کامیاب رہا تھا،ظفر صاحب نے اس سمینار میں پڑھے گئے تمام مقالات کو بے حد دیدہ زیب طریقے سے’’قمر رئیس :احوال وآثار‘‘ کے زیر عنوان شائع کیا۔اس کے ساتھ ہی انہوں نے

''قمر رئیس کی ترجمہ نگاری'' کے عنوان سے ایک مقالہ بھی تحریر کیا جو اس کتاب میں شامل ہے۔ظفر صاحب قمر رئیس کی ترجمہ نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''ان کے ترجمے میں سلاست ،روانی اور شعریت بھر پور طور پر دیکھنے کو ملتی ہے۔کہیں بھی جھول پا سکنے والی کیفیت نظر نہیں آتی........یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم شعری تخلیق پڑھ رہے ہیں،جس میں شعری محاسن کے ساتھ ساتھ معنویت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔'' 1

ظفر صاحب کا ایک اور علمی کارنامہ ایم فل کے لیے لکھا گیا وہ مقالہ ہے جو انہوں نے دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر قمر رئیس کی نگرانی میں مشہور ترقی پسند شاعر نیاز حیدر کے فن اور شخصیت پر لکھا تھا۔اس حقیقت کا اعتراف ناگزیر ہے کہ ان کی یہ کتاب نیاز حیدر پر ایک اہم حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔نیاز حیدر جیسے بے حد ذہین وطباع اور پر گو شاعر لیکن ایک انتہائی بے فکرو بے نیاز شخص کے بارے میں ظفر صاحب کے درج ذیل الفاظ زبان وبیان پر ان کی قدرت کے ساتھ ہی اسلوب اظہار کی دلکشی کے نقطۂ نظر سے بھی قابل توجہ ہیں:

> ''مجموعی طور پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نیاز حیدر کی بے ترتیبی میں ایک ترتیب،ان کی شخصیت کے انتشار میں بھی ایک اہتمام،ان کی زندگی کی بے تنظیمی میں بھی ایک تنظیم تھی مگر یہ چیزیں بظاہر دکھائی دینے والی نہ تھیں۔ایک عام سا آدمی جس کے پاس مال ومتاع تو خیر دور کی بات ہے،اس کا خیال بھی نہیں تھا۔اولاد اور جائداد کے تکلفات سے بے نیاز،لکھنے پڑھنے میں غرق اپنے عہد کی پوری تاریخ کو نظموں کے ذریعے کاغذ پر بکھیر دینے میں مصروف اور اپنے دور کے انسانوں کے درد،کرب،اذیت اور صعوبت کے پورے زہر کو پی کر سرخ رو ہوجانے کی تمنا کا نام نیاز حیدر تھا۔بابا نیاز حیدر۔'' 2

ظفر صاحب کا پی ایچ ڈی کا مقالہ جو پریم چند کے بعد اردو ناول کے تکنیکی مطالعے پر مشتمل ہے ابھی تک شائع نہیں ہو سکا۔یہ ان کا ایک بے حد اہم کام ہے اور اسے جلد از جلد منظر عام پر آنا چاہیے۔اردو میں ناول اور افسانے کے موضوعات ومیلانات پر تو اچھا خاصا کام ہوا ہے لیکن فنی وتکنیکی نقطۂ نظر سے ان دو اصناف کا جائزہ کم ہی لیا گیا ہے۔اس لیے ناول کے تکنیکی مطالعے پر مشتمل ظفر صاحب کا یہ تنقیدی

و تحقیقی مقالہ ضرور شائع ہونا چاہیے۔

ظفر صاحب نے اپنے کیریر کا آغاز روزنامہ ''قومی آواز'' دہلی سے بطور مترجم کیا تھا۔خبروں کا ترجمہ کرنے کی وجہ سے انہیں ترجمے کے فن اور اس کے مطالعات سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور ان کی یہی دلچسپی آگے چل کر شعبہ ترجمہ کو سمت و رفتار دینے میں معاون و مددگار ثابت ہوئی۔ بعد میں جب انہیں نظامت ترجمہ واشاعت، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا تو وہاں بھی انہوں نے ترجمے میں اپنی اسی دلچسپی کے باعث جدید تعلیمی مواد کے اردو میں ترجمے کے تعلق سے کئی اہم اقدامات کئے۔ظفر صاحب اردو یونیورسٹی کے مرکز برائے اردو زبان، ادب اور ثقافت کے بھی ڈائرکٹر تھے۔اسی مرکز سے انہوں نے ستمبر 2015ء میں ایک انتہائی موقر ششماہی ریفریڈ جرنل ''ادب وثقافت'' کے نام سے شائع کرنا شروع کیا۔اس جریدے کے بارہ شمارے ان کے زیر ادارت شائع ہوئے۔''شذرات'' کے عنوان سے ہر شمارے میں مشمولہ مضامین سے متعلق بھی گفتگو کرتے اور یونیورسٹی کی چند دیگر علمی و ادبی سرگرمیوں پر بھی روشنی ڈالتے تھے۔اس کے علاوہ اردو کو درپیش بعض دیگر مسائل پر بھی انہوں نے وقتاً فوقتاً اظہار خیال کیا ہے۔''ادب وثقافت' کے پانچویں شمارے میں''شذرات'' کے تحت جدید سائنسی علوم کے اردو زبان میں ترجمے کے حوالے سے وضع اصطلاحات کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر کیا تھا:

> ''مادری زبان میں علم سیکھنے کی قوت وافادیت آج بھی برقرار ہے لیکن اصطلاحات اور اسماء کے ترجمے پر اصرار ہمیں ترقی کی راہ میں پیچھے کی طرف دھکیل سکتا ہے۔ریڈیو یا ٹی وی کی اصطلاح ''فری کوئنسی'' کو اگر ہم ''تعدد'' ڈرائیونگ کی اصطلاح ایکسلریشن کو''اسراع'' کلوروپلاسٹ کو''سبز مائع دان'' .... تو ہمارا طالب علم یا آج کا قاری کیسے سمجھ پائے گا؟اور اگر کسی طرح سمجھ بھی گیا تو کیا وہ عملی میدان میں تشریف فرما اعلیٰ تعلیم یا روزگار بازار کے نمائندوں کو سمجھا سکتا ہے۔لہٰذا آج یہ ضروری سمجھا جارہا ہے کہ اردو میں انگریزی اصطلاحات کو من وعن قبول کیا جائے اور انہی کو عام کیا جائے۔اردو کا دامن یوں بھی بہت وسیع ہے، اس میں قوت انجذاب بے پناہ ہے۔کوئی حیرت نہیں کہ کچھ دنوں کے استعمال کے بعد وہ اصطلاحات بھی اردو اصطلاحات کی طرح زبان زد ہو جائیں۔'' [3]

اردو میں اصطلاح سازی کے تعلق سے ظفر صاحب نے ان خیالات کا اظہار سائنسی اصطلاحات کی اس توضیحی فرہنگ کے حوالے سے کیا تھا جو ان کے زیرِ نگرانی نظامت ترجمہ واشاعت، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے شائع کی ہے۔اس فرہنگ میں سائنس کی انگریزی اصطلاحات کو انگریزی کے ساتھ اردو رسم الخط میں لکھ دیا گیا تھا۔اگر ان میں سے کسی اصطلاح کا عام طور پر رائج اردو متبادل موجود تھا تو اسے بھی درج فرہنگ کر دیا گیا تھا۔

''ادب وثقافت'' کے دسویں شمارے سے ظفر صاحب نے ''کتب بینی میری فطرت ہے لیکن'' کے زیرِ عنوان نئی شائع شدہ کتابوں پر سیر حاصل تبصروں کا سلسلہ جاری کیا۔یہ تبصرے وہ خود کرتے تھے اور ان کے یہ تبصرے ان کے تنقیدی شعور نیز وسعت مطالعہ سے ہمیں واقف کراتے ہیں۔تبصروں کا یہ سلسلہ جب شروع ہوا تو اتفاقاً اسی زمانے میں اردو کے معروف ناقد، محقق، افسانہ نگار اور شاعر پروفیسر خالد سعید سابق صدر شعبۂ اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا شعری مجموعہ ''چاند سے باتیں'' منظرِ عام پر آیا۔ ظفر صاحب نے اس شعری مجموعہ پر ایک مختصر لیکن انتہائی جامع تبصرہ کیا اور وہ ''ادب وثقافت'' کے اسی شمارے میں متذکرہ بالا عنوان کے تحت شائع ہوا۔خالد سعید کی شعری کائنات کی اہم خصوصیات کے تعلق سے ظفر صاحب کے درج ذیل الفاظ ان کی شعری فہم اور تنقیدی بصیرت کا پتا دیتے ہیں:

> ''خالد سعید کی شاعری ان کی ذات اور اندرون حیات سے عرفان حاصل کرتی ہے۔ان کے کلام کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کا دل لہولہو ہے اور وہ ایک بے قراری کی کیفیت میں جی رہا ہے۔بہت ساری تمناؤں کی تکمیل کی خواہش، کائنات کو پالینے کی آرزو اور زیست کو من مرضی گزارنے کی تشنگی ان کی شاعری سے جا بجا جھلکتی نظر آتی ہے۔دراصل شاعر کا یہ احساس معاشرتی کرب، بے کیفی اور بے چینی کا اشاریہ ہے۔کوئی بھی فنکار صرف ایک زندگی کو نہیں جیتا بلکہ اس کے محسوسات میں ہزاروں زندگیوں کے تجربات پوشیدہ ہوتے ہیں جو اس کے فن کے ذریعے آشکار ہوتے ہیں۔خالد سعید کے یہاں بھی ایسا ہی ہے۔'' 4

ظفر صاحب کی انہیں علمی وادبی صلاحیتوں کو دیکھ کر یہ لگتا تھا کہ جیسے ہی انہیں موجودہ ملازمت

اوراس کی عائدکردہ انتظامی ذمہ داریوں سے سبک دوشی حاصل ہوگی، ان کا رشتہ دوبارہ قلم وقرطاس کی اس دنیا سے پھرایک باراستوار ہوجائے گا جوان کا اصل میدان تھی لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا اور وہ ہم سب سے اچانک اس طرح رخصت ہوگئے کہ آج بھی دل کو یہ یقین دلانا مشکل ہورہا ہے کہ ظفرصاحب اب کبھی واپس نہیں آئیں گے۔انہیں باتیں کرتے، مسکراتے، چند نپے تلے جملوں میں اپنے موقف سے واقف کراتے، نہایت متانت اور سنجیدگی سے کسی موضوع پر اپنی رائے ظاہر کرتے، یونیورسٹی کی ترقی وبقاء کے تعلق سے اپنی آراء وترجیحات کا مسکت ومدلل اظہار کرتے مختلف تقریبات وپروگراموں میں شریک ہوتے، مہذب وشائستہ گفتگوکرتے اب کبھی نہیں دیکھا جاسکے گا۔موت برحق ہے اور ہر ذی روح کوایک نہ ایک دن ضرور آنی ہے۔ہم سب کو بھی آئے گی اور بالآخرایک دن ہم سب بھی اسی راستے پر چل پڑیں گے جس پر ظفرصاحب جاچکے ہیں۔اللہ ان کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات کو بلند کرے، ان کے اہل خانہ اور دیگرلواحقین کو صبرعطا فرمائے۔آمین

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

حوالہ جات

1. پروفیسر قمر رئیس: احوال وآثار، صفحہ 195
2. نیاز حیدر: شخصیت اور شاعری، صفحہ 49
3. شذرات، ادب وثقافت، شمارہ نمبر 5، ستمبر 2017، صفحہ 7
4. کتب بینی مری فطرت ہے لیکن، ادب وثقافت، شمارہ نمبر 10، مارچ 2020، صفحہ 352

❒ **Dr. Syed Mahmood Kazmi**
Associate Professor
Department of Translation
Maulan Azad National Urdu University
Hyderabad - 500032
Mobile: 9949060358
Email: sm_kazmi@yahoo.com

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:98-111
Dr. Bibi Raza Khatoon, Prof. Mohd Zafaruddin ki Tasneef 'Niyaz Haider: Shakhsiat aur...

بی بی رضا خاتون

پروفیسر محمد ظفرالدین کی تصنیف

'نیاز حیدر: شخصیت اور شاعری'-ایک مطالعہ

اردو زبان میں اعلیٰ تعلیم فراہم کرنے کے مقصد سے 1998ء میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کا قیام عمل میں آیا۔ پروفیسر محمد ظفرالدین کا شمار مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ وہ یونیورسٹی میں مختلف عہدوں پر فائز رہے اور ہر عہدے سے متعلق ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دیا۔ ان ہی ذمہ داریوں میں نصابی کتب کی تیاری بھی شامل ہے۔ ابتداء میں ٹرانسلیشن ڈویژن کے رفقاء کے تعاون سے نصابی کتابیں ترجمہ کر کے شائع کیں۔ بعد ازاں انھوں نے ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز، مانو کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے نصابی کتب کی تیاری میں اہم رول ادا کیا۔ اس طرح کے تدریسی مواد کی تیاری کے ذریعے اردو زبان کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ سرسید نے اردو زبان کو ادب کے علاوہ علوم کی زبان بنانے کا جو خواب دیکھا تھا مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی راہ پر گامزن ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر محمد ظفرالدین کی خدمات قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر محمد ظفرالدین کی علمی و ادبی خدمات پر نظر ڈالیں تو مانو کے علاوہ دیگر یونیورسٹیوں کے لیے بھی بحیثیت کوآرڈینیٹر اور کورس رائٹر کے انہوں نے نصابی کتب کی تیاری میں حصہ لیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی کتابوں میں 'نیاز حیدر: شخصیت اور شاعری'، 'پروفیسر قمر رئیس: آثار و احوال'، 'سری ادب اور ابن صفی' 'اردو ترجمہ: حقائق اور امکانات' قابل ذکر ہیں۔ ملک کے موقر رسائل و جرائد میں ان کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ مرکز مطالعات اردو ثقافت، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے نکلنے والے سہ ماہی رسالہ 'ادب و ثقافت' کے مدیر کی حیثیت سے انھوں نے جو اداریے اور کتابوں پر تبصرے لکھے ہیں وہ ان کی

تنقیدی بصیرت کی غمازی کرتے ہیں۔ زیرنظر مضمون میں پروفیسر محمد ظفرالدین کی تصنیف 'نیاز حیدر: شخصیت اور شاعری' پر گفتگو کی جائے گی۔ ان کی کتابوں میں ''نیاز حیدر شخصیت اور شاعری'' اہمیت کی حامل ہے۔ یہ نیاز حیدر پر ایک اہم تحقیقی و تنقیدی کتاب ہے اس کتاب میں انھوں نے ترقی پسند شاعر نیاز حیدر کی شخصیت اور شاعری پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

ترقی پسند تحریک اردو زبان وادب کی سب سے بڑی اور باضابطہ تحریک ہے جس نے اردو شاعری کے دھارے کو ایک نیا موڑ دیا۔ ادب کے روایتی موضوعات سے ہٹ کر نئے اور متنوع قسم کے موضوعات پر ادب تخلیق کیا جانے لگا جن کا تعلق حقیقی زندگی سے تھا۔ اس تحریک نے اپنے عہد کے تقریباً تمام قلم کاروں کو متاثر کیا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعرا کی ایک طویل فہرست ہے جن میں جوش، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، مجاز لکھنوی، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، سردار جعفری وغیرہ شامل ہیں۔ بلاشبہ یہ بڑے نام ہیں اور بار بار دہرائے جاتے ہیں لیکن اس تحریک سے وابستہ شعراء میں کچھ اور نام بھی ہیں جنھیں ناقدین کی وہ توجہ نہیں ملی جو مذکورہ بالا شعراء کے حصے میں آئی۔ جس کے سبب ادب میں ان کا تعین قدر بھی نہ ہوسکا ایسے شعراء میں نیاز حیدر بھی شامل ہیں جن کی شاعری کو اپنے زمانے میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ پروفیسر محمد ظفرالدین نے ''نیاز حیدر کی شخصیت اور شاعری'' جیسے موضوع کا انتخاب کیا اور مختلف ابواب قائم کرکے اس موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے نیاز حیدر کی شخصیت اور شاعری پر کام کر کے انھیں طاق نسیاں کا حصہ بننے سے بچالیا۔

اس کتاب کو انھوں نے چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول میں سوانحی کوائف پیش کیے ہیں۔ باب دوم میں شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ باب سوم میں ترقی پسند شعری روایت کا احاطہ کیا ہے اور باب چہارم میں نیاز حیدر کی شاعری کا تجزیہ کیا ہے۔ پہلے باب میں نیاز حیدر کی پیدائش خاندان حالات زندگی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے، جس کے مستند ذرائع سے معلومات حاصل کی ہیں۔ دوسرے باب میں نیاز حیدر کی شخصیت پر گفتگو سے قبل شخصیت کے حوالے سے مختلف ماہرین کے نظریات کو پیش کرکے شخصیت جیسے مشکل اور پیچیدہ موضوع کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر محمد ظفرالدین نے نیاز حیدر کے سوانحی کوائف کو نہایت معروضی انداز میں پیش کیا ہے۔ ہیرو ازم کے اثر سے بچتے ہوئے شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو متوازن انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''نیاز حیدر نے ہر طرح کی حرص وطمع سے بلند، ستائش کی تمنا سے بے نیاز اور صلے سے بے پرواہ ہوکر اپنی طور سے آج کی دکھی انسانیت کی خدمت کی۔ وہ کرسی، گدی، اولاد، جائیداد، نام، مقام جیسی کسی بھی حرص یا خواہش کے شکار نہیں ہوئے اور مستانہ وار ایک ایسی زندگی جیتے رہے جو دوسروں کے لیے وقف تھی۔ مہاراشٹر کی جیل میں پولیس فائرنگ کے دوران کامریڈ ایس اے ڈونگے کو بچاتے ہوئے گولی سے خود ان کے زخمی ہونے کا واقعہ ہو یا کالج میں نظام حیدرآباد کی تصویر اتار کر پیروں سے روند دینے کا موقع ہو ہر جگہ وہ یا تو انسان دوست دکھائی دیتے ہیں یا انسان کی آزادی اور بڑائی کے لیے جدوجہد کرنے والے سپاہی۔۔۔۔۔ گرچہ نیاز حیدر کی زندگی میں کثرت شراب نوشی ایسی چیز ہے جسے ان کی کمزوری قرار دیا جاسکتا ہے مگر اس بلا نوشی نے انہیں ذلیل یا رسوا نہیں کیا'' (نیاز حیدر: شخصیت اور شاعری، صفحہ نمبر 12)

پروفیسر محمد ظفرالدین نے نیاز حیدر کی شخصیت عادات واطوار پر گفتگو میں جہاں ان کی شخصیت میں موجود بے نیازی کے عنصر پر خصوصی توجہ دی ہے کہ انہیں کسی چیز کی حرص و ہوس نہیں تھی نام نمود کرسی جائیداد شہرت وغیرہ سے بالکل بے نیاز تھے۔ عوام کی فلاح و بہبودی کو انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنایا تھا۔ وہیں انھوں نے نیاز حیدر کی شخصیت میں پائی جانے والی کمزوریوں کا بھی ذکر ہمدردانہ انداز میں کیا ہے کیونکہ انسان خوبیوں اور خامیوں کا مرکب ہے لیکن ان خامیوں اور کمزوریوں پر قابو پالینے کے بعد انسان درجہ کمال پر پہنچ جاتا ہے اور اپنی ذات کو خدمت خلق کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ نیاز حیدر نے بھی مزدوروں، کسانوں اور غریب عوام کے حقوق کی لڑائی کو اپنا مقصدِ حیات بنالیا تھا۔

اس کتاب میں پروفیسر محمد ظفرالدین نے تحقیقی حوالوں کو دیانتداری سے پیش کیا ہے۔ نیاز حیدر کے ابتدائی حالات کو پیش کرنے کے لیے ان کے شعری مجموعے 'شعلہ آوارگی' میں قمر رئیس کے مقدمے سے سب سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ اس مقدمے میں قمر رئیس نے نیاز حیدر کی بہن کامریڈ مرتضائی بیگم کے حوالے سے ان کے حالات وواقعات قلم بند کیے ہیں۔ نیاز حیدر کی انقلابی سرگرمیوں کے متعلق لکھا ہے کہ:

''عثمان آباد سے سید آلِ نبی کا تبادلہ تعلقہ لاتور ہو گیا۔نجن بھائی انٹر کر کے وہاں سے حیدر آباد پڑھنے گئے ۔عثمانیہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ راؤ رمبھا کی دیوڑھی میں رہتے تھے۔ یہاں وہ اسٹوڈنٹس فیڈ ریشن کے سرگرم رکن ہو گئے۔ حیدر آباد میں ان کی ملاقات مخدوم محی الدین اور ان کے انقلابی ساتھیوں راج بہادر گوڑ وغیرہ سے ہوئی'' (نیاز حیدر: شخصیت اور شاعری، صفحہ نمبر 13)

کسی بھی فنکار کی شخصیت اور فکر کی تشکیل میں کارفرما عوامل میں آس پاس کی زندگی ، بچپن اور لڑکپن کے حالات اور صحبتوں کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ نیاز حیدر کی فکر میں انقلابی عناصر عثمانیہ یونیورسٹی کے طالب علمی کے زمانے میں اسٹوڈنٹس فیڈ ریشن سے وابستگی اور انقلابی فکر کے حامل شاعر مخدوم محی الدین اور ان کے ساتھیوں راج بہادر گوڑ وغیرہ سے فکری اثر پذیری کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں پروفیسر محمد ظفر الدین نے نیاز حید کے روزنامہ قومی آواز بمبئی ایڈیشن میں شائع ہوئے انٹرویو سے بھی استفادہ کرتے ہوئے اپنی بات کو مدلل انداز میں پیش کیا ہے جو انہوں نے سید نعمان کو دیا تھا۔ نیاز حیدر بھی اپنے ذہنی ارتقاء میں حیدر آباد کی شعری و انقلابی فضا اور ان کے کامریڈ ساتھیوں کے رول کو اہم قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

''میرے اکثر لوگ جانتے ہیں کہ میرا ذہنی ارتقاء مخدوم محی الدین کے ساتھ حیدر آباد میں اور میری تمام باغیانہ صلاحیتیں مخدوم اور حیدر آباد کے بزرگ اور نوجوان شاعر و ادیب حیدر آباد کے عوام کی دین ہیں'' (نیاز حیدر: شخصیت اور شاعری، صفحہ نمبر 14)

نیاز ہندوستانی تھیٹر سے بھی وابستہ ہو گئے تھے جس کی روح رواں بیگم قدسیہ زیدی تھیں۔ انہوں نے ڈرامہ نگاری پر توجہ دی اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو ایک نئی جہت ملی۔ ڈرامہ شکنتلا اور امر پالی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ۔کرنل جمال عبدالناصر اور مارشل ٹیٹو ان ڈراموں کے شیدائیوں میں شامل تھے۔ان کے دوسرے ڈراموں میں ماٹی کی گاڑی اور سفید کنڈلی (برطول بریخت کا کشین چاک سرکل کا ترجمہ) کافی مقبول ہوئے ۔سفید کنڈلی کو اپٹا (IPTA) میں کئی بار اسٹیج کیا گیا۔ شبانہ اعظمی نے اس ڈرامے کی ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔

نیاز حیدر تھیٹر کے ساتھ ساتھ فلموں سے بھی وابستہ رہے۔ان کی لکھی ہوئی فلموں میں آندولن، آروہن، سانجھی کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ نیاز حیدر نے قلندرانہ زندگی بسر کی آخری دنوں میں ان کی بہن نے ان کا بہت خیال رکھا اپنی استطاعت سے بڑھ کر مہنگا علاج کرایا لیکن انھیں شفا نہیں ملی اور وہ 26رجنوری 1989ءکو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

اس کتاب میں نیاز حیدر کی شخصیت پر گفتگو کرنے سے قبل پروفیسر محمد ظفرالدین نے شخصیت سے متعلق مختلف ماہرین کی آراء کو پیش کر کے شخصیت جیسے مشکل اور پیچیدہ موضوع کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ جن میں افلاطون ،وارن (Warren) ،کارمائیکل (Charmichael) واٹسن (Watson) اور شرمین (Sherman) کے نظریات پر عالمانہ گفتگو کی ہے اور ذیلی عناوین شخصیت اور جسمانی ساخت، شخصیت کی صفات کے تحت تفصیل سے بحث کی ہے۔اس مطالعے کے ماحصل کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے نیاز حیدر کی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''آخر میں مجموعی طور پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نیاز حیدر کی بے ترتیبی میں ایک ترتیب، ان کی شخصیت کے انتشار میں بھی ایک اہتمام، ان کی زندگی کی بے تنظیمی بھی ایک تنظیم تھی مگر یہ چیزیں دکھائی نہ دینے والی تھیں۔ایک عام سا آدمی جس کے پاس مال ومتاع تو خیر دور کی بات ہے اس کا خیال بھی نہیں تھا۔اولاد اور جائیداد کے تکلفات سے بے نیاز، لکھنے پڑھنے میں غرق اپنے عہد کی پوری تاریخ کو نظموں کے ذریعے کاغذ پر بکھیر دینے میں مصروف اور اپنے دور کے انسانوں کے درد، کرب، اذیت اور صعوبت کے پورے زہر کو پی کر سرخ رو ہو جانے کی تمنا کا نام نیاز حیدر تھا۔ بابا نیاز حیدر'' (نیاز حیدر: شخصیت اور شاعری، صفحہ نمبر 49)

پروفیسر محمد ظفرالدین نے اس کتاب کے تیسرے باب میں ترقی پسند شعری روایت پر روشنی ڈالی ہے اور اگلے باب میں نیاز حیدر کی شاعری کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے۔ نیاز حیدر کی شاعری کا تجزیہ کرنے سے قبل انھوں نے ترقی پسند شعرا کے کلام پر جو موضوعاتی اور فنی حوالوں سے گفتگو کی ہے اس سے اس زمانے کے اہم موضوعات اور فن کی سطح پر ہو رہے تجربات کا اندازہ ہوتا ہے جس سے نیاز حیدر کے کلام کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ کیونکہ نیاز حیدر بھی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اور ان کے کلام میں عصری

حسیت ان کے عہد کے موضوعات کی ترجمانی کرتی ہے۔انھوں نے مخدوم محی الدین ا،سرار الحق مجاز، مجروح سلطان پوری، اختر الایمان، احمد ندیم قاسمی کے کلام کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔جس میں ان تمام شعرا کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے سبب موضوعات میں یکسانیت کے باوجود اسلوب اور لب و لہجے کی انفرادیت کو واضح کیا ہے۔

نیاز حیدر کی شاعری کا موضوعاتی تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر محمد ظفر الدین نے ہندوستان کی بھکتی تحریک اور تصوف کی روایت کا احاطہ کرتے ہوئے نیاز حیدر کو اس گنگا جمنی تہذیب کا پروردہ قرار دیا ہے۔ذیل کے اقتباس سے ان کے ہندوستان کی تہذیبی روایت سے واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

> ’’نیاز حیدر خلقی طور پر ہندوستان کی بھکتی کی روایت اور ہند-ایرانی تصوف کے سلسلے کے آدمی تھے۔ان کا جوگیوں اور سادھوسنتوں والا انداز، ان کی مستی وقلندری ان کی خودسرشاری اور خود مکتفی کیفیت جذب، اپنے وجود کے محور پر رقص کرنے والی ان کی ذات، جسم کی خاک کو ساری کائنات میں بکھرادینے اور ایک ایک ذرے سے ہم آہنگ ہونے کی جرات مندانہ سرشت نیاز حیدر کو کبیر، میرا اور میرا کے قبیلے کا فرد بناتی ہے۔اس قبیلے کے فرد ذات کو آفاق اور فرد کو خلق میں ضم کردیتے ہیں۔ان کے پیش نگاہ انسانیت کا ایک عالمگیر منظر ہوتا ہے اور ان کی آنکھیں ایک آفاقی وابدی سچائی سے روشن ہوتی ہیں اور یہی روشنی انہیں ساری دنیا میں شہر شہر، قریہ قریہ، بستی بستی گھومتے رہنے پر اکساتی ہے۔اس قبیلے کے فرد گھر نہیں بناتے کہ ساری دنیا ان کا گھر ہوتی ہے۔مکان نہیں بناتے کہ درودیوار کا کوئی حصار ان کی روح کی وسعتوں کو قید نہیں کرسکتا۔ان کا کوئی خاندان بھی نہیں ہوتا کہ ساری خلق ان کا خاندان ہوتی ہے‘‘
>
> (نیاز حیدر: شخصیت اور شاعری، صفحہ نمبر 84)

پروفیسر محمد ظفر الدین نے نیاز حیدر کی شخصیت کی خوبیوں کو نہایت خوبصورت اور فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ان کا طرز اسلوب بہت دلکش ہے انھوں نے نیاز حیدر کی شخصیت کی بے نیازی کو ظاہر کرنے کے لیے جس طرح کے تلازموں کا استعمال کیا ہے وہ نثر میں ایک طرح کی شعریت اور آہنگ کا احساس دلاتا ہے۔

نیاز حیدر کی شاعری پر کارل مارکس کے نظریات کا اثر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ان کی فکری اساس میں انسان دوستی کو مرکزیت حاصل ہے۔انہوں نے محنت کشوں،مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کی ۔اس طبقے پر ہونے والا جبر واستحصال انہیں آزردہ کر دیتا ہے۔ وہ انقلاب کا نعرہ لگاتے ہیں۔مزدور دنیا کے کسی حصے میں رہتا ہو،مزدور کی کہیں فتح ہو نیاز حیدر اسے اپنی ہی فتح متصور کرتے ہیں۔ نیاز مزدوروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کڑی محنت کا رسیا، کرم گیانی
کہ نو نرمان ہے جس کی نشانی
لہکتے کھیت ، زندہ کارخانے
کہو محنت بھرے، کتنے خزانے

کہ ہے مزدور، سچا کرم یوگی
سدا مزدور ہی کی جیت ہوگی

(سویروں کی نگر میں)

نیاز حیدر کو 1949ء میں حکومت کے خلاف آواز بلند کرنے کے الزام میں گرفتار کر کے ممبئی کی آرتھر روڈ جیل میں رکھا گیا جہاں پر انہوں نے کئی انقلابی نظمیں کہیں جن میں 'ہے اندھیرا چار دن' قابل ذکر ہے۔انھوں نے ملک کے اقتصادی نظام کے استحکام کے لیے مزدور کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

مزدور کے زندہ پرچم کی ہر سانس میں ہے اک راز نیا
ہر لہر کی جنبش سے ملتا ہے دنیا کو آغاز نیا
اک خواب نیا ،تعبیر نئی ، تخلیق نئی ، انداز نیا
اک روح دگر،اک تازہ بدن،اک نغمہ نور،اک ساز نیا

اس پرچم کی لہروں کے لیے کچھ خون شہیداں اور سہی
زنداں کے مٹائے جانے تک پابندی زنداں اور سہی

پروفیسر محمد ظفر الدین نے نیاز حیدر کی شاعری کا موضوعاتی وفنی مطالعہ کرنے کے لیے تین ذیلی عناوین قائم کیے ہیں۔(1) تصور حیات اور انسان (2) ہندوستانیت (3) شعری رویہ اور نظموں کی ساخت۔

پروفیسر محمد ظفر الدین کے مطابق نیاز حیدر نے موت وحیات کے فلسفے کو مثبت انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ موت وحیات کو کائنات کی سب سے بڑی حقیقتیں تسلیم کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''نیاز حیدر کے یہاں زندگی ایک مسلسل ارتقاء پذیر نامیاتی حرکت اور انسان کی تخلیقی قوت کی تجسیم ہے۔ جبر واستحصال، بدی اور شر کی قوتیں اس تخلیقی حرکت کو شکست دینے کی کوشش کرتی ہیں مگر زندگی کہیں نہیں ٹھہرتی اور انسان ہر بندھن اور قید کو توڑ کر آگے بڑھتا رہتا ہے۔ تہذیب کے سارے مظاہر انسان کی اسی تخلیقیت اور جرأت مندی کی بدولت قائم ہیں۔ نیاز حیدر کی نظموں میں زندگی کی یہی تصور جگہ جگہ نظر آتا ہے'' (نیاز حیدر: شخصیت اور شاعری، صفحہ نمبر ۸۷)

پروفیسر محمد ظفر الدین نے نیاز حیدر کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے ان کی شاعری میں استعاروں کی ندرت کا تذکرہ کیا ہے کہ کیسے انہوں نے زمین کو نمو اور تخلیق کا استعارہ بنا کر پیش کیا۔ زمین جس کے دامن میں شبنم کی بوندیں بھی ہیں اور آتش فشاں پہاڑ کے شعلے بھی۔ ریگستان کی ریت بھی ہے اور گلستان کی بہار بھی۔ اس کی گود میں زندگی جنم لیتی ہے اور زندگی کا خاتمہ بھی اسی کے وجود میں پیوست ہو جاتا ہے۔

حدیث غم ہے زمیں نغمہ طرب ہے زمیں
شبیہ شبنم و اشک و گہر عجب ہے زمیں
صبا کی موج ہے طوفان بے اماں ہے زمیں
مقام مرگ بہاراں ہی گلستاں ہے زمیں

کبھی ہے پیکر فردوس حسن وعشق وشباب
کبھی ہیں دوزخ اسفل سے بھی زیادہ خراب

دیار خضر بھی گمراہ کا وطن بھی یہیں
خدا کا گھر ہے مکیں گاہ اہرمن بھی یہیں
بدلتی رہتی ہے کردار کامیابی سے
زمیں زمیں ہے کسی خوبی وخرابی سے

(سنو تو مجھ سے سنو نغمہ جمال زمیں)

نیاز حیدر کی شاعری کا محور و مرکز عوام ہیں۔ پروفیسر محمد ظفرالدین نیاز حیدر کے احترام انسانیت کے جذبے کی بھرپور ستائش کرتے ہیں اور عام آدمی کے لیے ان کے دل میں موجود محبت، تڑپ اور دردمندی کو انسانیت کی معراج قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''عوام ان کے لیے انسان کی حرکی اور تخلیقی قوت اور تمام تر خیر و حسن کا سرچشمہ اور دنیا کے ارتقاء کے بنیادی محور ہیں۔ عوام کے تصور سے وابستہ تصور تہذیب ہے جو نیاز حیدر کے نزدیک ایک آفاقی اور عالمگیر پھیلاؤ رکھتا ہے۔ انھوں نے برصغیر اور ایشیا کے تہذیبی اور سیاسی منظرنامے پر جاری خیر و شر، نیکی و بدی، روشنی و تاریکی کے تصادم و پیکار کو شعری تجربہ بنایا ہے۔ نیاز حیدر عوام کی قوتوں اور صلاحیتوں کی راہ میں کسی سرحد اور دیوار کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہندوستان، پاکستان اور ایشیا کے دیگر ملکوں میں انہیں عوام ایک جیسی زنجیروں میں جکڑے نظر آتے ہیں اور ان زنجیروں کو توڑنے کی جدوجہد بھی یکساں ہے'' (نیاز حیدر: شخصیت اور شاعری، صفحہ نمبر 88)

مرے فن کے روح رواں ہیں عوام
مرے راز کے رازداں ہیں عوام
میری شاعری جن کی عظمت سے ہے
عزائم سے، ہمت سے، محنت سے ہے
پس پردہ کوئی حقیقت نہیں
نظر سے بچی کوئی صورت نہیں

پروفیسر محمد ظفرالدین نے نیاز حیدر کے کلام میں ہندوستانیت کے موضوع کے تحت ان کی مذہبی رواداری، احترام مذاہب کی روشنی میں ان کی وطن پرستی حب الوطنی کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب کا نہایت اہم اور دلچسپ باب ہے جس میں نیاز حیدر کی وسیع النظری کے ساتھ ساتھ پروفیسر محمد ظفرالدین کے وسیع و عمیق مطالعے کا بھی اندازہ ہوتا ہے کیونکہ اس طرح کی تشریح و تفہیم کے لیے مطالعہ کا وسیع ہونا لازم ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس طرح نیاز حیدر نظیر اکبرآبادی کی سیکولر روایت کی پاسداری کرتے نظر آتے

ہیں۔احترام مذاہب کے ذریعے نظیر اکبرآبادی نے جس طرح سے قومی یکجہتی کو قائم کیا تھا۔ نیاز حیدر نے بھی اسی طرز پر ہندو دیو مالائی تلمیحات کا بہت زیادہ استعمال کیا ہے۔ان تلمیحات کے ذریعے ہندی الفاظ کا ان کی شاعری میں در آنا فطری امر ہے۔جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں ہندی زبان اور ہندی تہذیب سے بھرپور واقفیت ہے۔پروفیسر محمد ظفرالدین اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''نیاز حیدر نے ہندوستانی دیو مالاؤں کوشعری اظہار کی زبان دی ہے۔انھوں نے عام آدمی اور ہندوستانی روح کا اس کی اپنی زبان میں اظہار کیا ہے۔''
>
> (نیاز حیدر:شخصیت اور شاعری،صفحہ نمبر 103)

نٹ راج آج پھر ناچو
دیت، دشٹ، جھوٹ سب نشٹ کرو
جیت جائے مت سانچو
کمیت بھوم پہ اجول جوالا
اگنی بھڑکے ہو اجیالا
جٹا بکھیرو۔۔۔۔۔بادل چھائے
گگن سے گنگا۔۔۔۔اتر کے آئے
بجھے پیاس وش یا امرت ہو
چھلکن لاگے پیالا
نٹ راج آج پھر ناچو (نٹ راج)

اس نظم میں نیاز حیدر نے شیو کے اس غضبناک روپ کو موضوع بنایا ہے جس میں وہ اپنے جلال سے تمام برائیوں کو جلا کر بھسم کر دیتے ہیں۔موضوع کی مناسبت سے جس طرح کی لفظیات کا انتخاب کیا ہے وہ غیض وغضبناک پیکر اور اس پورے منظر کو محاکات کے ذریعے پیش کیا ہے۔تانڈو، وندنا، مانجھی، جنم اشٹمی، آج ودھاتا ہرشت ہے وغیرہ اس نوع کی نظمیں ہیں۔نیاز حیدر کے کلام کا تانیثی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا گیا تو ان کی شاعری میں بہت سی نظمیں ایسی ملیں جس میں عورت کے لیے تقدس اور اس کے وجود کو انسانیت کی بقا کا ضامن قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک عورت کی پہچان اس کی خوبصورتی

اور نزاکت نہیں بلکہ اس کی تخلیق کے کرب کو برداشت کرنے کی صلاحیت، محبت، شفقت، ممتا، وفا، حیا، جذبہ ایثار اور بلند ہمت وحوصلہ اس کی پہچان ہیں۔ ان کی ایک بہت خوبصورت نظم 'سکل سمست سجل سندری' کے یہ اشعار اس خیال کی تائید کرتے ہیں۔

پھانسی جھولے، آگ میں جھلسے ،زویا اور جمیلا
نیل کے نٹ پر ناچ دکھائے آزادی کی لیلا
پریم ڈگریا چلت لجائے وہ گھونگٹ شرمیلا
گھر کی دیوی دن میں جھوجھے پیئے گھونٹ زہریلا
پاربتی، مریم، سیتا، رادھا، میرا کہلائے
ماتھے سے مہتابی چھوٹے کرنیں زلفوں کی بکھرائے

نیاز حیدر کی شاعری میں ہیئت اور ساخت کے تجربوں کا پروفیسر محمد ظفر الدین نے بڑے ہی فنکارانہ انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ نظم کی اقسام اور بدلتے رجحانات پر ان کی گہری نظر ہے۔ انھوں نے جس طرح سے نیاز حیدر کے یہاں نئے اسالیب اور تکنیکی تجربات کی نشاندہی کی ہے اس سے نظم نگاری کی روایت اور فنی لوازمات سے ان کی بھرپور واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے نیاز حیدر کی شاعری میں لوک ادب کی روایت کی پاسداری اور عوامی زبان کے استعمال کو ان کی شاعرانہ خوبیوں میں شامل کیا ہے۔ جس سے ہندوستان کی مٹی کی مہک آتی ہے جو اس ملک کی گنگا جمنی تہذیب کا ایک خوبصورت ورثہ ہے ان کا کہنا ہے کہ نیاز حیدر نے اپنی شاعری کے ذریعے اسے محفوظ کر کے اگلی نسلوں کو منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''نیاز حیدر کی شاعری میں لہجے اور آہنگ، اسالیب بیان اظہار اور ہیئتی ساخت کا بڑا تنوع ہے۔ انہوں نے پابند نظمیں لکھی ہیں اور آزاد نظمیں بھی، پابند نظموں میں انہوں نے مسدس کو خاص طور پر ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ مسدس میں انہوں نے کئی تکنیکی تجربے کیے ہیں۔ جن کا مقصد ایک خاص کیفیت اور تاثر ادا کرنا ہے جو بصورت دیگر ممکن نہ ہوتا۔ اس سے کہیں زیادہ تکنیکی تجربے انھوں نے آزاد نظموں میں کیے ان تمام تجربات سے آزاد نظم میں اظہار کے ایسے امکانات

روشن ہوئے ہیں جو نیاز حیدر کی تخلیقی بصیرت پر دلالت کرتے ہیں۔اس کے علاوہ نیاز حیدر نے لوک گیتوں کی ساخت اور آہنگ کی ایسی بہت سی نظمیں کہی ہیں جو اردو شاعری میں انھیں کا حصہ ہیں جس کا سب سے بڑا سبب وہ زبان ہے جو ان کے علاوہ اور کسی نے استعمال نہیں کی اور نہ کوئی کر سکتا تھا'' (نیاز حیدر: شخصیت اور شاعری، صفحہ نمبر 111)

'بنام فنکار' میں ہیئت کے تجربے سے آہنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے یہ نظم چھ بندوں پر مشتمل ہے جن میں پانچ بند ایک بحر میں ہیں مگر آخری بند میں بحر بدل دی گئی ہے۔

لب کشائی کی جسارت کے لیے اک شرط ہے
اے سخنور تیرے ہونٹوں کو نہ لاحق ہو جذام
سکہ سیمیں کے پر تو سے بچا اپنا دہن
ورنہ تیری بات سے آزار پائیں گے عوام

اور آخری بند جس میں بحر بدل دی گئی ہے اس طرح سے ہے

نغمہ و شعر و علم و حکمت و فن
نرخ ہے تیز گرم ہے بازار
جا کے جلدی سے بیچ حسن ضمیر
بر ہو جائے گی مرے فن کار

پروفیسر محمد ظفر الدین نے نیاز حیدر کی شاعری کے بارے میں مختلف ناقدین کی آراء کا تجزیہ کر کے ان میں پائے جانے والے تضاد کو واضح کیا ہے۔فضیل جعفری کے ہفت روزہ بلیٹز 18 فروری 1989ء کے شمارے میں ''اردو کا آخری بوہیمن شاعر: نیاز حیدر کے عنوان سے شائع شدہ مضمون کا معروضی تجزیہ کیا ہے جس میں انھوں نے ایک طرف تو نیاز حیدر کی شاعری کی تعریف کی ہے اور دوسری جانب ان کی شاعری کو فنی سطح پر کمزور قرار دیا ہے۔ان کو اعلی درجے کا شاعر تسلیم کرنے سے انکار کرتے نظر آتے ہیں جس کے سبب ایک قول محال(paradox) کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔اس طرح سے قاری پر شاعر کی نہ فنکارانہ صلاحیتیں ظاہر ہوتی ہیں اور نہ ہی ان کی شاعری کا تعین قدر ہو سکتا ہے۔ پروفیسر محمد

ظفرالدین کا خیال ہے کہ ہنگامی طور پر لکھے گئے مضامین اور کلام کے مکمل مطالعے کے بغیر لکھے گئے مضامین موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے اور نہ ہی ایک مضمون میں کسی شاعر کے کلام کے حسن و قبح کو جانچ کر ان پر فیصلہ صادر کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کے سرسری مطالعوں اور غیر واضح اور متضاد بیانات نے نیاز حیدر کی حیثیت کو نقصان پہنچایا۔ ان کا صحیح طور پر تعین قدر نہ ہو سکا۔ پروفیسر ظفرالدین نے اس کتاب میں ان کی شاعری کا مطالعہ موضوعاتی اور فنی سطح پر مختلف جہات سے نہایت معروضی انداز میں کر کے ان کے کلام کا تعین قدر کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''راقم الحروف نے بھی نیاز کی شاعری کے ہمہ جہت پہلوؤں، شاعرانہ کمالات اور جودت طبع کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ فضیل جعفری نے نیاز کے انتقال پر ہنگامی طور پر وہ مضمون قلم بند کیا اور فوری طور پر انھیں نیاز کا جو بھی تھوڑا بہت کلام ہاتھ لگا اس کی روشنی میں انھوں نے نیاز کی مکمل شاعری پر حکم لگا دیا۔ جلد بازی میں جاری کیے گئے اس طرح کے فیصلے اکثر گمراہی کا سبب بنتے ہیں جس کے لیے مضمون نگار ذمہ دار ہوتا ہے'' (نیاز حیدر: شخصیت اور شاعری، صفحہ نمبر 125)

مذکورہ بالا اقتباس میں پروفیسر محمد ظفرالدین نے نہایت بے باکانہ انداز میں فضیل جعفری کے مضمون پر اظہار خیال کیا ہے۔ یہ بے باکی مطالعہ کی گہرائی سے حاصل ہونے والی خود اعتمادی کو ظاہر کرتی ہے۔ اکثر نئے لکھنے والے قلم کار بڑے ناقدین کی آراء کی تردید یا ان سے ہوئے تسامح کی نشاندہی کرنے سے گریز کرتے ہیں لیکن پروفیسر ظفرالدین نے کسی بھی طرح کی مرعوبیت سے بچتے ہوئے نہایت بے باکانہ انداز میں اپنی تحقیق اور تنقیدی مطالعے کے نتائج پیش کیے ہیں۔

پروفیسر محمد ظفرالدین نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ نیاز حیدر بہت اچھا تنقیدی شعور رکھتے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ تحقیق کے دوران انہیں جو مسودے دستیاب ہوئے ہیں ان میں کئی نظموں پر نیاز حیدر نے خود rejected اور not to be published لکھا ہے۔ یہ رویہ انھیں غالب کی یاد دلاتا ہے جنھوں نے اپنے کلام کا خاصہ حصہ خود ہی القط کر دیا تھا۔ پروفیسر محمد ظفرالدین کے تحقیقی نتائج سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نیاز حیدر نے جو کلام شائع کیا ہے وہ کافی غور وخوض کے بعد منتخب کیا گیا جو تنقیدی معیارات پر پورا اترتا ہے۔

چونکہ یہ کتاب نیاز حیدر کی شخصیت اور فن دونوں کا احاطہ کرتی ہے۔ پروفیسر ظفر الدین نے ان کی شخصیت میں پائے جانے والے اس تضاد کا بھی ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ اپنا کلام کسی رسالے میں اشاعت کے لیے خود نہیں بھیجا کرتے تھے۔ پروفیسر صاحب نے نیاز حیدر کی شخصیت کے اس پہلو کو ان کی انانیت قرار دیا ہے اور اپنی تحقیق سے دستیاب خطوط کی روشنی میں ان کے اس دعوے کی تردید کی ہے اور نہایت مخلصانہ انداز میں یہ بھی کہا ہے کہ اس کا مقصد نیاز کی شخصیت یا کردار کو مجروح کرنا نہیں ہے بلکہ یہ تحقیقی تقاضوں کی تکمیل اور ایک فنکار کی شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں کو سمجھنے کی ایماندارانہ کوشش ہے۔

کسی بھی فنکار کی شخصیت اور کلام کی تفہیم میں خطوط کو بہت اہم تصور کیا جاتا ہے، ایک طرح سے وہ بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔ پروفیسر محمد ظفر الدین نے ان خطوط کا استعمال کر کے اپنی بات کو مدلل انداز میں واضح کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں نیاز حیدر کے مکمل کلام کی ایک طویل فہرست دی گئی ہے۔ ان کی ناقدری کے لیے مصنف نے ان کی خود کی شخصیت کی بے نیازی کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ ان کی سچی قدردانی کے لیے ان کے کلام کا مطالعہ کرنے، اس پر گفتگو کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

پروفیسر محمد ظفر الدین نے نیاز حیدر جیسے شاعر کا انتخاب کیا جنھیں اکثر ناقدین نے نظر انداز کر دیا یا ان کے کلام پر متضاد آراء ظاہر کی جس کے سبب اردو شاعری میں ان کے مقام و مرتبے کا تعین نہ ہوسکا۔ انھوں نے نیاز حیدر کی شاعری کا مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے نہایت معروضی و علمی انداز میں مطالعہ کر کے ان کی کلام کی خوبیوں و خامیوں کو عیاں کر دیا ہے۔ انھوں نے نیاز حیدر کی شخصیت اور شاعری کی جس طرح سے بازیافت کی ہے اس سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اس تصنیف میں پیش کیا گیا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ نیاز حیدر کے مقام و مرتبے کے تعین میں معاون ثابت ہوگا۔

❒ **Dr. BiBi Raza Khatoon**
Assistant Professor
Department of Urdu
Maulana Azad National urdu University
Hyderabad-500032
Mobile: 99989037857
Email: brkhatoon@gmail.com

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:112-120
Dr. Firoz Alam, Zafar Bhai - Khak Mein Mil Gaye Nageene Log

فیروز عالم

ظفر بھائی — خاک میں مل گئے نگینے لوگ

پانچ اپریل 2021 کی صبح — تقریباً ساڑھے دس بجے تھے۔ طبیعت پر عجیب سا اضمحلال طاری تھا۔ ذہن مختلف قسم کے اندیشوں اور وسوسوں میں گرفتار تھا۔ کووِڈ کی دوسری لہر نے ملک کو پوری شدت کے ساتھ اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ ہر طرف تباہی مچی ہوئی تھی۔ اخباروں کے صفحات اس وبا کا شکار ہونے والوں کی تعداد میں بے تحاشا اضافے، اسپتالوں میں مریضوں کی بھیڑ، آکسیجن اور دواؤں کی شدید قلت، مرنے والوں کی بڑی تعداد، افراتفری اور خوف و دہشت کی خبروں سے بھرے پڑے تھے۔ ایک دن پہلے ہی میری کورونا رپورٹ بھی مثبت آئی تھی۔ گھر کے تمام افراد گھبرائے ہوئے تھے۔ میں خود ذہنی طور پر پریشان تھا۔ کیمپس میں کئی لوگ اس وبا میں گرفتار ہو گئے تھے اور موجودہ صورتِ حال کے پیش نظر ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں خدانخواستہ میری طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تو اسپتال میں داخلہ ملنا بھی مشکل ہے۔ مستقبل کے اندیشوں میں بری طرح مبتلا تھا کہ پتہ نہیں کیا ہوگا۔ اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میرے ساتھی حبیب احمد کا فون تھا۔ حبیب نے بے حد گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''آپ فوراً باہر آیئے۔ ایمرجنسی ہے۔ دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں جھنجھناہٹ ہو رہی ہے۔''

میں کسی انہونی کے اندیشے سے بے حد خوف زدہ ہو گیا۔ مجھے لگا شاید کیمپس کے کسی ساتھی پر فالج کا اثر ہوا ہے۔ میں چونکہ کووِڈ کی وجہ سے گھر میں مقید تھا اس لیے حبیب سے کہا کہ میں باہر نہیں نکل سکتا، بھائی کو بھیج رہا ہوں اور چھوٹے بھائی پرویز کے ہاتھوں میں فون تھما دیا کہ وہ بات کرے۔ پرویز بات کر رہا تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ کوئی بہت بڑا سانحہ ہو گیا ہے۔ بات ختم ہوئی اور اس نے یہ نہایت اندوہ ناک اطلاع دی کہ ظفر بھائی نہیں رہے۔ حرکتِ قلب بند ہونے کی وجہ سے ابھی

ابھی ان کا انتقال ہوگیا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے میرے دل کی دھڑکن بھی بند ہورہی ہے۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ آنکھوں میں ظفر بھائی کا مسکراتا چہرہ گردش کرنے لگا۔ گذشتہ پندرہ سولہ برسوں میں ان کے ساتھ گزارے لمحات ذہن کے پردے پر جھلملانے لگے۔ اوران سے وابستہ بے شمار یادیں دل کو کچوکے لگانے لگیں۔ ایک عجیب سا احساس ذہن ودل پر چھا گیا۔ کچھ کھو دینے کا، کسی بہت ہی عزیز، قابلِ قدر ہستی سے محروم ہوجانے کا احساس—

آج جب پروفیسر محمد ظفرالدین، جنھیں روزِ اول سے میں ظفر بھائی ہی کہتا رہا، کے بارے میں لکھنے بیٹھا ہوں تو بے شمار باتیں اور واقعات یاد آرہے ہیں۔ 2004 میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں ان سے پہلی ملاقات جوان کی خوش اخلاقی اوراپنائیت کی وجہ سے دل پر نقش ہوکر رہ گئی۔ دسمبر 2006 میں میرے تقرر کی اطلاع دینے کے لیے ان کا فون کرنا اور مبارک باد دینا، ملازمت جوائن کرنے کے لیے دہلی سے میرے حیدرآباد آنے کے وقت سفر میں ان کا فون اوراپنے گھر قیام کرنے کی دعوت، ایک ہفتے تک میری مہمان نوازی اور ضیافت، یونی ورسٹی میں جوائننگ کے مختلف مراحل اوراس اجنبی سر زمین پر قدم قدم پران کا تعاون اور رہنمائی— کتنی ہی باتیں ہیں۔ کیا کیا بیان کروں۔ ان کی سرپرستی نے حیدرآباد میں غریب الوطنی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ یہاں میرے بڑے بھائی موجود ہیں۔ ان کے پاس ہر مسئلے کا حل موجود رہتا تھا۔ میں اور میرے ساتھ مانو میں ملازمت حاصل کرنے والے میرے کئی ساتھی جن میں ڈاکٹر محمد امتیاز عالم (ریسرچ آفیسر، آئی ایم سی) ڈاکٹر محمد اطہر حسین (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ تعلیم وتربیت) اورڈاکٹر خواجہ محمد ضیاء الدین (اسسٹنٹ پروفیسر، سی اسی ای آئی پی) خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، انھیں آپسی گفتگو میں بڑے بھائی ہی کہا کرتے تھے۔ اتفاق سے ہم سب لوگوں کو کیمپس میں کوارٹرس مل گئے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے ہم سب یہاں بچپن سے آباد ہیں۔ جائس (اترپردیش) سے ڈاکٹر علیم اشرف جائسی، میرٹھ سے ڈاکٹر فریدہ صدیقی، الہ آباد سے ڈاکٹر سید محمود کاظمی، سہسرام (بہار) سے ڈاکٹر جمال الدین خاں، کیرالا کے ملاّ پورم سے ڈاکٹر سلیل قادر، تلنگانہ سے ڈاکٹر شاہدہ اور ڈاکٹر شاکرہ پروین، دلی سے ڈاکٹر اشونی، کشمیر سے ڈاکٹر جاوید وانی، اور مئو سے ڈاکٹر شمیم احمد— سب لوگ الگ الگ مقامات سے آئے تھے۔ ایک چھوٹا سا ہندوستان ہمارے کیمپس میں آباد ہوگیا تھا۔ لیکن محبت ایسی تھی کہ سب ایک ہی خاندان کے افراد محسوس ہوتے تھے۔ اس خاندان کے سینئر ارکان میں ظفر بھائی، فضل صاحب (پروفیسر پی فضل الرحمٰن، ڈائرکٹر یو جی سی اکیڈمک اسٹاف کالج)

پروفیسر خالد سعید (صدر شعبۂ اردو اور ڈین اسکول برائے السنہ، لسانیات و ہندوستانیات) پروفیسر ٹی وی کٹی منی (صدر شعبۂ ہندی جو بعد میں اندرا گاندھی نیشنل ٹرائبل یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بنے) پروفیسر حسین یٰسین صدیقی (شعبۂ سوشل ورک) اور پروفیسر کے آر اقبال احمد (نائب شیخ الجامعہ اور ڈائرکٹر نظامت فاصلاتی تعلیم) تھے جو پروفیسر کوارٹرس میں آباد تھے۔ اس زمانے میں ٹائپ۔4 کوارٹرس نہیں بنے تھے اور اسسٹنٹ پروفیسر اور اس گریڈ کے دیگر ملازمین کے لیے بارہ کوارٹرس بنے تھے جنھیں لکچرر کوارٹر کا نام دیا گیا۔ ان میں ہم جیسے تازہ واردانِ بساطِ جامعہ سکونت پذیر تھے۔

وہ ہم سب کی زندگی کا سنہرا زمانہ تھا۔ یونیورسٹی تشکیلی مراحل میں تھی۔ پروفیسر اے ایم پٹھان کی سربراہی میں نئے نئے شعبے قائم ہو رہے تھے، بڑی تعداد میں تقررات ہو رہے تھے اور مختلف عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ہم لوگ اپنا کام بھی دل جمعی سے کرتے اور فرصت کے اوقات میں خوب گپ شپ اور ہنسی مذاق کا سلسلہ چلتا رہتا۔ صبح کی سیر میں ہم نوجوانوں کے ساتھ اکثر کٹی منی صاحب، صدیقی صاحب اور ظفر بھائی بھی ساتھ ہوتے تھے۔ ایک دن ایسے ہی ہم لوگ ٹہل رہے تھے۔ ظفر بھائی بھی ساتھ تھے۔ بدن بھاری ہونے کی وجہ سے ان کے ٹہلنے کی رفتار ہم لوگوں سے ذرا سست رہتی تھی۔ فضل صاحب کار سے گزرے۔ انھوں نے کار روکی اور ظفر بھائی پر طنز کیا۔

''ایسے ٹہلنے سے کچھ نہیں ہوگا۔''

ظفر بھائی نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''اور جیسے آپ ٹہل رہے ہیں اس سے تو اور کچھ نہیں ہوگا۔''

جواب سن کر فضل صاحب رکے نہیں، تیزی سے کار آگے بڑھا دی۔ ان دونوں میں اس طرح کی نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ حسِ مزاح اور حاضر جوابی ظفر بھائی میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور اکثر اپنے کاٹ دار جملوں سے سامنے والے کو لاجواب کر دیتے تھے۔ ان دونوں نے تقریباً ایک ساتھ ہی یونی ورسٹی جوائن کیا تھا اور ہم عمر بھی تھے۔ دونوں میں ایک دوسرے کے تئیں بے حد محبت بھی تھی۔ چھٹی کے دنوں میں دونوں صبح کو ٹہلنے نکلتے۔ اس میں غالباً ان کے ارادے کا کم اور بھابیوں کو یہ جتانے کا خیال زیادہ رہتا ہوگا کہ ہمیں اپنی صحت کا بہت خیال ہے۔ اسی لیے شاید وہ لوگ ٹہلتے کم تھے اور سوشل سائنس بلڈنگ (جو اس زمانے میں لکچر ہال کمپلیکس کے نام سے جانا جاتا تھا) کے سامنے کی پُلیا یا پی وی سی کوارٹر کے سامنے فٹ پاتھ پر دیر تک بیٹھے نہ جانے کن موضوعات پر باتیں کرتے رہتے تھے۔

چونکہ ہم لوگ کیمپس کے ابتدائی مکین تھے اس لیے ہمارے کوارٹرس میں بہت ساری بنیادی سہولیات کی کمی تھی۔ رہائشی علاقے کی سڑک کچی تھی، چہار دیواری نہیں تھی، پارکنگ ندارد تھی، مچھروں سے بچنے کے لیے دروازے اور کھڑکیوں پر جالی کی ضرورت تھی، بچوں کے کھیلنے کے لیے کوئی مناسب جگہ نہیں تھی،طبی امداد کا کوئی انتظام نہ تھا۔ یہ اور اس طرح کے بہت سارے مسائل تھے۔ان مسائل کے حل کے لیے،ہم لوگوں نے مانو ریزیڈنٹس ویلفیئر سوسائٹی تشکیل دی اور اتفاق رائے سے ظفر بھائی کو اس کا صدر منتخب کیا گیا۔انھوں نے اپنے رسوخ اور تعلقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تمام مسائل حل کرانے میں کامیابی حاصل کی۔کیمپس میں شفٹ ہونے کے کچھ ہی دنوں کے بعد رمضان کا مہینہ آیا۔ ہم سب پریشان تھے کہ تراویح کیسے پڑھی جائے۔اس وقت کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں تیس پینتیس افراد ایک ساتھ نماز پڑھ سکیں۔ ہمارے دل کی بات پروفیسر اے ایم پٹھان جیسے نیک، رحم دل،انسانیت نواز اور راسخ العقیدہ وائس چانسلر تک پہنچی اور ان کی ایما پر ظفر بھائی نے یونی ورسٹی مہمان خانے کے ایئر کنڈیشنڈ ہال میں تراویح کا اہتمام کرایا۔ شیخ الجامعہ سے لے کر چھوٹے بچے تک سب نماز میں موجود ہوتے تھے۔اس روح پرور ماحول میں عبادت کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ پورے مہینے کیمپس میں خوب چہل پہل اور رونق رہتی تھی۔ پروفیسر پٹھان تراویح کے اختتام پر پورے کیمپس کی دعوت کرتے تھے جس کے انتظام وانصرام کی ذمہ داری بھی ظفر بھائی ہی نبھاتے تھے۔

ظفر بھائی کی قیام گاہ پی کیو-5 (پروفیسر کوارٹر) ہم سب کے لیے مرجع خلائق کا درجہ رکھتی تھی جہاں اکثر ہم سب کی مشترکہ دعوتیں ہوا کرتی تھیں۔ خود اچھا کھانے اور دوستوں کو بھی خوب کھلانے پلانے کے معاملے میں ظفر بھائی ہمیشہ آگے رہتے تھے۔ دعوتیں دینے اور ضیافتیں کرنے کا انھیں بے حد شوق تھا اور ان کے اس شوق کو ان کی اہلیہ مسرت بھابی (ڈاکٹر مسرت جہاں، استاد شعبۂ اردو) کی خوش اخلاقی، سلیقہ مندی اور امور خانہ داری خصوصاً لذیذ ڈشیز بنانے میں ان کی مہارت نے مزید جلا بخش دی تھی۔ ان دونوں کی ذہنی ہم آہنگی اور شاندار کیمسٹری دیکھ کر ہم سب عش عش کرتے تھے۔ دونوں کے چہروں پر ہمیشہ خوش دلی اور مسکراہٹ ہی نظر آئی۔ کیا شاندار جوڑی تھی— ہم سب کی قیام گاہیں آس پاس تھیں اس لیے اکثر کبھی صبح میں ناشتے کے وقت اور کبھی رات کے کھانے پر ہم لوگوں میں سے کوئی نہ کوئی ان کا شریک ہوتا اور ان کی ہم طعامی اور ہم کلامی سے لطف اندوز ہوتا۔ میرے ساتھی اطہر، امتیاز اور ضیاء الدین اس وقت تک رشتۂ ازدواج سے منسلک نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے انھیں کنوارے ہونے کا فائدہ ملا

اور ظفر بھائی کے یہاں انھوں نے خوب دعوتیں کھائیں۔ ہمارے جو ساتھی بھی شادی کے بندھن میں بندھے انھیں پہلی دعوت اور تحفے تحائف سے ظفر بھائی اور مسرت بھابی نے ہی نوازا۔ میرے بیوی بچے جب پہلی بار حیدر آباد آئے تو انھیں بھی پہلی دعوت ظفر بھائی نے ہی اپنے برندابن، ٹولی چوکی والے گھر میں دی تھی۔ واپسی میں ڈھیر سارے چاکلیٹ اور بسکٹ کے ڈبے بھی انھوں نے بچوں کے ہاتھوں میں تھما دیے تھے۔ میری بیوی کو انھوں نے ہمیشہ نام لے کر ہی پکارا جیسے گھر کے بڑے اپنے چھوٹوں کو پکارتے ہیں۔ اس طویل عرصے میں ان کی شفقت اور محبت میں کوئی کمی نہ آئی۔ ایک بار میرے ساتھ میرا چھوٹا بیٹا ابوذران کے گھر گیا۔ انھوں نے اسے چاکلیٹ دی۔ اس نے کہا کہ بھائی جان اور آپی کے لیے بھی دیجیے۔ وہ مسکرائے اور ان دونوں کے لیے بھی چاکلیٹ دے کر مجھ سے کہنے لگے کہ مشترکہ خاندان کا یہی فائدہ ہے کہ بچے انفرادیت پسند کی بجاے اجتماعیت پسند ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے ساتھ اپنے بھائی بہنوں کے لیے بھی سوچتے ہیں۔ آگے چل کر اس سوچ کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے۔

ایک بار ہم لوگ کسی تقریب سے دیر رات گئے واپس آرہے تھے۔ ٹیکسی یا آٹو نہیں ملا تو بس سے ٹیلی کام نگر تک پہنچے اور وہاں سے یونی ورسٹی تک کا دو کلو میٹر کا فاصلہ پیدل طے کرنے لگے۔ چند قدم چلے تھے کہ ظفر بھائی سامنے سے گزرے۔ ان کی گاڑی بھری ہوئی تھی۔ مشکل سے پانچ منٹ کا وقفہ گزرا ہوگا کہ وہ کار لے کر واپس آئے۔ میں نے کہا کہ ''آپ کو زحمت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔'' کہنے لگے۔'' تمھارے لیے تھوڑی آیا ہوں، میں تو محبوب چھپرا والوں کو لینے آیا ہوں۔'' میرے ساتھ میری بیوی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ ان کا میکہ محبوب چھپرا ہے۔ ایسے چھوٹے چھوٹے انگنت واقعات ہیں۔

ان کے گھر پر ہر سال رمضان میں خصوصی دعوت ہوتی تھی جس میں کیمپس کے تمام مکین شریک ہوتے تھے۔ وہ خاص اہتمام سے اپنی نگرانی میں حلیم بنواتے تھے اور اپنے ہاتھوں سے نکال کر بڑی محبت سے سب کو پیش کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک دعوت کا واقعہ یاد آرہا ہے۔ ایک صاحب نے حلیم کی تعریف کی کہ بہت ہی خوش ذائقہ ہے۔ ظفر بھائی نے ایک طشتری میں حلیم نکالا اور ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ان کے بغل میں ہی میں بھی کھانے میں مصروف تھا۔ ظفر بھائی ایک طشتری لے کر میری طرف بڑھے۔ مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''حلیم اچھا لگا؟''

میں پہلے ہی دو پلیٹ حلیم کھا چکا تھا۔ اب مزید گنجائش نہیں تھی۔ اگر تعریف کرتا تو پھر کھانا

پڑتا۔ میں نے ہنستے ہوئے جھٹ سے جواب دیا۔

''مجھے اچھا نہیں لگا۔''

وہ بات سمجھ گئے۔ ان کے چہرے پر مخصوص مسکراہٹ آئی اور انھوں نے طشتری کسی اور کے ہاتھوں میں تھما دی۔

ایک بار میں ٹرین کا ٹکٹ بنا رہا تھا کہ انٹرنیٹ کنکشن منقطع ہوگیا۔ اگر دیر ہوتی تو سیٹیں بُک ہو جاتیں۔ میں نے ظفر بھائی کو فون کیا۔ وہ گھر ہی پر تھے۔ بولے ''آجاؤ، کوشش کرتے ہیں۔'' میں پہنچا تو وہ آئی آر سی ٹی سی کی ویب سائٹ کھولے میرا انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھ سے ٹرین کا نام پوچھا اور فوراً ٹکٹ بنا دیا۔ میں نے اجازت چاہی تو کہنے لگے کہ ''صبح کے وقت آئے ہو، بغیر ناشتہ کیے نہیں جا سکتے۔'' مسرت بھابی نے اس دن شاندار چکن نگیٹ بنایا تھا۔ چکن نگیٹ کا وہ ذائقہ یاد رہ گیا جس میں ظفر بھائی کی محبت اور مسرت بھابی کا خلوص شامل تھا۔

کسی انسان کی قدر افزائی میں اس کی شخصیت کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی صلاحیت اور کارکردگی کا بھی بڑا اہم کردار ہوتا ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کے قیام کے ابتدائی ایام سے ظفر بھائی اس سے وابستہ تھے۔ انھیں یونی ورسٹی کا اولین پبلک رِلیشنز آفیسر، اولین پراکٹر، اولین میڈیا کوآرڈنیٹر ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ درسی کتب کی تیاری، ترجمہ اور اشاعت کی غرض سے جب نظامتِ ترجمہ و اشاعت کا قیام عمل میں آیا تو اربابِ اختیار کی نگاہِ انتخاب ظفر بھائی پر ہی پڑی اور انھیں اس کا اولین ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔ ان کی نگرانی میں 75 سے زائد کتابیں بہت کم عرصے میں تیار ہوئیں اور اشاعت کے مرحلے سے گزریں۔ انھوں نے فاصلاتی طرز کے خود آموزشی مواد کو ایڈٹ کرا کے کتابی صورت میں شائع کرایا۔ اس سلسلے کی 16 کتب چند مہینے قبل منظر عام پر آئیں جن کی طلبا میں زبردست مانگ ہے۔ اس سے پہلے وہ یونی ورسٹی کی فاصلاتی تعلیم کے لیے نظامتِ ترجمہ میں دو سو سے زیادہ کتابیں اپنی نگرانی میں تیار کرا چکے تھے۔ انھیں جب مرکز برائے اردو زبان، ادب اور ثقافت (موجودہ مرکز مطالعاتِ اردو ثقافت) کا ڈائرکٹر بنایا گیا تو انھوں نے اس کی سرگرمیوں میں اضافہ کرتے ہوئے ''ادب و ثقافت'' کے نام سے ایک ریسرچ جرنل کا آغاز کیا۔ اس کا خاکہ مرکز کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر خالد سعید نے تیار کیا تھا اور پہلے شمارے کا خاصا کام بھی کر لیا تھا لیکن ان کے تبادلے کے بعد ان کے اس خواب کو ظفر بھائی نے تکمیل تک پہنچایا۔ انھوں نے ''ادب و ثقافت'' کو اپنی جاں فشانی اور مدیرانہ سوجھ بوجھ سے ملک

کے مقتدر رسائل میں اہم مقام کا حامل بنا دیا۔ ہر شمارے کے اداریے میں وہ مشمولات کا مختصر اور جامع تعارف کرانے کے ساتھ علم و ادب سے متعلق مختلف مسائل و موضوعات پر بھی بصیرت افروز گفتگو کرتے تھے۔ وہ بہ ذات خود تمام سینئر، جونیئر اساتذہ اور اسکالرز کو فون کرتے تھے اور ادب و ثقافت کے لیے مضمون لکھنے کی گزارش کرتے تھے۔ آج ''ادب و ثقافت'' کے قلمی معاونین میں ملک و بیرون ملک کے چوٹی کے قلم کار شامل ہیں۔ اس رسالے کے معیار کے مدِ نظر اسے یو جی سی کی کیئر لسٹ میں شامل کر لیا گیا ہے۔

ظفر بھائی کی بڑی خوبی یہ تھی کہ انھیں جو بھی ذمہ داری تفویض کی جاتی تھی وہ اسے بہ خوشی قبول کرتے تھے اور پھر اس کو پوری ایمانداری کے ساتھ نبھاتے تھے۔ اس کے بارے میں تمام معلومات حاصل کرتے تھے، زبردست منصوبہ بندی کرتے تھے، اپنے ساتھیوں کو اعتماد میں لیتے تھے اور پھر آگے بڑھتے تھے۔ وہ ایک بہت اچھے ٹیم لیڈر تھے اور اپنی ٹیم کے ہر رکن کو ساتھ لے کر چلتے تھے۔ ان کا کام کرانے کا انداز بھی بہت نرالا تھا۔ وہ کام کو انجوائے کرتے تھے اور اپنے ماتحتوں سے خوش اسلوبی کے ساتھ خوش گوار ماحول میں کام لیتے تھے۔ انھیں چیخنے چلانے کی عادت بالکل نہ تھی جیسا کہ بعض سربراہوں میں ہوتی ہے کہ جب تک دو چار ماتحتوں کو ڈانٹ نہ لیں، ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ میں نے انھیں کبھی اونچی آواز میں بات کرتے یا مشتعل ہوتے نہیں دیکھا۔ دفتر میں بھی ظفر بھائی کے تعلقات سب کے ساتھ اچھے تھے۔ وہ جس شعبے یا صیغے میں بھی رہے، ہر جگہ اپنے لہجے کے خلوص، نرم مزاجی، اعتدال پسندی اور کام کے تئیں سنجیدگی اور ایمانداری کی وجہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا۔ وہ ڈین، اسکول آف لینگویجز، لنگوسٹکس اینڈ انڈولوجی رہے، پبلک ریلیشنز آفس، پراکٹر آفس، ٹرانسلیشنز ڈویژن، شعبۂ ترجمہ، مرکز مطالعاتِ اردو ثقافت اور نظامتِ ترجمہ و اشاعت کی سربراہی بھی کامیابی کے ساتھ انجام دی۔ اولین وائس چانسلر پروفیسر محمد شمیم جے راجپوری سے لے کر موجودہ وائس چانسلر تک سبھی ان کی انتظامی و علمی صلاحیتوں کے قائل رہے۔ ان سب نے ان کی کارکردگی اور یونی ورسٹی کے بیشتر امور سے واقفیت کی بنیاد پر جس شعبے کو بھی مزید مضبوط بنانے کی ضرورت محسوس کی، سب سے پہلے ظفر بھائی کی ہی خدمات حاصل کیں۔

راقم السطور جن دنوں نظامت فاصلاتی تعلیم میں تھا، کچھ دن ان کی سرپرستی میں فرائضِ منصبی ادا کرنے کا موقع ملا۔ یہ 2015 کی بات ہے۔ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد میاں نظامت فاصلاتی تعلیم کی کارکردگی سے خوش نہیں تھے۔ انھوں نے ظفر بھائی کو آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی مقرر کیا اور کچھ دنوں کے بعد انھیں انچارج ڈائرکٹر بنا دیا۔ وہ غالباً چھ یا سات مہینے انچارج رہے اور اس دوران انھوں نے نظامت

فاصلاتی تعلیم کے معاملات پٹری پر لانے کی پوری کوشش کی اور اس میں بہت حد تک کامیاب رہے۔انھوں نے پہلی میٹنگ میں ہی اس خیال کا اظہار کیا کہ نظامت فاصلاتی تعلیم ہماری یونی ورسٹی کی شناخت ہے۔اس کی ترقی میں ہی یونی ورسٹی کی ترقی کا راز پنہاں ہے۔اس کی ترقی کے لیے آپ لوگ پہلے سے کوشاں ہیں، بس اس میں ذراسی تیزی لانے کی ضرورت ہے۔ جہاں کہیں دشواری ہے مجھے بتائیے، میں اسے دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔وہ سب کو ذمہ داری دے دیتے تھے اور ڈیڈ لائن بتا دیتے تھے۔آخری تاریخ سے پہلے کسی کو نہیں ٹوکتے تھے۔ان کے اس مخلصانہ رویے کی وجہ سے تمام افراد اپنا کام وقت پر مکمل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔فائلوں کی بروقت منظوری کے لیے وہ تمام متعلقہ صیغہ جات اور آفیسران کو فون کرتے تھے۔ جہاں بھی ضرورت ہوتی تھی خود پہنچ جاتے تھے۔

مرکز مطالعاتِ اردو ثقافت میں بھی مجھے ان کی قیادت میں تقریباً ایک سال کام کرنے کا موقع ملا۔مرکز کا عملہ پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ڈائرکٹر ظفر بھائی تھے۔ان کے علاوہ چیف کنسلٹنٹ کے طور پر تھیئٹر فنکار انیس اعظمی صاحب، مرکز کے لائبریرین ڈاکٹر زبیر احمد، میوزیم کیوریٹر حبیب احمد اور راقم اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر خدمات انجام دے رہے تھے۔بعد میں اس ٹیم میں ایک نئے رکن کا اضافہ اسو سی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر احمد خاں کی شکل میں ہوا۔مرکز میں سب نے اپنی اپنی ذمہ داریاں بانٹ رکھی تھیں اور ہر کام خوش اسلوبی سے انجام دیا جاتا تھا۔کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔اس طرح کی ذہنی وفکری ہم آہنگی،احساس ذمہ داری، مستعدی، پرفیکشن اور ٹیم بھاونا کم ہی شعبوں میں نظر آتی ہے۔اس پورے عرصے میں نہ ہم لوگوں نے ظفر بھائی کو کبھی شکایت کا موقعہ دیا اور نہ ان سے ہمیں کوئی گلہ تھا۔مرکز کی جانب سے کئی بڑے پروگرام، سیمنار اور مذاکرے بہت سلیقے کے ساتھ منعقد ہوئے اور کبھی کوئی بدمزگی نہیں ہوئی۔فروری 2021 کے دوسرے اور تیسرے ہفتے میں ان کی سرکردگی میں اپنی نوعیت کے دو بڑے قومی سیمنار منعقد ہوئے۔ نظامت ترجمہ واشاعت کی جانب سے ''اردو میں معلوماتی ادب'' اور مرکز مطالعاتِ اردو ثقافت کی طرف سے ''اردو کے تہذیبی وثقافتی ادارے''۔ان سمیناروں میں ملک بھر سے ماہرین کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا گیا اور بہترین مقالے پیش کیے گئے۔ظفر بھائی کے حسنِ انتظام اور مرکز مطالعاتِ اردو ثقافت اور نظامتِ ترجمہ واشاعت کے تمام عملے کی شب وروز کی محنت کی وجہ سے یہ دونوں سیمنار انتہائی کامیاب رہے۔

مارچ کے مہینے میں ان سے مرکز میں ملاقات ہوئی۔میں نے سمینار کی کامیابی کی مبارک باد دی۔ بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے آنے والے دنوں میں بہت کام کرنا ہے۔سیمنار کے تمام مقالوں کو ایڈٹ کر کے کتابی شکل دینی ہے۔مرکز کی سرگرمیوں میں مزید اضافہ کرنا ہے۔اس دن اپنے چھوٹے بیٹے فرقان کے ساتھ یونی ورسٹی آئے تھے۔فرقان کے پیر میں موچ آگئی تھی اسے ڈاکٹر کو دکھانا تھا۔اپنے بارے میں بتانے لگے کہ ابھی ڈاکٹر سے مل کر آرہا ہوں۔میں نے اپنا اور مسرت کا ٹسٹ کرایا تھا۔الحمدللہ، ہم دونوں کا بی پی،شوگر سب نارمل ہے۔حالانکہ ہم لوگ کھانے پینے میں زیادہ احتیاط نہیں کرتے۔ انھوں نے آفس اٹنڈنٹ فیاض سے چائے بنانے کے لیے کہا اور پھر دیر تک باتیں کرتے رہے۔چائے پینے کے بعد میں نے ان سے اجازت لی اور خدا حافظ کہا۔کیا پتہ تھا کہ یہی آخری خدا حافظ ثابت ہوگا اور پھر کبھی ظفر بھائی سے ملنا نصیب نہ ہوگا۔

آج جب یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔دل بھاری ہوگیا ہے اور پلکوں پر رکے ہوئے آنسو بے اختیار آنکھوں سے بہہ نکلنے کے لیے بیتاب ہیں۔کبھی سوچا نہ تھا کہ ظفر بھائی پر تعزیتی مضمون بھی لکھنا پڑے گا۔ابھی تو ان کی ملازمت کے دس برس باقی تھے۔یونی ورسٹی میں انھیں بہت سارے کام کرنے تھے۔دو سال پہلے ہی بیٹی ثانیہ کی شادی کے فرض سے سبک دوش ہوئے تھے۔ ابھی بہت ساری ذمہ داریاں پوری کرنی تھیں۔اپنا کیریئر آگے بڑھانا تھا،ڈھیر سارے علمی وادبی کام کرنے تھے،شبیع اور فرقان کے سر پر سہرا سجانا تھا،مسرت بھابی کا ساتھ نبھانا تھا،ہم سب لوگوں کی رہنمائی کرنی تھی۔اچانک یہ کیا ہوگیا،کیسے ہوگیا،سمجھ میں نہیں آتا۔ہم نے کیسی پیاری شخصیت کو کھو دیا،یہ سوچ کر دل بے حد اداس ہوجاتا ہے۔زندگی بھر اس بات کا بھی افسوس رہے گا کہ اپنے محسن کے آخری سفر میں بھی شریک نہ ہوسکا۔ کووِڈ کی وبا نے یہ موقع بھی مجھ سے چھین لیا۔ہم سب ایک انمول شخصیت سے محروم ہوگئے۔

مل گئے خاک میں نگینے لوگ

❐ **Dr. Firoz Alam**
Assistant Professor, Department of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 500032 (Telangana)
Mob: 9908201880 Email:firoz@manuu.edu.in

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:121-128
Dr. Ahamad Khan, Prof. Mohd. Zafaruddin: Ek Jahan Deedah Shakhsiyat

احمد خان

پروفیسر محمد ظفرالدین: ایک جہاں دیدہ شخصیت

پروفیسر محمد ظفرالدین صاحب سے میری واقفیت برسوں پرانی ہے۔مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ایک اہم اور سینئر رکن اور ششماہی مجلّہ ''ادب وثقافت'' کے مدیر کی حیثیت سے اردو حلقے میں ان کا نام خاصا معروف ہے۔ان سے میرا غائبانہ تعارف تو عرصہ پہلے سے تھا لیکن بہ نفس نفیس میری پہلی ملاقات اردو اکادمی دہلی کی جانب سے 21-19 فروری، 2016 کو منعقدہ قومی سمینار میں ہوئی تھی۔میری دانست کے مطابق وہ مجھے ذاتی طور پر قطعی نہیں جانتے تھے۔ان سے میرا کوئی سلام کلام یا کوئی ٹیلی فونک گفتگو بھی نہیں تھی۔یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مجھے اس حوالے سے جانتے رہے ہوں کہ میں یہاں آنے سے قبل شعبۂ اردو، ذاکر حسین دہلی کالج، دہلی یونیورسٹی سے بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر وابستہ تھا۔

خیر! میں اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کر رہا تھا۔دراصل انھوں نے پہلی ملاقات میں ہی اپنی نرم روی اور شگفتہ گفتگو سے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا۔ہوا یوں کہ مذکورہ سمینار کے پہلے اجلاس کی پہلی صف میں ایک لحیم شحیم شخص پر میری نظر پڑی جو اپنے رکھ رکھاؤ اور ظاہری شباہت میں انتہائی سنجیدہ اور دیدہ زیب تھے۔میں نے ان کے اردگرد کئی شناسا چہروں کا ہالہ بھی دیکھا۔مجھے یہ جاننے کی خواہش ہوئی کہ آخر یہ حضرت کون ہیں؟ میں نے اپنے پاس بیٹھے کسی دوست سے ان کے متعلق دریافت کیا۔اس نے کہا ارے ڈاکٹر صاحب کیا واقعی آپ ان کے متعلق نہیں جانتے۔میں نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور کہا کہ واقعی میں انھیں نہیں جانتا،تو میرے دوست نے بتایا کہ یہ پروفیسر شہزاد انجم کے بڑے بھائی پروفیسر محمد ظفرالدین ہیں۔بس اتنا سننا تھا کہ میں نے کہا ارے بھائی میں انھیں ان کے نام اور کام سے اچھی طرح واقف ہوں، بس میں انھیں چہرے سے نہیں پہچانتا تھا۔جب پہلا اجلاس ختم ہوا تو وقفۂ طعام کے دوران میں نے ان

سے ملاقات کی اوران کی خدمت میں سلام پیش کیا۔ واقعی وہ بڑی محبت سے پیش آئے اور جب انھیں علم ہوا کہ میں ذاکرحسین کالج سے وابستہ ہوں تو اور خوش ہوئے اور بتایا کہ اسی کالج سے انھوں نے گریجویشن کیا تھا۔ بہرحال یہ ایک خوشگوار ملاقات تھی جس سے دل ودماغ پر ان کا ایک گہرا نقش قائم ہوگیا۔

میری دوسری ملاقات 18 اکتوبر، 2019 کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد میں ایک انٹرویو کے دوران ہوئی جس میں وہ مرکز مطالعات اردو ثقافت کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے تشریف فرما تھے۔ انٹرویو کا نتیجہ میرے حق میں تھا۔ میں نے بحیثیت اسوسی ایٹ پروفیسر، مرکز مطالعات اردو ثقافت میں جوائن کرلیا۔ اب یہیں سے ملاقات کا سلسلہ تادم حیات جاری رہا۔

پروفیسر ظفرالدین، چونکہ یونیورسٹی کے اولین ملازمین میں شامل تھے۔ لہٰذا انھیں یونیورسٹی کے معاملات سے گہری واقفیت تھی۔ ان کی یادداشت بھی بہت اچھی تھی۔ وہ اکثر فرصت کے اوقات میں یونیورسٹی کے دلچسپ اور اہم معلومات کا ذکر کیا کرتے تھے۔ مختلف شعبوں کے قیام اور تدریسی و غیر تدریسی عملہ کی تقرری وغیرہ کے متعلق بھی ان سے گفتگو ہوتی تھی۔ عام طور پر وہ بہت سی سلیکشن کمیٹیوں کے رکن بھی رہ چکے تھے۔ دراصل ہر یونیورسٹی کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ لہٰذا مانو کے مزاج اور طرز عمل کو سمجھنے میں مجھے ان سے بڑی مدد ملی۔

جب میں حیدرآباد آیا تو میں یہاں کے لیے بالکل نیا تھا اور یہاں کے زیادہ تر لوگ میرے لیے نئے تھے۔ حیدرآباد کے بیشتر اردو ادبا وشعرا سے میں واقف نہیں تھا۔ بہت سے ایسے افراد تھے جن کا میں نے نام سنا تھا لیکن انھیں تفصیلی طور پر نہیں جانتا تھا۔ ظفرالدین صاحب نے ان کو جاننے اور سمجھنے میں میری کافی مدد کی۔ میں نے ان کی نظر سے مانو اور حیدرآباد کو انتہائی باریک بینی سے دیکھا۔

یہاں میں یہ عرض کرتا چلوں کہ وہ لوگوں کی خامیوں سے زیادہ خوبیوں کو بیان کرتے تھے۔ اگر کسی سے اختلاف تھا بھی تو بہت مہذب انداز میں اپنی رائے رکھتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ان کے اوصاف کا بھی ذکر کیا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ انسان کو کسی سے ذاتی اختلاف نہیں رکھنا چاہیے بلکہ اسے فکری یا نظریاتی اختلاف رکھنے کا پورا حق حاصل ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر کوئی آپ سے نظریاتی اختلاف رکھے تو اسے اپنا دشمن نہیں سمجھنا چاہیے۔ اگر آپ کے سامنے آپ کی کوئی خامی بیان کرے تو اسے اپنا ہمدرد سمجھنا چاہیے کیونکہ عام طور پر لوگ منہ دیکھی بات کرتے ہیں۔ اگر آپ کی کوئی

تعریف کرے تو سب سے پہلے آپ کو اپنا احتساب کرنا چاہیے کہ کیا واقعی آپ اس کے اہل ہیں۔ ہو سکے تو یہ بھی خیال کریں کہ تعریف کرنے والے کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ کیا اس کی تعریف محبت، شفقت، عقیدت، رشتہ، ربط ضبط یا کسی تقاضے کے سبب ہے؟ دراصل مادی دنیا میں تعریف کو ایک رسم یا فیشن کا درجہ بھی حاصل ہے۔ لہٰذا تعریف ہو یا نکتہ چینی دونوں میں از خود احتساب ضروری ہے۔

پروفیسر ظفرالدین کی حیثیت بلبلِ ہزار داستاں کی تھی۔ ان کے پاس کہنے، سنانے اور سمجھانے کے لیے بہت کچھ تھا۔ یہی نہیں کہ وہ صرف مانو اور حیدرآباد کے متعلق معلومات رکھتے تھے بلکہ اردو دنیا پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ مختلف اہم شخصیات کی ذات سے وابستہ خاص و عام واقعات ان کو ازبر تھے۔ انھیں واقعات بیانی کا فن آتا تھا۔ جب وہ ادبی دنیا کے کسی واقعے کو بیان کرتے تو فوراً انجام کو واضح نہیں کرتے تھے بلکہ وہ رفتہ رفتہ انجام کی طرف بڑھتے تھے۔ وہ یہ بھی خیال رکھتے تھے کہ سامع پر تجسس کا خمار مسلط ہو جائے اور باتوں کے سننے میں اس کی دلچسپی مزید بڑھتی جائے۔ ان کی گفتگو عام طور پر پُرکشش اور جاذب لفظیات سے آراستہ ہوتی تھی۔ ان میں واقعات بیان کرنے کی جو خوبی تھی اگر وہ افسانہ لکھتے تو یقیناً ایک اچھے افسانہ نگار ثابت ہو سکتے تھے۔

پروفیسر ظفرالدین کو یونیورسٹی کے انتظامی امور اور دفتری معاملات پر گہری دسترس حاصل تھی۔ وہ یونیورسٹی کے متعدد شعبہ جات کے صدر، اسکول کے ڈین، مراکز کے ڈائرکٹر، پراکٹر، پبلک ریلیشنز آفیسر، چیف وارڈن، سیکورٹی انچارج، لائبریرین اور کنٹرولر امتحانات جیسے اعلیٰ عہدوں پر جز وقتی یا مکمل طور پر فائز رہے۔ ان کا تقرر پہلے وائس چانسلر شمیم جیراج پوری کے دست مبارک سے 13 مارچ، 1998 کو عمل میں آیا تھا۔ ان کی خوبی، محنت اور لگن کے باعث بیشتر وائس چانسلرز نے ان پر اعتماد کیا اور انھیں اہم ذمہ داریوں سے نوازا۔

ظفرالدین صاحب کو نوٹنگ، ڈرافٹنگ، منٹس اور پروپوزل تیار کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ اردو کے ساتھ انگریزی زبان پر بھی ان کی گرفت تھی اور ترجمے کا بھی خاصا تجربہ تھا۔ مانو میں تقرری سے قبل اخبارات میں تراجم کا انھیں طویل تجربہ تھا۔ مانو میں انھوں نے بحیثیت پبلک ریلیشنز آفیسر اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ ظفرالدین صاحب سے میرا رابطہ اس وقت ہوا جب وہ مرکز مطالعات اردو ثقافت کے ڈائرکٹر تھے۔ یہاں انگریزی زبان میں نوٹنگ، منٹس اور پروپوزل تیار کرنے کی اکثر ضرورت درپیش

رہتی تھی۔ یہ کام میرے لیے بالکل نیا تھا کیونکہ مجھے خالص تدریس کا تجربہ تھا۔اس کام میں ظفرالدین صاحب نے نہ صرف مدد کی بلکہ میری کوششوں کی حوصلہ افزائی بھی کی۔

ظفرالدین صاحب اکثر اس بات کے لیے کوشاں رہتے تھے کہ اپنے سینٹر کو کس طرح فعال اور سرگرم رکھا جائے۔اس سلسلے میں اکثر میری ان سے گفتگو ہوتی تھی۔ان کا مشورہ تھا کہ ہمیں ریسرچ پر توجہ دینی چاہیے۔ یہاں ریسرچ سے مراد یہ ہے کہ یو جی سی یا دیگر سرکاری اداروں سے ذاتی یا مرکز کی جانب سے ریسرچ پروجیکٹ حاصل کرنا چاہیے۔اس ضمن میں ہم دونوں کی تیاری چل رہی تھی کہ مرکز کی جانب سے اور ذاتی طور پر بھی یو جی سی میں میجر ریسرچ پروجیکٹ کے لیے درخواست دی جائے۔اس کے علاوہ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ مرکز میں جب تک ریگولر درس وتدریس کا ماحول قائم نہ ہوگا، اس کی معنویت اور افادیت میں اضافہ ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے لیے ہمیں کوشش کرنی چاہیے۔ یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ مرکز مطالعات اردو ثقافت کی جانب سے Non-CGPA کے تحت کل چھے پرچے پڑھائے جاتے ہیں۔

ان کورسیز میں بی اے اور ایم اے سطح کے تمام اسٹریم کے طلبہ رجسٹرڈ ہوتے ہیں۔ظفرالدین صاحب کی کوشش تھی کہ ان کورسیز کو مزید فعال اور جاذب بنایا جائے۔اس کے لیے ضروری یہ تھا کہ طلبہ کے سامنے نصاب کا واضح خاکہ موجود ہو۔لہٰذا انھوں نے مجھے نصاب تیار کرنے کی ذمہ داری دی جوان کی نگرانی میں ہی یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔وہ پابندی کے ساتھ مذکورہ کورسیز کی کلاس لیتے تھے۔ وہ موجودہ تدریسی نظام سے کلی طور پر مطمئن نہیں تھے۔ان کی خواہش تھی کہ ان کے علاوہ بھی کچھ کورسیز ایسے ہوں جن میں طلبہ مرکز کے تحت براہِ راست داخلہ لیں اور یہاں ریگولر بنیاد پر درس وتدریس کا ماحول قائم ہو۔اس کے لیے انھوں مجھے ایک بار پھر یہ ذمہ داری دی کہ آپ ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسیز کا پروپوزل تیار کیجیے۔مشورے کے بعد یہ طے پایا کہ پی جی ڈپلوما، ڈپلوما اور سرٹیفیکیٹ کورسیز کا خاکہ اور نصاب تیار کیا جائے۔ان کورسیز کا خاکہ اور نصاب تیار کرنے میں خاصا وقت صرف ہوا اور کئی میٹنگوں کے بعد یہ کام مکمل ہوا۔اب اگلہ مرحلہ تھا کہ اسے بورڈ آف اسٹڈیز میں بھیجنے سے قبل سینٹر کی مشاورتی کمیٹی سے پاس کرایا جائے، جس کے پیشِ نظر ظفرالدین صاحب نے ایڈوائزری کمیٹی کی میٹنگ کا اہتمام کیا۔

مرکز کے تئیں ظفرالدین صاحب کا ایک اور خواب تھا جسے وہ حقیقت کا جامہ پہنانا چاہتے تھے۔مرکز کا موجودہ نام ''مرکز مطالعات اردو ثقافت'' ہے جس کا نام پہلے ''مرکز برائے اردو زبان، ادب

اور ثقافت'' تھا۔موصوف کا خیال تھا کہ مرکز کے پہلے نام کا دائرہ وسیع تھا جبکہ موجودہ نام میں صرف ثقافت پر زور ہے۔لہٰذا پہلے نام کی بازیافت ایک ضروری قدم ہے۔اس طرح انھوں نے بورڈ کی میٹنگ میں موجودہ نام کو تبدیل کرنے کی تجویز پیش کی جسے اتفاق رائے سے قبول کرلیا گیا۔یہ سلسلہ بھی ابھی اپنے انجام تک نہیں پہنچ سکا۔

ظفرالدین صاحب سینٹر کے اغراض و مقاصد سے بخوبی واقف تھے۔لہٰذا اردو تہذیب و ثقافت کے فروغ کے لیے بھی وہ پوری سرگرمی کے ساتھ کوشاں رہتے تھے۔وہ تحقیق اور تدریس کے ساتھ کلچرل اور ادبی پروگرام کا انعقاد بھی ضروری سمجھتے تھے۔اس کے لیے انھوں نے سالانہ پروگرام کا نظام الاوقات تیار کرایا تھا۔ان کا خصوصی زور اس بات پر رہتا تھا کہ مرکز کی جانب سے انوائٹید لکچر، سمینار اور ورک شاپ کا اہتمام ضروری ہے۔وہ بہت سے پروگرام کرنا چاہتے تھے لیکن مالی معاونت کے بغیر یہ ممکن نہ تھا۔لہٰذا وہ ایک بار مجھ سے کہنے لگے کہ اگر یونیورسٹی یا کسی سرکاری ادارے سے مالی تعاون نہیں ملتا تو ہم لوگ خود اس کے مصارف برداشت کریں گے اور مہمان مقرر کو کم از کم دو ہزار فی لکچر دینے کا انتظام کریں گے۔لیکن اس طوفانِ وبا میں اس سلسلے کو آگے نہیں بڑھایا جا سکا۔

ظفرالدین صاحب بلا کے ذہین تھے۔انھیں ترسیل کا فن آتا تھا۔کون سی بات کب کہنی ہے اور کیسے کہنی ہے، اس سے بخوبی واقف تھے۔ان کے جملے بڑے سدھے ہوتے تھے۔الفاظ کا انتخاب بھی بہت غور وخوض کے ساتھ کرتے تھے۔جملوں کی بہتر ادائیگی پر انھیں گرفت حاصل تھی۔وہ اشتعال سے گریز کرتے تھے۔بہت سنجیدگی کے ساتھ کسی کی بات سنتے اور اپنا ردعمل ظاہر کرتے تھے۔اگر کوئی بات ناگوار ہوتی تو فوراً اس پر اپنے تاثرات کا اظہار کرنے سے پرہیز کرتے تھے۔وہ سامنے والے کو بھی موقع دیتے کہ وہ اپنی باتوں پر غور کرے اور اس دوران وہ خود بھی اپنا احتساب کرتے تھے۔لہٰذا ٹکراؤ کی صورت نہیں پیدا ہوتی تھی۔وہ کسی بھی طرح کے ٹکراؤ سے گریز کرتے تھے۔وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جس مسئلے کا حل بغیر ٹکراؤ کے نکل سکتا ہے تبھی وہ اس پر آگے بڑھتے تھے۔ورنہ اپنا قدم پیچھے کھینچ لیتے تھے۔میں نے ایک بار ان سے کہا اتنے دنوں میں آپ کو کبھی غصہ کرتے نہیں دیکھا، آخر اس کا راز کیا ہے۔وہ مسکرائے اور پھر کہا کہ جناب کون شخص ہے جسے کبھی غصہ نہیں آتا؟ ہاں اتنا ضرور ہے کہ کچھ لوگ اس پر قابو کر لیتے ہیں اور کچھ نہیں کر پاتے۔جہاں تک میرا تعلق ہے میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ اپنے غصے پر قابو رکھ

سکوں، اللہ اس کام میں میری مدد فرماتا ہے۔

ظفرالدین صاحب کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ لوگوں کی نفسیات کو بڑی گہرائی سے سمجھتے تھے۔ کوئی شخص کس نفسیاتی عمل کے تحت ردعمل ظاہر کرسکتا ہے، اس کا انھیں بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ وہ کبھی کوئی ایسی بات نہیں کرتے تھے جس سے مخاطب کو نفسیاتی ٹھیس پہنچے۔ وہ شخص کی نفسیاتی سطح کے پیش نظر ہی اپنا مدعا بیان کرتے تھے۔ ایک اعلیٰ وافضل مرسل وہی ہوتا ہے جسے اعلیٰ انتظامیہ اور ماتحت عملہ سے گفت وشنید کی یکساں مہارت حاصل ہو۔ اس عمل میں ظفرالدین صاحب یکتا اور نادر تھے۔

ظفرالدین صاحب اپنے ماتحتوں کو موقع دینے میں انتہائی فراخ دلی کا ثبوت دیتے تھے۔ ان کے اس عمل سے نہ صرف دفتر کے عملہ کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی بلکہ ان کے اعتماد میں اضافہ بھی ہوتا تھا۔ وہ جسے پسند کرتے تھے اس کی ضرورت، خواہش، تکلیف، درد اور خوشی کو اپنا سمجھتے تھے۔ وہ اپنی استطاعت کے مطابق اس کی بھرپور مدد کرتے تھے۔

ظفرالدین صاحب ایک دور اندیش شخصیت کے مالک تھے ۔ حال اور مستقبل پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ حال کے معاملات کو مستقبل کے پیشِ نظر طے کرتے تھے۔ اس طرح وہ اپنے حال اور مستقبل کو بیک وقت بہتر بنانے میں اکثر کامیاب ہوتے تھے۔ ظفرالدین صاحب نے اپنی دانشوری یا وژن کا کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ ان کی کل کائنات مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی تھی ۔ اسی کو وہ اپنا منبع و مخرج سمجھتے تھے۔ وہ بہت سادگی اور خاموشی سے اپنے کام کو انجام دیتے تھے۔ انھیں یونیورسٹی کی جانب سے جو بھی ذمہ داری ملتی اسے انتہائی حسن وخوبی سے انجام تک پہنچاتے تھے اور اپنی دوراندیشی وحکمت عملی سے انھوں نے ہمیشہ ایک نیا معیار قائم کیا۔

ہم سبھی جانتے ہیں کہ ان کی ایک شناخت ششماہی مجلّہ ''ادب وثقافت'' کے مدیر کی بھی ہے۔ انھوں نے جس خوبی سے اس کی ادارت سنبھالی تھی یہ انھیں کا حصہ ہے۔ وہ مضامین کے انتخاب میں انتہائی دیانت داری کا ثبوت دیتے تھے۔ جب مرکز مطالعات اردو ثقافت سے 'ادب وثقافت' کی اشاعت کا دوبارہ سلسلہ شروع ہوا تو میں بھی اس سے بحیثیت نائب مدیر وابستہ ہوگیا۔ اس کا سہرا ظفرالدین صاحب کے سر جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی ذاتی کوشش اور دلچسپی سے یونیورسٹی انتظامیہ سے اجازت لے کر مجھے اس کا حصہ بنایا۔ میری شمولیت کے بعد 'ادب وثقافت' کا پہلا شمارہ مارچ 2021 میں شائع ہوا۔ وہ مجھ سے

اکثر کہا کرتے تھے کہ ادب وثقافت کے معیار کو ہمیشہ برقرار رکھنا ہے۔اس کے لیے چاہے کسی کی بھی ناراضگی کیوں نہ مول لینی پڑے۔ان کے یہاں اکثر ایسے اساتذہ کا فون آیا کرتا کہ ان کے ریسرچ اسکالرز کا مضمون رسالے میں شائع کر دیں۔اگر مضمون معیاری ہوتا تو اسے قبول فرماتے اور غیر معیاری ہوا تو صاف انکار کر دیتے تھے۔وہ رسالے کے معیار سے کبھی سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔ان کی کوشش ہوتی کہ اس کا معیار روز افزوں بلندی کی جانب رواں رہے۔

ظفرالدین صاحب کی یہ خواہش تھی کہ مرکز میں سمینار کا سلسلہ ہونا چاہیے۔انھیں جب علم ہوا کہ سال 2020 کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی کی جانب سے سمینار/کانفرنس/ورک شاپ کے لیے مالی تعاون کا اشتہار آیا ہے تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ مرکز کی جانب سے دوروزہ قومی سمینار کے لیے وہاں فوراً تجویز پیش کیجیے۔ان کے مشورے اور مرکز کے اغراض ومقاصد کے پیش نظر دوروزہ قومی سمینار بعنوان ''اردو زبان کے تہذیبی وثقافتی ادارے (مشاعرہ، مرثیہ خوانی،قوالی،داستان گوئی، چہار بیت،لوک گیت، رہس، ڈراما اور سنیما)'' کے مالی تعاون کے لیے این سی پی یو ایل میں درخواست دے دی گئی، جسے منظور بھی کر لیا گیا۔لہٰذا مذکورہ عنوان سے 16-15 فروری 2021 کو دوروزہ قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ہم سبھوں کو یہ کہاں علم تھا کہ ظفرالدین صاحب کی سرپرستی میں یہ آخری سمینار ہے۔جب سمینار کا دعوت نامہ تیار کیا جا رہا تھا تو میں نے ان سے کہا کہ کارڈ پر آپ کا نام بحیثیت ڈائرکٹر تو ہے ہی،اس کے علاوہ کنوینر کے طور پر آپ کا ہی نام جانا چاہیے لیکن انھوں نے سختی سے انکار کر دیا اور کہا کہ دعوت نامے پر کنوینر کے طور پر آپ کا نام جائے گا۔میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا کہ آپ مرکز کے ملازمِ اول ہیں لہٰذا بحیثیت کنوینر آپ کا نام مناسب ہے لیکن وہ قطعی نہیں مانے اور کہا کہ یہ سمینار آپ کے ذہن کی پیداوار ہے لہٰذا سمینار کے کنوینر آپ ہی ہوں گے۔دراصل یہ ان کی اعلیٰ ظرفی تھی کیونکہ عام طور پر اردو دنیا میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔حقیقتاً وہ محنت کرنے والوں کی قدر اور حوصلہ افزائی کرتے اور انھیں آگے بڑھاتے تھے۔

ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ انسان خوبیوں اور خامیوں کا مرکب ہوتا ہے۔اگر اس میں خامیاں نہ ہوں تو وہ انسان نہ ہو کر فرشتہ بن جائے۔یہ اور بات ہے کہ کسی میں خوبیاں زیادہ ہوتی ہیں تو کسی میں خامیاں۔دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ کسی کی خوبی یا خامی کا تعلق صرف اس کی ذات سے نہیں ہوتا بلکہ رائے قائم کرنے والے کی ذات سے بھی ہوتا ہے۔ایک ہی شخص کسی کی نظر میں اعلیٰ وافضل ہے اور

وہی دوسرے کی نظر میں معمولی کردار کا حامل ہے۔اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم جس کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں اس میں اس شخص کے کردار کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کا عمل دخل بھی ہوتا ہے۔ پروفیسر ظفرالدین صاحب کوئی فرشتہ نہیں بلکہ ہم جیسے ایک انسان تھے۔ان میں بھی خوبیاں اور خامیاں رہی ہوں گی۔میں نے اس مضمون میں ان کی جو تصویر پیش کی ہے، وہ میرے مشاہدات اور تجربات کا حاصل ہے۔ دراصل ظفرالدین صاحب کی شخصیت ایک محبّ اردو، مترجم، ناقد، ادیب، مدبر، مشفق، دوراندیش، ذہین، خوش گفتار، جہدکار، جہاں دیدہ اور بلند کردار انسان کی ہے۔دنیائے اردو کا یہ درخشاں ستارا اب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا ہے۔ان کی کمی کو پورا کرنا آسان نہیں ہے۔ان کی یادیں ہمیشہ مضطرب کرتی رہیں گی۔ اگرچہ وہ ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ہمیشہ ہم سبھوں کی یادوں میں زندہ رہیں گے۔

❒ **Dr. Ahamad Khan**
Associate Professor
Center for Urdu Culture Studies
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad - 500032
Mobile: 9868701491
Email: ahmadk71@yahoo.co.in

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:129-139
Ms. Sania Zafar, Mere Pyare Abbu Jan

ثانیہ ظفر

میرے پیارے ابو جان

اے میری پیاری ثانی

تم پر جان قربان

مجھے یاد ہے کہ ابو میرے لیے یہی گاتے تھے۔ان کے یہ الفاظ آج بھی میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔5/اپریل 2021ء کی صبح تک یہی آواز میرے کانوں میں آتی رہی۔وہ دن بھی ایک عام سا دن تھا لیکن میرے شوہر کے موبائل پر مسلسل آتی ہوئی کالوں سے مجھے یہ احساس ہوگیا کہ کچھ تو ہوا ہے۔ چاروں طرف فضا میں ایک عجیب سی گھٹن تھی،ایسی گھٹن جس میں سانس لینے کے لیے بھی مجھے خاصی جدو جہد کرنی پڑ رہی تھی۔ میرے موبائل فون پر آنے والے پہلے دو میسج ابو کی نازک حالت کے بارے میں تھے۔تیسرے میسج سے معلوم ہوا کہ ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔میں نے اپنے فون کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور خود کو نارمل رکھنے کے لیے گہری گہری سانسیں لے رہی تھی لیکن تیسرے میسج نے مجھے جیسے اچانک کسی گہری کھائی میں ڈھکیل دیا کہ جس سے میں آج تک باہر نہیں آسکی اور آئندہ بھی مجھے اس کا یقین نہیں۔اس دن سے آج تک میں اس کے لیے جدو جہد کر رہی ہوں لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ کبھی اختتام تک نہیں پہنچے گی۔

''بھائی جان نہیں رہے'' ہمارے فیملی وہاٹس ایپ گروپ میں میرے چچا نے یہ میسج کیا اور اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا،اس کے دھندلے سے نقوش ہی اب ذہن میں باقی ہیں۔ میں قطر سے حیدرآباد کے لیے روانہ ہوئی۔ ہاتھ میں ہوائی جہاز کا وہ ٹکٹ تھا جس پر لکھا تھا۔'' -*Emergency visit* *death of father*'' میں لگاتار کاغذ کے اس پرزے کو دیکھ رہی تھی، جو کچھ اس پر لکھا ہوا تھا۔اسے دیکھ کر مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔میرے شوہر نے بڑی ہی مشکلوں سے ہندوستان کے لیے ہماری اس پرواز کو ممکن بنایا تھا۔میرا ذہن یکے بعد دیگرے ایسے ہی کئی واقعات کو آج بھی اپنے دامن

میں سمیٹے ہوئے ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں کچھ بھی سن نہیں پا رہی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے آس پاس کے سبھی لوگ خاموش ہیں، مجھے صاف صاف کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا اور میرا ذہن آس پاس کی کسی بھی چیز کو سمجھنے اور محسوس کرنے سے قاصر تھا۔

اس رات جب میں ایرپورٹ پر پہنچی تو وہاں مجھے لینے کے لیے میرے ابو موجود نہیں تھے۔ ایسا منظر تو کبھی نہیں دیکھا تھا، یہ کیسی ملاقات تھی؟ مجھے اپنے گھر آئے دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور ان دو برسوں میں میں نے جانے کتنے ہی پروگرام بنائے تھے کہ مجھے گھر جا کر کیا کیا کرنا ہے، گھر والوں کے ساتھ کیسے کیسے مزے کرنے ہیں لیکن آج صرف میں تھی، کون اس صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کر سکتا ہے۔ میں ان پچیس سالوں کے بارے میں سوچتی ہوں جو میں نے اپنے ابو کے ساتھ گزارے ہیں۔ محسوس تو یہی ہوتا ہے کہ یہ عرصہ کتنا مختصر تھا، کتنا کم؟ لیکن اس کے اثرات تا عمر باقی رہیں گے۔

جب میں ابو کے بارے میں سوچتی ہوں تو جو پہلا واقعہ میرے ذہن میں آتا ہے وہ اس وقت کا ہے جب میں ابو سے کہہ رہی ہوں کہ وہ بازار جا کر میرے لیے پالک لے آئیں۔ پھر بطور خاص وہ عید یاد آتی ہے جب میں نے بینگنی رنگ کا لباس پہنا تھا اور ابو کے ساتھ عید کی نماز کے لیے جانا چاہتی تھی۔ وہ مجھے ''ثان'' کہتے تھے، میں آپ کو بتاؤں مجھے یہ نام پسند نہیں تھا لیکن درحقیقت یہ میرا پسندیدہ نام تھا اور ابو یہ بات جانتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ ہم لوگوں نے کئی گھر بدلے۔ ایک گھر ایسا بھی تھا جس کے پیچھے کافی کھلی ہوئی جگہ تھی۔ میں سائیکل چلانا سیکھنا چاہتی تھی اور ہر صبح ابو کے ساتھ ادھر جایا کرتی۔ وہ سائیکل پکڑ لیتے اور میں پیڈل مارتی اور جیسے ہی توازن قائم کر لیتی وہ مجھے چھوڑ دیتے۔ جس قدر میں سمجھتی ہوں زندگی بھی اسی طرح آگے بڑھتی ہے، لیکن میں اپنے ابو سے کہنا چاہتی ہوں کہ میں نے ابھی زندگی کو متوازن طور پر گزارنا نہیں سیکھا ہے، مجھے آپ کی ابھی بھی ضرورت ہے۔ ایسا وقت تو کسی بھی بیٹی کی زندگی میں نہیں آتا کہ جب اسے اپنے باپ کی ضرورت نہ محسوس ہو۔ میں ان سے یہ سب کہنا چاہتی تھی لیکن نہیں کہہ سکی۔

پہلا اسکول جس میں میرا داخلہ ہوا، میرے گھر سے تھوڑی ہی دور تھا۔ ابو اکثر صبح کے وقت مجھے اپنے اسکوٹر سے اسکول چھوڑ دیا کرتے تھے۔ میں اسکوٹر کا ہینڈل پکڑ لیتی اور ابو اپنے بجاج اسکوٹر کو ڈرائیو کرتے۔ میں نے پہلی بار مانو کیمپس ابو کے اسی اسکوٹر پر جا کر دیکھا، اس وقت تک کیمپس پوری طرح بنا نہیں تھا۔

ہم دوسرے بچوں کی طرح اپنے گھر کے پاس پڑوس میں بھی جایا کرتے تھے۔ پارکوں میں بھی جاتے، میں پارک میں ابو کے ساتھ کھیلا کرتی اور جب واپس ہونے لگتی تو ان سے ضد کرتی کہ وہ مجھے گود میں لے کر چلیں کیونکہ میں بہت تھک گئی ہوں۔ میں تقریباً ان کے اوپر کود جاتی اور وہ مجھے پکڑ لیا کرتے اور اس طرح ہم گھر واپس آتے۔ بچپن کے وہ معصوم اور پیارے دن جب ہم کس قدر خوش وخرم تھے اور زندگی کتنی سادہ تھی۔

مجھے کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق ہے، جس قدر پڑھنا چاہتی ہوں اتنا تو نہیں لیکن مہینے میں ایک یا دو کتابیں تو ضرور ہی خرید لیتی ہوں۔ مطالعے کی یہ عادت مجھے اپنے ابو سے ملی ہے۔ وہ مجھے حیدرآباد کی مشہور مارکیٹ ایبٹس میں اتوار کو لگنے والی کتابوں کی دکانوں پر لے جایا کرتے تھے۔ کتابوں کے اسی بازار سے میرے مطالعے کا شوق پروان چڑھا۔ فٹ پاتھ پر پھیلی ہوئی کتابیں دیکھ کر میں بے حد متاثر ہوئی تھی، خالد حسینی، نکولس اسپارک، چیتن بھگت وغیرہ سبھی کی کتابیں موجود تھیں۔ تقریباً ہر اتوار کی شام ہم وہاں جاتے تھے۔ میں کسی کتاب کا انتخاب کرتی اور ابو کو پکڑا دیتی، وہ دکان دار سے اس کی قیمت دریافت کرتے اور میں سمجھ لیتی کہ اب یہ کتاب میری ہوگئی۔ میرے ابو نے کبھی بھی پڑھنے لکھنے اور دیگر کسی بھی مفید چیز کے لیے خرچ کے تعلق سے مجھے فکرمند نہیں ہونے دیا۔ وہ مجھے کتنے ہی کتاب میلوں میں لے کر گئے۔ اور تب مجھے اپنے بستے کی وسعت کا اندازہ ہوتا تھا، یکے بعد دیگرے کتنی ہی کتابیں اس میں آجاتیں۔ کوئی بھی عنوان، کوئی بھی سرورق جو مجھے متاثر کرتا وہ کتاب میری ہو جاتی۔ اسی طرح ہمارے گھر میں ایک لائبریری تیار ہوگئی۔ دیواریں ان الماریوں سے چھپ گئی تھیں جن میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ یہ تھی کتابوں سے میرے ابو کی دلچسپی کہ جس پر ہم سب فخر کرتے تھے۔

چند صفحات میں بیان کرنے کے لیے ایسی بہت سی یادیں ہیں، ایسی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں جب میں نے اپنے ابو جان سے زندگی کے کتنے ہی سبق سیکھے۔ زندگی کو ہر حال میں جینے کا جوجذبہ ان کے اندر موجود تھا، اس کی مثال نہیں دی جاسکتی۔ ان کا ایقان تھا کہ سوچ ہمیشہ بلند ہونی چاہیے، مقاصد عظیم ہونے چاہئیں۔ وہ اس پر یقین رکھتے تھے کہ بہتر سے بہتر کے حصول کے لیے پوری کوشش کی جانی چاہیے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے ان سے ایک شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا کہ میں لندن جا کر تخلیقی ادب میں ایم اے کرنا چاہتی ہوں تو میرے ابو نے فوراً کہا بالکل جاؤ۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے وہاں کی ہر یونیورسٹی میں داخلے کے لیے درخواست دو۔ میری مسکراہٹ ایک بے ساختہ ہنسی

میں تبدیل ہو گئی لیکن مجھے ابو کے اس ردعمل سے قطعی تعجب نہیں ہوا تھا کیونکہ میرے ابو اسی طرح کے تھے۔ وہ اس میں مکمل یقین رکھتے تھے کہ خواب دیکھے جائیں اور زندگی میں خواب ضرور آپ کے ہمراہ ہوں۔

میری زندگی کے ایسے ہی ایک مشکل وقت میں انہوں نے مجھے ایک خط لکھا کہ کس طرح انسان کی بے جا انا اس کی سب سے بڑی دشمن ہوتی ہے جو بے حد قیمتی رشتوں کو بھی برباد کر دیتی ہے۔ اگر ابو کے اس جملے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ میرے ابو کس قدر سادہ لوح انسان تھے تو پھر اور کیا ظاہر ہوتا ہے؟ میں نے اس خط کو ان گنت بار پڑھا لیکن میں اسے کبھی پورا نہیں پڑھ سکی کیونکہ میرے مسلسل بہنے والے آنسوؤں اور بے قرار دل نے کبھی مجھے یہ خط پورا نہیں پڑھنے دیا۔ شاید کبھی، کسی دن جب میں خود کو زیادہ مضبوط بنا سکوں تو اسے پڑھ سکوں۔

میرے دادا جان کے پاس ایک ڈائری تھی جس میں انہوں نے میرے ابو کے بارے میں بہت کچھ لکھا تھا۔ اس ڈائری میں جو کچھ بھی لکھا ہے اس سے ان کے جذبات کا علم ہوتا ہے جو ایک باپ کے دل میں اپنے بیٹے کے لیے ہوتے ہیں۔ میرے دادا جان نے لکھا ہے کہ کس طرح محض 17 سال کی عمر میں میرے ابو نے اپنا وطن ''گیا'' چھوڑ کر ایک نئی راہ کی تلاش میں دہلی کا رخ کیا۔ انہوں نے اپنی دنیا آپ بنانے کے لیے گھر چھوڑا اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ میرے ابو کے مزاج اور بحیثیت ایک کامیاب انسان سماج و معاشرے میں ان کے مقام پر میرے دادا جان کو بھی فخر تھا۔ ابو نے بھی باوجود اپنی تمام تر کامیابیوں کے خود کو ہمیشہ ایک اچھا بیٹا ہی ثابت کیا اور ان سب کا ثبوت صرف دادا جان کی اس ڈائری سے ہی نہیں ملتا بلکہ وہ واقعتاً دادا جان کا اتنا ہی خیال رکھتے تھے۔ ایک لمبے اور دشوار گزار سفر کے باوجود بھی وہ ان سے ملنے جایا کرتے۔ دادا جان سے ان کی یہ وابستگی ان خطوط اور چیزوں سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو وہ انہیں برابر بھیجا کرتے تھے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ابو کس طرح دادا جان کے بستر کے سامنے بیٹھ کر ان سے نیچی آواز میں انتہائی نرمی کے ساتھ ان سے گفتگو کرتے تھے۔ میں اندازہ کر سکتی ہوں کہ ان دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہوتی ہوگی۔ شاید دونوں اس دور، اس زمانے کو یاد کرتے تھے جو گزر گیا۔ ایک بچی کے طور پر میں نے اس وقت بھی محسوس کیا تھا کہ وہ ایک مثالی اولاد تھے۔ میں اس وقت صرف یہی سوچ سکی تھی کہ جب کبھی اسی طرح ابو کا بڑھاپا ہوگا تو میں بھی ایسا ہی کروں گی۔ صبر و سکون کے ساتھ ابو کے سامنے، ان کے قریب بیٹھوں گی۔ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ان سے وہ سب بیان کروں گی جو مجھے زندگی میں پیش آیا ہوگا لیکن افسوس اب ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا۔ میں اس طرح ابو کا ہاتھ اپنے

ہاتھوں میں کبھی نہیں لے سکوں گی، آہ میرے ابو کتنی جلدی چلے گئے۔

ابو اپنی ماں کے بھی بے حد قریب تھے۔ میری دادی اپنی عمر کی پانچویں دہائی میں ابو کی شادی سے چند ماہ قبل ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں۔ گو کہ میں نے انہیں نہیں دیکھا لیکن ابو کی زبانی دادی سے متعلق بہت سے واقعات سننے کے بعد میں نے خود کو ان سے قریب محسوس کیا ہے۔ ابو اپنے سبھی بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے۔ انہوں نے ایک بڑے کے طور پر اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھایا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے بھائی، بہنوں میں ہر ایک کے تعلق سے فکر مند رہا کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی طرح کے تعاون اور مدد سے گریز نہیں کیا۔ میرے دو چچا پروفیسر شہزاد انجم اور جناب منہاج اصغران کے بہترین ساتھی تھے۔

میرے ابو نے ایک ایسی زندگی گزاری جس میں انہوں نے ابتداء سے ہی اپنی کفالت خود کی۔ وہ کبھی بھی خود ترحمی کا شکار نہیں ہوئے۔ انہیں اپنی قوت عمل پر پورا بھروسہ تھا۔ انہیں اس بات پر فخر تھا کہ اتنے نامساعد حالات کے باوجود انہیں کامیابی حاصل ہوئی۔ وہ صحیح معنوں میں ایک خودساز انسان تھے جو بطور ایک مثال کے ہمیشہ میری زندگی کا حصہ رہیں گے۔

میرے ابو کی رہائش گیا، دہلی اور حیدرآباد میں رہی تھی اور وہ ان تینوں شہروں سے بے حد متاثر تھے۔ گیا میں ان کی پیدائش ہوئی تھی، دہلی میں انہوں نے تعلیم حاصل کی اور بالآخر اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ حیدرآباد کا رخ کیا۔ ایک دوسرے سے زبان اور کلچر کے نقطۂ نظر سے ایک دوسرے سے پوری طرح مختلف ان شہروں میں ابو نے اپنی زندگی کو کامیابی سے ہم کنار کیا۔ گیا میں ہمارے گھر کے سامنے ایک مسجد تھی جہاں میرے دادا جان اپنے اوقات گزارا کرتے تھے۔ وہاں وہ بچوں کو پڑھاتے بھی تھے اور انہیں کتابت بھی سکھاتے تھے۔ میرے ابو نے اس کے بارے میں مجھے کئی کہانیاں سنائی تھیں۔ انہوں نے مجھے خشخاش کی روٹی اور مرغ کے اسٹیو کے بارے میں بھی بتایا جو گیا کا خاص پکوان تھا۔

ان کی طالب علمانہ زندگی اور ایک مختصر دور ملازمت دہلی میں گزرا۔ انہوں نے ہمیں کریم ہوٹل کے بارے میں بتایا۔ وہ انتہائی شوق کے ساتھ قطب مینار دیکھنے اور آدھی رات کو انڈیا گیٹ کے سبزہ زار پر آئس کریم کھانے کا ذکر کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اکثر و بیشتر دہلی یونیورسٹی کا ذکر اس طرح سے کیا کہ ہم سب گھر والے اس یونیورسٹی سے ایک طرح کی قربت محسوس کرتے تھے۔ دہلی یونیورسٹی کی کینٹین اور میس سے ان کا لگاؤ، اپنے پروفیسروں سے ان کا تعلق خاطر ان سب کے بارے میں وہ ہمیں بتاتے تھے۔ انہیں

اس بات پر ناز تھا کہ انہوں نے دہلی یونیورسٹی میں فرسٹ پوزیشن کے ساتھ گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔

ملازمت کے تعلق سے انہیں سب سے بڑی کامیابی حیدرآباد میں ملی اور وہ اپنے خاندان کے ساتھ اس نئے شہر میں آ گئے۔انہوں نے کھلے دل سے اس شہر کو قبول کرلیا۔وہ دکنی اردو سمجھتے اور اسے پسند بھی کرتے تھے۔ان کا یہ بھی خیال تھا کہ حیدرآبادی بریانی کا کوئی جواب نہیں۔آج بھی ہمارے یہاں بریانی کی ایک قسم ہے جو پکائی جاتی ہے۔

ابو نے 16/مارچ 1998ء کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں شمولیت اختیار کی تھی۔وہ اس یونیورسٹی کے بنیاد گزاروں میں شامل تھے اور انہیں اس یونیورسٹی سے ایک خاص تعلق خاطر تھا۔پریم چند نے اپنی کسی کہانی میں لکھا ہے کہ ایک کسان کو اپنا کھیت دیکھ کر اسی طرح کی خوشی و مسرت محسوس ہوتی ہے جو ایک ماں کو اپنے بیٹے کو دیکھ کر ہوتی ہے۔اردو یونیورسٹی کی ترقی و کامیابی کو دیکھ کر میرے ابو کو اسی طرح کی خوشی محسوس ہوتی تھی۔یونیورسٹی کی ترقی اور اس کے فروغ کے لیے میرے ابو نے بغیر کسی غرض کے انتھک محنت کی۔میں نے ان میں ہمیشہ یونیورسٹی کے تمام معاملات کو اولین ترجیح دینے کا جذبہ پایا۔یونیورسٹی سے ان کا تعلق ویسا ہی تھا جیسا اس باپ کا ہوتا ہے جو اپنے بچے کو پھلتے پھولتے ہوئے دیکھتا ہے۔وہ ہمیشہ پروفیسر قمر رئیس اور پروفیسر شارب ردولوی کا ذکر اس اعتراف کے ساتھ کرتے تھے کہ ان دونوں نے ابو کی بڑی رہنمائی کی تھی۔وہ ان تمام لوگوں کے احسان مند رہا کرتے تھے جوان پر بھروسہ کرتے تھے،انہیں قابل اعتماد قرار دیتے تھے۔

شاید ابو کے ہم پیشہ حلقے میں کم ہی لوگوں کو علم ہوگا کہ ان میں حسِ مزاح بہت زیادہ تھی۔وہ ایک خوش مزاج، زندہ دل اور ظریف انسان تھے۔وہ گھر پر ہم سبھوں کو ہمیشہ لطیفے سناتے، ہنساتے اور چھیڑتے رہتے تھے۔ان کی یہ مزاجانہ شگفتگی، مشکل حالات کو بھی خوش گوار اور آسان بنا دیتی تھی۔ہم خاندان کے سب افراد معہ دیگر رشتہ داروں کے اکثر ایک جگہ جمع ہوتے جن میں میری روزی خالہ اور فیروز ماموں ضرور شریک ہوتے تھے۔ہم لوگ ڈھیر ساری خوش گپیاں کرتے اور پوری رات ہنستے ہنساتے گزار دیتے تھے۔میرے ابو ایسی محفلوں کو بہت پسند کرتے تھے۔ان کے نزدیک رشتوں کی بڑی اہمیت تھی۔وہ تعلقات کو بنانے اور برقرار رکھنے میں یقین رکھتے تھے۔انھوں نے ہمیشہ لوگوں کی سالگرہ پر انھیں یاد کیا، مبارک باد دی اور تحائف دیے۔مجھے یاد ہے جب ہم یونیورسٹی کیمپس میں رہتے تھے تو ابو افطار، حلیم اور ڈنر پارٹی کا اہتمام بڑے شوق سے کرتے تھے۔ہمارے گھر مہمان ہمیشہ آتے تھے، چائے دن میں کئی مرتبہ بنتی تھی اور پردے سے ڈرائنگ

روم میں چائے کے ساتھ اسنیکس اور مٹھائیوں کی طشتریاں جاتی رہتی تھیں۔ جب ہماری نانی جان اور نانا جان آتے تو ہمارے کچن گارڈن میں 'کباب پارٹی' ضرور ہوتی تھی۔ میرے ابو جان اپنے گھر میں محفلیں آراستہ کرنے اور جمع ہوئے لوگوں کی خاطر و مدارات کو بے حد پسند کرتے تھے۔ وہ زندگی کو مکمل طور پر جینے میں یقین رکھتے تھے۔ وہ حالات سے سمجھوتا کرنے کے بجائے انہیں بہتر بنانے کے لیے کوشش کرتے تھے۔ انھوں نے مجھے یہ سکھایا کہ اپنے آپ کو کمتر نہ سمجھو اور پُر اعتماد رہو مگر انکساری کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دو۔ زندگی میں ان کی دلچسپی کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ لذیذ کھانوں کے بہت شوقین تھے اور ان کے پاس انواع و اقسام کے پکوان کی ایک لمبی چوڑی فہرست تھی۔

ابو کو گیت گنگنانا بہت پسند تھا۔ وہ جب صبح کے وقت شیو کرتے یا شام کی چائے پیتے تو اکثر گنگنایا کرتے تھے۔ انھوں نے دہلی کے دوران قیام فلم دیکھنے کے کئی واقعات مجھے سنائے، دراصل جن دنوں وہ روزنامہ 'قومی آواز' سے وابستہ تھے، انھیں فلم ریویو کے لیے بحیثیت صحافی خصوصی پاس ملتا تھا۔ میرے ابو باغبانی کا خوب لطف اٹھاتے تھے۔ انھوں نے ہمارے پروفیسر کوارٹر کے پچھلے حصے کو کچن گارڈن میں تبدیل کر دیا تھا۔ امی اور ابو نے بہت سے پودے لگائے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ان سے یہ پوچھا کہ کیا یہ پودے کبھی درخت بنیں گے؟ تو انھوں نے کہا تھا کہ انہیں اس کا یقین ہے کہ یہ پودے درخت بنیں گے اور یہی ہوا بھی۔ ہمارے گھر کے پیچھے آم، پپیتا، ناریل، امرود اور شہتوت کے درختوں کے علاوہ بھی بہت سے درخت تھے۔ ابو کو یونیورسٹی کیمپس کی زندگی پسند تھی، خاص طور پر وہ کیمپس میں ہمارے پڑوسی فضل چچا اور فریدہ آنٹی کے ساتھ وقت گزارنا انہیں بہت اچھا لگتا تھا۔ فضل چچا میرے ابو کے سب سے پرانے اور اچھے دوستوں میں سے ایک تھے۔ وہ رات کو کھانے کے بعد ساتھ ساتھ ٹہلا کرتے تھے۔

ابو کو سیر و سیاحت کا بھی بہت شوق تھا۔ ہم چھٹی کے دنوں میں اکثر گھومنے جایا کرتے تھے۔ آج جب میں سوچتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے زیادہ تر سفر میری خواہش کے مطابق اختیار کیے گئے تھے۔ ایک مرتبہ ہم لوگوں نے بنگلور اور اوٹی کی سیر کی۔ ہم کشمیر بھی گئے اور وہاں ہاؤس بوٹ میں قیام کیا۔ مجھے یاد ہے کہ ابو نے اس پر اصرار کیا کہ ہم کشمیری سیبوں کو محض یوں ہی نہ حاصل کر لیں بلکہ انہیں درخت سے توڑ کر کھائیں بھی۔ چنانچہ ہم لوگ سیب کے باغ میں گئے اور ہم نے ایسا ہی کیا۔ اس سے پہلے میں نے سیب کا درخت نہیں دیکھا تھا، بہر حال میں نے خود ہی سیب توڑے۔ دو دن ہم نے ڈل جھیل میں ایک ہاؤس بوٹ میں بھی گزارے، واہ کیا عیش و آرام تھے۔ ایک بار جب میں نے ابو سے ساحل سمندر

پر کچھ وقت گزارنے کی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے گوا جانے کا منصوبہ بنایا۔ چونکہ گھر کے سبھی افراد ایک ساتھ کچھ اچھا وقت گزارنا چاہتے تھے لہٰذا 2019ء میں ہم نے اپنی آخری چھٹیاں وشاکھا پٹنم میں گزاریں۔ میں آج بھی ان تصویروں کو دیکھتی ہوں جو ہم نے ساحل پر کھینچی تھیں۔ میرے ابو میرے ساتھ کھڑے ہیں، شاید کوئی لطیفہ سنا کر مجھے ہنسانے والے ہیں۔ میرا سر جھکا ہوا ہے اور وہ میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں کہاں معلوم تھا کہ ابو کے ساتھ یہ ہماری آخری سیر و تفریح ہوگی۔

ہمارے پاس ان اوقات کی بہت ساری تصاویر ہیں جن میں بیشتر ابو نے کھینچی ہیں۔ میرے ابو کو فوٹوگرافی سے بہت دلچسپی تھی۔ انھوں نے ان تمام جگہوں کی جہاں ہم گئے اور ان تقریبات کی جن میں ہم نے شرکت کی، ڈھیر ساری تصویریں کھینچیں۔ وہ کسی موقعے کو یادگار بنانے اور اسے محفوظ کرنے کی اہمیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ صبح سویرے اٹھتے اور ضروریات سے فارغ ہونے کے ساتھ اپنے دن کا آغاز کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ ایک منظّم اور نظم و ضبط کی حامل زندگی گزاری۔

میرے ابو مجھ سے ملاقات کرنے کے لیے قطر بھی آئے۔ ہم ایک ہفتے تک ساتھ رہے۔ مجھے یاد ہے کہ وہ مجھے دیکھنے اور مجھ سے ملنے کے لیے کس قدر بیتاب تھے۔ شاید یہ ان کے لیے باعث افتخار تھا کہ وہ ایک ایسے نئے ملک کو دیکھنے جا رہے تھے جہاں ان کی بیٹی رہتی ہے۔ انھوں نے جمعہ کی نماز میرے گھر کے قریب ایک مسجد میں پڑھی۔ انہوں نے یہاں جو کچھ بھی دیکھا، سب کی تصویریں کھینچ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ بغیر تھکے سب کچھ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ بغیر تھکے اور رکے یہاں کی ہر شئے دیکھ لینا چاہتے تھے۔ انہیں یہاں کے 'ولا گیو مال' میں جہاں رات کے وقت بھی دن جیسا ماحول ہوتا تھا، جانا اچھا لگتا تھا۔ 'ویسٹ بے' کی عمارتوں کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ سمندر کے کنارے پیروں تلے آتی ہوئی لہروں پر میرے ساتھ چلتے ہوئے انہیں بے حد سکون ملا۔ ہم نے 'شوق واقف' میں کباب کھائے۔ اس وقت معمول کے مطابق بازار میں بہت چہل پہل تھی اور بہت سی بنچوں کے درمیان ایک بنچ پر بیٹھ کر ہم نے 'شیش طاووق' کھائے۔ وہ رات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی جب میرے والدین میرے اور میرے شوہر کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور ہم دونوں ان کی میزبانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اس وقت ایسا لگا جیسے آج زندگی اپنے محور پر لوٹ گئی ہو۔ میرے شوہر نے جنھیں ابو پیار سے ''جناب ثاقب صاحب'' کہا کرتے تھے، ان کی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مجھے خوشی ہے کہ جب میرے شوہر نے میرے والدین سے قطر آنے کے لیے بہت اصرار کیا تو انہوں نے اپنی سخت مصروفیت کے سبب سے نہ چاہتے

ہوئے بھی قطر کا دورہ کیا۔ میرے شوہر نے انھیں مختلف مقامات پر لے جانے کی ذمہ داری خود نبھائی۔ میرے ابو نے اس شہر کو بڑے شوق سے دیکھا جس میں میں رہتی ہوں۔ میں نے یہ غور کیا کہ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ اس شہر سے بھی ایک جذباتی لگاؤ محسوس کر رہے تھے۔

جب میں واپسی کے وقت قطر ایئر پورٹ پر ابو کو چھوڑنے گئی تو آخری بار انھیں نمناک آنکھوں سے دیکھا اور گلے سے لگا لیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے انھیں اس طرح سے جکڑ رکھا تھا جیسے میں انھیں چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ درحقیقت میں ان کے ساتھ ہی جانا چاہتی تھی۔ انھوں نے سرمئی رنگ کی شرٹ اور پتلون پہن رکھا تھا۔ ان کے بال ہمیشہ کی طرح کنگھی کیے ہوئے تھے۔ مسکراہٹ، ان کے چہرے سے جدا نہیں ہوئی تھی لیکن میں جانتی تھی کہ وہ میرے ساتھ ابھی اور رہنا چاہتے تھے پھر چاہے وہ ایک لمحہ ہی کیوں نہ ہو۔ جدا ہوتے وقت ہم دونوں نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں حوصلے سے کام لوں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ میرے ذہن میں آج بھی اس وقت کی تصویر موجود ہے جب میرے ابو امی کے ساتھ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔ اگلے ایک سال پانچ ماہ تک میں حیدرآباد جانے کے لیے دن گنتی رہی، مجھے کیا معلوم تھا؟ کیا معلوم تھا کہ یہ ہوگا۔

''بیٹی خوش رہو'' یہ میرے لیے ان کا آخری پیغام تھا۔ میں ہمیشہ ان کے اسی پیغام کے ساتھ زندہ رہوں گی۔ سخت ترین لمحات میں بھی ان کا یہ پیغام مجھے قوت دیتا رہے گا۔

دوست واحباب، رشتہ دار، اہل خاندان سب مجھے تسلی دیتے ہیں لیکن وہ نہیں جانتے، وہ اس نقصان کا اندازہ نہیں کر سکتے جو مجھے اٹھانا پڑا ہے۔ میرا ذہن ابھی یہ قبول کرنے کو راضی نہیں کہ ایسا ہوا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ فون اٹھاؤں اور ان سے بات کروں، صرف یہ جاننے کے لیے کیا واقعی ایسا ہوا ہے؟ لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں جب لوگوں سے بات چیت کرتی ہوں تو اچانک 5 / اپریل، 2021 کے ہولناک سانحے کے متعلق سوچنے لگتی ہوں۔ کبھی کبھی میں اپنے ابو کے ساتھ کوئی واقعہ، کوئی لطیفہ یا کچھ اور بھی شیئر کرنا چاہتی ہوں لیکن ظاہر ہے کہ نہیں کر سکتی۔ میں کووڈ کے دوران سفر پر عائد پابندیوں کے سبب اپنے ابو سے گذشتہ تقریباً ڈیڑھ برس سے نہیں مل سکی تھی۔ گھر میں جو بھی نئی تبدیلیاں عمل میں آتی تھیں وہ ان کے ویڈیوز مجھے بھیجا کرتے تھے۔ انھوں نے امی کے لیے ایک نیا فریج خریدا تھا، میرے کمرے میں AC اور ڈرائنگ روم میں وال پیپر لگایا گیا تھا۔ اب میرا واٹس ایپ ان ویڈیوز سے خالی ہے اور کوئی نہیں جو اس خالی پن کو پُر کر سکے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے بالوں میں لگائے جانے والے

روغن بادام کی تصویر انہیں بھیجی تو انھوں نے بتایا کہ وہ بھی برسوں سے اس تیل کا استعمال کرتے آرہے ہیں۔میں نے انہیں جواب دیا کہ اس کی خوشبو مجھے آپ کی یاد دلاتی ہے تو انہوں نے کہا کہ میں یہ سن کر اندر سے ٹوٹ گیا ہوں۔انھوں نے پودوں سے سجی ہوئی ہماری بالکونی کی تصویر بھی بھیجی تھی۔ یہ تصویر ان کی آخری پروفائل تصویر تھی۔میں نے انھیں بتایا کہ اس بالکونی میں ٹہلنے کی مجھے بہت یاد آتی ہے تو انھوں نے مجھے جواب دیا کہ ہاں میں بھی صرف اور صرف اپنی بیٹی کو یاد کرتا ہوں۔

یہ کون سمجھ سکتا ہے؟ کون محسوس کر سکتا ہے؟

جب میں انہیں ویڈیو کال کرتی تو وہ مجھ سے کہتے کہ ''میں ہوں بیٹی، میں ہوں ابھی، میں یہاں ہوں بیٹی، میں یہاں ہوں، اور آج کہ جب وہ نہیں رہے''۔ان کی کہی ہوئی باتیں مجھے راحت دیتی ہیں، دل و دماغ کو سکون ملتا ہے۔اب یہ ساری چیزیں ختم ہو گئیں۔میں اپنے بچپن سے آخری دن تک ان سے عام دنیوی معاملات سے متعلق سوالات کرتی رہی اور وہ انتہائی تفصیل سے ان کا جواب دیتے رہے۔ایک بار وہ مجھے چیتن بھگت سے ملانے لے گئے اور جب میں نے چیتن بھگت سے کچھ سوالات کرنا چاہے تو انہوں نے فوراً مائیک میری طرف بڑھا دیا۔جب میں خریداری کے لیے جاتی اور چیزیں خریدتی تو وہ میرا شاپنگ بیگ پکڑے رہتے تھے۔جب کبھی میں فاسٹ فوڈ کھانا چاہتی تو وہ قطار میں کھڑے ہو کر میرا انتظار کرتے تھے۔

یہ کون سمجھ سکتا ہے؟ کون محسوس کر سکتا ہے؟

میں نے "Addressed to Heaven" کے عنوان سے کہانیوں کی ایک کتاب لکھی ہے۔اس میں ایک کہانی اس معصوم لڑکی کی ہے جو اپنی مرحومہ ماں کو خط لکھتی ہے۔جب میں نے یہ کہانی لکھی اس وقت میں انٹرمیڈیٹ کی طالبہ تھی۔میری ٹیچر کو حیرت تھی کہ جذبات نگاری کا کوئی تجربہ نہ ہونے کے باوجود میں اس کہانی میں جذبہ و احساس کی فطری عکاسی کس طرح کر سکی۔آج جب کہ میں لکھ رہی ہوں، مجھے ایسے ہی ایک حادثے سے گزرنے کا تجربہ ہو چکا ہے۔مجھے یاد ہے کہ جب میری کتاب کا پہلا اسٹاک میری دہلیز پر پہنچا تو میرے ابو کا جذبہ تفاخر قابلِ دید تھا۔میں نے انھیں کاپیوں کے بنڈل کے پاس کھڑا دیکھا۔وہ اپنے ہاتھوں کو پیچھے کیے ہوئے کتابوں کو مسرت بھری نظروں دیکھ رہے تھے۔میں نے اپنی اس کتاب کو ابو اور امی کے نام معنون کیا تھا۔خوشی سے ابو کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ جو مسرت انہیں حاصل ہوئی تھی اس کی مثال نہیں دی جا سکتی۔آج میں چاہے جتنی کتابیں لکھوں لیکن یہ اس کتاب

جیسی نہیں ہوں گی۔ میں وہ خوشی اور جوش اب کبھی نہیں دیکھ پاؤں گی۔ اب ویسا کبھی نہیں ہوسکتا۔

یہ کون سمجھ سکتا ہے؟ کون محسوس کرسکتا ہے؟

بہت جلد، بہت جلد،

ہم ابھی بھی ایک ساتھ زندگی گزار سکتے تھے،

ابھی کئی دورے زیرِ التوا تھے،

بہت سی گفتگو باقی تھی،

مجھے ابھی بھی ایک بار انھیں ابو کہنا تھا،

مجھے پھر ایک بار ان کے ساتھ ہنسنا تھا،

کاش میں ان کے لیے چائے بناتی،

ان کے لیے کھانا تیار کرتی،

یہ کون سمجھ سکتا ہے؟ کون محسوس کرسکتا ہے؟

جب میرے ابو قطر سے واپس ہوئے تو ان کے پاس سات سو ریال تھے، جسے انھوں نے اپنی الماری میں میرے لیے رکھ دیا تھا۔ میرے لیے ان کی طرف سے یہ آخری رقم تھی جو انہوں نے میرے لیے رکھی تھی۔ انھوں نے میری پچیسویں سالگرہ کے تحفے کے لیے ایک ہیرے کا ہار خرید کرامی کے لاکر میں محفوظ طریقے سے رکھ دیا تھا۔ میری سالگرہ پر یہ ان کا آخری تحفہ تھا۔ جب میں حیدرآباد پہنچی تو ان کی میز پر میں نے ایک کاغذ دیکھا جس پر انہوں نے اپنے ہاتھ سے میرا نام لکھا تھا۔ "Saniya Work"۔ یہ وہ آخری کام تھا جو انھوں نے میرے لیے کیا تھا۔

آج میں لکھنے سے قاصر ہوں، اظہار کرنے سے لاچار ہوں۔ میرے پاس لکھنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ میں غم سے نڈھال ہوں۔ دل کی جو کیفیت ہے بیان نہیں کرسکتی، الفاظ میں وہ قوت نہیں جو میرے جذبات کو زبان دے سکیں۔ یہ وہ درد ہے جس کا کوئی مداوا نہیں۔ شاید مستقبل میں اپنے ابو کے لیے مزید کچھ لکھ سکوں۔ شاید ان کے متعلق ایک پوری کتاب لکھوں لیکن ابھی میری طرف سے ابو کے لیے یہ محض ایک عاجزانہ خراج عقیدت ہے۔ (مترجم سید محمود کاظمی)

❒ **Sania Zafar**
D/o Prof. Mohd. Zafaruddin
Qatar

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:140-152
Prof. Qazi Habeeb Ahmed, Suba-e-Madras Mein Urdu Masnavi Nigari ki Rawayat

قاضی حبیب احمد

صوبہ مدراس میں اردو مثنوی نگاری کی روایات

سقوط گولکنڈہ و بیجاپور کے بعد ارباب علم و ادب کو یہ سرزمین چھوڑنی پڑی تھی اور قدردانوں کی تلاش میں انھوں نے ریاست کرناٹک کے علاقہ آرکاٹ کا رخ کیا جو موجودہ تمل ناڈو کا حصہ ہے۔ کیوں کہ یہاں ابھی ایسے حکمرانوں کا اثر و اقتدار باقی تھا جو زبان و ادب کے سچے قدردان اور مرتبہ شناس تھے۔ آرکاٹ کے نوابین انگریزوں کے زیرنگرانی ہونے کے باوجود اپنے محدود وسائل سے علماء اور اہل ہنر کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اس طرح جنوبی ہند میں مدراس اردو ادب کا مرکز بن گیا تھا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں۔

> والا جاہی حکمرانوں کی علم دوستی، ان کی داد و دہش اور زبان و ادب کی خدمت کے جذبے نے علاقہ آرکاٹ کو ایک دبستان ادب کی حیثیت عطا کر دی تھی۔ 1

اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی میں مدراس اور اس کے نواح میں آرکاٹ کا علاقہ علم و ادب کا مرجع بنا ہوا تھا۔ جس کا اعتراف اہل علم نے کیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں۔

> ''سلطنت گولکنڈہ اور بالخصوص بیجاپور کی تباہی کے بعد دکنی خاندان جوق در جوق میسور اور تامل ناڈو کا رخ کر رہے تھے۔ اس طرح دکنی اردو کی تامل کے علاقے میں توسیع ہو رہی تھی۔'' 2

اس سے پہلے کہ مدراس کے شعراء کی مثنویوں کا فرداً فرداً جائزہ لیا جائے۔ ان مثنویوں کی زبان اور موضوعات پر اظہار خیال ضروری ہے۔ نصیر الدین ہاشمی اپنی کتاب ''مدراس میں اردو'' میں رقم طراز ہیں۔

> ''دکن کے دیگر حصوں میں جو مثنویاں لکھی گئیں ان کے قطع نظر صوبہ مدراس کی مثنویوں میں قصے کہانیوں سے زیادہ سیر، عقائد، مناقب، وغیرہ کو مثنویوں کا

موضوع قرار دیا گیا ہے۔اس زمانے میں شمالی ہند میں اردو شاعری کی بنیاد قائم
ہو چکی تھی،مگر مثنویوں کا کمتر اور غزل کہنے کا زیادہ تر رواج تھا۔میرؔ،سوداؔ،دردؔ،
مظہرؔ،حاتمؔ وغیرہ اس وقت میدان سخن میں داد سخنوری دے رہے تھے۔شمالی ہند
کی زبان مدراس کی زبان سے کسی قدر مختلف تھی۔اس لئے لامحالہ مدراس کی
عام مثنویوں کی زبان بھی شمالی ہند کی مثنویوں سے مختلف ہے۔مگر اس کے ساتھ
ہی مدراس کی بعض مثنویاں شمالی ہند کی زبان میں لکھی ہوئی نظر آتی ہیں۔مثلاً
''گلزار عشق'' مصنفہ باقرآگاہ وغیرہ''3

علاقہ مدراس میں اردو مثنویوں کا اولین نقش نصرتیؔ،مومنؔ،معظمؔ،شغلیؔ،گیاتیؔ،ہاشمیؔ وغیرہ کے ہاں نظر آتا ہے۔نصرتیؔ اور مومنؔ کے متعلق مختلف تذکروں میں لکھا ہے کہ وہ علاقہ کرناٹک کے رہنے والے تھے۔بقول لچھمی نارائن شفیقؔ نصرتیؔ کا تعلق مدراس سے تھا۔4 مولف ''تذکرہ شعرائے دکن'' نے بھی لکھا ہے:

''نصرتیؔ حاکم کرناٹک کے قرابت داروں سے تھا۔ریختہ میں شاعر خوش بیان و
شیریں زبان تھا۔سخن سنجی و شعرفہمی میں بے مثل تھا۔معانی و الفاظ کی شیرازہ بندی
میں بے بدل تھا۔کلام سے تازہ تازہ مضامین نمایاں ہیں۔لطائف و ظرائف
عیاں۔مدت تک کرناٹک میں رہا۔پھر سیر کرتا ہوا بیجاپور آیا''5

باوجود یہ کہ نصرتیؔ کا مدراس سے علاقہ رہا ہے،یہاں اس کی مثنوی نگاری کا جائزہ اس لئے نہیں لیا جارہا ہے کہ ادب کا کوئی طالب علم نصرتیؔ سے ناواقف نہیں ہے۔لٰہذا میں صرف ان شعراء سے غرض رکھوں گا جو یا تو پردہ خفا میں ہیں یا کم معروف ہیں۔مدراس کے قدیم شعراء میں دوسرا بڑا نام مومنؔ کا ہے۔اصل نام عبدالمومن تھا۔شمس اللہ قادری اور نصیرالدین ہاشمی کے بموجب مومنؔ مدراس کے باشندے تھے۔انھوں نے ایک مثنوی ''اسرارِ عشق'' کے نام سے لکھی۔''اسرارِ عشق'' میں فرقہ مہدویہ کے بانی سید محمد جونپوری کے حالاتِ زندگی اور تعلیمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس مثنوی کا ایک مخطوطہ حیدرآباد اسٹیٹ لائبریری میں موجود ہے۔یہ مثنوی 1681ء میں تصنیف ہوئی۔''اسرارِ عشق'' دکنی زبان کی ایک ضخیم مثنوی ہے۔اس میں اشعار کی جملہ تعداد پانچ ہزار دوسو تیئیس ہے۔اس مخطوطہ کے ابتداء میں 93 اور آخر میں 9 شعر فارسی میں لکھے گئے ہیں۔جملہ صفحات 562 ہیں۔''اسرارِ عشق'' کے ہر باب کے عنوان کے ساتھ ایک ایک شعر بھی لکھا گیا ہے۔ان تمام اشعار کو جمع کر دیں تو مثنوی کا خلاصہ سامنے آجاتا ہے۔ یہ انداز مومنؔ

سے پہلے نصرتی کی مثنوی ''گلشنِ عشق''اور ہاشمی بیجا پوری کی ''یوسف زلیخا'' میں ملتا ہے۔بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تصور میں حقیقی ہور مجازی جدا کوئی کیوں کرے یو عشق بازی
سبب تیرا ہے یو سب عشق بازی سراسر کیا حقیقی کیا مجازی
کہولتے تھے اگن میں تیر بازی دکھاتے تھے فلک کو تیغ بازی

خلفاء راشدین کے متعلق لکھتے ہیں:

علیم راز و یار غار خاصہ کہ تھا جس کوں محمد کا خلاصہ
رسالت کا نہ ہوتا گر ختم کاج عمر تھا لائق پیغمبری آج
خلافت پا محمد مصطفےٰ کا نشاں محوا کیا جور و جفا کا

افضل الدین اقبال لکھتے ہیں۔

''مثنوی 'اسرار عشق' کی زبان عام فہم اور سیدھی سادی ہے۔تصوف کے نکات پیش کرتے ہوئے بھی ان کا طرز ادا مشکل پسندی سے نا آشنا رہتا ہے۔''6

سترہویں صدی کے ربع آخر میں معظم، شغلی، گیانی کے نام قابل ذکر ہیں جو آپس میں معاصرین تھے جن کی مثنویاں رشد وہدایت کا وسیلہ تھیں۔معظم کا دیوان اور چار مثنویاں ''گلزار بہشت، گنج مخفی، وجود العارفین اور شجرۃ الاتقیاء سالار جنگ میوزیم لائبریری میں آج بھی محفوظ ہیں۔ان سب کا موضوع تصوف ہے۔شغلی کی مثنوی '' پندنامہ'' جو 1086ھ میں لکھی گئی تھی، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مذہب واخلاق کے موضوع پر رقم ہوئی ہے۔یہ 105 اشعار پر مشتمل ہے۔کلام شغلی کے مخطوطے ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد میں بھی موجود ہیں۔شاہ مرتضیٰ گیانی ایک صوفی شاعر تھے۔ان کی ایک طویل مثنوی ''وصل نامہ'' کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو میں موجود ہے۔اس مثنوی میں وحدۃ الوجود کے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔

نواب ذوالفقار خاں کے دور میں ہاشمی بیجا پوری ہجرت کرکے آرکاٹ چلے آئے تھے۔ان کی مثنوی ''یوسف زلیخا'' جو 1687ء میں تصنیف ہوئی تھی کافی معروف ومقبول ہے۔نواب سعادت اللہ خاں خود بھی شاعر تھے۔گلشن تخلص کرتے تھے۔آپ کے دربار کے ایک قادرالکلام شاعر لالہ جسونت رائے، منشی تخلص کرتے تھے۔وہ درباری شاعر ہی نہیں پیش کار، سوانح نگار اور مورخ بھی تھے۔ان کی فارسی کتاب

''سعید نامہ'' نواب سعادت اللہ خاں کے دور کی مبسوط تاریخ بھی ہے۔''ہندوؤں میں اردو'' انھیں کی تصنیف ہے۔''سعید نامہ'' میں ان کا دکنی کلام سادگی، صفائی، نازک خیالی اور تخیل کی بلند پروازی کا غماز نظر آتا ہے۔منشی نے اپنی اس تاریخ میں اپنی ایک اور اردو مثنوی ''گلدستۂ عشق'' کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ مثنوی 1129ھ میں تصنیف ہوئی اور نواب سعادت اللہ خاں کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔مؤلف نے اعتراف کیا ہے کہ ''گلدستۂ عشق'' غواصیؔ کی مثنوی ''سیف الملک و بدیع الجمال'' سے ماخوذ ہے۔مختصر یہ کہ نواب سعادت اللہ خاں کا طویل دورِ حکومت علم و فضل کی قدردانی اور شعراء نوازی کے لحاظ سے بڑا امتیاز تھا۔اس عہد میں اولیائے عظام اور صوفیائے کرام کی اتنی کثرت تھی کہ صرف ایک شہر آرکاٹ میں تین سو ساٹھ (360) مشائخین کے مکانات تھے اور آرکاٹ ''چھوٹا شاہ جہاں آباد'' کہلانے لگا۔

نواب محمد علی والا جاہ کا دور حکومت علم و ادب کا دور زرین تھا۔نواب صاحب نے بلا تفریق مذہب و ملت سب کو سرفراز کیا۔راجہ حکومت رام ریاست کے دیوان تھے۔کاشی پرشاد فدویؔ کو رائے کا خطاب عطا ہوا اور پیش کاری کی خدمت عطا ہوئی۔مکھن لال خردؔ کو رائے کا خطاب اور منشی گیری عطا ہوئی۔انھیں کا لکھا ہوا قطعہ تاریخ والا جاہی مسجد کے محراب پر کندہ کرایا گیا تھا جو آج بھی اسی حالت میں موجود ہے۔آپ کی علم دوستی، داد و دہش اور کریم النفسی کے باعث ملک کے کونے کونے سے اہل علم و فضل کا مدراس میں اجتماع ہونے لگا۔بحر العلوم مولانا محمد عبد العلی فرنگی محل سے بلائے گئے۔ملک الشعراء میر اسماعیل خاں ابجدیؔ کو تاریخ کرناٹک ''انور نامہ'' لکھنے پر چاندی میں تولا گیا۔باقر آگاہؔ کو زرین گہوارہ عطا ہوا۔ بہر حال اس دور میں شعر و سخن کے بھی بڑے چرچے تھے۔کئی شعراء کی ضخیم مثنویاں معرض وجود میں آئیں۔ولیؔ اورنگ آبادی کے معاصر میر ولی فیاض ولیؔ ویلوری اسی دور کے ایک باکمال پُرگو اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ان کی پیدائش شہر مدراس سے ڈیڑھ سو کلومیٹر دور واقع شہر ویلور میں ہوئی۔انھوں نے متعدد مثنویاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ولیؔ ویلوری کی مثنوی ''رتن پدم'' کا ذکر حکیم شمس اللہ قادری کے علاوہ اشپرانگر (Eshparanger) اور اسٹوارٹ (Stevewart) نے بھی کیا ہے۔ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ اس مثنوی کو ولیؔ ویلوری کی اولین کوشش قرار دیتے ہیں۔''رتن پدم'' تقریباً چار ہزار ابیات پر مشتمل تھی یہ سرندیپ کی مہارانی پدماوتی اور چتور کے راجہ رتن سین کی مشہور کلاسیکل داستان ہے۔''رتن پدم'' پدماوت کا منظوم ترجمہ ہے۔ پدماوت کو ملک محمد جائسی نے اودھی زبان میں تصنیف کیا تھا۔ یہ ہندی ادب کا ایک بے نظیر شاہکار ہے اور مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ولیؔ ویلوری کی دوسری مشہور

مثنوی ''روضۃ الشہداء'' ہے جو تقریباً پانچ سوابیات کی ایک طویل دکنی مثنوی ہے۔ یہ مثنوی ملا حسین واعظ الکاشفی کی فارسی کتاب ''روضۃ الشہداء'' کا ترجمہ ہے۔ فارسی کتاب نثر میں ہے ولؔی ویلوری نے اس کا بڑا کامیاب منظوم ترجمہ کیا ہے۔ یہ مثنوی دس مجلس پر مشتمل ہے۔ اس لئے ''دہ مجلس'' بھی کہلاتی ہے۔ ڈاکٹر رشید موسوی کا بیان ہے کہ ایک عرصہ تک علاقہ مدراس کی مجالس عزاء میں زیادہ تر ''روضۃ الشہداء'' ہی پڑھی جاتی تھی۔ مدراس کے مختلف کتب خانوں میں آج بھی 'روضۃ الشہداء' کے متعدد نسخے پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یورپ میں بھی اس کے قلمی نسخے موجود ہیں دو انڈیا آفس میں اور ایک رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں۔ ''روضۃ الشہداء'' کی تصنیف کا سن مختلف محققین نے مختلف بتایا ہے۔ شمس اللہ قادری نے ''اردوئے قدیم'' میں 1119ھ مطابق 1707ء، پروفیسر عبد القادر سروری نے ''فہرستِ مخطوطات جامعہ عثمانیہ'' میں 1109ھ مطابق 1717ء ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے ''فہرستِ مخطوطات ادارہ ادبیاتِ اردو'' جلد اوّل میں 1137ھ مطابق 1724ء اور ''دکن میں اردو'' میں مولوی نصیر الدین ہاشمی نے 1130ھ مطابق 1727ء لکھا ہے۔ چونکہ کتب خانہ سالار جنگ میں ''روضۃ الشہداء'' کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔ جس میں 1141ھ درج ہے۔

حضرت خواجہ رحمت اللہ ایک اہل دل بزرگ اور بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ رحمتؔ تخلص تھا۔ آپ نے کئی مثنویاں لکھیں جن میں سب سے زیادہ شہرت ''تنبیہ النساء'' (رسالہ بدعت شکن) کو حاصل ہوئی۔ یہ مثنوی چھ سو ابیات پر مشتمل ہے اور اس کو پندرہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر باب کا عنوان فارسی ہے۔ درمیان میں قرآن و احادیث کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ اس مثنوی کے مخاطب سہاگن عورتیں ہیں۔ مثنوی کے ہر بیان کی ابتداء میں ''سن سہاگن'' سے مخاطب کیا گیا ہے۔ جیسے

سن سہاگن پند حق دل جان سے — میں کہوں احادیث اور قران سے
سن سہاگن بات میری کر قبول — میں کہوں فرمائے سو حضرت رسول
سن سہاگن یاد رکھ باتاں تمام — پڑھ دروداں، چھوڑ دے گیتاں حرام

یہ مثنوی اواخر بارہویں صدی کی مشہور و مقبول مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کی مقبولیت کے متعلق ڈاکٹر زور رقم طراز ہیں:

''کتاب راقم الحروف کے بچپن میں بہت مقبول تھی اور وہ ایسی کئی خواتین سے واقف ہیں جنھیں یہ پوری کتاب حفظ تھی اور ان کے گھر کے ملازموں اور بچوں کو

بھی اس مثنوی کے بیسوں ابیات یاد تھیں۔ مسلمان عورتوں کی اصلاح کے لئے
اس سے بہتر کوئی کتاب اردو میں نہیں لکھی گئی اور نہ اتنی مشہور و مقبول ہوئی۔'' 7

شاہ ابوالحسن قربیؔ کی پیدائش بیجاپور میں ہوئی۔ آپ نے ہجرت کر کے ویلور میں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ کے خانوادے کی علمی، ادبی اور روحانی خدمات دو صدیوں پر محیط ہیں۔ آپ قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ فارسی اور دکنی میں آپ کا وافر کلام دستیاب ہے۔ اردو دیوان ۳۴ برس کی عمر میں ترتیب دیا۔ 8 آپ کی نظموں کے مجموعے ''معراج نامہ''، ''نمک نامہ''، ''ہدایت نامہ''، ''بدعت نامہ'' بطور مخطوطے دار العلوم لطیفیہ، حضرت مکان، ویلور کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ آپ نے ایک مختصر مثنوی ''چکی نامہ'' بھی لکھی، جواب نایاب ہے۔

شاہ ابوالحسن قربیؒ کے فرزند حضرت ذوقیؔ بڑے فصیح اللسان شاعر تھے۔ آپ کی زود گوئی کا یہ عالم تھا کہ بقول مولانا عبدالحی، صاحب مثنوی ''مطلع النور''، آپ کے نوک قلم سے تقریباً تین لاکھ ابیات معرض تحریر میں آئے۔ آپ نے دو تاریخی مثنویاں لکھیں۔ پہلی مثنوی ''در بے بہا'' قلعہ تنجاور کی فتح سے متعلق ہے اور اس جنگ کا بہترین نقشہ کھینچا گیا ہے۔ یہ مثنوی غالباً 1182ھ مطابق 1768ء میں قلم بند ہوئی تھی۔ حضرت ذوقیؔ کی دوسری مثنوی محمد نجیب خاں شہید کے حالات پر لکھی گئی ہے جو نواب انوار الدین خاں کے رفیق کار اور مصاحب تھے۔ 1748ء کی گڑھ آمبور کی جنگ میں نواب انوالدین خاں کے ساتھ ہی شہید ہوئے تھے۔ یہ مثنوی 1771ء میں لکھی گئی تھی۔ ڈیڑھ ہزار اشعار پر مشتمل یہ مثنوی صرف سات دن میں مکمل کی گئی تھی۔ حضرت ذوقیؔ کی دیگر اردو مثنویوں میں ''عقائدِ ذوقیؔ'' اور ''غوث نامہ'' قابلِ ذکر ہیں۔ مثنوی ''عقائد ذوقیؔ'' میں تقریباً ایک سو دس اشعار ہیں۔ ''غوث نامہ'' میں حضرت غوث الاعظمؒ دستگیر کی کرامات کا ذکر کیا ہے۔ یہ مثنوی صرف دو دن میں لکھی گئی اور اس میں چار سو ابیات ہیں۔

مولوی امین الدین احمد 1714ء کو مدراس میں پیدا ہوئے۔ آپ اردو اور فارسی زبان میں یکساں عبور رکھتے تھے۔ آپ نے اپنے شاگردوں اور دوستوں کی ایماء پر ایک طویل مثنوی دکنی زبان میں ''عقائد امین الدین احمد خان'' کے نام سے منظوم کی تھی۔ اس کا ایک عمدہ قلمی نسخہ اس وقت کتب خانہ مدرسۂ محمدی، مدراس میں محفوظ ہے۔ اس مثنوی کے خاتمے پر وہ لکھتے ہیں:

خدا نے کیا یہ رسالہ تمام طفیل محمد علیہ السلام
پے بعض یاروں کا ایماء ہوا کہ ہندی زباں یہ رسالہ ہوا

سعادت کے عالم کا ہے وہ نظام خدا دے اسے علم و دولت مدام

کرے اس دعا کو اجابت خدا کہ ہے نام اس کا مجیب الدعا

باقر آگاہ 1745ء کو ویلور میں پیدا ہوئے۔جنوبی ہند کی ادبی تاریخ میں آپ کی حیثیت بہت نمایاں ہے۔ان کے والد مولوی محمد مرتضیٰ نے عادل شاہی سلطنت کے خاتمہ کے بعد بیجاپور سے ہجرت کرکے ویلور میں سکونت اختیار کرلی تھی۔نواب والا جاہ نے اپنے دونوں لڑکوں کی اتالیقی آپ کے سپرد کی تھی۔آپ کو اپنا دبیر خاص مقرر کیا تھا۔بقول صاحب ''سخنوران بلند فکر''، ''پندرہ سال کی عمر میں نظم ونثر لکھنے پر قادر ہوگئے''9؎ کہا جاتا ہے کہ آگاہ نے عربی، فارسی اور اردو میں چھوٹے بڑے 303 رسالے تصنیف کئے تھے۔بقول ڈاکٹر افضل الدین اقبال:

''ابتداء میں ان کے کلام پر دکنی اثر نمایاں تھا۔لیکن جب شمالی ہند سے مرزا اظفری گورگانی، حافظ فضل الدین علی ممتاز دہلوی اور حکیم عظیم الدین تجمل لکھنوی جیسے شعراء مدراس آئے تو آگاہ نے قدیم دکنی زبان کا استعمال ترک کردیا''10؎

آگاہ کی سولہ مثنویاں ہیں جن میں سے اکثر مطبوعہ ہیں۔رسالہ عقائد، تحفۃ النساء، ہشت بہشت، محبوب القلوب، ریاض الجنان، تحفۃ الاحباب، فرائد در فوائد، گلزار عشق، روضۃ الاسلام، خمسہ متحیرہ اوج آگاہی (صبح نو بہار، عشق ذاتی، عشق صفاتی، عشق افعالی، عشق آثاری) اور مثنوی روپ سنگار۔ نصیر الدین ہاشمی نے ''یورپ میں دکنی مخطوطات'' میں آگاہ کی مزید تین مثنویوں ''رسالہ فرقہ ہائے اسلام''، ''ہدایت نامہ''، ''معراج نامہ'' کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ مثنویاں پیرس کے قومی کتب خانہ میں موجود ہیں۔کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی میں آگاہ کی ایک مثنوی شرح کلمہ ایمان مجمل کا مخطوطہ موجود ہے۔مثنوی ''گلزار عشق'' آگاہ کی معرکۃ الآراء تصنیف ہے۔اس میں رضوان شاہ اور روح افزا کی مشہور کلاسیکل داستان منظوم ہوئی ہے۔یہ مثنوی 1795ء میں لکھی گئی ہے۔مثنوی میں محاوروں کی برجستگی، الفاظ کی شیرینی، موقع ومحل کی مناسبت سے ہے۔الفاظ اور ترکیبوں کا استعمال آگاہ کی قادر الکلامی اور پختہ جمالیاتی شعور کے بین شواہد ہیں۔خود آگاہ نے اپنی تعلّیٰ اس مثنوی میں یوں ظاہر کی ہے۔

ہے دکھنی میں مجکو مہارت یتی کہ النصر منکم کہے نصرتی

گر اردو کہ بہاکے میں کھولوں زبان تو سودا کا سب سود ہو وے زیاں

مثنوی ''گلزار عشق'' کے کچھ نمونہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

میرا سینہ حسرت سے ناشاد ہے　　گنہ لازم و رنج برباد ہے
نہ اب جاں نہ جاناں میری بات میں　　مجھے بخت ڈالے ہیں کس گھات میں
بہر حال دونو ہو کشتی سوار　　چلے تن بہ تقدیر بے اختیار
اوپر ان کے تھا نیلگوں آسماں　　تلے ان کے دریائے دور ازگراں
نمایاں ہوئی رات کو یک نہنگ　　اوڑے کوہ کا جس کے ہیبت سے رنگ
محبت میں کیا کیا مصیبت سہا　　عجب ہے کہ اب لک وہ جیتا رہا

مثنوی ''روپ سنگار'' کا صرف ایک نسخہ ادارہ ادبیات اردو میں دستیاب ہے۔370 ابیات پر مشتمل یہ دکنی مثنوی 1800ء میں تصنیف ہوئی ہے۔اس میں سنسکرت خیال نائکہ بھید سے بحث کی گئی ہے۔جس سے آگاہ کی سنسکرت اور برج بھاشا سے آگہی کا بھی ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ رقم طراز ہیں۔

''آگاہ اردو کے بہت بڑے محسنوں میں سے ہیں۔نثر اور نظم دونوں پر قابو تھا۔ غزل،قصیدہ،مثنوی،ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔واقعہ یہ ہے کہ دکنی علم وفضل اور شعر وسخن ان پر ختم ہوگیا۔ان کے بعد جنوبی ہند میں اتنا بڑا ادیب اور شاعر پیدا نہ ہوسکا۔وہ میرؔ اور سوداؔ کے ہم عصر تھے۔لیکن زبان قدیم استعمال کی ہے۔اس لئے شمالی ہند میں شہرت حاصل نہیں ہوئی۔''11

شاہ تراب چشتی مدراس کے ایک پرگو اور کثیر التصانیف صوفی شاعر تھے۔ڈاکٹر سیدہ جعفر کی تحقیق کے بموجب شاہ تراب جن کا اصلی نام تراب علی تھا۔ان کے مرشد و پیر پا شاہ حسینی نے ''گنج الاسرار'' کا لقب بخشا اور رشد وہدایت کے لئے مدراس کے علاقہ ترنامل بھیجا۔شاہ تراب کی اہم اور معرکۃ الآراء مثنوی ''من سمجھاون'' ڈاکٹر سیدہ جعفر کے بسیط مقدمے اور مفید حواشی کے ساتھ 1964ء میں حیدر آباد سے شائع ہوچکی ہے۔یہ مثنوی جودکھنی ادب میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔مرہٹی کے مشہور فلسفی وشاعر رام داس کی ''شری مناچے شلوک'' کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ان کی دیگر تصانیف میں گیان سروپ،ظہور کلی،گلزار وحدت،گنج الاسرار،مثنوی مہہ جبین وملا اور آئینہ کثرت قابل ذکر ہیں۔شاہ تراب کی یہ ساری تصانیف کم و بیش 1170ھ اور 1187ھ کے درمیانی عرصہ میں لکھی گئی ہیں۔12 شاہ تراب کا دیوان ''دیوان تراب'' کے نام سے 1982ء میں ڈاکٹر سلطانہ بخش نے جمیل الدین عالی کے بسیط مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقی

اردو پاکستان، کراچی کے زیر اہتمام شائع کیا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے شاہ تراب کی مثنوی مہ جبین وملا کا پورا قصہ بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ میر تقی میرؔ نے اپنی مثنوی ''دریائے عشق'' میں بھی ایک ایسا ہی قصہ بیان کیا ہے۔13 شاہ تراب کے زبان وبیان پر تبصرہ کرتے ہوئے جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''ان کی زبان پر دکھنی اردو کا اثر گہرا ہے۔لیکن وہ، وہ زبان نہیں ہے جو ہمیں حسن شوقیؔ، قلی قطب شاہ، نصرتیؔ یا غواصیؔ کے ہاں نظر آتی ہے۔ بلکہ یہ وہ زبان وبیان ہیں جو ولی دکنی کے ہاں نظر آتے ہیں اور جو مزاجاً آبروؔ و ناجیؔ سے قریب تر ہیں۔''14

سید محمد والہؔ موسوی، نواب محمد علی والا جاہ کے ہم زلف تھے۔ اچھے شاعر و انشاپرداز تھے۔ خراسان میں پیدا ہوئے۔دہلی آکر شاہ عالم بہادر شاہ کے دربار سے وابستہ ہوئے۔پھر آصف جاہ اول انھیں اپنا رفیق بنا کر حیدرآباد لے آئے۔نواب انورالدین کو آصف جاہ نے مدراس کا صوبہ دار بنایا تو والہؔ ان کی پشت پناہی کے لئے مدراس بھیجے گئے۔1770ء میں والہؔ نے وفات پائی۔والہؔ کی ایک مثنوی 'طالب وموہنی'' اور ایک کتاب ''رازقِ باری'' مشہور ہے۔اس مثنوی کو ڈاکٹر زورؔ نے اپنے فاضلانہ مقدمے کے ساتھ 1957ء میں ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد سے شائع کرایا۔''طالب موہنی'' کی درد بھری کہانی مہاراشٹرا کے ایک برہمن نے والہؔ کو سنائی تھی۔اس واقعہ کا والہؔ پر گہرا اثر ہوا اور اسے انھوں نے مثنوی کا روپ دے دیا۔اس مثنوی میں ایک ہزار سے زائد اشعار موجود ہیں۔چند اشعار بطور نمونہ درج ہیں:

ننگے سر ہو چلا تابوت کے ساتھ   سر اوپر اور سینے پر مارتا ہاتھ
کہے ہندواں کہ کیوں سر پھوڑتا ہے   موے پر بھی اسے نئیں چھوڑتا ہے
بہت بے شرم عاشق بوالہوس ہے   کہ دلبر مرگئی تجھ میں نفس ہے
وہ طالب عاشق صاحب وفا تھا   عشق میں روز اول سوں فدا تھا
یو طعنا جب سنا غیرت میں آیا   ڈولے سوں اپس کا مکہ پھرایا

اس مثنوی میں والہؔ نے لطیف پیرایہ اختیار کیا ہے۔اور جزئیات نگاری کا خاص اہتمام کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے امور کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ بالکل صحیح اور سچا واقعہ معلوم ہوتے ہیں۔ نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''میر تقی میرؔ کی مثنوی ''دریائے عشق'' میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے۔وہ ان کا طبع زاد اور میر کی دماغی پیداوار خیال کیا جاتا ہے۔مگر والہؔ کی اس مثنوی کا پلاٹ

قریب قریب وہی ہے ،جو ''دریائے عشق'' کا ہے۔اور والٓہ کی یہ مثنوی ''دریائے عشق'' سے پہلے لکھی گئی ہے۔اس لئے کیا تعجب ہے کہ میرؔ نے والٓہ کی یہ مثنوی دیکھی ہو۔اور ''دریائے عشق'' کواسی سے اخذ کیا ہو۔''15؎

نواب والا جاہ کے ملک الشعراء میر اسماعیل خان ابجدیؔ مشہور مورخ ملا محمد قاسم مولف ''فرشتہ'' کے بہنوئی تھے۔وہ فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے۔ان کی فارسی مثنوی ''انورنامہ'' شاندارتاریخی کارنامہ تسلیم کیا جاتا ہے۔150اشعار پر مبنی ابجدیؔ کی ایک مختصر دکنی مثنوی ''حقیقت نامہ'' شائع ہو چکی ہے۔جو دراصل مثنوی مولانا روم کے پہلے شعر کی شرح ہے اور بعض تصوف کی اصطلاحات کی مبسوط بحث پیش کی گئی ہے۔چنانچہ اس مثنوی کے اختتام پر وہ لکھتے ہیں۔

مثنوی مولوی کی بیت کوں شرح کیتا ہوں کہ یکدل سوزسوں
اشک ریزی سے سدا ہو غرق آب یوں کہے یالیتنی کنت تراب

نواب عمدۃ الامراء کے دربار کے ایک باکمال شاعر سرشارؔ بھی تھے۔جن کے تفصیلی حالاتِ زندگی کا پتہ نہیں چلتا۔صرف ان کی ایک مثنوی ''چارگلشن'' کا پتہ چلا ہے۔اس مثنوی کا ایک مخطوطہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔مولوی نصیرالدین ہاشمی کا بیان ہے کہ اس مثنوی کی ابتدا کے دوصفحات میں حمد ہے۔پھر دو صفحے مناجات کے ہیں۔پھر دو صفحوں میں نعت ہے،اس کے بعد منقبت حضرت علی مرتضیٰؓ اور معراج کے حالات ہیں۔اس کے بعد بادشاہ کی تعریف ہے۔سبب تالیف کے بعد قصہ شروع کیا گیا ہے۔یہ مثنوی ''قصہ چہار درویش'' کا منظوم ترجمہ ہے۔اس کتاب کے جملہ اوراق دوسو اکیس (221) ہیں۔اس کی کتابت 2/ذلحجہ 1251ھ بمقام قادرنگر تنجاور ہوئی۔

غلام محی الدین معجزؔ 1759ء کو آرکاٹ میں پیدا ہوئے۔مدراس کے مشہور استادِ سخن گذرے ہیں۔دکھنی دیوان میں ایک عشقیہ مثنوی اور چھبیس صفحوں میں غزلیات ہیں۔ان اشعار پر دکنیت غالب ہے۔

شاہ غوث جامی،اپنے پیرومرشد سید سراللہ انتر جامی کی نسبت سے جامی لکھتے تھے۔غوثیؔ تخلص تھا۔کسی تذکرے میں حالات زندگی مذکور نہیں ہیں۔اب تک ان کی تین اردو مثنویوں روضہ صفا، ریاض مسعود اور ضیافت نامہ کا پتہ چلا ہے۔غوثیؔ کا انتقال 1810ء میں ہوا۔اسی تخلص کا ایک اور شاعر اسی زمانہ میں گذرا ہے۔جس کا تعلق چنگل پیٹ سے تھا۔غوثیؔ چنگل پیٹی نے مثنوی ''شہادت جنگِ سلطانی'' کے نام سے ایک مثنوی لکھی ہے۔یہ مثنوی ٹیپو سلطانؒ کی شہادت کے بعد ہی 1716ء میں لکھی گئی ہے۔

نواب اعزالدین خاں نام تھا۔کبھی نامؔی اور کبھی مستقیم تخلص کرتے تھے۔آپ کا تاریخی نام غلام علی تھا۔1767ء کو آرکاٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جو نواب والا جاہ کے بھی رشتہ دار تھے، گو پا موسے آکر مدراس میں اقامت پذیر ہوئے۔نامؔی کی شادی نواب والا جاہ کی نواسی سے ہوئی۔نامؔی ایک فطری شاعر تھے اور انھیں باقر آگاہ سے تلمذ حاصل تھا۔نواب عمدۃ الامراء نے انھیں ملک الشعراء مقرر کیا۔ نامؔی کی مثنویوں میں ''نو بہار عشق، بہارستان عشق، سلیمان نامہ، گنج قدرت، قصۂ بی بی مریم اور داستان کلفت وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔''سلیمان نامہ'' ایک طویل مثنوی ہے۔اس مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔حضرت سلیمان کا ایک رفیق سیر کو جاتا ہے اور پری پر عاشق ہو جاتا ہے۔

اسی میں ہوئی ہے وہ جنگل میں شام — نکل آیا گردوں پر ماہ تمام
جو مہتاب سے بن میں پھولا کپاس — ہوا شب کا یکسر روپہلی لباس
عجب چاندنی کی تھی کچھ آن بان — بگولا دکھاتا تھا جوں چرخ بان
چمکتا تھا ہر برگ مثل شرار — مگر بر میں داغے تھے ہر جا انار
کرشمہ تھا غمزہ تھا اور ناز بھی — ادا بھی تھا اور آن و انداز بھی
غرور اور شوخی ہنسی اور حیا — بہت خوش نما تھا نہایت سجا
سراپا تھے اعضا نہایت درست — تھے چھب تختی یکدست چالاک وچست
چمک اس کے مکھڑے پہ مہتاب سی — جبیں صاف و شفاف سیماب سی

دکنی مثنویوں کا عام دستور یہ تھا کہ ابتداء میں حمد، نعت، منقبت وغیرہ کے بعد بادشاہ وقت کی ضرور مدح کرتے ہیں۔مگر اس مثنوی میں بادشاہ کی تعریف نہیں ہے۔حالانکہ نامؔی کو دربار سے خاص تعلق تھا۔وہ ملک الشعراء تھے۔اس معاملے میں وہ اپنے استاد باقر آگاہ کے پیرو نظر آتے ہیں۔کیونکہ آگاہ کی مثنویوں میں بھی باوجود دربار سے تعلق کے بادشاہ کی کبھی مدح نہیں ہوتی۔ انھوں نے کبھی بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھی نہیں لکھا۔

سید حسین شاہ حقیقؔت کی پیدائش 1772ء میں ہوئی۔''ہشت گلزار'' دراصل طوطی ہند امیر خسرو کی ''ہشت بہشت'' کا منظوم ترجمہ ہے اور حقیقؔت کی مثنویوں میں ''ہیرا من طوطا'' بھی مشہور ہے۔جو حقیقؔت نے اپنے قیام مدراس کے زمانے میں پڑھی یا سنی تھی۔اس مثنوی کا ماخذ کوئی پرانی کہانی ہے۔سخاوت مرزا کا خیال ہے کہ اس مثنوی کا قصہ ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے قصہ سے مشابہ ہے۔

سید محمود بلگرامی، قلندر بخش جرأتؔ کے شاگرد تھے۔ جادہ پیمائی کرتے ہوئے مدراس آئے اور آرکاٹ میں سکونت اختیار کی۔ انھوں نے مثنوی ''بہشت گلزار'' 1225ھ میں مرتب کی۔ محمودؔ کی یہ مثنوی امیر خسرو کی ''ہشت بہشت'' کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ اپنے استاد جرأتؔ کے خلاف محمودؔ کی مثنوی کئی ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ طوالت دکنی اثر سے ہے۔ اشعار کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

دے سکندر بنا گدا کو تو   کردے دارا سا، بے نوا کو تو
دے تو شاہی کا جس کو چاہے سریر   چاہے جب شاہوں کو بنا دے فقیر
ملک ایران کا تھا اک والی   میرا اور تیرا ہے خدا والی
کیا بیاں کیجیے اس کی شان وشکوہ   شاہوں کا جس کا در پہ ہو انبوہ

شریفؔ مدراسی کی پیدائش 1824ء کے آس پاس ہوئی۔ آپ کی تصانیف میں ایک مثنوی ''شامِ غربت'' (1889ء) قابلِ ذکر ہے۔

نواب رؤف احمد پرتوؔ نواب عظیم جاہ ہفتم پرنس آف آرکاٹ کے نواسے تھے۔ آپ کی تصانیف میں مثنوی ''حرزِ جاں'' قابلِ ذکر ہے۔ ''وفاق نامہ پرتوؔ''، ''سیہ نامہ پرتوؔ''، ''معذرت نامہ پرتوؔ'' ان کی طویل مثنویاں ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے کئی مختصر مثنویاں بھی کہی ہیں۔ مختصر مثنویوں میں 'فراق نامہ'' 87 ابیات پر مشتمل ہے۔

لطف النساء بیگم اثیمہؔ آرکاٹ کے ایک مذہبی اور علمی گھرانے کی باصلاحیت ادیبہ اور شاعرہ تھیں۔ آپ کی مثنویوں میں گلبن مہ رخاں، گلشن مہ وشاں، مثنوی گلشن شاہداں قابلِ ذکر ہیں۔

دورِ جدید میں کاوشؔ بدری مرحوم نے مثنوی لکھ کر اس مردہ صنف میں جان ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کی ایک مثنوی ''قبلہ نما'' 1965ء میں طبع ہوئی ہے۔ کاوشؔ بدری قادر الکلام شاعر اور ادیب تھے۔ آپ کی مثنویوں کے موضوعات عموماً سیاسی اور کبھی متصوفانہ ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ سالک نائطی مرحوم نے بھی ایک طویل مثنوی ''عشق پیچاں'' تقریباً ڈیڑھ ہزار اشعار پر مشتمل لکھی ہے مگر طباعت کی نوبت نہیں آئی۔ غرض تمل ناڈو میں مثنوی نگاری کی بڑی شاندار اور تابناک روایات رہی ہیں، اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے۔

مصادر وحواشی:

1. مقدمہ ''مدراس میں اردو ادب کی نشو ونما'' جلد اول از ڈاکٹر افضل الدین اقبال، 1979ء، ص5
2. پیش لفظ، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ''من سمجھاون'' مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر، مطبوعہ حیدر آباد
3. ''مدراس میں اردو'' از نصیر الدین ہاشمی، مطبوعہ حیدر آباد، 1938ء، ص59
4. ''چمنستان شعراء'' از لچھمی نارائن شفیق، مطبوعہ اورنگ آباد، ص322،
5. ''تذکرہ شعرائے دکن'' جلد دوم از عبد الجبار ملکاپوری، مطبوعہ حیدر آباد 1329ھ، ص1090
6. ''مدراس میں اردو ادب کی نشو ونما'' جلد اول از ڈاکٹر افضل الدین اقبال، 1979ء، ص64،
7. ''تذکرہ اردو مخطوطات'' جلد اول از ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ، ص170
8. مقدمہ ''دیوان قربی'' مرتب پروفیسر فضل اللہ، مطبوعہ حیدر آباد، 1964ء، ص32
9. ''سخنوران بلند فکر'' از محمد منور خاں گوہر، ص133
10. ''مدراس میں اردو ادب کی نشو ونما'' جلد اول از ڈاکٹر افضل الدین اقبال، 1979ء، ص165
11. ''تذکرہ اردو مخطوطات'' جلد اول از ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ، ص77
12. مقدمہ ''دیوان تراب'' از ڈاکٹر سلطانہ بخش، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، 1982ء، ص13
13. ''تاریخ ادب اردو'' جلد دوم، حصہ اول از ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوز، دہلی، ص315
14. ''تاریخ ادب اردو'' جلد دوم، حصہ اول از ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوز، دہلی، ص317
15. ''مدراس میں اردو'' از نصیر الدین ہاشمی، مطبوعہ حیدر آباد، 1938ء، ص29

❒ **Prof. Qazi Habeeb Ahmed**

Head, Department of Arabic, Persian and Urdu
Madras University, Chinnai - 5
Mobile: 9444318785
Email: drkhazihabib@gmail.com

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:153-174
Prof. Mohd. Fahim Akhtar, Delhi Saltanat ke Ahad ka Tamaddun aur Ilm-o-Adab

محمد فہیم اختر

دہلی سلطنت کے عہد کا تمدن اور علم و ادب

عہد وسطی میں ہندوستان کے اندر ایک مضبوط اور وسیع حکومت دہلی سلطنت کے نام سے قائم ہوئی۔ 1206 سے 1526 تک اس سلطنت میں پانچ خاندانوں نے یکے بعد دیگرے حکومت کی اور پھر مغلیہ حکومت نے اس کی جگہ لے لی۔ ہندوستان کے اندر اشوک اور ہرش وردھن کے بعد اتنی مضبوطی اور وسعت کے ساتھ قائم ہونے والی یہ پہلی ایسی متحدہ حکومت تھی جس نے زندگی کے ہر میدان کو متاثر کیا۔ دہلی سلطنت کی تاریخ پر ایک اجمالی نظر بتاتی ہے کہ اس دور میں ملک میں مضبوط حکومت قائم ہوئی، عوام کو امن وامان حاصل ہوا، بیرونی دنیا کے ساتھ تجارتی روابط مضبوط ہوئے، معاشی اصلاحات اور زراعت کے فروغ نے عوام کو خوشحال بنایا، نئے نئے شہر بسے، یادگار عمارتیں اور قلعے تعمیر ہوئے، فن تعمیر میں نت نئے تجربات کیے گئے، شاہراہوں اور سڑکوں کی تعمیر اور ان پر سرایوں اور مسافر خانوں کی فراہمی نے آمد و رفت کی سہولت بہم پہنچائی، ڈاک کے سواری اور پیدل نظام نے روابط بحال کیے، دہلی اور متعدد شہروں میں تعلیمی مراکز قائم ہوئے، بادشاہوں نے دل کھول کر علم و ادب اور فنون لطیفہ کی سرپرستی کی، جس کے نتیجہ میں پوری دنیا سے اہل فن و اہل کمال یہاں جمع ہونے لگے۔ شعر و شاعری، زبان و ادب، حکمت و تاریخ اور اسلامی علوم پر وقیع کتابیں تصنیف ہوئیں، سنسکرت سے فارسی اور فارسی سے سنسکرت میں کتابوں کے ترجمے ہوئے، مدارس و اسکول اور کالج قائم ہوئے، عوام کی اخلاقی اصلاح اور مذہبی رواداری کے لیے صوفیا اور مشائخ نے خانقاہیں قائم کیں جو بلا تفریق مذہب عوام کے لئے امن و اخلاق کی آماجگاہ بنیں، وقت کے اکابر مشائخ نے اس سرزمین کو اپنی برکتوں سے فیضیاب کیا، عدل و انصاف کا پختہ نظام قائم کیا گیا، پولیس اور خفیہ محکمہ کے ذریعہ سخت نگرانی رکھ کر ظلم پر بندشیں لگائی گئیں، فوجی محکمہ کو مضبوط تر بنایا گیا کہ

منگولوں کی غارت گری ہندوستان جنت نشان کو نقصان پہنچانے کی ہمت نہ کرسکی اور نہ اسے کامیابی ملی، مذہبی آزادی نے ملک میں امن وامان اور بھائی چارہ کی فضا کو ایسا مضبوط بنایا کہ اتنی وسیع مملکت میں مذہبی بنیادوں پر فرقہ وارانہ فسادات کے بدنما داغ نہیں لگے۔

سوا تین سو برس کی اس دہلی سلطنت نے ہندوستان کو دنیا کے نقشہ پر انتہائی ترقی یافتہ، مضبوط و مستحکم، خوشحال اور مہذب ملک بنا کر پیش کیا۔ آخر میں دہلی سلطنت کی کمزوری اور بکھراؤ اور بالآخر اس کے زوال نے مرکزی حکومت کی عظمت تو ختم کردی لیکن علاقائی حکومتوں کے قیام کی راہ ہموار کردی۔ اس سے علاقائی خصوصیات اور تہذیب کی زیادہ بہتر سرپرستی ہوئی، علم وادب کی سرپرستی ایک دہلی کے بجائے جونپور، مالوہ، اڑیسہ، دکن، بنگال، ملتان، سندھ اور کشمیر وغیرہ کئی جگہوں پر ہونے لگی۔ ان علاقوں میں صنعت وحرفت اور زراعت کو فروغ ملا، گجرات اور بنگال میں بحری تجارت میں ترقی ہوئی، دوردراز سے اشیاء تجارت کی برآمد درآمد ہونے لگی اور یہ تجارت کی مشہور منڈیاں بن گئیں۔ بہت سے نئے نئے شہر تعمیر ہوئے اور ہنداسلامی فن تعمیر میں علاقائی خصوصیات آمیز ہوئیں۔ دہلی سلطنت کی یہ تمدنی وتہذیبی اور علمی تاریخ بڑی دلچسپ اور شاندار ہے۔ ذیل کی سطور میں اس پر کچھ تفصیل سے نظر ڈالتے ہیں۔

دہلی سلطنت کا سماجی تمدن

دہلی سلطنت کا سماجی نظام عہد وسطی میں جاری سماجی نظام کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ اس سلطنت کے حکمراں اگرچہ مسلمان تھے اور اسلام میں سماج کے اندر ذات وبرادری یا مالی حیثیت کی بنیاد پر فرق مراتب نہیں ہے لیکن ہندوستان کے عہد وسطی میں سماج کے اندر یہ فرق مراتب موجود تھا۔ عہد وسطی کا سماج کئی طبقوں پر مشتمل تھا۔ سب سے اوپر حکمراں اور امراء کا طبقہ تھا، جن میں بیشتر مسلمان تھے، لیکن ہندوؤں میں بھی امراء اور حکمرانی کرنے والے خاندانوں کے افراد تھے۔ ہندو سماج کے اندر اونچ نیچ اور برادری کے طبقات پہلے سے موجود تھے۔ گاؤں کے اندر دو طرح کے لوگ تھے ایک طبقہ کاشتکاروں اور کسانوں کا تھا جن کی محنت پر ملک کی معیشت کا انحصار تھا۔ دوسرا طبقہ زمینداروں اور گاؤں کے سرداروں کا تھا، ان ہی میں سے محصلین ہوتے جو گاؤں سے لگان وصول کرتے تھے۔ سماج کے اندر تاجروں کا ایک طبقہ تھا، یہ لوگ اشیاء تجارت کی درآمد برآمد سے بھی جڑے ہوئے تھے۔ عہد سلطنت کے سماج کا ایک اہم عنصر غلاموں کا تھا، اس دور میں دنیا کے بیشتر حصوں میں غلاموں اور باندیوں کی تجارت جاری تھی، اس

کے لیے غلاموں کو پکڑنے اور انھیں اچھی تعلیم و تربیت سے آراستہ کرکے اونچی قیمتوں پر فروخت کرنے کا رواج تھا۔ایسے غلام اپنی قابلیت کی وجہ سے غلامی سے نکل کر امراء کی صف تک بھی پہنچتے بلکہ تخت حکومت پر بھی بیٹھتے تھے، دہلی سلطنت کا آغاز کرنے والے سلاطین بھی غلام ہی تھے، جو اپنی قابلیت اور صلاحیت کے بل بوتے پر ہندوستان کے بادشاہ بنے تھے۔

سماجی زندگی میں سب سے اہم اور باحیثیت طبقہ امراء کا تھا،حکمراں طبقہ بھی ان ہی میں سے ہوتا تھا۔عام طور پر امراء تین درجوں میں تقسیم تھے، کچھ خان تھے جو سب سے اعلی رتبہ تھا ،اس کے بعد ملک، پھر امیر ہوتے تھے۔ یہ تقسیم بہت زیادہ نمایاں نہیں تھی ،حکومت اور فوج کے بڑے عہدے ان ہی لوگوں کے پاس ہوتے تھے۔خاندان غلاماں کے مشہور سلطان شمس الدین التمش نے ایسے چالیس امراء کی جماعت بنائی تھی جو حکومت کے کاروبار کو سنبھالنے میں اس کے مددگار ہوتے تھے، یہ جماعت چہلگانی کہلاتی تھی۔التمش کے بعد سربراہ حکومت کی تعیین میں ان امراء کا بڑا دخل تھا۔اس کا جانشیں غیاث الدین بلبن بھی انہی چالیس امراء میں سے ایک تھا اور اس جماعت کی طاقت واہمیت سے وہ واقف تھا، چنانچہ جب وہ بادشاہ بنا تو اپنی حکومت کی مضبوطی کے لیے اس نے امراء کی یہ جماعت توڑ دی لیکن سماج کے اندر امراء باقی رہے اور قابل لوگوں کو ان کے کارناموں پر خان وغیرہ کے خطابات ملتے رہے۔مختلف مناسبتوں میں اور فتوحات وغیرہ کے موقعوں پر ان امراء کو بیش قیمت تحائف ملتے تھے۔یہ امراء بھی بادشاہ کے دربار میں قیمتی تحائف ونذر پیش کرتے تھے،امراء کے محلات ، سامان عیش وراحت اور ٹھاٹھ باٹھ بادشاہ کے نقش قدم پر ہوتے تھے۔ان میں سے بعض کو امتیازی حیثیت کے اظہار کے لیے کچھ علامتیں اور نشان وغیرہ بھی عطا ہوتی تھیں۔ یہ بات بہت دلچسپ ہے کہ امراء کی اس حیثیت تک پہنچنے کے لیے کسی نسل کی قید نہ تھی ،لوگ اپنی صلاحیت وقابلیت کے ذریعہ اس مقام کو حاصل کر لیتے تھے۔امراء کی صف میں غیر مسلم اور ہندو بھی تھے اور انھیں بھی اعلیٰ سماجی حیثیت اور حکومت میں عہدے حاصل تھے۔ دہلی حکومت کے آغاز کے وقت راجپوت ہندوستان کے کئی علاقوں میں حکومت کر رہے تھے، آہستہ آہستہ ایسے بیشتر علاقے دہلی سلطنت میں شامل ہو گئے لیکن راجستھان اور آس پاس کے علاقوں میں کئی جگہ ان کی حکومتیں باقی تھیں، کچھ جگہوں پر وہ دہلی سلطنت کے باجگذار کے طور پر تھے اور مرکز کو متعینہ خراج دے کر اپنی حکومت میں آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ان کے پاس فوجیں ہوتیں اور وہ نہایت شاہانہ ٹھاٹھ

باٹھ کی زندگی گذارتے تھے۔اونچی ذات کے یہ ہندو اور برہمن وغیرہ خود دارالسلطنت دہلی میں بڑی شان وشوکت کے ساتھ رہتے تھے،حکومت ان کو اعلی عہدے دیا کرتی تھی۔دہلی سلطنت کے بانی قطب الدین ایبک کی فوج میں ہندو افسر اور سپاہی تھے۔غیاث الدین بلبن اور علاء الدین خلجی کے عہد میں ہندو سرداروں کا اقتدار کافی بڑھ گیا تھا' حتی کہ علاء الدین نے ان کی بغاوت کے اندیشہ سے ان کی طاقت توڑنے کی کوشش کی اور مسلم امراء کے ساتھ ہندو سرداروں پر بھی سختی اور پابندی نافذ کی۔لیکن خاندان تغلق کے مشہور فرمانروا محمد بن تغلق کے عہد میں ہندو سردار اور بھی طاقتور ہو گئے تھے، وہ صوبوں کی گورنری اور محکمہ مال کے اعلیٰ عہدیدار مقرر ہونے لگے۔ان کے اثرات اتنے زیادہ ہو گئے تھے کہ لوگ ان پر رشک وحسد کرتے تھے۔فیروز شاہ تغلق کے محبوب ہم جلیسوں میں ہندو سردار بھی شامل تھے۔مؤرخین نے ہندو سرداروں اور امیروں کی شاندار زندگی،عیش وعشرت اور مقام وعظمت کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے جن کے یہاں مسلمان بھی نوکر ہوتے تھے اور جن کے دروازوں پر مسلمان غرباء بھیک مانگتے تھے۔ ضیاء الدین برنی نے فتاوی جہانداری میں لکھا ہے کہ ہندو دار السلطنت میں بھی بڑے بڑے مکانات محلوں ہی کی طرح بناتے ہیں، وہ کمخواب کے لباس پہنتے ہیں،عربی گھوڑوں کی سواری کرتے ہیں،جن پر چاندی اور سونے کا ساز ہوتا ہے اور ان کی عظمت طرح طرح سے ظاہر ہوتی ہے اور وہ عیش وتنعم کی زندگی گذارتے ہیں۔

ہندوستان میں قدیم زمانہ سے تجارت کا رواج رہا ہے لیکن دہلی سلطنت کے قیام کے بعد وسط ایشیا اور عرب ممالک کے ساتھ ہندوستان کے تجارتی تعلقات میں مزید مضبوطی اور وسعت آئی،اور اشیاء تجارت کی درآمد برآمد بڑھ گئی،سلاطین دہلی نے بھی اس جانب پوری توجہ دی اور سہولیات بہم پہنچائیں۔ محمد بن تغلق نے دہلی سے دیوگیری تک سات سو میل کی لمبی شاہراہ تیار کرائی جس پر دونوں جانب درخت لگوائے اور تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر سرائے بنوائے جہاں مسافروں کے ٹھہرنے اور خورد ونوش کا انتظام کرایا،اس سے تجارت کو بہت فروغ ملا۔دہلی میں تجارت کی منڈیاں لگتی تھیں اور ہر سامان کے لیے علاحدہ بازار تھے، جہاں کپڑے،اجناس، جانور،غلام وباندی،مٹھائیاں، جوتے،اسلحے اور دیگر سامان ملتے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ بیرونی تجار بھی تھے جو دوسرے ممالک سے سامانِ تجارت لاتے اور ہندوستان میں فروخت کرتے، کیونکہ اس دور میں ملتان بیرونی تجارت کا ایک بڑا مرکز بن گیا تھا۔خراسانی،عراقی اور

ایرانی بیرونی تجارت میں نمایاں تھے۔تجارت پیشہ طبقے میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل تھے، ان کی سماجی زندگی بھی آرام وراحت سے بھرپور اور باحیثیت تھی۔ بسااوقات ان تاجروں کے پاس اتنی دولت ہوتی کہ امراء اور دوسرے لوگ ان سے قرض لیا کرتے۔تجارتِ بحری اور بری دونوں قسم کی تھی، بحری تجارت کی وجہ سے ساحلی علاقوں کے شہروں میں تجارت کوفروغ مل رہا تھا۔سلاطین دہلی نے تجارت کے فروغ اور اشیاء کی قیمتوں کوارزاں بنانے میں کافی دلچسپی لی۔علاءالدین خلجی کے زمانے میں اشیاء کی نرخ بندی کردی گئی تھی اور قیمتیں سستی ہوگئی تھیں، فیروز شاہ تغلق اور بہلول لودھی اور سکندر لودھی کے عہد میں قیمتیں اور بھی کم ہوگئی تھیں جس سے لوگوں کو بہت آسانیاں حاصل ہوگئی تھیں۔تاجروں کے ساتھ سماج میں ایک بڑا طبقہ صنعت وحرفت سے جڑا ہوا بھی تھا، دیہاتوں میں چھوٹی موٹی ایسی صنعتیں تھیں جو زراعت سے وابستہ ہوتی تھیں،شہری صنعتوں میں پارچہ بافی یعنی کپڑے کی تیاری اور اس سے متعلق متعدد صنعتیں بڑی ترقی پر تھیں۔اس کے علاوہ دھات سازی،شکر سازی، کاغذ سازی اور سنگ تراشی کی صنعتیں رائج تھیں۔کپڑے کی صنعت عروج پر تھی اور اس سے جڑی زردوزی، رنگ سازی اور کشیدہ سازی کی صنعتیں بڑے شہروں میں رائج تھیں۔طرح طرح کے عمدہ اور نفیس کپڑوں کی تیاری میں سماج کا ایک بڑا طبقہ مشغول تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں ان صنعتوں سے جڑے ہوئے تھے۔شہروں کے اندر ان پیشہ وروں اور صنعتوں سے وابستہ لوگوں کی علاحدہ آبادیاں ہوتی تھیں۔ان صنعتوں کے لیے شاہی کارخانے قائم تھے، جہاں بڑی تعداد میں ملازم ہوتے تھے،ان کی زندگی متوسط طرز کی ہوتی تھی، بہت سارے غلاموں کو صنعتوں کی تربیت دے کران کاموں میں لگایا جاتا تھا۔فیروز شاہ تغلق نے ایسی صنعتوں کو بہت فروغ دیا تھا،اس نے تقریباً دولاکھ غلام جمع کر کے ان میں سے ایک بڑی تعداد کو صنعتوں کی تربیت دی تھی اور انھیں مختلف پرگنوں میں پھیلا دیا تھا۔اس سے صنعت کو ترقی ہوئی اور سماجی زندگی میں لوگوں کو ہنرمند بن کر کمانے کا راستہ حاصل ہوا۔

دہلی سلطنت کا یہ دور صوفیہ اور مشائخ عظام کے وجود اور ان کی برکتوں سے بھی فیضیاب ہو رہا تھا۔شیخ معین الدین چشتی اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے ساتھ قطب الدین ایبک،شمس الدین التمش اور غیاث الدین بلبن کی عقیدت جگ ظاہر تھی۔ بابا فرید الدین گنج شکر اور شیخ نظام الدین اولیاء جیسی عظیم ہستیاں اسی دور میں تھیں جن کے آستانوں پر ہزاروں لوگ روحانی سکون اور اخلاقی تربیت

حاصل کیا کرتے تھے۔ سماج میں ان کی عظمت اور دبدبہ کے سامنے بسا اوقات شاہانہ عظمت ماند پڑ جاتی تھی۔ قاضی حمید الدین ناگوری، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی، شیخ نصیر الدین چراغ، شیخ علی احمد صابر کلیری، خواجہ جمال الدین ہانسوی، مخدوم جہانیان جہاں گشت، شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری، شیخ جلال الدین تبریزی، شیخ سید اشرف جہانگیر سمنانی، شیخ سراج الدین اخی سراج، شیخ نور قطب عالم وغیرہ مشائخ سے دہلی سلطنت کا یہ زمانہ بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ ان مشائخ کی خدمات اور روحانی سرگرمیوں نے سماج پر بڑے گہرے اثرات ڈالے، ہندو اور مسلم دونوں ان بزرگوں کی خانقاہوں میں آتے، مسلم امراء کے ساتھ ہندو امراء بھی یہاں جبین عقیدت خم کرتے اور سماج کے اندر روحانی ماحول میں تقویت پیدا ہوتی۔

مذہبی اعتبار سے دہلی سلطنت پر اگر نظر ڈالی جائے تو وہ بڑی حد تک ایسی حکومت محسوس ہوتی ہے جس میں مذہب کو اعلیٰ حیثیت حاصل تھی اور اس کا اثر براہ راست سماج پر بھی مرتب ہو رہا تھا، اس لیے یہ سماج بھی بڑی حد تک مذہبی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا، حکومت اور سماج دونوں سطحوں پر اس عہد میں مذہب اور بالخصوص اسلام کا رنگ صاف نمایاں نظر آتا ہے۔ عہد سلطنت کے ابتدائی سلاطین بذات خود گہرے مذہبی رنگ کے حامل تھے، وہ نہ صرف علم اور دینداری سے آراستہ تھے بلکہ شریعت کی تابعداری اپنا فریضہ سمجھتے تھے، چنانچہ انھوں نے مذہب اور اسلامی شریعت کو اہمیت دی اور اہل علم کی قدردانی کی جس کی وجہ سے سماج میں اہل علم کا مقام اونچا ہوا بلکہ لوگ مذہب اور دین کی طرف راغب ہونے لگے۔ دہلی سلطنت میں سماج کے اندر جہاں دینداری اور مذہب سے تعلق کا غالب ماحول رہا، وہیں اس کے برعکس صورت حال بھی رہی، جس میں بسا اوقات زیادہ شدت بھی پیدا ہوئی۔ چنانچہ علاء الدین خلجی کے دربار میں وہ دینی اور مذہبی رنگ نہ تھا جو اس کے پیشرو سلاطین اور بعد کے سلاطین میں نظر آتا ہے، علاء الدین مذہبی آدمی نہیں تھا لیکن وہ مذہب کی بے حرمتی نہیں کرتا تھا، اس کے دور کو تو علماء وفقہاء کی موجودگی کے اعتبار سے سب سے زیادہ زرخیز دور کہا جاتا ہے۔ اسی طرح خلجی عہد کے قطب الدین مبارک کا دربار مذہبی رنگ سے خالی تھا اور اس کا براہ راست اثر سماج کی مذہبی حالت پر مرتب ہوتا تھا۔ خسرو خاں کے زمانہ میں تو مذہب اسلام کی بے حرمتی کے واقعات پیش آنے لگے تھے لیکن مجموعی طور پر دہلی سلاطین کے دربار میں مذہبی رنگ ہی زیادہ غالب رہا، البتہ دربار کی آرائش وزیبائش، بادشاہوں کی نجی محفلوں اور بادشاہوں کی سزاؤں کو مذہبی رنگ سے مستثنیٰ کر کے دیکھنا ضروری ہوگا۔

سلاطین دہلی نے دوسرے اہل مذاہب کے ساتھ بھی عزت ومساوات کا برتاؤ کیا، مذہب کی بنیاد پر کسی کو اس کے حق سے محروم نہیں کیا۔ محمد بن تغلق کی بنائی ہوئی دہلی سے دولت آباد کی طویل شاہراہ اور اس پر موجود مسافروں کی بیش قیمت سہولتیں ہندو ومسلمان سب کے لیے تھیں۔ فیروز تغلق کے عہد میں کسانوں سے قرضوں کی معافی، ٹیکس میں بے انتہا کمی اور نہر اور کنوؤں کی تیاری نیز باغات کے لگوانے، بیماروں کے لیے اسپتال کھولنے، غریبوں محتاجوں کی مالی امداد، بے روزگاروں کے لیے روزگار اور غریب بچیوں کی شادی کے انتظامات جیسے فلاحی اقدامات یکساں طور پر ہندو اور مسلمان سب کے لیے تھے۔ ہندو مذہب کی طرح جین مذہب اور دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ بھی یکساں برتاؤ ہوتا تھا اور سلاطین دہلی ان کی بھی قدر افزائی کرتے تھے۔

یہ بہت دلچسپ ہے کہ دہلی سلطنت کے دور میں ہندوستان کے سماج پر اسلام کے افکار و نظریات اور عقائد کے گہرے اثرات مرتب ہوئے اور ہندو سماج کے اندر ایسی تحریکیں اٹھیں جن میں اسلامی عقائد اور تعلیمات سے استفادہ کا عکس نظر آتا ہے۔ اس سلسلہ میں مشہور مؤرخ ڈاکٹر تارا چند کے درج ذیل چند ٹکڑے قابل مطالعہ ہیں: ''ہندو مسلمان دونوں نے ایک ایسا طرز زندگی اختیار کرنے کی کوشش کی جس سے دونوں اچھے ہمسایہ کی طرح زندگی بسر کرسکیں' اس نئے طرز زندگی سے ایک ایسا تمدن پیدا ہوا جو نہ تو بالکل ہندوؤں ہی کا تھا' نہ خالصاً مسلمانوں کا' بلکہ ایک مخلوط ہندو مسلم تمدن تھا، اس طرح ہندو مذہب' ہندو آرٹ' ہندو ادب اور ہندو سائنس نے اسلامی اثرات قبول کرنے شروع کیے اور ہندو کلچر اور ہندو ذہنیت میں بھی تبدیلی پیدا ہونے لگی۔ مہاراشٹر' گجرات' پنجاب' ہندوستان اور بنگال کے مذہبی پیشواؤں نے پرانے اعتقادات کی بہت سی باتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔''

جناب کے ایم پنیکر صاحب نے لکھا ہے کہ ہندو معاشرت پر اسلام کے اثرات کی وجہ سے ہندوؤں کے معاشرتی نظام میں برابر نئے عقائد اور فرقے پیدا ہوتے جا رہے تھے۔ اس عہد میں ہندو مذہب کی تجدیدی تحریکیں برابر جاری رہیں۔ ویشنو تحریک اسی زمانے میں شروع ہوئی جس کی وجہ سے شمال میں جے دیو، میرا بائی، راما نند، کبیر، پھر مہاراشٹرا اور گجرات میں گیانیشور وغیرہ جیسے پیشوا پیدا ہوئے۔ کرناٹک میں لنگایت کا عروج بھی اسی دور میں ہوا۔ گیت گووند پوری میں لکھی گئی اور یہ اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کی شرح راجپوتانہ کے مہارانا کمبھ نے لکھی، راما نند کی تحریک کا مرکز بنارس میں تھا۔ یہ بات تو واضح

ہے کہ اسی عہد میں ہندو مذہب پر اسلام کا گہرا اثر پڑا، ہندوستان میں خدا پرستی کا تصور اسلام ہی کی بدولت پیدا ہوا۔ بھکتی عقائد میں بھی خالص توحید پرستی ہے‘‘۔

عہد سلطنت کی تعمیرات اور فنی جلوے

دہلی سلطنت کے عہد میں تمدن کا ایک اہم مظہر تعمیرات اور اس کا فن ہے۔ اس سلطنت کے پانچوں خاندانوں کی حکومتوں کے دور میں فن تعمیر کے اندر نئے نئے تجربات کیے گئے۔ سلاطین دہلی کے یہ تعمیراتی کارنامے آج بہت کچھ مٹ چکے ہیں لیکن جو کچھ باقی ہیں وہ اپنی عظمت وشوکت، نقش آرائی اور پختگی وحسن کے جلوے دکھانے کے لیے کافی ہیں۔ دہلی سلطنت کے فن تعمیر میں خاص بات یہ ہے کہ پورے تین سو برس کی مدت میں یہ فن مسلسل ارتقاء پذیر رہا، ہر بعد والے دور میں پہلے کی بہ نسبت کچھ نئے خیالات، نئے نقش ونگار، نئے طرز وانداز اور نئی اشیاء کے استعمال کو روبہ عمل لایا جاتا رہا۔ سلاطین دہلی کی تعمیرات مختلف مقاصد کے لیے استعمال ہوتی رہی ہیں۔ انہوں نے مذہبی مقاصد سے لے کر مقبرے، فوجی اہمیت کے قلعے، تعلیم گاہیں، محل، دروازے، منارے، شہر اور اس کی دیواریں، حوض اور سرائے وغیرہ متعدد قسم کی عمارتیں تعمیر کیں، گو کہ ان عمارتوں کے مقاصد استعمال مختلف تھے، لیکن انہوں نے ان سب میں اپنے طرز تعمیر کے نقوش ثبت کیے ہیں۔

قطب الدین ایبک نے مسجد قوۃ الاسلام کی بنیاد رکھی اور اس کے اذان خانہ کے طور پر عظیم الشان قسم کا مینارہ بنوایا۔ یہ منارہ جو اب قطب مینار کہلاتا ہے، دراصل مسجد کا اذان خانہ تھا۔ مسجد بڑی وسیع وعظیم بنانے کا منصوبہ تھا اور مینار کی تعمیر میں اس نے اپنے اسلامی ذوق اور عظمت وشکوہ کے اظہار کو سمویا تھا۔ اس مینارہ کی تعمیر میں زیادہ تر یہیں کے کاریگر جیسے مستری اور سنگ تراش استعمال کیے گئے۔ مسلم دنیا میں مینار اس سے قبل موجود تھے لیکن یہ مینار کچھ انفرادیت رکھتا تھا۔ اس کی اونچائی 72.5 میٹر رکھی گئی، بعد میں اس کی اوپر کی ایک منزل گر گئی تھی اور فیروز تغلق نے اس کی مرمت کروا کے ایک منزل کا اور اضافہ کرا دیا تھا۔ قطب مینار بلند تخیل کے ساتھ اور بہت عمدہ طریقہ پر بنایا گیا تھا، اس کے چھجے (بالکونی) اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں جو اس میں ابھرے اور باہر نکلے ہوئے ہیں۔ قطب مینار کی پہلی منزل پر آیت قرآنی **لا اکراہ فی الدین** (دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے) کندہ ہے۔ پورے مینار کو بہترین نقاشی سے آراستہ کیا گیا ہے۔

شمس الدین التمش نے مسجد قوۃ الاسلام کی توسیع کرائی اور شمال‘ جنوب اور مشرق کی سمتوں میں مسجد کے اندر اضافہ کر دیا جس سے یہ مسجد تین گنی ہوگئی۔اس نے قطب مینار میں بھی اضافہ کرایا۔التمش نے اجمیر میں ڈھائی دن کا جھونپڑا تعمیر کرایا‘ بدایوں میں مسجد اور دوسری عمارتیں بنوائیں۔اس نے خود اپنا مقبرہ بنوایا جو مربع شکل کی عمارت تھا اور چاروں کونوں پر ہشت پہل کی شکل دے کر گنبد تعمیر کیا گیا تھا‘ اندرونی دیواروں پر متاثر کن نقاشی کی گئی تھی جس میں خطاطی کے اندر ہندوستان کی گل کاری کی آمیزش کی گئی تھی۔ یہ گویا ہندو مسلم روایات کے آپسی امتزاج کا نشان تھا۔بلبن کے دور میں وسط ایشیا سے آئے ہوئے مسلم ماہرین فن‘ ریاضی داں اور ماہرین تعمیرات سے بھی استفادہ کیا گیا چنانچہ بلبن کے مقبرہ میں محراب میں فنی اعتبار سے زیادہ پختگی نظر آتی ہے‘اس میں محراب کو دونوں طرف ابھرے چھجے یا منڈیر جیسے پتھروں پر براہ راست ابھارا گیا ہے اور ہندوستان میں پہلے سے رائج طریقہ ترک کیا گیا ہے،جس میں پتھر پر پتھر رہ کر فاصلے کم کرتے جاتے تھے اور پھر اوپر ایک پتھر کی سل رکھ کر اسے ڈھک دیتے تھے۔

علاءالدین خلجی کے عہد سے مسلم فن تعمیر کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔اس دور میں اس میدان میں ترقیاں ہوئیں اور بہت زیادہ عماراتی کام ہوئے۔علاءالدین نے سیری میں اپنا پایہ تخت تعمیر کرایا جو قطب سے کچھ کیلو میٹر کے فاصلہ پر تھا،اب اس کے نشان ناپید ہو چکے ہیں۔علاءالدین نے قطب مینار سے دوگنا اونچا ایک اور مینار تعمیر کرانا چاہا لیکن اس کا یہ منصوبہ پورا نہیں ہوسکا‘ البتہ اس نے قوۃ الاسلام میں داخلہ کا ایک دروازہ بنوایا جو علائی دروازہ کہلاتا ہے۔اسے نئے اصول پر بنایا گیا تھا جو ہندوستان میں اپنے طرز کی پہلی عمارت تھی۔نقادوں کے مطابق علائی دروازہ مسلمانوں کی ابتدائی تعمیرات کا بہت ہی حسین اور مکمل نمونہ ہے۔اس دروازہ میں ایک مربع شکل کی عمارت ایک ہشت پہل میں تبدیلی ہوگئی ہے جس پر گنبد کا انحصار ہے۔دروازہ کی اندرونی دیواریں بہت ہی مرصع نقش ونگار سے مزین ہیں اور ان میں عمدہ نفاست برتی گئی ہے۔علاءالدین آخری سلطان ہے جس نے غلام عہد کے سلاطین کے فن تعمیرات کو برقرار رکھا۔

غیاث الدین تغلق کے دور میں طرز تعمیر کے اندر نقاشی اور نقش نگاری کو چھوڑ کر سادہ انداز اختیار کر لیا گیا‘ انتہا درجہ کی سادہ تعمیرات کا نیا اسٹائیل اس نے پیدا کیا‘ جس کا نمونہ تغلق آباد کا قلعہ ہے۔ اس قلعہ کی بنیاد ایک بلند پہاڑی پر ہے‘ اس کی چاروں طرف خندق ہے‘ قلعے میں چاروں طرف برج‘

فصیل، مینارے اور دروازے دیے گئے ہیں۔اس کی شکل نیم مخمسی ہے۔اس نئے طرز کی مثال ملتان میں غیاث الدین تغلق کا مقبرہ ہے جو ہشت پہل ہے، اس کے مختلف زاویوں میں برج بنے ہیں۔ غیاث الدین تغلق کا یہ مقبرہ مشہور بزرگ شیخ رکن الدین ملتانی کو دے دیا گیا تھا، کیونکہ سلطان کی وفات اچانک دہلی میں ہوگئی تھی۔محمد تغلق نے تعمیرات سے دلچسپی لی، اس کی تعمیرات میں دولت آباد کا قلعہ، شہر جہاں پناہ، دہلی کا لال گنبد اور غیاث الدین کا مقبرہ وغیرہ ہیں۔محمد تغلق نے طرز تعمیر اور اس کے تصور میں کچھ تبدیلی کی ،اس نے مقبرہ کے سوگوارانہ ماحول کو ختم کیا ،مقبرہ کو جھیل کے درمیان بنایا اور گنبد اور دیواروں کے نقش ونگار کے ذریعہ دیکھنے والوں کے لیے ایک اچھا منظر فراہم کیا۔لال گنبد میں بھی اس نے نقش ونگار کے ذریعہ خوبصورتی پیدا کی۔محمد تغلق کا سب سے اہم تعمیراتی کارنامہ دولت آباد کا قلعہ ہے، اس قلعہ میں حربی فن تعمیر کا بہترین استعمال کیا گیا ہے اور محمد تغلق نے اپنی جدت پسندی اور بلند خیالی کا عکس دکھایا ہے۔قلعہ کو ایک ایسی پہاڑی پر بنایا گیا جہاں تک پہنچنے کا راستہ بہت پیچ وخم کے ساتھ لے جایا گیا۔ تاکہ ایک چھوٹی فوج بھی دیر تک دشمن کا مقابلہ کر سکے اور ہر طرف سے دشمن پر حملہ کرنا ممکن ہو۔روزنوں کی تعداد زیادہ رکھی گئی۔پھر قلعے کے دو حصے بنائے گئے ،اوپر کی منزل فوجیوں کے لیے تھی اور اسے نیچے کی منزل سے علاحدہ کر دیا گیا، اور اوپر کی منزل کا راستہ نیچے کی منزل سے علاحدہ کر کے زمین دوز اس طرح اوپر لے جایا گیا تھا کہ اگر دشمن نیچے کی منزل پر قبضہ کرے تو اوپر کی فوج کو مقابلہ میں دشواری نہ ہو۔پھر زمین دوز راستوں کے بالائی حصہ پر ایک آہنی آنگیٹھی رکھی گئی تھی ،جس میں حملہ کے وقت آگ جلادی جاتی تو اس کے دھویں اور شعلوں سے حملہ آور آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔

محمد تغلق کے بعد فیروز شاہ تغلق بادشاہ ہوا تو غیاث الدین تغلق کے آسان اسٹائل کی طرف متوجہ ہوا، اس کی عمارتوں میں بڑی سادگی اور نشیب آ گیا۔اس کی تعمیر میں اس کا مقبرہ اور قلعہ ہے جو فیروز شاہ کوٹلہ کہلاتا ہے۔اس کے علاوہ اس نے بہت سی قدیم عمارتوں، مسجدوں اور مقبروں کی مرمت کرائی اور ان میں ترمیم واضافے کرائے، فیروز شاہ کا مدرسہ بھی اس کی تعمیر کا نمونہ ہے۔اس نے اس کے علاوہ کثرت سے نہریں جاری کیں، کنویں کھدوائے، مسجدیں اور خانقاہیں بنوائیں، نئے شہر بسائے، حمام تیار کرائے، شفاخانے بنوائے، ہزاروں باغ لگوائے ،جن سے اچھی آمدنی بھی ہونے لگی۔فن تعمیر میں کسی جدت کے بجائے اس کی توجہ رفاہ عام، زراعت کی ترقی اور لوگوں کی بہبود پر رہی۔ فیروز شاہ کی عمارتوں

میں پتھروں پر گچ یا چونے کے مسالے کی ایک بڑی سی تہہ چڑھائی جاتی تھی، جس پر سفید پتائی کی جاتی تھی۔ یہ طریقہ بعد میں بھی رائج رہا۔ فیروز کی عمارتوں میں سجاوٹ میں کنول نظر آتا ہے۔ فیروز کے وزیر خان جہاں تلنگی نے بھی عمارتیں بنوائیں۔ البتہ اس نے مسجدوں کی تعمیر میں جدت کی، جہاں پناہ کی کھڑکی مسجد اور نظام الدین کی کالی مسجد میں مسقّف چبوترہ بنوا کر اس کے کھلے ہوئے حصوں کو چار صحنوں میں تقسیم کر دیا تاکہ اندر جانے والے لوگ دھوپ اور تپش اور بارش سے بچ سکیں۔ اس کا مقبرہ چھوٹا اور ہشت پہل ہے۔ مقبرہ کی یہی شکل بعد میں مدتوں تک اپنائی جاتی رہی ہے۔

سادات سلاطین کے زمانہ میں بڑے پیمانے پر مقبرے تعمیر ہوئے، ان میں سائز کا اضافہ ہوا، رنگ و زینت میں اضافہ کیا گیا، اور فرش اور دیواروں کو مزین کیا گیا۔ ان عمارتوں میں بہترین قسم کے میناروں، چھتریوں اور بڑے گنبدوں کا اضافہ کیا گیا۔ لودھیوں کے زمانے میں زینت و آرائش میں اور اضافہ ہوا، رنگین ٹائل کا استعمال کیا گیا، انہیں اونچے چبوتروں پر اٹھایا گیا جس سے وہ عالیشان نظر آنے لگیں۔ کچھ مقبروں کو باغات میں تعمیر کیا گیا، لودھی گارڈن اسی کی مثال ہے۔ اس دور میں ایک نیا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ گنبد دوہرے بنائے گئے، سکندر لودھی کے مقبرے میں یہ فن پوری طرح اختیار کیا گیا ہے، اس میں اوپر اور نیچے گنبد ہوتے، اوپر کے گنبد کی اونچائی زیادہ رکھی جاتی اور نیچے کا گنبد اتھلا بنایا جاتا، اس کا فائدہ یہ تھا کہ اوپر کا گنبد زیادہ اونچا رکھنا آسان ہو گیا۔ بعد میں یہی طریقہ عام عمارتوں میں استعمال ہونے لگا۔

فن تعمیر کا یہ طرز جس میں ہندوستانی طرز کی آمیزش کرتے ہوئے اسلامی ذوق و رجحان کو برتا گیا، ہند اسلامی فن تعمیر کہلایا۔ مسلم سلاطین نے اپنی عمارتوں میں ہندوستان کے کئی اسٹائل اور بالخصوص نقاشی میں گل و بوٹے وغیرہ استعمال کیے۔ پھر ہندو مندروں میں مسلم طرز تعمیر سے متاثر ہو کر وسیع گنبد اور درباروں میں زیبائش و آرائش کے ملتے جلتے انداز اختیار کیے گئے۔ علاقائی حکومتوں کی تعمیرات میں اسی طرز کے اندر علاقائی اثرات بھی شامل ہوتے گئے اور نئے نئے انداز کی عمارتیں بنیں۔ اس طرح سلاطین دہلی نے فن تعمیر کے میدان میں اپنے اعلیٰ ذوق، بلند خیالی اور وسیع تصور کے ساتھ اسلامی آہنگ کو شامل کر کے عمدہ و پختہ تعمیرات کی لافانی یادگاریں چھوڑی ہیں۔

دہلی سلطنت میں علم و ادب کا فروغ

دہلی سلطنت کے پورے دور میں علمی خدمات کی ہمہ ہمی دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ خدمات کئی

طرح کی رہی ہیں ۔عموماً سلاطین نے شعراء اور علماء کی سرپرستی کی اور انہیں دربار کی زینت بنایا، یہ شعراء اپنے فن کے کمال دکھاتے ،علماء اور فضلاء نے بادشاہوں سے علمی گفتگو اور مشورے جاری رکھے، نیز تعلیم کی اشاعت کی ،سلاطین کی خواہش اور اپنے طور پر بھی کئی اہل علم نے تاریخ کی کتابیں لکھیں جس سے اس عہد کی معاصر تاریخ قلم بند ہوگئی ۔بعض امراء نے اپنی سرپرستی میں کتابیں لکھوائیں ۔اس دور میں بڑے فقہاء اور علماء موجود تھے جنہوں نے تفسیر اور فقہ کے موضوعات پر قیمتی کتابیں تصنیف فرمائیں ۔سلاطین نے مدارس اور اسکول بھی قائم کیے جہاں طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے تعلیم اور رہائش کے بہترین انتظامات اور ان کے اخراجات کے لیے بڑے بڑے اوقاف خاص کیے گئے تھے ۔سنسکرت اور فارسی زبانوں میں کتابوں کے ترجمے کرائے گئے جس سے استفادہ کا دائرہ وسیع ہوا۔علاقائی زبانوں کو بھی فروغ دیا گیا اور ان میں غیر مسلم اہل فضل نے تصنیفات تیار کیں ،اس طرح یہ عہد علمی اعتبار سے مالا مال نظر آتا ہے۔

قطب الدین ایبک جس نے امام ابوحنیفہ کی اولاد میں سے ایک بڑے عالم قاضی فخر الدین عبدالعزیز کوفی کے گھر میں تربیت پائی تھی ،اور جس نے غزنی اور غور کی علمی محفلیں دیکھی تھیں، دہلی میں اس نے علماء وفضلاء اور شعراء کو اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دی اور ان کی سرپرستی شروع کی ۔مولانا بہاؤالدین اوش اپنے زمانہ کے مشہور شاعر اور ادیب تھے، اوش سے ہندوستان آ کر ایبک کے دامن دولت سے وابستہ ہوئے ۔ جمال الدین محمد ایبک کے دربار سے وابستہ دوسرے بڑے شاعر تھے جن کے علم کی قدر دانی کی گئی ۔ایسے ہی قاضی حمید الدین ایک باکمال شاعر اور عالم وفاضل تھے جو عنایت شاہانہ سے مستفید ہوتے رہے ۔ایبک کے دور کی ایک اہم علمی شخصیت حسن نظامی نیشاپوری کی ہے جنہوں نے ایبک کی خواہش پر مشہور ومعروف تاریخ ''تاج المآثر'' لکھی ہے جس میں 587ھ سے 612ھ تک کے واقعات درج ہیں ۔اس میں شہاب الدین غوری کے ہندوستان پر آخری پانچ حملوں کے ذکر سے لے کر قطب الدین ایبک کے پورے عہد اور التمش کے عہد کے ابتدائی سات برسوں کے سیاسی وجنگی واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے ۔ایبک اور التمش کے حالات پر یہ پہلی تاریخ ہے اور اس کا مؤلف ہندوستان کا پہلا مؤرخ ہے جس کی اصل کتاب محفوظ رہی ہے ۔ایبک کے دور کا ایک اور مشہور مورخ مبارک شاہ ہے جو عرف عام میں فخر مدبر کہلاتا ہے۔اس نے 'بحرالانساب' کے نام سے کتاب لکھ کر قطب الدین ایبک کی خدمت میں پیش کی ،اس میں رسول اکرم ﷺ کے عہد سے لے کر مؤلف کے زمانہ تک کے شجرے قلم بند کیے گئے ہیں ۔

اس میں قطب الدین کے اوائل زندگی اور حکمرانی کے واقعات درج ہیں۔اسی سے ملتا جلتا ایک نام فخر الدین مبارک شاہ مروزی کا ہے جس کی کتاب 'تاریخ فخر الدین مبارک شاہ' کہلاتی ہے، یہ بھی اس دور کی معاصر کتاب ہے اوراس میں ایبک کے بارے میں مختصر معلومات درج ہیں ۔ یہ دراصل غیاث الدین غوری کے دربار کا ایک ممتاز شاعر تھااور 602ھ میں وفات پائی ۔عہد قطبی کے نامور فاضل اور فخر ہند شخصیت مولانا رضی الدین حسن صغانی کی ہے، جن کی کتاب 'مشارق الانوار' حدیث کی مشہور کتابوں میں سے ایک ہے اور عرصہ تک نصاب میں پڑھائی جاتی رہی ہے۔امام صغانی محدث ہونے کے ساتھ بڑے ادیب، لغوی اور مفسر وفقیہ بھی ہیں۔قطب الدین ایبک نے انہیں لاہور کی قضائت پیش کی تھی ۔مختلف فنون پر انہوں نے بیسیوں کتابیں تصنیف کیں جن میں فن لغت کے اندر ایک کتاب 'العباب الزاخر' بیس جلدوں میں اور ایک 'مجمع البحرین' بارہ جلدوں میں ہے۔

شمس الدین التمش کا چھبیس 26 سالہ طویل دور ہندوستان میں مسلم حکومت کے استحکام اور علم و ادب کے روشن کارناموں کا زمانہ ہے۔اس عہد میں عالم اسلام کے دوسرے شہروں میں چنگیزی فتنہ کی قہر سامانیاں برپا تھیں' اس لیے دہلی کی طرف ہر جانب سے علماء وفضلاء آرہے تھے، التمش نے آنے والے علماء واہل کمال کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کے لیے وظائف مقرر کیے۔ان کے علمی کاموں کی قدر اور ہمت افزائی اور علم و دین کی خدمت کے لیے ان کو سہولیات بہم پہنچائیں ۔مشہور بزرگ حضرت جلال الدین تبریزی دہلی آئے تو التمش نے علماء ومشائخ کی ایک جماعت کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر ان کا استقبال کیا۔شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کو اس نے شیخ الاسلام بنایا' قاضی قطب الدین کا شانی ،نورالدین مبارک غزنوی اور قاضی فخر الائمہ اس کے دربار کی زینت تھے ۔ قاضی حمید الدین ناگوری سے اس کو بے پناہ عقیدت تھی ۔التمش ہی کے دربار سے مشہور مورخ ،قاضی اور فقیہ مولانا منہاج الدین سراج وابستہ ہوئے ، وہ شاہی خیمہ میں وعظ کہتے تھے، التمش نے انہیں گوالیار کا قاضی وخطیب اور تمام امور شرعی کا نگراں مقرر کیا تھا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ التمش کے دربار میں ارباب فضل وکمال اس قدر جمع ہوگئے تھے کہ کہیں اس کی کوئی مثال نہ تھی ۔ان علماء میں بعض درس وتدریس کے لیے مشہور تھے ۔التمش نے ان کے لیے دہلی میں متعدد مدرسے قائم کیے، دہلی کا مشہور مدرسہ معزی اسی بادشاہ کا قائم کردہ ہے جسے اس نے معز الدین (شہاب الدین غوری) کی یاد کے لیے قائم کیا تھا۔ بدایوں میں اپنی اقطاع کے زمانے میں بھی التمش نے

اس نام سے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ دہلی میں ایک دوسرا مدرسہ ناصریہ کے نام سے قائم ہوا تھا جسے التمش نے اپنے مرحوم بیٹے ناصرالدین کے نام پر بنایا تھا۔ التمش کے اپنے نام پر بھی ایک مدرسہ تھا جس کی بوسیدہ عمارت کی تعمیر ومرمت فیروز شاہ نے اپنے زمانہ میں کرائی۔

التمش کے دربار سے وابستہ شعراء میں خواجہ ابو نصر ناصری، بخارا کے مشہور شاعر و فلسفی امیر روحانی تاج الدین ریزہ اور شہاب الدین مہمرہ نامور اہل کمال تھے۔ التمش کا وزیر فخر الدین عصامی خود بڑا فاضل شخص تھا، وہ بغداد کے دربار خلیفہ میں تیس برس کام کر چکا تھا۔ پھر اس کی جگہ نظام الملک محمد جنیدی وزیر مقرر ہوا جو اپنے تدبر اور علم وفضل کے علاوہ علم دوستی اور علم پروری کے لیے بھی اس عہد میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ خود اس کا دربار بھی علماء وفضلاء اور شعراء سے مزین رہا کرتا تھا۔ التمش کے ایک امیر بہاء الدین علی کا شمار بھی اہل علم واہل ذوق میں ہوتا تھا اور اس کا دربار بھی شعراء کی سرپرستی کے لیے مشہور تھا۔ فخر الدین مبارک شاہ جو فخر مدبر کے نام سے معروف ہے، التمش کے دربار سے وابستہ رہا، اس نے بحرالانساب یا سلسلہ الانساب لکھ کر قطب الدین ایبک کو پیش کی تھی۔ اس کی دوسری کتاب آداب الحرب والشجاعہ ہے، جسے اس نے التمش کے نام پر معنون کیا تھا۔ یہ فارسی زبان میں فنون جنگ پر بہترین کتاب ہے۔ اسی عہد کے ایک نامور اہل علم مؤید جرجامی ہیں، جنہوں نے امام غزالی کی مشہور تصنیف احیاء علوم الدین کا فارسی میں ترجمہ کر کے التمش کے نام منسوب کیا۔ قاضی منہاج سراج نے اپنی کتاب طبقات ناصری میں ذکر کیا ہے کہ التمش کے دور میں علم وادب کی جو ترقی شروع ہوئی وہ آئندہ برابر بڑھتی ہی چلی گئی۔ شمس الدین التمش نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ بیرون ہندوستان سے اچھی کتابیں منگوائی جائیں اور ملک کے علمی خزانہ کو مالا مال کیا جائے۔ بلبن کے بیٹے بغرا خان نے اپنے بیٹے کیقباد کو نصیحت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ میرے والدین نے اتالیق کو حکم دیا تھا کہ آداب السلاطین اور مآثر السلاطین جیسی کتابیں جو سلطان شمس الدین التمش کے بیٹوں کے لیے بغداد سے لائی گئی تھیں، ہم لوگوں کو پڑھائی جائیں۔ دراصل التمش نے اپنے بیٹے محمود کی خاطر خواہ تعلیم کے لیے علاحدہ انتظام کر رکھا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی رضیہ سلطان کی تعلیم وتربیت کے لیے بھی بڑا اہتمام کیا تھا جس کی وجہ سے وہ انتہائی تعلیم یافتہ اور قابل حکمراں ثابت ہوئی تھی۔ عہد شمسی میں صوفیہ کرام نے بھی تصنیفی کاموں سے دلچسپی لی، چنانچہ خواجہ اجمیری کے خلیفہ سلطان التارکین شیخ حمید الدین ناگوری کے مکتوبات فن انشاء میں مشہور ہیں، ان ہی کی اصول الطریقہ اور

سرور الصدور نامی کتابیں ہیں ۔اسی نام کے ایک اور بزرگ قاضی حمید الدین ناگوری تھے جو شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید تھے اور دہلی آ کر خواجہ بختیار کاکی کے عقیدت مندوں میں شامل ہوئے اور سماع کے بڑے دلدادہ تھے،ان کی کتاب طوالع الشموس مشہور ہے،ان کی ایک کتاب رسالہ عشقیہ ہے جس میں عشق الہیٰ کے مضامین بیان ہوئے ہیں۔

1236ء میں التمش کی وفات کے بعد اس کے بیٹے رکن الدین فیروز سلطان کے عہد میں مشہور شاعر تاج الدین سنگریزہ کو دبیر الملک کے منصب پر فائز کیا گیا تھا،مولانا شہاب الدین مہمرہ جیسے نامور شاعر بھی جن کو امیر خسرو نے اپنا استاد بنایا تھا، فیروز کے دربار سے منسلک رہے۔التمش کی بیٹی رضیہ سلطان جو خود بھی قرآن اور دوسرے علوم میں دستگاہ رکھتی تھی،تخت سلطنت پر بیٹھنے کے بعد علماء وفضلاء کی سرپرست رہی۔ دہلی کے مدرسہ ناصریہ کا اہتمام اسی نے قاضی منہاج الدین سراج کے سپرد کیا تھا۔ انہوں نے طبقات ناصری میں رضیہ کو عالم نواز کے لقب سے یاد کیا ہے۔التمش کے چھوٹے بیٹے ناصر الدین محمود نے مولانا منہاج الدین سراج کو صدر جہاں ،پھر قاضی دہلی اور تمام مملکت کا قاضی القضاۃ بنایا۔مولانا منہاج الدین نے اپنی مشہور تاریخ طبقات ناصری ختم کر کے اسی بادشاہ کی خدمت میں پیش کی اور اسی کے نام پر اس کا نام ’طبقات ناصری‘ رکھا۔اس کتاب میں 23 طبقات ہیں جن میں ابتدائے عالم سے لے کر 1261 تک کے تاریخی واقعات ہیں،دہلی سلطنت کے قطب الدین ایبک سے ناصر الدین محمود تک سلاطین دہلی اور ان کے امراء کے حالات اخیر کے ابواب میں بیان ہوئے ہیں۔مؤلف بلبن کی تخت نشینی کے وقت زندہ تھے،لیکن تاریخ 658 مطابق 1260 پر ختم کر دی ہے۔مولانا ضیاءالدین برنی نے اپنی تاریخ عہد بلبن سے شروع کی ہے۔ناصر الدین محمود کے زمانے میں ہی قاضی عماد الدین محمد بن اسماعیل اشفورقانی ایک بڑے فقیہ اور جید عالم اور قاضی ممالک کے منصب پر فائز تھے۔ان کی ایک قیمتی کتاب ’صنوان القضاء وعنوان الافتاء‘ عربی زبان میں قضاء کے آداب اور مسائل کے موضوع پر ہے جو ہندوستان میں لکھی جانے والی اس موضوع کی پہلی کتاب ہے۔معاصر عالم قاضی شریعت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ بانی اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی تحقیق سے چار جلدوں میں یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔ سلطان کے دربار کے شعراء میں مولانا منہاج الدین اور عمید الدین سنامی خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔

سلطان غیاث الدین بلبن کے دور میں اتنے مشائخ جمع ہو گئے تھے کہ مورخین نے اس عہد کو

خیرالاعصار کہا ہے۔ بابا فرید گنج شکر، خواجہ علی چشتی، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی، ان کے صاحبزادے شیخ صدرالدین، شیخ بدرالدین غزنوی، شیخ ابوالموئید، شیخ نظام الدین اولیاء، شیخ جمال الدین ہانسوی، خواجہ علاء الدین علی بن احمد صابر، شیخ حسام الدین ملتانی، شیخ نجیب الدین فردوسی اور شیخ ابوبکر طوسی وغیرہ سے پورا ملک منور ہوگیا تھا۔ ان مشائخ کے علاوہ فضلاء وعلماء بھی بڑی تعداد میں اس دور میں جمع ہوگئے تھے۔ بلبن نے ان علماء اور ارباب کمال کو علاحدہ علاحدہ محلوں میں آباد کیا تھا اور ان کی بھرپور سرپرستی کی تھی جس سے اس عہد میں علم وفن کی بڑی رونق ہوگئی تھی۔ بلبن کے دور میں مشہور علماء میں ایک مولانا برہان الدین محمود بلخی تھے جو صاحب ہدایہ شیخ برہان الدین مرغینانی کے شاگرد تھے۔ ان سے ہی ہندوستان میں ہدایہ کو رواج ملا، علامہ نجم الدین دمشقی فلسفہ کے عالم اور امام فخر الدین رازی کے شاگرد تھے۔ شیخ سراج الدین ابوبکر فقہ واصول فقہ اور عربی ادب کے بڑے عالم تھے۔ مولانا شرف الدین ولوالجی درس فقہ کے لیے مشہور تھے۔ مولانا برہان الدین بزار اور قاضی رکن الدین سامانوی بھی اس دور کے مشہور فقیہ تھے۔ مولانا کمال الدین زاہد بڑے زاہد و متقی عالم تھے، ان سے ہی شیخ نظام الدین اولیاء نے مشارق الانوار پڑھی تھی۔ مولانا شمس الدین خوارزمی یگانہ عصر تھے، دہلی کے تمام اساتذہ ان کے شاگرد تھے، ان کے تین چہیتے شاگردوں میں مولانا قطب الدین ناقلہ، مولانا برہان الدین عبدالباقی اور شیخ نظام الدین اولیاء تھے۔ بلبن نے ان کو شمس الملک کا خطاب دے کر سلطنت کا مستوفی الملک (آڈیٹر جنرل) مقرر کیا تھا۔ مولانا فخر الدین ناقلہ فقہ و اصول اور عربی ادب کے بڑے ماہر تھے، بلبن نے ان کو صدر جہاں بنایا تھا۔ اسی طرح قاضی رفیع الدین قارزونی، قاضی شمس الدین، قاضی جلال الدین کاشانی، قاضی سدیدالدین اور قاضی ظہیرالدین وغیرہ بھی اس عہد کے بلند پایہ عالم اور منصب قضاء پر فائز اصحاب تھے۔

اس عہد میں امراء کے دربار بھی علم وفضل کے مراکز بن گئے تھے، بالخصوص بلبن کے بیٹے خان محمد کا ملتان میں دربار بے مثال تھا، جہاں فضلاء وشعراء کا مجمع رہتا تھا اور شعروادب کے علمی نکات پر گفتگو ہوتی تھی۔ خان محمد کے دربار سے امیر خسرو جیسی عظیم شخصیت اور امیر حسن جیسے ماہر فن شاعر وابستہ تھے۔ شہزادہ خان محمد خود بھی شعروادب کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتا تھا، اس نے ایک بیاض شعری تیار کی تھی جس میں اپنے ذوق کے مطابق بیس ہزار اشعار منتخب کیے تھے، اس انتخاب پر امیر خسرو اور امیر حسن سجزی بھی داد دیتے تھے۔ شہزادہ محمد کی علمی سرپرستی کی شہرت بیرون ملک پہنچی ہوئی تھی۔ دہلی کے شاہی دربار سے بھی کئی

فضلاء سلطان محمد کے دربار ملتان سے وابستہ ہو گئے تھے۔ شہزادہ نے ان کو جاگیریں دے کر اپنی قدردانی کا ثبوت دیا۔ سلطان محمد اس بات کی کوشش کرتا کہ بیرون ملک کے ارباب کمال اس کے دربار میں آئیں‘ وہ لاہور میں خود شیخ عثمان ترمذی کی خدمت میں حاضر ہوا جو توران کے بڑے جید عالم تھے اور انہیں اپنے یہاں قیام کرنے کی بہت منت سماجت کی۔ اس نے دو مرتبہ شیخ سعدی کی خدمت میں شیراز قاصد بھجوا کر ان کو ملتان آنے کی دعوت دی اور تحائف کے ساتھ سفر خرچ بھیجا۔ بلبن کے دوسرے بیٹے شہزادہ بغرا خان کے یہاں بھی ادب کی مجلسیں قائم ہوتی تھیں جہاں ماہرین موسیقی، ارباب نشاط اور مغنیوں کا اجتماع رہتا تھا۔ اس کے درباری شعراء میں شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر کے علاوہ ایک زمانے میں امیر خسرو اور امیر حسن سجزی بھی رہتے تھے۔ ان امراء کی تقلید میں ایسے علمی جلسے ہر محلّہ اور آبادی میں منعقد ہونے لگے تھے۔ علاء الدین کشلی خان جو بلبن کا بھتیجہ تھا، وہ بھی اہل علم کا قدرداں اور فیاض تھا۔ اس کے دربار کی شہرت سن کر مصر و شام، روم و بغداد، خراسان و ترکستان اور ماوراء النہر سے شعراء آتے اور انعام و اکرام سے مالا مال ہو کر یہاں سے واپس جاتے۔ امیر خسرو سب سے پہلے اسی امیر کشلی خان کے دربار سے وابستہ ہوئے تھے۔ اسی طرح امیر علی سرجاندار بھی علمی قدردانی کے لیے مشہور امیر تھا اور کثرت سے سخاوت و فیاضی کرتا تھا۔ بلبن کے دربار کا ایک اور امیر ملک الامراء فخر الدین جو دہلی کا کوتوال تھا اہل علم کی سرپرستی اور علمی سخاوت و فیاضی کے لیے مشہور تھا۔ اس کے یہاں ہزاروں افراد قرآن کی تلاوت کے لیے متعین رہتے تھے۔ امیر خسرو کی شہرت و عظمت کا آغاز اسی دور سے ہوتا ہے۔ شہزادہ محمد کی شہادت کے بعد خسرو گوشہ نشین ہو گئے۔ کیقباد کی تخت نشینی کے بعد جب بغرا خان اور کیقباد کی ملاقات ہوئی تو اس موقع پر خسرو موجود تھے اور کیقباد کی خواہش پر اس تاریخی ملاقات کو انہوں نے منظوم کیا اور قران السعدین کے نام سے تین ہزار نو سو چوالیس اشعار کی ایک مثنوی لکھی۔ بادشاہ نے ان کو اپنا ندیم خاص بنالیا تھا اور ان کے لیے روزینہ مقرر کر دیا تھا۔ ان کی شعری تصانیف غزلوں اور مثنویوں پر مشتمل ہے، تحفتہ الصغر، غرۃ الکمال، وسط الحیوۃ، بقیہ نقیہ اور نہایت الکمال، اسی طرح خمسہ ان کے اہم دیوان ہیں۔

خلجی خاندان کے بانی جلال الدین فیروز خلجی خود عمدہ علمی ذوق رکھتا تھا۔ وہ خود شاعر تھا اور شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتا تھا، وہ علم و ہنر کا بڑا قدرداں رہا۔ جلال الدین خلجی کے ہم نشینوں میں ممتاز ارباب علم ہوئے جو اکثر اس کی نجی مجلسوں میں شریک رہتے۔ امیر خسرو اس کی مجلس میں ہر روز نئی نئی

غزلیں لاتے اور بادشاہ ان غزلوں کو خوب پسند کرتا اور انعامات سے نوازتا۔جلال الدین نے امیر خسرو کو اپنے شاہی کتب خانہ کا کتاب دار مقرر کیا تھا۔وہ بادشاہ ہونے سے پہلے بھی امیر خسرو کا قدرداں رہا تھا۔ اس نے خسرو کو اپنا مصحف دار بھی بنایا تھا اور امیر کا خطاب دے کر سفید کمر بند لگانے کی اجازت دی تھی جو صرف شاہی خاندان کے لیے مخصوص تھا۔جلال الدین کے ہم نشینوں میں امیر خسرو کے علاوہ تاج الدین عراقی،خواجہ حسن،معید دیوانہ،امیر ارسلان قلی‘ اختیار الدین یاغی اور باقی خطیر وغیرہ رہے۔جن میں سے بعض نے شاعری اور تاریخ پر کتابیں تصنیف کیں۔جلال الدین کے بعد علاء الدین خلجی تخت نشین ہوا۔ علاء الدین کا دور اہل علم اور ارباب کمال کی کثرت کے لیے ممتاز ہے،مولانا عبدالحق حقی نے لکھا ہے کہ: سلطان علاء الدین کے عہد میں دہلی علماء وفضلاء کا بہت بڑا مرکز بن گیا تھا۔مسجدیں، مدرسے،حمام، مقبرے، قلعے اور ہر قسم کی عمارتیں اس طرح تعمیر ہوئیں کہ جیسے کسی نے جادو کیا ہے اور فضلاء کا مجمع ایسا ہوا جو کہ کسی زمانے میں نہیں ہوا۔علوم وفنون کے 45 ماہرین درس وتدریس میں مشغول تھے۔

دربار علائی سے وابستہ شعراء میں امیر خسرو،امیر حسن،صدر الدین علی،فخر الدین خواص،حمید الدین راجہ،مولانا عارف،عبدالحکیم اور شہاب الدین صدر نشین وغیرہ تھے۔ان سب کو دربار سے وظائف ملتے تھے۔اس دور کے مورخین میں امیر ارسلان کلاہی اور کبیر الدین فرزند تاج الدین عراقی ہیں جس نے فتوحات علائی پر کتاب لکھی تھی،جس کا نام فتح نامہ ہے۔ان کے علاوہ امیر خسرو اور ضیاء الدین برنی بھی اس دور کے بڑے مورخین میں ہی۔نثر نگاروں میں عین الملک ملتانی کا تعلق دربار علائی سے ہے جس کی نثر،انشائے ماہر وشستہ نثر میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔خلجی خاندان کی حکومت چالیس برس رہی۔اس زمانے میں علم وادب کو بھی سب سے زیادہ رونق حاصل ہوئی۔اوپر ذکر کی گئی کتابوں کے علاوہ اس دور میں ملفوظاتی ادب بھی سامنے آیا چنانچہ شیخ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات کو امیر خسرو نے افضل الفوائد کے نام سے،امیر حسن سنجری نے فوائد الفواد کے عنوان سے،اور شیخ نصیر الدین چشتی نے مفتاح العاشقین کے نام سے جمع کیا۔خواجہ محبوب الٰہی کے ایک شاگرد امیر خورد نے ان کی حیات سیر الاولیاء کے نام سے لکھی۔ اس دور میں گجرات میں گجراتی ادب‘ بنگال میں بنگالی ادب اور جنوبی ہند کے علاقوں میں علاقائی ادب پر بھی کام ہوئے۔

غیاث الدین تغلق کے عہد میں تعلیمی ترقی کی راہیں وسیع ہوئیں۔سلطان ارباب علم وفضل کا

گرویدہ تھا، انہیں اپنے دربار میں مدعو کرتا اوران کے لیے وظائف جاری کرتا۔لیکن اس کے دور میں لائق ارباب علم اتنے نہ تھے جتنے عہد علائی میں تھے۔محمد بن تغلق اعلیٰ درجہ کا عالم وفاضل اور متعدد خوبیوں کا حامل شخص تھا۔قرآن مجید کا حافظ، نماز وروزہ کا پابند، بہترین خطاط، ساحرالبیان خطیب، عربی وفارسی میں اعلیٰ خطوط لکھنے والا، اور جدت پسند تھا۔ اس کا حافظہ بھی بڑا عجیب وغریب تھا، جو کچھ پڑھتا اس کو تاریخ کے ساتھ یادرکھتا، کئی کتابیں اس کو زبانی یاد تھیں، وہ طب، منطق، ہیئت اور ریاضی میں بھی بڑی مہارت رکھتا تھا۔ یونانی فلسفہ کا بھی مطالعہ کررکھا تھا، علماء وفضلاء سے مذاکرے کیا کرتا تھا، ارباب علم ودانش کو دلائل سے قائل کرتا۔اشعار میں گہرے معانی اور نئی نئی تشبیہات واستعارات پیدا کرتا کہ لوگ دنگ رہ جاتے۔ اپنی ان خوبیوں کے ساتھ وہ فیاضی اورغربا پروری کے لیے بھی مشہور تھا۔اس کی فیاضی کی شہرت سن کر ارباب فضل دہلی آتے اورانعامات سے سرفراز ہوکر واپس جاتے' لیکن وہ اس کے ساتھ ساتھ تندخواور وہمی مزاج رکھتا تھا، جس کی وجہ سے علمی ماحول پر براثر پڑا۔لیکن سلطان کا ذوق علمی تھا' اس کے دربار میں شروع سے آخر تک علمی معیاراونچارہا۔مورخین نے لکھا ہے کہ اس کے دربار میں عربی فارسی اور ہندوستانی زبانوں کے ایک ہزار لائق شعراء تھے۔اس کے دسترخوان پر دو دو سو علماء ہوتے اور وہ ان سے علمی مذاکرے کرتا۔محمد بن تغلق کے دربار میں آنے والے نامور اہل علم میں مشہور لغت القاموس کے مصنف علامہ مجدالدین، مولانا شمس الدین یحییٰ، شیخ عبدالعزیز الاردویلی جو علامہ ابن تیمیہ کے شاگرد رہ چکے تھے، موجود تھے۔مشائخ میں شیخ نصیرالدین چراغ دہلی مشائخ چشتیہ کی یادگار تھے۔اسی بادشاہ کے زمانے میں مشہور سیاح ابن بطوطہ دہلی آیا۔محمد بن تغلق نے اسے دہلی کا قاضی مقرر کیا تھا اور کچھ عرصہ بعد اسے سفیر بنا کر چین بھیجا۔مشہور مورخ ضیاءالدین برنی بھی اس دور میں موجود تھا۔وہ سلطان کا ندیم خاص مقرر ہوا تھا۔شعراء میں ملک الشعراء بدر چاچ تھا جس کی سلطان نے بڑی قدر کی اور فخرالزماں کا خطاب دیا۔مولانا معین الدین عمرانی بڑے فقیہ تھے' جنھوں نے فقہ واصول کی کئی کتابوں جیسے کنز، منار، حسامی وغیرہ پر حواشی لکھے تھے۔ضیاء نخشبی بھی اس عہد کے نامور فاضل ہیں' جنھوں نے سلک السلوک اور طوطی نامہ لکھی۔ یہ طوطی نامہ سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ ہے۔اس عہد کا ایک اور مشہور مؤرخ عصامی ہے جس نے 12 ہزار اشعار کی ایک مثنوی فتوح السلاطین لکھی جس میں غزنویوں، غوریوں، خاندان غلاماں، خاندان خلجی اور خاندان تغلق کے پہلے دو بادشاہوں کی فتوحات اور واقعات زندگی نظم کیے ہیں۔

فیروز تغلق اپنے رفاہی کاموں، عوامی فلاح و بہبود اور علم و دین کی خدمت کے شاندار کارناموں کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی صف اول میں رکھے جانے کے لائق ہے جس طرح اس نے سلطنت کی مادی خوشحالی پر توجہ دی، تعلیم وثقافت کے فروغ پر بھی خاطر خواہ توجہ دی۔ خود اس کی تعلیم بھی اعلیٰ درجہ پر ہوئی تھی، چنانچہ اس نے خود ایک کتاب فتوحات فیروز شاہی تصنیف کی۔ اس کے دربار میں ضیاء الدین برنی اور شمس سراج عفیف جیسے بڑے مورخ تھے۔ ان دونوں کی کتابیں تاریخ فیروز شاہی کے نام سے موجود ہیں۔ فیروز شاہ نے علماء وفضلاء کی پذیرائی کے لیے خاص اہتمام کر رکھا تھا، چنانچہ ایک خاص محل صرف علماء سے ملاقات کے لیے بنوایا تھا۔ فیروز تغلق نے ہزاروں غلاموں کو جمع کر لیا تھا جن میں ایک بڑی تعداد کو تعلیم اور درس سے لگا رکھا تھا۔ کچھ غلام قرآن کی تلاوت کرتے اور حفظ کرنے میں مشغول رہتے، کچھ مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرتے اور کچھ کتابوں کی نقلیں تیار کرتے۔ اس نے علم کے فروغ کے لیے باضابطہ قانون بنایا تھا اور سلطنت کے مختلف حصوں میں علماء وفضلاء کو آباد کیا تاکہ وہ لوگوں میں تعلیم کی اشاعت کریں۔ اس نے پرانے فرمانرواؤں کی عمارتوں کی مرمت کرائی جن میں مسجدیں اور مدارس کی بھی از سرنو مرمت کرائی اور ان کے اوقاف مقرر کیے، چنانچہ خود اس نے 40 مسجدوں اور 30 مدرسوں کا ذکر کیا ہے۔ فیروز شاہ نے ایک مدرسہ فتح خاں کے مقبرہ کے پاس بنوایا تھا، دوسرا مدرسہ فیروز آباد میں بنوایا تھا جو مدرسہ فیروز شاہی کہلاتا تھا، وہ اپنی علمی شہرت اور تعمیری دلآویزی میں تمام مدارس میں ممتاز تھا۔ مولانا جلال الدین رومی اسی مدرسے میں درس دیتے تھے۔ اس مدرسہ کو دیکھنے کے لیے دور دراز کے علاقوں سے سیاح آتے تھے۔ مدرسہ کے اساتذہ اور تمام طلبہ کے لیے روزینے مقرر تھے۔ اچھے طلبہ کو وظیفہ دیا جاتا تھا۔ فیروز شاہ تغلق کے دور کے تین بڑے عالم مولانا احمد تھانیسری، مولانا خواجگی اور قاضی عبدالمقتدر دہلوی تھے۔ مشائخ میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کی فیروز شاہ نے بڑی قدر کی، بلکہ اس کی تخت نشینی میں شیخ چراغ دہلی کی کوششوں کا دخل رہا، شیخ صدر الدین ملتانی اسی دور میں شیخ الاسلام تھے۔ اس عہد کے شعراء میں قاضی عابد، مسعود بک، ظہیر دہلوی، حمید قلندر اور امیر احمد معروف ومشہور رہے تھے۔ فیروز تغلق کے عہد میں فقہ کو خاص طور سے فروغ حاصل ہوا اور فقہ کے موضوع پر کتابیں لکھی گئیں، ان میں فقہ فیروز شاہی مشہور ہے، جو یعقوب مظفر کرانی نے تصنیف کی تھی۔ ایسی ہی ایک کتاب فوائد فیروز شاہی ہے، جسے شرف محمد عطائی نے تصنیف کیا تھا۔ فیروز شاہ کا ایک صاحب علم امیر تاتارخاں تھا، اس نے فقہ کی ایک

اہم مبسوط کتاب فتاویٰ تاتارخانیہ تیار کرائی، جسے مولانا عالم بن علاء حنفی نے تیار کر کے امیر کے نام سے منسوب کیا۔ اس امیر نے علماء کی ایک جماعت کے ذریعہ تفسیر میں بھی ایسی ہی ضخیم کتاب تیار کرائی۔ حضرت چراغ دہلی کے ایک مرید مولانا رکن الدین نے 30 ہزار اشعار پر مشتمل ایک فقہی کتاب طرفتہ الفقہاء لکھی تھی۔ فیروز شاہ کے عہد میں سنسکرت کی کئی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔ جن میں دلائل فیروز شاہی قابل ذکر ہے۔ اس دور کے مشائخ میں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بھی ہیں، جن کے مکتوبات کا مجموعہ مکتوبات صدی اور مکتوبات دوصدی کے نام سے موجود ہے۔

لودھی خاندان میں بہلول لودھی فضلاء کی محبت کا شوق رکھتا تھا اور ان کو انعامات دے کر علم کی قدردانی کرتا تھا۔ اس نے کچھ مدارس بھی قائم کیے، اور ایسا امن و امان قائم کیا جس سے علم و ادب کی ترقی ہوئی۔ بہلول کے بعد اس کا بیٹا نظام خاں تخت سلطنت پر بیٹھا جس نے سکندر لودھی کا لقب اختیار کیا۔ سکندر لودھی خود بھی بڑا فاضل اور عالم تھا' علماء کے ساتھ صحبت رکھتا تھا، ان سے مذہبی مناظرے کیا کرتا تھا، اس نے علوم و فنون کی فیاضیانہ سرپرستی کی۔ اس کے دستر خوان پر جید قسم کے علماء و فضلاء ساتھ ہوتے۔ سلطان خود بھی ایک اچھا شاعر تھا اور گلرخ تخلص استعمال کرتا تھا۔ اس کے دیوان میں آٹھ ہزار اشعار ہیں۔ سکندر لودھی نے اپنا دارالسلطنت آگرہ منتقل کر دیا تھا۔ وہاں عرب، ایران، بخارا اور ہندوستان کے دوسرے شہروں کے علماء و فضلاء اس کی قدردانی کی وجہ سے جمع ہو گئے تھے۔ سکندر کے علمی ذوق اور علم کی اشاعت کے شوق کا یہ عالم تھا کہ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ تمام فوجی عہدیدار بھی تعلیم یافتہ ہوں۔ اس طرح اس کے دور میں فوجی فنون سپہ گری کے ساتھ علمی قابلیت بھی رکھتے تھے۔ سکندر لودھی کے عہد کا ایک اہم علمی کارنامہ یہ ہے کہ اس دور میں ہندوؤں نے فارسی سیکھنی شروع کی۔ پہلے ہندو فارسی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ سکندر لودھی نے انہیں ترغیب دی اور اس کی ترغیب پر کائستھوں نے فارسی سیکھی اور سرکاری عہدے حاصل کرتے گئے۔ اس سے دونوں قوموں کے باہمی روابط کو فروغ ملا اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے علوم کا خود ان کی زبان میں مطالعہ شروع کیا۔ اس عہد میں سنسکرت کی کتابوں کا کثرت سے فارسی میں ترجمہ ہوا۔ سلطان نے ترجمہ کی ترغیب دی اور اس کی ہمت افزائی کی۔ سلطان کی فرمائش پر بہت سی کتابیں فارسی میں ترجمہ کی گئیں۔ طب پر سنسکرت کی ایک اہم کتاب ارگا مہا بیدک کا فارسی میں ترجمہ کرایا گیا اور طب سکندری نام رکھا گیا۔ موسیقی کی کتابوں کا بھی فارسی میں ترجمہ ہوا۔

علم وفن کی سرپرستی میں سلطان سکندر لودھی کے ذوق وشوق کا اثر اس کے امراء پر بھی تھا، چنانچہ اس کے متعدد امراء بھی علمی فیاضی میں بہت پیش پیش رہتے تھے۔اس کے عہد میں ملتان سے دو بڑے عالم شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ دہلی آئے جنھوں نے درس و تدریس کے معیار کو بہت بلند کیا۔مولانا رفیع الدین شیرازی محدث شیراز سے آئے، ملک العلماء مولانا عبداللہ اس کے دربار سے وابستہ تھے جنہوں نے فتوی دیا تھا کہ ہندوؤں کی قدیمی عبادت گاہ کو گرانا خلاف شرع ہے اور ہندوؤں کے اشنان کی قدیم رسم بند کرنا جائز نہیں ہے۔عہد سکندری کی ایک اہم علمی شخصیت شیخ جمال کی ہے جن کی تصنیف سیر العارفین مشائخ کے تذکرہ میں ہے، ان ہی کے صاحبزادہ شیخ گدائی ہیں جو عہد اکبری کے شیخ الاسلام ہوئے۔

مختصر یہ کہ دہلی سلطنت کا عہد تہذیب وتمدن اور علم وادب کا ایک عظیم گہوارا تھا جس میں مختلف علوم وفنون، مشترکہ تہذیب وتمدن، تعلیمی نظم ونسق، صنعت وحرفت، فنِ تعمیرات اور زبان وادب وغیرہ کو فروغ پانے کا خاطر خواہ موقع ملا۔

❐ **Prof. Mohd Fahim Akhtar**
Head, Department of Islamic Studies
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad - 500032
Mobile: 9885775629
Email: fahim@manuu.edu.in

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:175-185
Prof. Abu Bakar Abbad, Akbar Allahabadi ki Qeraat-e-Nau

ابوبکر عباد

اکبر الٰہ آبادی کی قرأتِ نو

اکبر کے تعلق سے بہت سے لوگوں نے مضامین لکھے ہیں۔ پرانے لوگوں میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین، جعفر علی خاں اثرؔ اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی جیسے حضرات کے نام بطور خاص اہم ہیں۔ ان سبھی نے اکبرؔ کی ظرافت، نئی تہذیب سے ان کی مخالفت، پرانی تہذیب کی حمایت، ان کے نظریۂ تعلیم، نظریۂ عورت، موضوعات کی جدت اور اردو شاعری میں انگریزی الفاظ کی بکثرت شمولیت کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ اس ضمن میں ان کے قطعات، ان کی رباعیوں اور غزلوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ بعد کے لوگوں نے بھی انھی موضوعات کو اپنی تحریروں کا بنیادی حوالہ بنایا ہے اور مطالعے کی یہی روایتی روش اپنائی ہے۔ جانے کیوں نئے ناقدین نے بھی فکری لحاظ سے اکبرؔ کے تصورات کو سمجھنے اور فنی اعتبار سے ان کی شاعری کے پوشیدہ گوشوں کو دریافت کرنے کی کوششیں نہیں کیں، اور نہ ہی ان کی نظم نگاری پر زیادہ توجہ دی، گو کہ اکبر نے بڑی تعداد میں اور متعدد موضوعات پر نظمیں کہی ہیں۔

شاید اکبر کی نظموں کو نظر انداز کیے جانے کی ایک وجہ یہ رہی کہ انھوں نے اپنی زندگی کے نصف اول تک صرف غزلیں ہی کہیں، اس لیے ان کی نظمیں عام لوگوں کی نظروں اور ناقدین کے ذہنوں سے کافی حد تک اوجھل رہیں۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ ان کے طنزیہ اور ظریفانہ موضوعات واسلوب اتنے شوخ اور ایسے اثر انگیز تھے کہ لوگ اس جادو سے باہر نہیں نکل پائے اور انھوں نے کلام اکبرؔ کے فنی تجزیے کے بجائے محض اپنے مطلب کے موضوعاتی اشعار ڈھونڈنے اور اس حوالے سے ان کے تصورات کو منور کرنے پر اکتفا کی۔ تیسری وجہ یہ رہی کہ اکبرؔ نے اپنی بیشتر نظموں پر عنوانات نہیں لگائے ہیں جس کی وجہ سے یہ

نظمیں نظیرؔ اکبرآبادی، علامہ اقبالؔ، جوشؔ ملیح آبادی اور اسماعیل میرٹھی کی نظموں کی مانند قاری کو اپنی جانب متوجہ نہیں کر سکیں، بالخصوص عام قاری اور سہل پسند ناقدین یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہے کہ اس نوع کے شعری متن کا تعلق کس صنف سے قائم کیا جائے۔

روایت یہ ہے کہ 1877 میں جب منشی احمد حسین نے اپنے مشہور زمانہ اخبار 'اودھ پنچ' کا اجرا کیا تو اس موقع سے اکبرؔ الہ آبادی نے ان کے نام ایک منظوم خط لکھا۔ اسی منظوم خط سے اکبر الہ آبادی کی باضابطہ نظم نگاری بھی شروع ہوتی ہے اور ان کے طنز و ظرافت کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ چار مصرعوں والی رباعی اور دو اشعار والے قطعے پہلے بھی کہتے رہے تھے۔ یہ منظوم خط اکبر کے کلیات میں 'نامہ بنام مدیر اودھ پنچ' کے عنوان سے موجود ہے۔ مثنوی کی بحر میں لکھی ہوئی یہ طویل نظم ایک سو چودہ اشعار پر مشتمل ہے۔ گرچہ اکبرؔ کی یہ پہلی نظم تھی مگر فنی اعتبار سے بہت کامیاب ہے۔ اس کے تمام مصرعے ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور فطری طور پر آگے بڑھتے ہوئے نظم کو انجام تک پہنچاتے ہیں۔ نظم کی روانی اور ظرافت اکبرؔ کی حسِ مزاح اور زبان پر ان کی قدرت کی گواہی دیتے ہیں۔ اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اکبر کی اچھی اور کامیاب نظموں میں سے ایک، ان کی یہ پہلی نظم بھی ہے۔

اس منظوم خط 'نامہ بنام مدیر اودھ پنچ' کے بعد سے ایسا لگا جیسے اکبر غزلوں سے منھ موڑ کر نظموں کے ہی ہو رہے۔ انھوں نے کثرت سے نظمیں لکھنی شروع کیں۔ یہاں تک کہ علامہ سید سلیمان ندوی کے نام 25 جولائی 1919 کے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: ''تین ہزار سے زیادہ نظمیں بیاضوں میں موجود ہیں۔ حصہ سوم کے لیے پبلک کا بڑا تقاضہ ہے۔ حیران ہوں کہ ترتیب و انتخاب کیوں کر ہو۔'' (رقعات اکبر، مرتبہ، محمد نصیر ہمایوں، لاہور، ص، 38) سید افتخار حسین کو 10 جولائی 1919 کے خط میں لکھتے ہیں کہ: ''حصہ سوم کی ترتیب و تہذیب میں مصروف ہوں، مشیر کوئی نہیں۔ قریب 2600 (دو ہزار چھ سو) نظمیں ہیں۔'' (ایضاً، ص، 64) ظاہر ہے ان نظموں میں ان کے قطعات بھی شامل ہیں۔ ان کی نظمیں طویل بھی ہیں اور مختصر بھی۔ زیادہ تر نظمیں غزل کے فارم میں ہیں اور کچھ نظموں میں قافیہ اور ردیف کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔ بہت سی نظمیں فنی معیار کے لحاظ سے مکمل اور منضبط ہیں اور کچھ ایسی ہیں جن پر مسلسل غزل کا گمان ہوتا ہے۔ کچھ نظمیں باضابطہ عنوان کے تحت لکھی گئی ہیں اور ایسی نظمیں بھی خاصی تعداد میں ہیں جن کے اوپر انھوں نے کوئی عنوان نہیں لگایا ہے۔ اکبر کے یہاں تقریباً سو نظمیں ایسی ہیں جو محض تین اشعار پر

مشتمل ہیں۔ یہ نظمیں رباعی کے چار مصرعوں اور غزل کے قطعہ بند دو اشعار سے یوں مختلف ہیں کہ یہاں مضمون یا خیال کی تکمیل چار کے بجائے چھے مصرعوں میں ہوتی ہے۔ یہ نظمیں غزل، مثنوی، مسدس اور دوسری ہیئتوں میں بھی ہیں۔ پہلے ان کی چھے مصرعوں والی نظم ملاحظہ کیجیے۔اس طرز اسلوب کو اکبر کی جدت پسند طبیعت کی اپج سے تعبیر کرنا غلط نہ ہوگا۔

بے علم اگر عقل کو آزاد کریں گے　　دنیا تو گئی دین بھی برباد کریں گے
جب خود نہیں رہنے کے کسی اصل پہ قائم　　کیا خاک وہ قائم کوئی بنیاد کریں گے
بارک کوئی کردے گی عطا ان کو گورنمنٹ　　یا کالونی کوئی اپنی آباد کریں گے

اکبر کے یہاں اچھی نظمیں بھی ہیں اور کم اچھی بھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی کامیاب نظموں میں ایسی نظموں کی تعداد زیادہ ہے جو بلاعنوان ہیں۔سو، ان کی نظموں کی طرف توجہ نہ دیے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ناقدوں نے 'برق کلیسا'، 'جلوہ دربار دہلی'، 'کرزن سبھا' اور 'گاندھی نامہ' کے مقابلے میں بلاعنوان نظموں کے موضوعات طے نہ کر پانے کے باعث انھیں نظرانداز کیا جس کی وجہ سے ان نظموں کی خوبیوں کا جیسا بیان ہونا چاہیے تھا نہیں کیا گیا۔ مسدس کی ہیئت میں ان کی ایک طویل قومی نظم ہے۔اس کا ایک بند ملاحظہ کیجیے۔ یہ نظم ان پر رجعت پسندی کے الزام کا بھی کافی حد تک دفاع کرتی ہے:

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو
اٹھو تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو، ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے اطراف دنیا میں سفر سیکھو
خواص خشک تر سیکھو علوم بحر و بر سیکھو
خدا کے واسطے اے نوجوانو ہوش میں آؤ
دلوں میں اپنے غیرت کو جگہ دو جوش میں آؤ

کلیم الدین احمد مثنوی کی ہیئت میں لکھی ہوئی ان کی ایک بلاعنوان نظم جو یوں شروع ہوتی ہے:

دو تیتریاں ہوا میں اڑتی دیکھیں　　اک آن میں سو طرف کو مڑتی دیکھیں
بھولی خوش رنگ جست نازک پیاری　　پہنے ہوئے فطرتی منقش ساری
پھرتی ہے کہ برق طبیعت کا ابھار　　تیزی ہے کہ آنکھ کو تعاقب دشوار

کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''کس سادگی، صفائی اور پاکیزگی سے تیتریوں کے ناچ کی تصویر کھینچی گئی ہے۔، یہ تصویر رسمی نہیں۔ اکبر اس منظر سے متاثر ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ تصویر ایسی حسین اور موثر ہے۔ کاش وہ اس قسم کی نظموں کی طرف توجہ کرتے۔'' (اردو شاعری پر ایک نظر، جلد دوئم، پٹنہ، تیسرا ایڈیشن، 1966، ص 96-95)

اکبر اپنی نظموں میں تضادات سے بہت کام لیتے ہیں۔ مثلاً مشرق و مغرب کا تضاد، نئی اور پرانی تہذیب کا تضاد، مذہب اور لامذہبیت کا تضاد، خیر اور شر کا تضاد، شوہر و بیوی کا تضاد، چھوٹے بڑے کا تضاد، صاحب اور ملازم کا تضاد اور عام اور خاص کا تضاد۔ اس تضاد کی وجہ سے ہی ان کی شاعری میں واقعے، کردار اور عمل کے دونوں رخ یا پہلو زیادہ نکھر کر اور زیادہ شدت سے سامنے آتے ہیں۔ کہنا چاہیے کہ نظموں میں تضادات کا ایسا ہنر مندانہ، دلچسپ اور اثر انگیز استعمال کم شاعروں نے کیا ہے۔ وہ محض طنز و ظرافت کو نظموں کا جامہ نہیں پہناتے، بلکہ ان کی بیشتر نظموں میں طنز و ظرافت کی تہہ میں کوئی نہ کوئی پیغام، کوئی نکتہ یا فلسفہ پوشیدہ ہوتا ہے یا بین السطور اصلاحی اور اخلاقی پہلو بہر طور رہتا ہے۔ ملا واحدی کے نام وہ اپنے خط میں لکھتے ہیں: ''ایسی ظرافت جو نری ظرافت ہو اور اس کے اندر کوئی اخلاقی نصیحت نہ ہو یا کوئی نکتہ مذہبی سوشل یا فلسفیانہ نہ پیدا ہو، کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی۔'' (بحوالہ علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر، 1950، ص، 30) لیکن اہم بات یہ ہے کہ وہ یہ پیغام پروپیگنڈہ یا تبلیغ کے طور پر یا ناصحانہ اور بزرگانہ انداز میں نہیں دیتے، بلکہ بڑی فنکاری کے ساتھ بالواسطہ طریقے، یا تقابل کی صورت یا پھر ڈرامائی تکنیک کے ذریعے نظموں میں اس طرح سموتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے جیسے بات سے بات اپنے آپ پیدا ہوئی ہے۔ یہ بات بہت ہی اہم ہے کہ ان کے طنز و ظرافت میں زیر لب مسکراہٹ، میٹھی میٹھی گدگدی اور گوش و نظر کو متوجہ کرنے والی ایک خوش رنگ روشنی اور شگفتہ آواز ہوتی ہے، کسی طرح کی تضحیک، تذلیل، حسد، کینہ اور بغض نہیں ہوتا۔ ہاں اس پردے میں آہ، افسوس، دکھ، زیاں، چٹخارے، کاٹ اور چُہل کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ یہ طنز و مزاح کی وہ ہنر مندی ہے جسے اکبر جیسا فنکار ہی سنبھال اور نبھا سکتا تھا۔ البتہ جہاں بات براہ راست کہنے اور کسی حد تک برہنہ لہجے کی ضرورت ہوئی تو اس سے بھی اکبر نے گریز نہیں کیا۔ تصور نسواں کے حوالے سے بعض نظموں اور 'گاندھی نامہ' میں اس کی نشاندہی بہ آسانی کی جا سکتی ہے۔

اکبر کی نظموں میں واقعہ نگاری، مکالمہ بندی، مناظر کی عکاسی، پیکر تراشی اور ڈرامائی عناصر کی

بہتات ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری حسِ مزاح اور جمالیاتی کیف کے ساتھ ساتھ حواسِ خمسہ کے بھی بیشتر حسوں کو بیک وقت بیدار کرتی ہے۔انھیں چھوٹے کینوس پر بڑے مناظر پینٹ کرنے کا ہنر اور دجلہ میں فرات دکھانے کا فن خوب آتا ہے۔مختصر نظموں میں بلند خیال بیان کرنے کا رمز اور نئی اصطلاحوں اور معمولی الفاظ کی مدد سے روایات ونظریات کے بکھان کا بھید جیسا اکبر جانتے تھے کم شاعر جانتے ہیں۔یہ تو ممکن ہے کہ اکبر کے نظریات سے اتفاق یا اختلاف کیا جائے ،لیکن انھوں نے اپنے نظریوں کو مختلف تکنیک کے ذریعے جس سلیقے ،صناعی اور شعری نزاکتوں کے ساتھ بیان کیا ہے اس سے انکار ممکن نہیں ہے۔

موضوعاتی نظموں میں کردار کی تلاش کو خوب نہیں کہا جا سکتا ،کہ فکشن کی طرح یہاں کرداری نگاری کی زیادہ گنجائش ہوتی بھی نہیں ہے۔ہاں یہ ضرور ہے کہ تاریخی ،اسطوری ،مذہبی ،سیاسی اور محبوب شخصیتوں کے حوالے سے اردو میں کافی نظمیں لکھی گئی ہیں۔علامہ اقبال ،جوش ملیح آبادی ،پنڈت برج نرائن چکبست ،منشی درگا سہائے سرورؔ جہان آبادی اور پنڈت آنند نرائن ملاّ کے یہاں اس کی عمدہ مثالیں موجود ہیں۔یوں عمومی باتوں اور واقعات وعمل کے لیے اکبر کی نظموں میں چھوٹے ،بڑے ،خاص ،عام ،اہم اور غیر اہم کرداروں کی ایک کہکشاں نظر آتی ہے جس میں شیخ ،مولوی ،پنڈت ،برہمن ،لاٹ صاحب ،سیٹھ جی ،انگریز ،بیگم ،بی بی ،مس ،بوڑھا ،لالہ ،نیٹو ،نوجوان ،جمن ،گھورن ،کلو اور نئے تعلیم یافتہ مرد وخواتین وغیرہ سے ملاقاتیں کی جا سکتی ہیں۔مزے کی بات یہ ہے کہ ملاقات کے وقت کسی بھی کردار کی شکل وصورت نظر نہیں آتی اور ملاقات کے بعد ان کی سیرت ونفسیات اور ان کے رویے بھول نہیں پاتے۔ اکبر کی فنکاری یہ ہے کہ وہ محض چند لفظوں اور کبھی کبھی تو صرف ناموں کے انتخاب سے ہی کرداروں کی ایسی سیرت اور نفسیات بیان کر جاتے ہیں کہ پڑھنے والا اپنے طور پر ان ناموں کی مدد سے ذہن میں کردار کی صورت ہی کیا ،ایک جیتی جاگتی مجسم شخصیت بنا لیتا ہے۔

جن اہم شخصیتوں پر اکبر نے نظمیں لکھی ہیں ان میں سر سید احمد خاں ، پنڈت مدن موہن مالویہ ،مولانا محمد علی جوہر ،لالہ لاجپت رائے ،علامہ شبلی نعمانی ،مہاتما گاندھی اور لارڈ کرزن وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔اکبر کے کرداروں کے تنوع سے اکبر کے سماجی سروکار ،ان کے نفسیاتی شعور اور حالات و واقعات سے ان کی واقفیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے ،کہ سماج کے مختلف طبقوں کے احوال ،تحریکات

ور جحانات، بیانات و واقعات، ان سے وابستہ اہم شخصیات اور ان کی نفسیات سے انھیں کس درجہ دلچسپی تھی۔ اکبر کے چند ایسے اشعار ملاحظہ فرمائیے جن میں انھوں نے انسانی نفسیات، سیاسی حالات اور بعض اہم امور پر بڑے بلیغ اشارے کیے ہیں:

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں | مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

گائیں سبزہ پا گئیں کر کے کلیل | اونٹ کانٹوں پر لٹکتے ہی رہے

قصیدے سے نہ چلتا ہے، نہ یہ دوہے سے چلتا ہے | سمجھ لو خوب، کارِ سلطنت لوہے سے چلتا ہے

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام | وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ہنگامۂ محشر کا تو مقصود ہے معلوم | دہلی میں یہ دربار ہے معلوم نہیں کیوں

ناچ ہے مغرب کا بزم دہر میں | جھومتے ہیں مشرقی بیٹھے ہوئے

خوب فن حرب سیکھ رہے ہیں پریڈ پر | میرے لیے چمن میں شٹل کاک کا ہے کھیل

یاروں کی دوڑ دھوپ ہے دنیا کی چیخ پر | اور دین ہے کباب ضرورت کی سیخ پر

پنڈت کو بھی سلام ہو اور مولوی کو بھی | مذہب نہ چاہیے مجھے ایمان چاہیے

کہنے کی ضرورت نہیں کہ اکبر بڑے ہی دیندار اور مذہبی انسان تھے۔ دکھاوے، ظاہر داری، ضد اور عیاری کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اردو شاعری کی روایت کو نبھاتے ہوئے انھوں نے ظاہر پرستی، کج بحثی اور انانیت پسندی کی علامتوں بطور خاص مولوی، ملا، پنڈت، گرو، برہمن، زاہد اور شیخ کو اپنی ظرافت کا خوب نشانہ بنایا ہے، بلکہ ویسا اور اُتنا ہی، جتنا اور جیسا انھوں نے معاشرے کی غیر ضروری مغرب پرستی، عورتوں کی بیجا آزادی اور نئی تہذیب کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

قُل قُل شیشہ کو سنیے تو ذرا حضرت شیخ | دیکھیے تو کہیں اس قل میں 'ھواللہ' نہ ہو

خلاف شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں | مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

پوچھا کہ شغل کیا ہے؟ کہنے لگے گرو جی | بس رام رام جپنا چیلوں کا مال اپنا

بحث میں مولوی نہ ہاریں گے | جان ہاریں گے جی نہ ہاریں گے

گھلایا شیخ کو اس شوخ کے شیریں تکلم نے | مٹایا زہد کی خشکی کو اک موج تبسم نے

مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے خدا گو بخش دیں | گھیر ہی لیں گے پولس والے، سزا ہو یا نہ ہو

مذہب چھڑایا عشوۂ دنیا نے شیخ سے　　دیکھی جو ریل اونٹ سے آخر اتر پڑے

پریس میں شیخ ہیں، مسجد اجاڑ، ایوان خالی ہے　　کتب خانہ بھرا جاتا ہے اور میدان خالی ہے

ابھرے ہیں عیب ان کے اور خوبیاں دبی ہیں　　بے دین اگر نہیں ہیں، تو شیخ جی غبی ہیں

محلے میں نہ کی جب شیخ کی وقعت عزیزوں نے　　تو بیچارہ کمیٹی ہی میں جا کر، کود اچھل آیا

خوب لڑوایا بہم دل کھول کر　　مار ڈالا راویوں نے قوم کو

المیہ یہ ہے کہ ہمارے ناقدین کی تحریروں میں نظیرا کبرآبادی کی طرح اکبرالہ آبادی اور ان کی شاعری بھی مقام اور مرتبے کے تعین میں افراط وتفریط کا شکار ہوئی۔ ایک گروہ نے انھیں اور ان کی شاعری کو عورتوں کی تعلیم اور ان کی آزادی کا دشمن قرار دیا اور مغربی تہذیب کا بدترین مخالف کہا، تو دوسری جماعت نے ان کو اور ان کی شاعری کو مشرقی تہذیب کا حامی اور پاسدار بتایا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ شاعر، بالخصوص نظموں کا شاعر اپنی شخصیت کے اظہار کے علاوہ سماج، معاشرے اور بدلتے حالات کا مصور بھی ہوتا ہے اور مبصر بھی۔ وہ ذہنیت کا ترجمان بھی ہوتا ہے اور تجزیہ نگار بھی۔ وہ مذہبی اور تنظیمی مبلغ کی طرح کسی ایک نظریے کی تلقین نہیں کرتا اور اچھائیوں کا مجموعہ بتاتے ہوئے اسے اپنانے پر اصرار نہیں کرتا۔ بلکہ شاعر ایک معلم کی مانند تمام نظریات کو ان کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ بیان کرتا ہے اور پڑھنے سننے والوں کو اخذ واختیار کی مکمل آزادی دیتا ہے۔ اگر اکبر کی تمام شاعری کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ اکبر نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں مبلغ یا مفکر بن کر نہیں آتے ہیں، بلکہ وہ ملک وقوم اور تہذیب و ثقافت کے مصور، مبصر، مترجم اور معلم کی حیثیت سے آتے اور لوگوں کے سامنے چیزوں/معاملوں کو آشکار کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ہمیشہ دونوں رخوں کو دکھایا ہے۔ مشرقی تہذیب کے ساتھ مغربی تہذیب کو، عورتوں کی مکمل آزادی کے ساتھ ان کی مشروط آزادی کو، مذہب کے ظاہر کے ساتھ اس کے باطن کو اور سیاستدانوں کی خوبیوں کے ساتھ ان کی خرابیوں کو بھی۔ ناقدین اب تک اکبر کو چند اشعار کے حوالے سے عورتوں کی تعلیم کا مخالف ثابت کرتے آرہے ہیں، مگر یقین کیجیے کہ اکبر نے عورتوں کی تعلیم کی بڑی حمایت کی ہے اور اسے وقت کی اہم ضرورت سے تعبیر کیا ہے۔ یہ بند ملاحظہ کیجیے:

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے　　لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے

حسن معاشرت میں سراسر فتور ہے　　اور اس میں والدین کا بے شک قصور ہے

ان پر یہ فرض ہے کہ کریں کوئی بندو بست
چھوڑیں نہ لڑکیوں کو جہالت میں شاد و مست

واقعہ یہ ہے کہ عورتوں کی آزادی اور ان کی تعلیم کے تعلق سے اکبر قدامت پرست نہیں، مصلحت پسند تھے۔ وہ ترجیحات کے قائل اور اخذ و اختیار کے حامی تھے۔

اکبر کی فنی ہنرمندی یہ ہے کہ انھوں نے فکر، خیال اور واقعے کو شیریں، شگفتہ اور شوخ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ کوئی ان کے فکر یا خیال سے اتفاق رکھے یا نہ رکھے، طرزِ اظہار کے انوکھے پن سے ضرور لطف اندوز ہوگا۔ اور دراصل شاعری کا فریضہ بھی یہی ہے۔ پھر یہ کہ ان کی شاعری اشتہار، اعلان یا تبلیغ کا کام نہیں کرتی، جیسا کہ ہمارے ناقدین باور کراتے آئے ہیں، بلکہ ان کی شاعری ایک التباس پیدا کرتی ہے۔ اپنے قاری کو 'ہاں' اور 'نا' کی کیفیت میں مبتلا رکھتی ہے، اختیار اور انکار کے وہم میں ڈالتی اور ایک کشمکش کو جنم دیتی ہے۔ یا مرزا غالبؔ کی زبان میں کہیے کہ ''ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر'' والی سچویشن میں لا کھڑا کرتی ہے۔ آیئے ان سب سے الگ اکبر کے کچھ خوبصورت اور دلچسپ اشعار سے لطف اندوز ہوتے ہیں:

نگاہیں، چتونیں، عشوے، کرشمے — اُدھر اتنے، اِدھر تنہا مرا دل
بعد مدت کے جو تقریر بھی کی تم نے تو — جس کے معنی نہیں، مطلب نہیں، مفہوم نہیں
کر گئی کام نگاہِ مسِ پُرفن کیسا — تج چلے دیر و حرم شیخ و برہمن کیسا
نہیں بدلی زباں اس شوخ کی یہ کون کہتا ہے — میں جب جاتا ہوں اس کی بزم میں، سِٹ ڈاون کہتی ہے
میری نصیحتوں کو سن کر وہ شوخ بولا — نیٹو کی کیا سند ہے صاحب کہیں تو مانوں
پریوں کے عاشقوں کو سودا ہوا مِسوں کا — جو پھاڑتے تھے جامہ اب کوٹ سی رہے ہیں
اک دن وہ تھا کہ دب گئے تھے لوگ دین سے — اک دن یہ ہے کہ دین دبا ہے مشین سے
جناب اکبر سے کوئی کہہ دے کہ لوگ بیٹھے ہیں اس انجمن میں — ایسی باتیں یہ آپ کیا قہر کر رہے ہیں

یہ اشعار بھی ملاحظہ کیجیے:

جو حرا کے جاننے والے تھے صوفی ہو گئے — داستان بدر والے شیعہ سنی ہو گئے
آتا ہے وجد مجھ کو ہر دین کی ادا پر — مسجد میں ناچتا ہوں ناقوس کی صدا پر

باپ ماں سے، شیخ سے، اللہ سے کیا ان کو کام ڈاکٹر جنوا گئے تعلیم دی سرکار نے
تری پالسی کا حال تو کھلتا نہیں صاحب ہماری پالسی تو صاف ہے ایماں فروشی کی
مذہب چھوڑو، ملت چھوڑو، صورت بدلو، عمر گنواؤ صرف کلرکی کی امید اور اتنی مصیبت، توبہ توبہ
رات اُس مِس سے کلیسا میں ہوا میں دوچار ہائے وہ حسن، وہ شوخی، وہ نزاکت، وہ ابھار

سارتر نے کہیں لکھا ہے کہ شعرا زبان کے روایتی استعمال سے انکار کرتے ہیں۔ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ نثر کے مقابلے شاعری میں حسن بیان اور حسن خیال دونوں کا پاس ولحاظ کہیں زیادہ رکھنا پڑتا ہے۔ سو، اگر شاعر روایتی زبان کے استعمال کا ہی پابند رہے تو ممکن نہیں کہ وہ نئے خیالات ومضامین کا مکمل اظہار کر پائے اور بدلتے حالات اور تبدیل ہوتے زمانے کی نمائندگی پر قادر ہو سکے۔ ہر بدلتا ہوا عہد اپنے ساتھ نئے خیالات وموضوعات اور نئے مضامین واسالیب لے کر آتا ہے جس کے اظہار کے لیے نئے الفاظ اور نئی اصطلاحوں کی بہر طور ضرورت ہوتی ہے۔ اکبر اس راز سے واقف تھے اور نظیر اکبر آبادی کی جدت پسندی، دوراندیشی اور قادرالکلامی کے قائل تھے۔ سو، انھوں نے بھی زبان کے معاملے میں روایت پرست شاعروں کے بجائے بغاوت پسند نظیر اکبرآبادی کے مسلک کو اختیار کیا اور اردو شاعری کو عوامی موضوعات، نئے الفاظ اور انوکھی طرز سے ثروت مند بناتے رہے۔ اکبر کے خیال میں معنی کی ادائیگی کے لیے شاعر کو لفظوں کے انتخاب اور ان کے استعمال کی آزادی ہونی چاہیے جسے انھوں نے بلا تکلف برتا بھی۔ ان اشعار سے ان کے موقف کی تائید ہوتی ہے:

نقش صورت ہی کی تزئیں پہ رہی جس کی نظر اُس سخن سے حسنِ معنی یک قلم جاتا رہا
شعر اکبر میں کوئی کشف وکرامات نہیں دل پہ گزری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں
اک شاعری وہ ہے جسے فطرت سے میل ہے اک شاعری وہ ہے جو اکھاڑے کا کھیل ہے

ظاہر ہے اکبر کا مقصد زبان کی روایتی پابندیوں اور تصنع پسندی کے بجائے شاعری کو اظہار ذات وکائنات کا وسیلہ بنانا تھا۔ کہ ان کے نزدیک زبان کی تزئین کے مقابلے میں شاعری کو اثر انگیز اور ذہن ودل کو برانگیخت کرنے والا ہونا چاہیے۔ گویا وہ شاعری میں حسن الفاظ پر معنی کی ترسیل کو ترجیح دیتے ہیں اور روایتی زبان کی پابندی پر خیال کی جدت، موضوعات کے تنوع اور نئے الفاظ کی شمولیت کو رائج کرنے کی وکالت کرتے ہیں:

معنی کو ضرورت نہیں الفاظ کی اکبر　　سب جانتے ہیں حسن صدا اور ہی کچھ ہے
مذہب کو شاعروں کے نہ پوچھیں جناب شیخ　　جس وقت جو خیال ہے، مذہب بھی ہے وہی
چھوڑ دہلی لکھنؤ سے بھی نہ کچھ امید کر　　نظم میں بھی وعظِ آزادی کی اب تائید کر
صاف ہے، روشن ہے اور ہے صاحبِ سوز وگداز　　شاعری میں بس زبان شمع کی تقلید کر

حسن بیان اور اظہار خیال کے تعلق سے اکبر نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی اپنے خیال کا اظہار کیا ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے:

''حسن زبان اور حسن خیال دونوں کے امتزاج سے عمدہ شعر پیدا ہوتے ہیں۔... یاد رکھنا چاہیے کہ اگر ردیفوں کا چمکنا اور نہایت بے تکلف طور پر ان سے معنی کا پیدا ہونا اور ان کا با محاورہ ہونا مقبولیت شعر میں نہایت درجہ کو موثر ہے لیکن درحقیقت ردیفوں کو ہی چمکا کر داد لینا اور اسی پر قناعت کرنا اور زبان ہی کے ٹکڑوں پر بسر اوقات کرنا دلیل اس بات کی ہے کہ شاعر عمدہ خیالات اور بلند مضامین پیدا کرنے سے عاجز ہے۔'' (علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر، سنہ 1950، ص24)

لیکن اسی مضمون میں ذرا آگے چل کر یہ وضاحت بھی کرتے ہیں: ''یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم صرف حسن خیال اور خیالات مفیدہ کے طرفدار ہیں، ہرگز نہیں۔ شاعری کالج یا مدرسہ کا سبق نہیں ہے۔ دنیا آنکھوں کے سامنے ہو۔... لطیف اور رنگین خیالات ہوں۔ طرز بیان دلکش ہو۔'' (ایضاً)

تجھے ہم شاعروں میں کیوں نہ اکبر منتخب سمجھیں　　بیاں ایسا کہ دل مانے زباں ایسی کہ سب سمجھے

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اکبر کو فن کی خارجی ترکیب اور باطنی حسن کا گہرا شعور تھا۔ وہ مثبت فکر اور اعلیٰ مضامین کے قائل تھے اور خوب جانتے تھے کہ طریقۂ اظہار کو اثر انگیز، قابل قبول اور دلچسپ کیسے بنایا جاتا ہے، چنانچہ انھوں نے روایتی شاعری کے شاہراہ عام سے الگ ہٹ کر ایک ایسی ڈگر اختیار کی جس پر اوروں کے لیے چلنا آسان ہو یا نہ ہو لیکن وہ اکبر کی شناخت اور ان کی انفرادیت کی گواہ بنی رہے۔ اس کا دعویٰ انھوں نے غزل کی شاعری میں کیا اور نظمیہ شاعری میں بھی۔ مثلاً یہ کہ:

غزل ایسی پڑھو مملو ہو جو عالی مضامیں سے　　کرو اب دوسرے کوچے میں اے اکبر گزر اپنا
غزل ایسی پڑھوں جس سے برا یہ صدا نکلے　　عروجِ فکر عالی ہوں، نشانِ عشق کامل ہوں

یہ رنگ ہی نیا ہے کوچہ ہی دوسرا ہے　　　کیوں کر نہ شعر اکبر آئے پسند سب کو

شاہد معنیٰ نے اوڑھا ہے ظرافت کا لباس　　　سرد موسم تھا ہوائیں چل رہی تھیں برفبار

اکبر کوشدت پسند، مغرب مخالف اور غالی مشرق پرست کے بطور پیش کیا جاتا رہا ہے۔تسلیم کیجیے کہ اکبر نے انگریزوں کے ہاتھوں بھارت کے تہذیبی اور ثقافتی لباس کو جس طرح تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا اور جو محسوس کیا تھا اسے انھوں نے ویسے ہی بیان کیا۔واضح رہے کہ اکبر عورتوں کی تعلیم ،ان کی آزادی اور نئی تہذیب کی مکمل تردید نہیں کررہے تھے، بلکہ وہ تبدیلی کو مشروط طریقے پر اپنانے کے حق میں تھے۔اُس وقت ملک کا ایک بڑا طبقہ اِس نظریے کا حامی تھا اور یقین کیجیے کہ آج بھی ملک کا ایک بڑا طبقہ اس نظریے کا حامی ہے۔اس نظریے کی حمایت یا مخالفت میں صحیح اور غلط کا مسئلہ تب بھی موضوع بحث تھا،آج بھی ہے۔

اردو شاعری،شاعری کے حوالے سے مشرقی مزاج اور ہندوستانی سماج کو اکبر کی عطا یہ ہے کہ انھوں نے خالص اردو، فارسی اور عربی الفاظ اور مشرقی روایات کے لباس میں پیراستہ شاعری کو پہلی بار انگریزی الفاظ اور مغربی اصطلاحوں سے آراستہ کیا۔قاری کے ذہنوں کو تہذیبی اور ثقافتی تبدیلیوں سے آگاہ کر کے ہر ایک کے محاسن و معائب کو سمجھنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے آمادہ کیا۔اور مغربیت کے تضاد کے ذریعے مشرقیت یا ہندوستانیت کی محبت اور افادیت کو عوام کے ذہن و دل میں جاگزیں کیا اور اسے حامل تہذیب و تمدن کے طور پر اوروں سے برتر ثابت کرنے کی کوششیں کیں۔وقت اور حالات کے تحت اکبر کے بعض نظریوں کو تو رد کیا جاسکتا ہے،لیکن ان کی شاعری کبھی اور کسی طور رد نہیں کی جاسکتی۔

❒ **Prof. Abu Bakar Abbad**
Department of Urdu
Delhi University, Delhi
Mobile: 9810532735
Email: bakarabbad@yahoo.co.in

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:186-205
Prof. Mohd. Kazim, Habib Tanvir ka Shahkar Drama 'Aagra Bazar' (Ek Tajziyati Mutala)
محمد کاظم

حبیب تنویر کا شاہکار ڈراما ’آگرہ بازار‘
(ایک تجزیاتی مطالعہ)

اردو ڈراما کے کھیلے جانے کا سلسلہ انیسویں صدی میں شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے نہ صرف اردو ادب کے خزانے میں اضافہ کرنا شروع کیا بلکہ جدید ہندستانی تھیئٹر کی راہ ہموار کی۔ اندرسبھائی دور کے بعد بنگال میں اردو ڈرامانے اہم کارنامہ انجام دیا اور پھر اس کے بعد پارسی تھیئٹر نے تو نہ صرف ڈراما بلکہ ہندستانی فلم کی تاریخ میں بھی نمایاں خدمات پیش کیں۔ بیسویں صدی کے وسط میں Indian People's Theatre Association (IPTA) نے ڈرامے کو سماجی مسائل سے جوڑا تو پرتھوی تھیئٹر نے انسانیت اور سماج کے درمیان پیدا ہوئے فاصلے کو پاٹنے کی کوشش کی۔ اسی زمانے میں ہندستانی تھیئٹر اپنے پورے شباب پر تھا جو نوجوان حبیب تنویر کی ہدایت میں تھیئٹر جو نئی جہت سے آشنا کرنے میں سرگرم تھا۔ 1954 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین، جامعہ ملیہ کی جانب سے ہندستان کے عوامی شاعر نظیر اکبرآبادی کو یاد کرتے ہوئے ’یوم نظیر‘ منایا گیا۔ اس موقع پر اطہر پرویز نے حبیب تنویر سے گزارش کی کہ وہ نظیر اکبرآبادی پر ایک ڈراما تیار کریں۔ حبیب تنویر نے ڈراما تیار کیا اور اسے نہایت کامیابی کے ساتھ اس طرح پیش کیا جو کئی سطحوں پر ہندستانی تھیئٹر میں نیا اور تجرباتی تھا۔ اس کی پیش کش کا انداز برختین تھیئٹر (Brechtian Theatre) جیسا تھا تو اس کی پیش کش میں اداکاروں اور تماشائیوں کے درمیانی فاصلے ختم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ گویا یہ ایپک تھیئٹر کی کامیاب مثال ہے۔ اس کے بعد حبیب تنویر نے اس طرز پر اور بھی کئی ڈرامے تیار کرکے ناظرین کے سامنے پیش کیے جو نہایت کامیاب رہے۔ ان میں خود بریخت کے کئی ڈرامے بشمول ’ست زواں کی ایک عورت، ہمت والی ماں، گلیلیو‘ شامل

ہیں ان کے علاوہ 'مٹی کی گاڑی، رستم سہراب، مرزا شہرت رائے وغیرہ بھی اسی طرز میں پیش کیے گئے ۔لیکن آگرہ بازار کو جوشہرت ملی وہ ان میں سے کسی ڈرامے کے حصے میں نہیں آئی۔اس ڈرامے کی شہرت اور کامیابی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ 14 مارچ 1954 کو یہ پہلی بار کھیلا گیا اور عوام کے اصرار پر 19,20,24 اور 25 اپریل کو یہ دہلی شہر میں کھیلا جانا تھا اس درمیان یہ ڈراما شائع ہوکر منظر عام پر آ گیا۔اور اس طرح یہ ڈراما نہ صرف اسٹیج پر دھوم مچانے لگا بلکہ اردو کے ڈرامائی ادب کی دنیا میں بھی ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں اسی ڈرامے کا تجزیہ مقصود ہے۔

ڈراما 'آگرہ بازار' بظاہر نظیر اکبرآبادی کی حیات اور ان کی شاعری پر مبنی دکھائی دیتا ہے لیکن دراصل یہ ڈراما نظیر اکبرآبادی کے گرد گھومنے کے باوجود اس کا ہیرو نظیر نہیں ہے بلکہ نظیر کا زمانہ اور اس دور کے سماجی رویے ہیں۔ پورے ڈرامے میں نظیر کبھی بھی اسٹیج پر نہیں آتے لیکن اس کی موجودگی کا احساس مختلف کرداروں کی شکل میں بار بار ہوتا ہے۔خود حبیب تنویر ڈراما آگرہ بازار کا پیش لفظ لکھتے ہوئے کہتے ہیں:

> پلاٹ کے اعتبار سے ڈراما افسانوی حیثیت رکھتا ہے، کہانی من گھڑت ہے اور بہت چھوٹی اور سیدھی سادی! میں نے زور اس بات پر دیا ہے کہ 'کھیل' کو اس روپ میں پیش کروں کہ جو بنیادی بات نظیر کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں، وہ ٹھیک ٹھیک اور دلچسپی کے ساتھ کہہ پاؤں۔

اس کی مزید وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> میں ڈرامے کی بنیاد نظیر کی زندگی کو نہیں بلکہ اس کے کلام کو بنانا چاہتا تھا۔ڈراما لکھنے کے دوران میں یہ بات بھی ذہن میں آئی کہ نظیر کو اسٹیج پر نہ لانا ہی بہتر ہوگا۔اس سے نہ صرف میرے موضوع کے بہت سے مرحلے طے ہو گئے، بلکہ میری تکنیک پر بھی اس کا اچھا اثر پڑا، اور تکنیک اور موضوع کا گٹھاؤ بڑھ گیا۔

حبیب تنویر کے اس قول کی روشنی میں آگرہ بازار کے پلاٹ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ ایک ایسے زمانے کی کہانی دکھائی دیتی ہے جو ادبی اور سماجی دونوں سطحوں پر انحطاط پذیر دکھائی دیتا ہے۔ادبی سطح پر ہم میر کے زمانے کے بعد سیدھے غالب کے زمانے پر آتے ہیں بیچ میں نظیر کے دور کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔اس دور میں انگریزوں کا تسلط اتنا بڑھ گیا تھا کہ ہندستانیوں کو بے شمار تکالیف اور مفلسی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور اس

کی بھرپور عکاسی اس ڈراما میں ہوتی ہے۔ ڈراما آگرہ بازار کے پلاٹ کو چار حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔

پہلے حصے میں بازار کا ماحول نظر آتا ہے۔ مداری تاریخی پس منظر پیش کرتا ہے اور اس کی اکثر باتیں نظیر کی نظموں کی طرف اشارے کرتی ہیں۔ مداری کی باتوں سے ہمیں نادرشاہ اور احمد شاہ ابدالی کے دلی کو لوٹنے اور سورج مل جاٹ کے آگرہ شہر کو تباہ کرنے کا علم ہوتا ہے۔ اس کے بعد انگریزوں کے ہندستان آنے اور پلاسی کی جنگ کا ذکر ہوتا ہے۔ پھر بنگال کے قحط کی تصویر کھینچتے ہوئے اپنی مفلسی کا رونا رونے لگتا ہے۔ جب مداری کا بندر تماشائی کے پاس پیسے لینے کی غرض سے جاتا ہے تو لوگ وہاں سے جانے لگتے ہیں اور ککڑی والا ان کے سامنے جا کر ککڑی بیچنے کی کوشش کرتا ہے۔ ککڑی والے سے مداری اس بات پر لڑنے لگتا ہے کہ وہ اس کے تماشائی کو ککڑی بیچنے گیا اور وہ اسے پیسے دیے بغیر چلے گئے۔ گویا ہر شخص اپنی مفلسی کا رونا روتا ہے۔ گویا ککڑی والے کی جستجو، افلاس کی لعنت، ککڑی والے کی ابتدائی ناکامیاں وغیرہ کی مدد سے ڈراما نگار ڈرامے کو پہلی کشمکش کی جانب لے جاتا ہے۔

دوسرے حصے میں اس زمانے کے تذکرہ نویس، شاعر اور ادیب، تساہل اور توہم کو پیش کیا گیا ہے۔ صحت منداور افادی ادب جس کا عوام کی زندگی اور ان کے روزمرہ مسائل سے گہرا تعلق ہے۔ ان کی نظر میں عامیانہ اور گھٹیا ادب ہے اور یہی ادب اور یہی شاعری سارے بازار میں گونجتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ککڑی والے کی جستجو اب بھی جاری ہے۔ وہ ایک ایک کے پیچھے پھر کر اپنی ککڑی پر چند اشعار لکھوانا چاہتا ہے لیکن کوئی اس پر تیار نہیں ہوتا جس کی وجہ سے اس کی مایوسی میں اضافہ ہوتا جارہا ہے:

تربوز والا: اپنا تو وچار ہے تربوج بیچنا چھوڑ کے کویتا رچنا شروع کردیں (دونوں ہنستے ہیں) یا پھر یہ سہرہی چھوڑ دیں!

لڈو والا: پر جاؤ گے کدھر، سوال تو یہ ہے! چاروں اور لوٹ مار مچی ہوئی ہے!

تربوز والا: ایک جندگی نے کیا نہیں دکھایا؟ بڑے بڑے بادساہ دردر کی ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں تو ہم کس کھیت کی مولی ہیں بھیا؟ چلیں بھئی، دن بھر پیر توڑنا تو کرموں میں لکھا ہے۔ تربوج ٹھنڈا! ٹھنڈا تربوج۔

مایوسی اس قدر بڑھتی ہے کہ وہ تھک کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہاں ایک طرح سے ڈرامے کی کشمکش اپنے عروج پر آکر ختم ہوتی ہے۔ اس طرح پہلا ایکٹ ختم ہوتا ہے۔

تیسرے حصے میں پتنگ والے کا کردار ابھر کر سامنے آتا ہے۔ پتنگ والے کے کردار میں نظیر اکبر آبادی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ گویا نظیر کے کردار اور اس کی زندگی پر روشنی پڑنے کا سلسلہ یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ ایک بچے کی زبان سے نظیر کا کلام سن کر ایک جانب لوگ خوش ہوتے ہیں تو دوسری جانب متعصب ادیب اور مورخ ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ یہ لوگ پست مذاق لوگوں کا مجمع دیکھ کر غصے میں پاؤں پٹختے ہوئے باہر نکل جاتے ہیں اور اب جو لوگ کتب فروش کی دکان اور اس کے آس پاس ہوتے ہیں وہ پتنگ والے کی دکان کے قریب آجاتے ہیں اور ذوق وشوق سے نظیر کا کلام سننے میں مگن ہو جاتے ہیں۔ اس طرح پتنگ والے کی دکان ڈرامے کا نقطۂ عروج بن جاتی ہے۔

آخری حصے میں ککڑی والے کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور نظیر کی مقبولیت کا اظہار بغیر کسی نعرہ بازی کے ہونے لگتا ہے جس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ادب کا زندگی سے گہرا تعلق ہے اور عوام کے لیے بھی اعلیٰ شاعری تخلیق کی جا سکتی ہے۔ نظیر کی انسان دوستی اور ہمہ گیری اس وقت پورے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ نظم آدمی نامہ سے یہ پیغام دیا جاتا ہے کہ مفلس وگدا سب آدمی ہیں اور وہ کسی سے کم تر نہیں ہیں اگر اس کے اندر کچھ کر گزرنے کا حوصلہ اور عزم ہے تو۔

ڈراما آگرہ بازار کے پلاٹ کا تانا بانا بنتے وقت ایسی فنکاری کا مظاہرہ کیا گیا ہے جو اردو ڈرامے میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ پورا ڈراما صرف ایک دو دن کے واقعات پر مبنی ہے۔ یعنی اسٹیج پر جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ ایک ہی دن میں ہو رہا ہے اور اس ایک دن میں ادب، ثقافت، تہذیب، ظلم واستبداد اور نہ جانے کیا کیا بیان کر دیا گیا ہے۔ گویا پوری تاریخ ہمارے سامنے آجاتی ہے جس میں میر، غالب، ذوق، سودا، بہادر شاہ ظفر اور ان کے ادوار کے لوگ خود بخود ڈرامے کا اٹوٹ حصہ بن جاتے ہیں۔ ڈرامے کے درمیان میں وقفے وقفے سے بار بار دو فقیر نظیر کا کلام گاتے ہوئے آتے ہیں اور پھر واپس چلے جاتے ہیں۔ اس ڈرامے میں نظیر کے کل تئیس منظوم کلام پیش کیے گئے ہیں جن میں شہر آشوب، نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ مختصراً ڈرامے کے پلاٹ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حبیب تنویر نے ایک مخصوص دور کی عکاسی کے لیے ایک ایسے کردار کا انتخاب کیا جو تاریخی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے اس کام کے لیے نہایت موزوں اور کارآمد ہے۔ اس کی ایک مثال دیکھیں:

تذکرہ نویس :جی ہاں، بھئی عجب ذہین لڑکا ہے، یہ اسد اللہ بھی۔ اس کم عمری میں فارسی

میں شعر کہتا ہے اور واللہ خود میری سمجھ میں نہیں آتے۔

ہمجولی:اس کی عمر تو یہی کوئی تیرہ چودہ کی ہوگی؟

شاعر نما آدمی :جی ہاں، اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ شیخ محمد ابراہیم ذوق کو دیکھئے۔ 18-20 کی عمر ہوگی، اکبر ثانی کے دربار میں پہنچے، شاہ نصیر جیسے کہنہ مشق کا تختہ الٹ دیا اور اب استاد شہہ ہیں، ساری دلی میں ان کا طوطی بول رہا ہے۔

تذکرہ نویس : میاں اب کیسی دلی، کہاں کا دربار، اور کون سے اکبر ثانی؟ اکبر و عالم گیر وغیرہ کے بعد عالمگیر ثانی اور شاہ عالم ثانی اور اکبر ثانی، لوح سلطنت مغلیہ پر حرف مکرر کی طرح آتے ہیں اور اجڑی ہوئی دلی کے خرابۂ وحشت ناک میں، جس کا نام کبھی قلعہ معلیٰ تھا، ایک لٹا پٹا دربار جم جاتا ہے۔ گھڑی بھر کے لیے شعرو ادب کی آواز بلند ہوتی ہے، پھر وحشیوں کا حملہ اور وہی ہو کا عالم۔ لوگ اودھ کی طرف یا دکن کی طرف بھاگ نکلے اور دلی کے گورستان شاہی میں پھر وہی کتے لوٹتے ہیں اور الو بولتا ہے۔

آگرہ بازار کے پلاٹ کی بنیاد انسانی زندگی کی ٹھوس صداقتوں پر مبنی ہے۔ اس کے پلاٹ کا تعلق ایسے واقعات سے ہے جو ماضی میں شاید پیش آیا ہو اس لیے حبیب تنویر نے ہر طرح سے تاریخی صداقت سے لبریز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈرامے میں کئی بار ایسے مواقع آتے ہیں کہ جب اس کا پلاٹ فکشن کی حدود کو پار کرتے ہوئے تاریخ کے دائرے میں داخل ہوتا نظر آتا ہے اور وہ محض ایک شاعر کی سوانح حیات ہونے کے بجائے ایک دور کی تاریخ بن جاتا ہے۔

پلاٹ کو پیش کرنے کے لیے کردار کی ضرورت پیش آتی ہے اور ہر کردار اپنی تعلیم، ماحول، نفسیات، سماج، تہذیب، اور ثقافت کو اپنے ساتھ لیے ہوتا ہے۔ کسی فن پارے کے ایسے کردار جن کی گفتگو، افعال، حرکات وسکنات اور جذباتی حالت کے اظہار میں زندگی کی حقیقی عکاسی پائی جاتی ہو یا جن میں ایسی ہمہ گیری ہو کہ جو زمانہ اور وقت گزر جانے کے باوجود انہیں زندہ رکھ سکیں، انھیں نہ صرف معیاری بلکہ متحرک اور زندہ کردار کہا جاسکتا ہے۔ ان میں انفرادیت کے باوجود ایک ایسی عمومیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے سماج کے کسی طبقے کی روایات ونظریات کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ ان کا مزاج اپنے عہد اور

معاشرے سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ ڈراما آگرہ بازار میں ایسے کئی کردار نظر آتے ہیں مثال کے طور پر ایک جانب پتنگ والا، ککڑی والا، لڈو والا، تربوز والا، بندر والا، جیسے کردار ہیں تو دوسری جانب کتب فروش، تذکرہ نویس، شاعر نما آدمی، ہمجولی وغیرہ کے کردار کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ تمام کردار نہ صرف اپنے بارے میں یا اپنے معاون کردار کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں بلکہ اس دور اور اس کی تہذیب وثقافت، فرنگیوں کے مظالم، شعر فہمی کے اصول اور اس دور کی تہذیب وثقافت اور مفلسی کی زندگی کو پیش کرتے ہیں۔ چند مثال دیکھیں:

گھوڑوں کا تاجر: اسی کو کہتے ہیں صاحب گھوڑے بیچ کر سونا۔ حیدر آباد کی طرف گیا تھا۔ جاتے وقت تو ایسی تکلیف نہ ہوئی، واپسی پر فرنگیوں اور مراٹھوں میں لڑائی چھڑ گئی۔ ناگپور کی طرف سے آنے والا تھا، خیر وہاں سے کتراتا ہوا لڑائیوں کی خوں ریزیوں سے بچ بچا کر آ رہا تھا کہ جھانسی کے پاس فرنگیوں کے بھگائے ہوئے ٹھگوں اور پنڈاریوں سے مڈبھیڑ ہو گئی جو کچھ تھوڑا بہت کمایا تھا وہ بھی ان کی نذر کر دیا اور باقی ماندہ گھوڑے ان ہی کے کام آئے۔ لٹ لٹا کر میرٹھ ہوتا ہوا آ رہا ہوں۔

پتنگ والا: ہے ہے بہت برا زمانہ آ رہا ہے یار۔

گھوڑوں کا تاجر: میرٹھ میں دیکھا کہ ہر شخص فرنگیوں سے بیزار ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہندستانی جو فرنگیوں کی فوج میں ملازم ہیں، اپنے افسروں سے برگشتہ ہیں، نہ جانے زمانے کیا انقلابات دکھائے!

ڈراما آگرہ بازار کے کرداروں پر نظر ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ حبیب تنویر نے جن کرداروں کو اس ڈرامے میں پیش کیا ہے اسے دو گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے گروہ میں پتنگ والا، ککڑی والا، لڈو والا، تربوز والا، مداری، ریچھ والا، برتن والا، ہمجولی اور بازار کے دوسرے لوگ شامل کیے جا سکتے ہیں۔ یہ وہ کردار ہیں جو خود کو زندہ رکھنے کے لیے اقتدار کو بدلنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ انھیں یہ معلوم ہے کہ ان کے مسائل کا حل موجودہ نظام میں ممکن نہیں ہے۔ دوسرے گروہ میں شاعر نما آدمی، کتب فروش تذکرہ نویس اور ان جیسے لوگ خود کو بچائے رکھنے کے لیے پرانی قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ انھیں یہ بھی احساس نہیں کہ جن پر وہ قائم ہیں اور جنھیں بچائے رکھنے کا جتن کر رہے ہیں وہ کب کی مر چکی اور اب

ان کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

انھیں نکات کو مدنظر رکھ کر حبیب تنویر نے دو متزاد یعنی پتنگ والا اور کتب فروش کے کردار کی تخلیق کی۔ ان دونوں کرداروں کے تخلیق کا واقعہ بیان کرتے ہوئے حبیب تنویر لکھتے ہیں:

> اس زمانے کے پڑھے لکھے متوسط طبقے نے نظیر کی انسان کی حیثیت سے تو تعریف کی لیکن بہ حیثیت شاعر اس کو نظر انداز کیا۔ البتہ چھوٹے کام کرنے والے اور کاریگروں میں وہ مقبول رہا۔ بس مجھے کتب فروش اور پتنگ والے کے کردار مل گئے۔ جس کے بل پر ڈراما آگے بڑھتا ہے اور جن کی دوکانیں بازار کے دو اہم ترین مرکز ہیں۔

یہ دونوں کردار ڈرامے کا نہ صرف مرکزی کردار ہیں بلکہ ان دونوں کی وجہ سے اس بازار کی رونق ہے جس کو مرکز میں رکھ کر یہ ڈراما کھیلا جا رہا ہے۔ گویا یہ دونوں اور ان دونوں کی دکانیں بازار کی رونق ہیں۔ ان دونوں کی دوکان پر لوگ آتے ہیں اور اس بازار کے دوسرے پھیری لگانے والے ان سے اپنا سامان بیچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلے کتب فروش کا ایک مکالمہ دیکھیں جس سے اس کے کردار پر بھرپور روشنی پڑتی ہے:

تذکرہ نویس: میں ایسے ویسوں سے بات کر کے اپنی زبان خراب کرنا نہیں چاہتا۔

کتب فروش: آپ بھی گویا میر صاحب کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ سنا ہے کہ دلی سے لکھنو کے سفر میں میر صاحب ایک لکھنوی کے ساتھ ایک ہی یکہ پر ہم سفر تھے اور سارے راستے خاموش رہے کہ کہیں زبان نہ بگڑ جائے۔

تذکرہ نویس: صاحب یہی روایتیں تو ہیں کہ آگے چل کر قوم کو زندہ رکھیں گی ورنہ بربادی میں کسر کونسی باقی رہ گئی ہے۔ صاحب سنا ہے کلام پاک کا ریختہ میں ترجمہ آ گیا ہے۔

کتب فروش: جی ہاں، شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ موجود ہے اور اگر آپ کو مولوی عبدالقادر کا ترجمہ درکار ہے تو کچھ روز انتظار کر لیجیے، ہفتے دو ہفتے میں آ جائے گا۔

شاعر نما آدمی: ترقی کا دور آ رہا ہے مولانا۔

کتب فروش: ترقی کہہ لیجئے یا تنزل! بہر حال زمانہ بڑی تیزی سے بدل رہا ہے۔ جگہ جگہ چھاپے خانے کھل رہے ہیں اور کلام پاک کے ساتھ ساتھ انجیل کے بھی ترجمہ چھپ رہے ہیں۔ سنا ہے کلکتے میں ایک فرنگی ہے جو سنسکرت، فارسی، ریختہ اور دیگر ہندستانی زبانوں میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔ اس نے وہاں ایک مدرسہ کھولا ہے، فورٹ ولیم کالج نام کا۔ وہاں ان زبانوں میں درس دیا جاتا ہے اور اب تو سنا ہے کہ مشاعرے بھی وہیں منعقد ہوں گے۔

کتب فروش: سچ کہتے ہو بھائی! عجب گردشوں کا زمانہ ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سلطنت مغلیہ نہیں ہے، ایک زبردست قوی ہیکل شیر ببر ہے جس پر سینکڑوں کتے بلیوں نے حملہ کر دیا ہے اور اسے زخموں سے چور اور لاچار دیکھ کر آسمان سے چیل اور گدھ بھی جمع ہو گئے ہیں، اور ٹھنگیں مار مار کر اس کی تکہ بوٹی کر رہے ہیں۔ اور وہ شیر ہے کہ نہ تو اسے کراہنے کی مہلت ہے نہ مرجانے کا یارا۔

کتب فروش: لیجیے ہم نے سوچا خوش گلو لڑکا ہے، مولانا کلام سن کر خوش ہوں گے، میں کیا جانتا تھا کہ وہ یہ بازاری کلام سنانے لگے گا، آخر مولانا ناراض ہو کر چل دیے۔

ہم جولی: لیکن نظم تو خوب تھی صاحب!

شاعر نما آدمی: جی ہاں ''سوسو طرح کا کر کر بستار تیرتے ہیں!'' اسے آپ شاعری کہتے ہیں؟ یوں معلوم ہوتا ہے آدمی شعر نہیں پڑھ رہا ہے، لکڑی کھا رہا ہے۔

ہم جولی: لیکن صاحب 'کر کر' مستعمل ہے۔ اساتذہ نے باندھا ہے۔

شاعر نما آدمی: چلیے اب اٹھئے۔

کتب فروش: معاف کیجیے گا۔

ان مکالموں سے کتب فروش کے کردار پر روشنی پڑتی ہے کہ وہ کیسا کردار ہے۔ اسی طرح پتنگ والے کا کردار کتب فروش سے بالکل مختلف مزاج کا ہے۔ اس کے مکالمے دیکھیں جس سے اس کے کردار پر روشنی پڑتی ہے:

لڑکا: اب کھول رہے ہو دکان؟

پتنگ والا: ہاں صاحب، ذرا تیرا کی کا میلہ دیکھنے گئے تھے۔

لڑکا: پتنگ وتنگ بھی بنائی ہے یا اس سال تیرا کی کا میلہ ہی دیکھتے رہے؟

پتنگ والا: کون سی پتنگ چاہیئے؟ ہر رنگ، ہر نو، ہر مذاق، ہر بہار کی پتنگیں موجود ہیں صاحب!

کون سی پتنگ لیجیے گا؟ دودھاریہ، گلھریا، پہاڑیا، دوبار، للسرا، گھائل، لنگٹیا، چاند تارا، بگلا، نپا، دھیر، خربوزیا، چنیدی، پان، یمنا، دوگوڑیا، ککڑی، چوکھڑا، باجرا...

لڑکا: ہاں ہاں ہاں، بس بھئی بس، نام تک نہیں سنے ان پتنگوں کے اپنی زندگی میں۔

پتنگ والا: پھر کیا پتنگ اڑاتے ہیں آپ؟

لڑکا: اڑا لیتے ہیں بھئی تھوڑی بہت! آپ تو ہمیں ایک سیدھا سادا دودھاریا دے دیجیے۔

پتنگ والا: دودھاریا لیجیے۔

پتنگ والا: یار اپنے کو تو یہی کلام اچھا لگتا ہے اور یہی شعر ہم جیسے جاہلوں کی سمجھ میں آتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے بھیا کہ اپنے دل کا حال مل جاتا ہے ان شعروں میں اور اپنے آس پاس کی دنیا کا حال اور طرہ یہ ہے کہ ہمارے شاعر نے وطن سے باہر قدم نہیں رکھا، یہیں بیٹھے بیٹھے ساری دنیا دیکھ لی۔

ان مکالموں سے پتنگ والے کی پسند و ناپسند اور اس کے کردار کا ایک خاکہ تیار ہو جاتا ہے۔ پتنگ والا ہی نظیر کی شاعری اور اس کے عادات و اطوار کا نمائندہ ہے۔ وہ عوام کے دکھ درد کو بھی سمجھتا ہے اور ڈرامے کے مقاصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے دوسرے کرداروں کی مدد کرتا ہے اور ان پر طنز کے کوڑے بھی برساتا ہے۔ اس سے ڈرامے میں ناظرین کی نہ صرف دلچسپی بڑھ جاتی ہے بلکہ ڈراما پیش کرنے میں مدد بھی ملتی ہے۔ گویا پتنگ والے کا کردار نہ صرف اہم ہے بلکہ دوسرے کرداروں کا محرک بھی ہے۔

حبیب تنویر نے چھوٹے چھوٹے بہت سے کردار تخلیق کیے ہیں ان میں ایک بہت چھوٹے سے کردار میں نظیر کی نواسی آتی ہے۔ اس کردار کی تخلیق کے سلسلے میں حبیب تنویر فرماتے ہیں:

اس کا خیال مجھے اس بات سے آیا کہ عبدالغفور شہباز نے نظیر کے اکثر حالات زندگی ان کی نواسی ولایتی بیگم سے معلوم کئے تھے۔

یوں تو نظیر کی نواسی کا کردار بہت چھوٹا ہے لیکن اہم ہے۔ اس کردار سے نظیر کی شخصیت پر روشنی

پڑتی ہے۔اس کردار کا مکالمہ دیکھیں:

پتنگ والا:(منظور سے) یاں نظیر کی نواسی ہے۔(لڑکی سے) نانا کیا کر رہے ہیں۔

لڑکی: میں بتاؤں؟ پڑھا رہے ہیں۔

پتنگ والا:اور تم لڈو کھا رہی ہو؟ کس نے دیے پیسے؟

لڑکی: میں بتاؤں؟ نانا کو پڑھانے کے پیسے ملتے ہیں نا۔

پتنگ والا:اور تم موج کرتی ہو، کیوں؟

لڑکی :نہیں، میں بتاؤں؟ ہمارے نانا پیسے کو ہاتھ نہیں لگاتے ہیں نا۔ جیسے ہم کو اماں کہتی ہے نا، کہ گندی چیز کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے ویسے نانا نے آج پیسے کو رومال میں باندھ کر کونے میں پھینک دیا۔

پتنگ والا:اور تم نے اٹھالیا۔

لڑکی:نہیں۔سب تھوڑا ہی، خالی ایک پیسہ۔

ڈرامے کے اہم کرداروں میں ایک کردار تذکرہ نویس کا ہے۔تذکرہ نویس اس زمانے میں شرفا کی نمائندگی کرتے ہیں اور نظیر کے کلام کو بازارو کلام بتاتے ہیں۔اگر غور سے دیکھیں تو تذکرہ نویس نہ صرف اس زمانے اور اس کے بعد کے تذکرہ نویسوں کی نمائندگی کرتا ہے بلکہ اس کے کردار میں میر کی شخصیت کی بھی جھلک ملتی ہے۔اسے ابوالقاسم میر قدرت اللہ، شیفتہ اور میر کی شخصیتوں کے امتزاج کے طور پر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ کتب فروش کی دکان پر جن کا غلبہ ہے ان میں سب سے اہم تذکرہ نویس ہی ہیں۔وہ نظیر کو اچھا انسان تو مانتے ہیں لیکن شاعر نہیں مانتے۔ایک مکالمہ دیکھیں:

تذکرہ نویس :(ایک کتاب دیکھتے ہوئے) بھئی بہت باغ و بہار آدمی ہے۔خوش مزاج، شگفتہ افتاد، ہر شخص سے ہنس کر ملنے والا، کسی کا دل نہ دکھانے والا، ایسا کہ شاید جس کی مثال دنیا میں مشکل سے ملے گی! لیکن شاعری آں چیز دیگر است! فحش کلامی، ہرزہ گوئی، ابتذال اور عامیانہ مذاق کی تک بندی کو ہم نے شعر نہیں مانا! میاں نظیر کو شاعر ماننا ان پر بہت بڑا بہتان ہوگا۔شعرا کے تذکرہ میں ان کی کوئی جگہ نہیں۔

دوسرے کرداروں پر نظر ڈالتے ہیں تو روایتی شاعری کے انحطاط کی تصویر شاعر نما آدمی کے

کردار میں نظر آتی ہے اور متوسط طبقے کی متضاد ذہنیت کا نقشہ اس کے ہمجولی کے کردار میں دکھائی دیتی ہے۔ لڈو والا، تربوز والا، ککڑی والا، بندر والا، ریچھ والا وغیرہ کا کردار حبیب تنویر نے نظیر کی نظموں سے لیا ہے اور اس کے کردار کو بالکل ویسا ہی بنایا ہے جو نظیر کی نظموں میں دکھتا ہے۔

ڈراما آگرہ بازار کے کرداروں کی تعداد پر نظر ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ چھوٹے بڑے کل چھبیس کردار ہیں۔ ان کرداروں میں شاید ہی کوئی ایسا ہے جس کی اہمیت نہ ہو۔ یہاں تک کہ ایک لڑکا جو پتنگ کی دکان کے بند رہنے پر اس کے باہر مسلسل سویا رہتا ہے اور جب پتنگ والا اپنی دکان کھولنے آتا ہے تو اسے خبیث کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے وہاں سے اٹھتا ہے اور جب وہ وہاں سے اٹھ کر دوسری جانب جاتا ہے تو صرف اس کے چلنے اور حلیے سے ایک مکمل کردار اور زمانے کی مفلسی کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح جب اس لڑکے کو کتب فروش آواز دیتا ہے تو وہ نہیں سنتا اور جب اسے مغلظات کے ساتھ بلایا جاتا ہے تو فوراً وہ آجاتا ہے اور کتب فروش اسے پان لانے کے لیے کہتا ہے۔ اس پر اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس لڑکے نے ہمیشہ مغلظات ہی سنا ہے، کسی نے اسے کبھی اچھے الفاظ میں یاد ہی نہیں کیا اس لیے جب کوئی مہذب الفاظ میں آواز دیتا ہے تو اسے لگتا ہے کہ کسی اور کو بلایا جارہا ہے۔

اس طرح حبیب تنویر نے مداری، شاعر نما آدمی اور اس کا ہمجولی، گھوڑوں کا تاجر، ریچھ والا، ریچھ، بندر یہاں تک کہ کتاب کا گاہک بھی نہایت خوش اسلوبی سے تخلیق کیا ہے۔ یہ اور اس ڈراما کے تمام کردار دو شکل میں کام کرتے ہیں ایک زمانے کی بے ثباتی کو ظاہر کرتے ہیں تو دوسرے نظیر کی شخصیت اور شاعری پر روشنی ڈالتے ہیں۔ گویا حبیب تنویر نے اس ڈرامے میں جتنے بھی کردار پیش کیے ہیں ان میں سے سب کے سب اہم اور ضروری ہیں۔

ڈراما آگرہ بازار کی ایک بڑی خوبی یہ کہ کردار جس طبقے یا سماج سے تعلق رکھتا ہے زبان بھی اس کے مطابق ہے۔ مختلف طبقوں اور گروہوں کے لوگوں کی گفتگو سے ان کا طبقاتی فرق بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کردار صرف آپس میں گفتگو نہیں کرتا بلکہ پلاٹ کو آگے بڑھاتا ہے۔ کردار موقعہ محل کی موزونیت و مناسبت کے ساتھ ساتھ اپنے مرتبے اور ماحول کے مطابق گفتگو کرتا دکھائی دیتا ہے۔

ڈراما آگرہ بازار چونکہ اسٹیج پر دکھایا جاتا رہا ہے اس لیے یہ ڈراما کردار کی ذہنی سطح اور معاشرت کے مطابق ہے۔ ڈراما نگار نے ہر کردار کو اس کی گفتگو اور لہجے کی مدد سے ابھارا ہے۔ ہر دو انسان میں جو

فرق ہوتا ہے وہی ان کے مکالموں میں بھی نظر آتا ہے۔ مکالموں میں فطرت و معاشرت کی صحیح عکاسی کے لیے مختلف طبقوں کی زبان پر ڈراما نگار کو گویا دسترس حاصل ہے اور نہ صرف زبان بلکہ زبان کے پیچھے جو تہذیبی و ثقافتی عوامل کام کرتے ہیں ان سے بھی حبیب تنویر بخوبی واقف ہیں۔ پروفیسر محمد حسن مکالمہ کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''مکالمے تین صورتوں سے خالی نہیں ہوتے اور اگر وہ ان تینوں میں سے کوئی شرط پوری نہ کرتے ہوں تو ڈرامے میں ان کی گنجائش نہیں۔ یا تو مکالمہ کہانی کو آگے بڑھاتا ہو، یا کردار کے کسی پہلو کو واضح اور اس میں تبدیلی یا ارتقا ظاہر کرتا ہو یا فضا پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہو۔ یہ معیار ہر مکالمے کے ہر ٹکڑے کے لیے برتا جاسکتا ہے۔ لفاظی یا شاعرانہ تقریروں کی گنجائش اس طرح ختم ہو جاتی ہے۔''

ان نکات کو مدنظر رکھتے ہوئے حبیب تنویر کے مکالموں پر نظر ڈالتے ہیں تو اس پر وہ نہ صرف کھرے اترتے ہیں بلکہ مزید اضافہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ آگرہ بازار چوں کہ کسی شخصیت کو مرکزی کردار کے طور پر نہیں پیش کرتا گرچہ ایک خاص شخصیت کو ذہن میں رکھ کر لکھا گیا ہے، اس لیے یہاں ہر منظر میں ایک خاص فضا نظر آتی ہے۔ ایک خاص ماحول دکھائی دیتا ہے اور یہ ماحول کرداروں کے مکالمے سے بنتا ہے۔

ڈراما آگرہ بازار کے مکالموں پر غور کرنے سے اس کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ نظیر کی نظموں کی ڈراما نگاری، حبیب تنویر کے مکالموں میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ پتنگ فروش، مداری اور بازار کے لوگوں کے اکثر مکالمے پر نظیر کے اشعار کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان مکالموں کی وجہ سے ہی نظیر کا کردار ڈراما میں نہ ہوتے ہوئے بھی ہر جگہ اور ہر وقت وہ ڈرامے کا حصہ محسوس ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند مکالمے دیکھیں:

شاعر نما آدمی: حضور! تو یہ ہے میاں نظیر کا معیار سخن!

کتب فروش: تعجب اس بات پر ہے کہ میاں نظیر شریف گھرانے کے آدمی ہیں! جاہل اور گداگر ان کی چیزیں گاتے پھرتے ہیں۔ انھیں اپنا نہ سہی، اپنے خاندان کی عزت کا تو خیال ہونا چاہیے۔

تذکرہ نویس: صاحب جس شخص کی تمام عمر پتنگ بازی، میلے ٹھیلوں کی سیر، آوارہ گردی اور قمار بازی میں گزری، اسے کیا شرم وحیا!

شاعر نما آدمی: اب تو خیر آخری عمر میں ایک صوفی صافی کی زندگی بسر کرنے لگے ہیں، ورنہ سنا ہے عہد شباب میں یہ عالم تھا کہ بازار کے لونڈوں کے ساتھ گاتے بجاتے اور کوٹھوں پر پھرتے تھے۔ ہولی کے دنوں میں باقاعدہ رنگ کھیلتے اور ہر رسم میں شریک ہوتے۔

کتب فروش: اب بھلا بتایئے، ان سوقیانہ طرز کے گانوں کو، جو سڑکوں پر بھیک مانگنے والے گاتے ہیں، اگر شعر کہہ دیا جائے تو دنیائے شاعری پر ظلم نہ ہوگا۔

لڑکا: میں تو پتنگ خریدنے آیا تھا صاحب، شعر سنانے کی غرض سے تو نہیں آیا تھا۔

پتنگ والا: ارے یار! مگر یہ تو جانتے ہو کہ کتنی پرانی ملاقات ہے ہماری میاں نظیر سے! سنانا تھا تو ہماری دوکان پر بیٹھ کر سناتے۔ وہاں شعر پڑھ کر ان کو بھی بے عزت کیا اور ہمیں بھی، واہ....اسی پر تو کہا ہے حضرت نظیر نے کہ

دل سا در یتیم بکا کوڑیوں کے مول
کیا کیجیے خیر یہ بھی خریدار کے نصیب

پتنگ والا: یار اپنے کو تو یہی کلام اچھا لگتا ہے اور یہی شعر ہم جیسے جاہلوں کی سمجھ میں آتے ہیں۔ سچی بات ہے بھیا کہ اپنے دل کا حال مل جاتا ہے ان شعروں میں اور اپنے آس پاس کی دنیا کا حال، اور طرہ یہ ہے کہ ہمارے شاعر نے وطن سے باہر قدم نہیں رکھا۔ یہیں بیٹھے بیٹھے ساری دنیا دیکھ لی۔

کتب فروش: (ایک دیہاتی لڑکے کو گزرتے دیکھ کر) ادھر آنا میاں (لڑکا نہیں سنتا) ادھر آبے خبیث! (لڑکا آتا ہے) سسرے ریختہ نہیں سمجھتے، جب تک مغلظات نہ بکیے، سمجھتے ہیں عزت ہی نہ ہوئی (لڑکے کو پیسے دے کر) ذرا سامنے کی دوکان سے چار پان بنوالا۔

ان مکالموں کو دیکھیں تو اس میں کردار اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔

حبیب تنویر انسانی زندگی کو دوسری تمام چیزوں پر فوقیت دیتے ہوئے انسانوں کی پریشانی، انکی دشواریاں، ان کے دکھ درد کو سمجھنا اوران کے حق کی بات کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ان مکالموں کے ساتھ ساتھ ڈرامے کا کوئی بھی مکالمہ دیکھیں اس میں کردار اور ماحول کی مناسبت سے پلاٹ کو بہترین طریقے سے پیش کرنے میں مکالمہ نہ صرف کامیاب بلکہ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔مکالمے موقع اور ماحول کے ساتھ ساتھ کردار کی مناسبت سے تحریر کئے گئے ہیں۔کردار کی تعلیمی،تہذیبی،ثقافتی اور ذہنی سطح کی عکاسی ان مکالموں سے بخوبی ہوتی ہے۔

ڈرامے کی زبان کا انحصار اس کے موضوع اور کردار پر ہوتا ہے۔یعنی تمام کردار ایک ہی زبان میں گفتگو نہیں کرتے۔ان کی تعلیم،تہذیب وثقافت،سماج،ماحول اور دوسرے کردار سے رشتہ کی مناسبت سے بھی زبان کا تعین کیا جاتا ہے۔ہم جانتے ہیں کہ عام زندگی میں ہم میں سے تقریباً سبھی بعض اوقات ایک ہی شخص سے ماحول کی مناسبت سے مختلف زبان میں بات کرتے ہیں یعنی اگر خوشی کا ماحول ہے تو زبان مختلف ہوتی ہے اور اگر غصہ یا ناراض ہیں تو مختلف طرح کے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں یا غیر ارادی طور پر زبان سے ادا ہوتا ہے۔اس لیے مختلف کردار کی زبان مختلف ہونی چاہئے یعنی اردو ہونے کے باوجود ان کے ذریعہ ادا کیے جانے والے جملے کی ساخت، الفاظ کا انتخاب اور بولنے کا لہجہ مختلف ہونا چاہئے۔ ڈراما آگرہ بازار کی زبان میں یہ فرق صاف طور پر دکھائی دیتا ہے یعنی تذکرہ نویس، شاعر نما آدمی اور کتب فروش کی زبان پتنگ والا اور بازار کے دوسرے کرداروں کی زبان سے مختلف ہے بلکہ ہر کردار اپنی خاص زبان اور لہجہ لیے ہوئے ہے۔چند مکالمے دیکھیں:

داستان گو: میر صاحب کوئی 30 برس بعد وطن مالوف واپس آئے۔علما وفقرا سے ملے،عزت وتوقیر ملی، پر ایسا کوئی مخاطب نہ ملا کہ اس سے دل بیتاب کو تسلی ہو، کہنے لگے کہ سبحان اللہ! یہی وہ شہر ہے کہ جس کے ہر کوچے میں عارف، کامل، فاضل، شاعر، منشی اور دانش مند تھے، آج وہاں کوئی ایسا آدمی نہیں کہ اس کی صحبت سے لطف اٹھاؤں۔ چار مہینے اس طور سے وطن عزیز میں گزارے، بہت رنج ہوا اور واپس چلے گئے۔

ان کا بزم میں آنا بس اتنا یاد ہے میر
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

غرض صاحب اب کیسا تذکرہ اور کہاں کا تذکرہ نویس! بہرحال داستان پارینہ کا ایک زریں ورق اب تک ذہن کے کسی گوشے میں جگمگا تا رہتا ہے۔عہد حاضر کی ظلمتوں نے اگراس شمع کو بجھا نہ دیا تو ممکن ہے کہ آنے والی نسلوں کے لیے کچھ چھوڑ جاؤں ورنہ اب تو ہمارا دم بھی غنیمت سمجھو۔

ان مکالموں کی زبان پر غور کریں تو پائیں گے کہ یہاں ایک خاص طرح کی زبان ہے۔اس میں صرف میر تقی میر کی دلی واپسی نہیں ہے بلکہ زمانے کی ستم ظریفی بھی ہے اور زبان کے معیار کو بچائے رکھنے کا احساس بھی ہے۔ڈراما آگرہ بازار میں داستان گو، شاعر نما آدمی اور کتب فروش جو زبان استعمال کرتا ہے اسے معیاری کہا جاتا تھا اور عوام جو زبان استعمال کرتے ہیں اسے غیر معیاری اور بازارو کہہ دیا جاتا تھا اس لیے نظیر کے کلام کو بھی بازارو کہا گیا۔حالانکہ اس ڈرامے میں ہی نظیر کے ایسے بہت سے اشعار پیش کیے گئے ہیں جو نہ صرف فارسی آمیز ہیں بلکہ آسان زبان میں بھی جس پائے کا شعر ہے اس سے پہلے اور بعد میں بھی کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیں:

صحرا میں مرے حال پہ کوئی بھی نہ رویا
گر پھوٹ کے رویا تو مرے پاؤں کا چھالا

ڈرامے میں پوری غزل پیش کی گئی ہے۔اس غزل کو سننے کے بعد کتب فروش اور داستان نویس بھی حیرت کا اظہار کرتا ہے کہ نظیر کی یہ غزل تو ہم لوگوں نے نہیں سنی اور پھر یہ کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ایک دو اشعار تو کوئی بھی کہہ سکتا ہے۔کتب فروش اور داستان نویس کی نظر میں زبان اور شاعری کا معیار مختلف ہے۔ایک اجنبی جب ناسخ کا کلام لینے کتاب کی دکان پر آتا ہے تو کتب فروش کس زبان میں اس سے مخاطب ہوتا ہے دیکھیں:

اجنبی: (کتب فروش سے) کلام ناسخ آپ کے یہاں ہے؟

کتب فروش: (پتنگ والے کا غصہ اس اجنبی پر نکالتا ہے۔موقع پاتے ہی برس پڑتا ہے)

میاں! ناسخ کل کے چھوکرے ہیں، ابھی ابھی شعر کہنا شروع کیا ہے اور ابھی سے آپ ان کے کلام کی تلاش میں نکل پڑے۔ایسا ہی شوق ہے تو لکھنؤ چلے جایئے اور خود سن لیجیے۔

گویا ان کی نظر میں صرف استاد کا کلام معیاری ہے اور نوجوان شعرا اس لائق نہیں ہیں کہ ان کا مطالعہ بھی کیا جائے۔ جب ان کی نظر میں نوجوان شاعر لائق مطالعہ نہیں ہیں تو بازار کے لوگوں کی زبان سن کر ان پر کیا گزرتی ہوگی اس کا اندازہ ان کے مکالموں سے بخوبی ہوتا ہے۔ اس کی کامیاب عکاسی حبیب تنویر نے درمیان میں کتب فروش کے مکالموں سے کی ہے۔ ہم ڈرامے کا مطالعہ کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ کتب فروش نہ صرف نازیبا الفاظ کا استعمال کرتا ہے بلکہ مغلظات بکتا ہے، جس سے اس کردار کی ذہنیت کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

بازار کے مختلف لوگ الگ الگ زبان میں بات کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی زبان پر غور کریں تو اس میں ان کے پیشے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ککڑی والا، لڈو والا، تربوز والا اور دوسرے دکان دار اپنے پیشے کی مناسبت سے زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ پتنگ والے کی زبان کو نظیر کی زبان مان سکتے ہیں، کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مخاطب کے لحاظ سے پتنگ والے کی زبان بدلتی ہے۔ جب وہ پتنگ بیچ رہا ہوتا ہے تو اس کی زبان مختلف ہوتی ہے اور جب بچے سے مخاطب ہوتا ہے تو مختلف، جب وہ سوئے ہوئے آدمی کو جگاتا ہے تو اس کی زبان مختلف ہوتی ہے اور جب نظیر کی شاعری اور شخصیت پر بات کرتا ہے تو مختلف زبان میں گفتگو کرتا ہے۔ حبیب تنویر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے کسی بھی کردار کا مکالمہ لکھتے وقت صرف اس کی ذاتی زندگی کو پیش نہیں کیا ہے بلکہ اسے آفاقی بنا دیا ہے۔ مداری کا مکالمہ دیکھیں اور اس کی زبان کا لطف لینے کے ساتھ ساتھ زمانے کی ستم ظریفی کو بھی محسوس کریں:

مداری: (بندر نچاتا ہے) ہاں جرا ناچ دکھادو، ناچ، آگرہ سہر میں جرا ناچ دکھادو۔ بچہ لوگ جرا ہاتھ کا تالی بجاؤ۔ اچھا بتاؤ تو جرا، ہولی میں مردنگ کیسے بجاؤں گے۔ (بندر مردنگ بجاتا ہے) اور پتنگ کیسے اراؤں گے۔ (بندر نقل کرتا ہے) اور بانکے بن کر مہادیوی کے میلے میں کیسے جاؤں گے؟ (بندر کج کلاہی کی چال چلتا ہے) اور برسات آ گیا تو؟ (بندر پھسل جاتا ہے) پھسل پروں گے؟ ارے بھئی واہ اور اگر جاڑا لگی تو؟ (بندر بدن میں کپکپی پیدا کرتا ہے) اور بڑھا ہو گئے تو؟ (بندر بڑھاپے کی نقل کرتا ہے) اور مر گئے تو؟ (بندر مر جاتا ہے) ہندو کو رام کی کسم اور مسلمان کو قرآن کی قسم ذرا ایک ایک قدم پیچھے ہٹ جاؤ۔ اچھا اب بتاؤ

بھلا نادرشاہ دلی پر کیسا جھپٹا تھا؟ (بندر مداری کو ایک لاٹھی مارتا ہے) ارے تم تو سارے دلی سہر کو مار ڈالو گے! بس کرو بڑے میاں، بس کرو۔ اچھا! احمد ساہ ابدالی دلی پر کیسا جھپٹا تھا؟ (بندر لاٹھی مارتا ہے) ہاں ہاں ہاں!!! اور سورج مل جاٹ آگرہ سہر پر کیسا جھپٹا تھا؟ (وہی نقل) اور آگرہ شہر میں کیا ہوا تھا؟ (بندر ادھر ادھر دوڑتا ہے) لوگ بھاگ بھاگ گیا تھا۔ (بندر لیٹ جاتا ہے) اور بہت سا آدمی مر گیا تھا؟ اور پھرنگی ہندوستان میں کیسا آیا تھا؟ (بندر بھیک مانگنے کی نقل کرتا ہے۔ اور پلاسی کی لڑائی میں لاٹ صاحب نے کیا کیا تھا؟ (بندر لاٹھی سے بندوق چلاتا ہے۔) فیر کر دیا تھا؟ اوہ ہو ہو۔ اور بنگال میں کیا ہوا تھا؟ (بندر پیٹ بجاتا ہے اور کمزوری کا اظہار کرتا ہے) کال پڑ گیا تھا۔ (بندر لیٹ جاتا ہے۔ لوگ باگ بھوک سے مر گیا تھا؟ .....اور ہمارا کیسا حالت ہے؟ (بندر پھر پیٹ بجاتا ہے) اور کل ہمارا کیسا حالت ہو جائیں گا؟ (بندر گر جاتا ہے) پھر ہمارے کو کیا کرنا چاہیے؟ (بندر لوگوں کے پاس جاتا ہے اور پیروں پر سر رکھ کر لیٹ جاتا ہے) سلام کرو (بندر سلام کرتا لوگ کھسکنے لگتے ہیں۔)

اس طرح کے بہت سے مکالمے پیش کیے جا سکتے ہیں جس میں کردار کی مناسبت سے مختلف زبان کے ساتھ ساتھ اس کی پوری شخصیت اور اس کی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ پورا زمانہ اپنی تمام اچھائی اور برائی کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ گویا اس ڈرامے میں کرداروں کی زبان صرف اس ڈرامے کی زبان نہیں ہے بلکہ اس دور میں مختلف طبقوں میں بولی جانے والی زبان کی نمائندگی بھی کرتی ہے اور ادب کے طالب علم کو اس کا بھی احساس دلاتی ہے کہ اس زمانے میں کس کس طرح کی زبان آگرے میں بولی جاتی تھی۔ حبیب تنویر نے اس ڈرامے کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان کو اردو زبان پر کس قدر دسترس حاصل تھی کہ نہ صرف معیاری زبان تخلیق کر سکتے تھے بلکہ کسی بھی زمانے کی زبان میں تخلیق کر سکتے تھے، یہ صلاحیت اردو ادب کے کسی بھی دوسرے ادیب و نقاد میں اس قدر دیکھنے کو نہیں ملتی۔ انھوں نے اس ڈرامے کے ذریعہ یہ بھی ثابت کر دیا کہ اردو زبان میں مکالمے کیسے لکھے جاتے ہیں جس سے کردار مکمل صورت میں زندگی جیتا ہوا دکھائی دے۔

ڈرامے کی زبان صرف زبان سے ادا کیے جانے والے مکالمے ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ بے معنی الفاظ بھی ہوتے ہیں جو کردار کی زبان سے ادا ہوتے ہیں، وہ آواز بھی ہوتی ہیں جو احساس یا تاثرات کو ظاہر کرنے کے لیے ادا کی جاتی ہیں، وہ حرکات وسکنات بھی ڈرامے کی زبان ہوتے ہیں جو کردار کے ذریعہ پیش کیے جاتے ہیں۔ ڈراما آگرہ بازار میں اس طرح کی ہدایات موجود ہیں جس سے اداکار کو اپنی اداکاری کے جوہر دکھانے کے مواقع ملتے ہیں اور ان بے معنی آوازوں کے ساتھ ساتھ حرکات وسکنات کے ذریعہ اپنا جوہر دکھا سکے۔ کئی کردار ایسے ہیں جو پورے ڈرامے میں ایک بھی لفظ ادا نہیں کرتے۔ وہ یا تو بار بار ایک جانب سے اسٹیج پر داخل ہوتے ہیں اور دوسری جانب سے نکل جاتے ہیں۔ کئی کردار دوکانوں پر کھڑے ہیں۔ چند مثال دیکھیں:

> یہ اجنبی بہت دیر سے بازار کے چکر کاٹ رہا ہے۔ آوارہ گرد ہے، لوگوں کے منھ تکتا رہتا ہے اور ہر جگہ دخل انداز ہونا چاہتا ہے۔ اسے دنیا میں کوئی کام نہیں۔
>
> کتب فروش کی دوکان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کتب فروش کتاب کے پیچھے سے سر اٹھا کر دیکھتا ہے۔ طیش کے مارے اس کی نگاہیں سرخ ہوگئی ہیں۔ پتنگ والا حمید کے برابر بینچ پر بیٹھ جاتا ہے۔
>
> کتب فروش اسے غضب آلود نگاہوں سے گھور رہا ہے۔ ککڑی والا جواب تک انجان تھا مولوی صاحب کی نگاہوں کو دیکھ کر یکا یک چپ ہو جاتا ہے اور بھاگ کر دائیں کونے میں دبک جاتا ہے۔ پتنگ والا جو مجمع میں سب سے آگے تھا کتب فروش کی دوکان کی طرف بڑھتا ہے۔
>
> تذکرہ نویس جھنجھلا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور بغیر کچھ کہے چلا جاتا ہے۔ محفل پر ایک تحقیر آمیز سناٹا چھا گیا ہے مگر بہت سے رستہ چلنے والے بڑے شوق سے نظم سننے کے لیے رک گئے ہیں۔ اس جمگھٹ کو دیکھ کر مولوی صاحب برس پڑتے ہیں۔

ان ہدایات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ جن کرداروں کے مکالمے ہیں اس کے علاوہ بہت سے ایسے کردار ہیں جن کے مکالمے تو نہیں ہیں لیکن اس کا وجود مکمل صورت میں ڈرامے میں موجود ہے۔ ڈرامے میں ایسے کردار کی تلاش کی جائے تو اس کی تعداد ڈرامے میں موجود کرداروں سے زیادہ بھی

ہوسکتی ہے۔ ان ہدایات میں اداکاروں کو اپنا کردار تیار کرنے میں مدد تو ملتی ہی ہے ساتھ ہی ساتھ ایسے بے شمار مکالمے مل جاتے ہیں جسے الفاظ کا لباس تو نہیں پہنایا گیا ہے لیکن اظہار کا بھرپور موقع عنایت کیا گیا ہے۔ اگر اظہار کے اس طریقہ کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر ڈراما تو پیش کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں زندگی نہیں محسوس کی جاسکتی۔

ڈراما آگرہ بازار کی پیش کش کا ایک اہم حصہ موسیقی ہے۔ موسیقی کے ذریعہ ماحول، حالات اور کردار کی ذہنیت کو اجاگر کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ ڈراما شروع ہی ہوتا ہے شہر آشوب سے۔ دو فقیر شہر آشوب گاتے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور درمیان میں بھی وہ نظیر کی نظمیں گاتے ہیں۔ آخر میں ککڑی والا، لڈو والا، تربوز والا، مداری، ریچھ والا اور دوسرے دوکاندار بھی گاتے ہیں۔ لڑکا نظیر کا کلام ترنم سے گا کر پیش کرتا ہے۔ ہولی، مہادیو کا بیاہ وغیرہ نظمیں گا کر پیش کی جاتی ہیں۔ اس طرح غزلوں کے ساتھ ساتھ کل بائیس نظمیں اس ڈرامے میں گائی جاتی ہیں اور اس کی خوبی یہ ہے کہ سب کی سب مختلف دھن میں گائی جاتی ہیں۔ گویا یہ گیت نہ صرف نظیر کی شخصیت کو پیش کرتے ہوئے ڈرامے میں ماحول تیار کرنے کا کام کرتے ہیں بلکہ ہندستانی موسیقی سے بھی ناظرین کو واقف کراتے ہیں۔ اگر ان گیتوں کو ڈرامے سے نکال دیا جائے تو ڈرامے کی روح نکل جائے گی اور بغیر روح کے کسی چیز کا وجود نہیں ہوتا۔ گویا یہ نظمیں اس ڈرامے کا اٹوٹ حصہ ہیں۔

اسی طرح اب روشنی بھی ڈرامے کی پیش کش کا اٹوٹ حصہ بن گیا ہے۔ روشنی کی مدد سے وقت، حالات، ماحول، مقام وغیرہ کو بخوبی پیش کیا جاتا ہے۔ آرائش اور لباس بھی ڈرامے کی پیش کش کا ضروری حصہ ہے۔ بہت سی باتیں اور نکات کو صرف آرائش اور لباس کے ذریعہ کامیابی کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے اور حبیب تنویر نے اس کا خاص التزام رکھا ہے۔ ڈرامے کو شائع کرتے ہوئے انھوں نے آخر میں لباس اور ساز و سامان کی فہرست بھی پیش کر دی ہے۔ اس سے اس ڈرامے کو آئندہ کھیلنے میں مدد ملے گی۔ لباس اور ساز و سامان سے ڈرامے میں زندگی پیدا کی جاتی ہے اور مختلف کردار کی پسند و ناپسند کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنیت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس سے اس کے رتبے کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے اور اس ڈرامے میں تو اس کے پیشے کا بھی علم ہو جاتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو آگرہ بازار نہ صرف نظیر اکبر آبادی کی زندگی اور ان کے فن پر روشنی

ڈالتا ہے بلکہ ڈرامے کی نئی تکنیک میں لکھا گیا ایک اہم اردو ڈراما ہے۔ اس زمانے میں اردو میں ڈرامے تو لکھے جا رہے تھے لیکن ان میں جدید تکنیک کم کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ پہلی بار ایپک تھیئٹر کی تھیوری کو نہ صرف اردو بلکہ ہندستان میں پیش کرنے کا سہرا حبیب تنویر کے سر جاتا ہے اور یہ کام انھوں نے آگرہ بازار کے ذریعہ انجام دیا۔ ڈرامے کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو آگرہ بازار کے علاوہ شاید ہی کوئی ڈراما ہو جو ایک دن کے حادثات و واقعات پر محیط ہو۔ ڈراما آگرہ بازار صبح کے وقت شروع ہوتا ہے اور شام ہوتے ہوتے اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ جب کہ اس ایک دن میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی خوبیوں اور خامیوں کو پیش کر دیا گیا ہے۔ اس دور کے سماج اور زمانے کی ستم ظریفی، مفلسی اور ادبی صورت حال کو کامیابی سے دکھایا گیا ہے۔

اس ڈرامے کے کردار نہ صرف اصل صورت میں موجود ہیں بلکہ جیتے جاگتے دکھتے ہیں۔ اس دور کے زیادہ تر ڈراما نگاروں کے کردار انسانی صفت سے آزاد ہوتے ہیں اور ایک جیسی زبان میں بات چیت کرتے دکھائی دیتے ہیں جبکہ حبیب تنویر کے مختلف کردار مختلف زبان میں گفتگو کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ حبیب تنویر کو اسٹیج کرافٹ کا بھرپور علم ہے اس لیے اس ڈرامے میں اس کا بھی فن کارانہ استعمال کیا گیا ہے۔ ڈراما آگرہ بازار کو پہلی بار یوم نظیر کے موقع پر پیش کیا گیا تھا اور پھر اس کے بعد مسلسل نہ صرف حبیب تنویر اور نیا تھیئٹر کے ذریعہ ہندستان اور غیر ممالک میں پیش کیا گیا بلکہ ڈرامے سے دلچسپی رکھنے والے ہر فنکار کی خواہش ہوتی رہی کہ وہ اس میں اداکاری کرے یا اسے پیش کرے اور کروائے اور وقفے وقفے سے وہ اس خواہش کی تکمیل بھی کرتے رہے۔ اس طرح ڈراما آگرہ بازار نہ صرف اردو ڈراما اور تھیئٹر کا ایک سنگ میل ہے بلکہ ہندستانی تھیئٹر کا وہ باب ہے جس کے ذکر کے بغیر ڈرامے کی تاریخ پر گفتگو ہی نہیں کی جا سکتی۔

❒ **Prof. Mohd. Kazim**
Department of Urdu
University of Delhi, Delhi
Mobile: 9868188463
Email: kazimdu@gmail.com

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:206-225
Dr. Mazhar Ahmad, Novel "Umrao Jan Ada" ka Nishatiya Ahang

مظہر احمد

ناول ’’امراؤ جان ادا‘‘ کا نشاطیہ آہنگ

مرزا محمد ہادی رسؔوا اور ناول امراؤ جان ادا کے ناقدوں نے نہایت تفصیل اور گہرائی کے ساتھ ان کے فکر وفن پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ بعض نقادوں نے طویل مضامین تحریر کرتے ہوئے امراؤ جان ادا کی خصوصیات پر مفصل گفتگو کی ہے اور ناول کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ ناول کے پلاٹ، کردار، مکالمے، منظر نگاری، جذبات نگاری، محاکات اور اس کے موضوع کے تعلق سے اہم آرا پیش کی ہیں۔ ان میں سے بیشتر کے نزدیک ایک طوائف کی داستانِ حیات کے پس منظر میں رسؔوا نے لکھنوی تہذیب کی جھلک پیش کی ہے۔ اس جھلک میں لکھنؤ کے رسم و رواج، لباس و زیورات، تیج تہوار، میلوں ٹھیلوں کی تفصیلات بھی در پردہ چلی آئی ہیں۔ علاوہ ازیں اور نوابوں، رئیس زادوں کے ساتھ ادنیٰ طبقے کے لوگوں کے کرداروں کی نمائندگی بھی ناول میں موجود ہے۔ طوائف کے کوٹھوں کی تفصیلات، وہاں کے شب و روز کے معاملات، دلالوں کی ریشہ دوانیاں، رئیس زادوں کی عیاشیاں، رنڈیوں کی آپسی رقابت، ہوس نا کی اور عشق کی مختلف کیفیات و درجات کو کہیں خود مرزا رسؔوا کی زبان اور کہیں امراؤ جان ادا کی زبان سے ادا کیا گیا ہے اور ان تمام امور و خصوصیات پر ہمارے نقادوں کی نظر گئی ہے اور انھوں نے ان امور پر بے لاگ تبصرے اور تنقید بھی کی ہے۔ دراصل مرزا رسؔوا کے بیشتر نقاد ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں کے معترف ہیں۔ بلکہ اکثر ان کے عقیدت مند ہیں۔ اس لیے اکثر کی نظریں رسؔوا کی تصنیفات کی خوبیوں پر ہی مرکوز ہوتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ امراؤ جان ادا کے علاوہ مصنف کے دوسرے ناولوں کی خامیوں پر بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ دراصل حقیقت یہ ہے کہ امراؤ جان ادا کی بے شمار خوبیوں کے سامنے اس کی چند خامیوں پر نظر کم ہی پڑتی ہے۔ حالانکہ کئی نقادوں نے امراؤ جان ادا پر سخت تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے۔

امراؤ جان ادا کی کہانی المیہ ہے۔اس کی مجموعی فضا پر غم کی ایک اَن دیکھی چادر سی پڑی ہوئی ہے۔ایک متوسط گھرانے کی کمسن بچی کے اغوا کیے جانے کے منظر سے اصل کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ جسے مار دینے کے بجائے لکھنؤ کی ایک طوائف کے کوٹھے پر معمولی رقم کے عوض بیچ دیا جاتا ہے اور پھر یہاں سے ایک شریف گھرانے کی معصوم لڑکی کے طوائف بننے کی کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔امراؤ جان کی سوانح میں کئی دردناک موڑ آتے ہیں۔ زندگی کے تلخ تجربات و احساسات کی ترجمانی وہ اپنی شاعری کے ذریعے کرتی ہے۔(یاد رہے کہ ناول کے ہر حصّے کی ابتدا ایک شعر سے ہوتی ہے جو امراؤ جان کے ہی زورِ قلم کا نتیجہ ہوتا ہے)عشاق کی بے وفائی اور زمانے کی ستم ظریفیوں کا شکار ہو کر اس کی زندگی کئی دردناک موڑ اختیار کرتی ہے۔ایک سے زیادہ بار کوٹھے سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کرتی ہے اور ہر بار واپس لائی جاتی ہے۔اس کے عشاق میں گوہر مرزا (دلال)،نواب سلطان (نواب) اور فیض علی (ڈاکو) خاص ہیں۔اسے بھی اُن سے انسیت یا محبت ہو جاتی ہے مگر ہر بار ناکامی ہی ہاتھ لگتی ہے۔ کان پور میں ایک نوچی کو لے کر اپنا ’’کاروبار‘‘ شروع کرنے کی کوشش میں بھی وہ ناکام رہتی ہے۔فیض آباد میں اپنے آبائی گھر کے پڑوس میں مجرے کے دوران اسے اپنا گھر یاد آتا ہے۔ ماں بھی اسے پہچان لیتی ہے مگر چھوٹا بھائی اس کے گلے پر چھری رکھ دیتا ہے اور اسے وہاں سے چلے جانے کے لیے کہتا ہے اور وہ پھر واپس کوٹھے پر آجاتی ہے۔ زندگی کے اتنے اُتار چڑھاؤ سہنے کی وجہ سے اس کی زندگی ایک ازلی محرومی کا شکار نظر آتی ہے۔ یہ تمام واقعات اور ان کی تفصیلات ہمارے نقادوں کے زیرِ قلم رہی ہیں اور انھوں نے کماحقہٗ تنقید کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس سلسلے میں ہمارا معروضہ یہ ہے کہ مرزا رسوا نے نہایت خوبی کے ساتھ اس المیہ کہانی کو ایک نشاطیہ آہنگ فراہم کر دیا ہے اور اس طرح اس ناول کے ماحول کو قنوطیت کے گہرے اتھاہ اور اندھیرے کنویں میں ڈوبنے سے بچا لیا ہے۔واقعات کی بُنت میں جا بجا ظرافت کے ایسے دھارے بہہ رہے ہیں کہ ہم جذبات کی دو متضاد کیفیات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے نقادوں نے اس طرف کم ہی توجہ کی ہے جس پر کسی قدر حیرت ضرور ہوتی ہے۔

میمونہ بیگم انصاری نے اپنے تنقیدی و تحقیقی مقالے میں پہلی بار امراؤ جان ادا میں طنز و مزاح کی چاشنی کی طرف اشارے کیے ہیں۔ان کے مطابق:

''ناول کے اندر سنسنی خیزی بھی ہے اور واقعات میں طنز و مزاح کی چاشنی بھی۔''

محترمہ نے یہ جملہ واقعات کے تنوع کے ضمن میں تحریر کیا ہے۔ ان کے مطابق ناول کے واقعات بعض دردناک اور بعض خوبصورت اور دلچسپ ہیں۔ یعنی واقعات کو حزنیہ (المیہ) اور طربیہ کے عنوانات کے تحت منقسم کیا جاسکتا ہے۔ اس کی تفصیلات آگے آئیں گی۔ نورالحسن نقوی نے ذرا وضاحت کے ساتھ ناول کی طربیہ خصوصیات پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

> ''ظرافت کی چاشنی بھی ناول میں جابجا موجود ہے۔ امراؤ جان سے رسؔوا کی نوک جھونک بعض جگہ بہت پر لطف ہو جاتی ہے۔ بعض کردار تو ایسے ہیں کہ ان کی صورت دیکھ کر ہی ہنسی آجاتی ہے۔ ظرافت نے اس ناول کو اور بھی پر لطف بنا دیا ہے۔''

اس اقتباس کا پہلا اور آخری جملہ ناول کی مجموعی خوبی کی طرف اشارے کر رہا ہے۔ نقوی کے مطابق ناول میں ظرافت کی چاشنی جا بجا موجود ہے اور اس کی وجہ سے ناول اور پُر لطف ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ناول یعنی امراؤ جان کی کہانی حزنیہ ہے۔ مگر مصنف نے اسے ایک ان دیکھے نشاطیہ آہنگ کے ساتھ سپردِ قلم کیا ہے۔ ان دیکھا اس لیے کہ جا بجا ظرافت کی چاشنی کے باوجود قاری امراؤ جان کی داستان میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ ناول کے ظریفانہ حصص پر اس کی توجہ مرکوز نہیں ہو پاتی اور اس طرح المیہ داستان گوئی میں طربیہ ماحول ضم ہو کر رہ جاتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ ٹریجڈی (المیہ، حزنیہ) اور کامیڈی (طربیہ) دراصل ڈرامے کی دو اہم اقسام ہیں۔ ارسطو نے اس پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ڈرامے کی ان دونوں اقسام کا اطلاق فکشن کی دیگر اصناف پر بھی کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ناول اور افسانے کے فنّی مباحث کے سلسلے میں ناقدین نے ڈرامے کی ان اصطلاحات پر بھی توجہ مرکوز کی ہے۔ ڈرامے کے ایک ممتاز ناقد عشرت رحمانی نے حزنیہ (المیہ) کی تین اقسام بیان کی ہیں۔ ان میں سے ایک کی تعریف وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں: ''جس میں حزن قصّے کا اصل جز و ضرور ہوتا ہے مگر سامعین کی خاطر یا تدبیر گری کے لحاظ سے شادمانی وطرب کا خفیف سا شائبہ شریک کر کے رنج و غم کی بارِ گراں کو کسی حد تک کم کر دیا جاتا ہے۔ مگر انجام غم ناک ہوتا ہے۔'' المیہ کی یہ تعریف ہمارے لیے مفیدِ مطلب ہے۔ امراؤ جان ادا کے قصّے کا اصل جز و حزن و ملال ہے۔ اس کی زندگی

المیاتی سلسلے کی ایک نہ ختم ہونے والی زیست سے عبارت ہے۔اس کی بدنصیبی اور زمانے کی اس کے تئیں بے قدری اس کی زندگی میں سکون و اطمینان نہیں آنے دیتی۔ سلسلۂ روز و شب کے نشیب و فراز اُسے سکون سے جینے نہیں دیتے اور انجام بھی دردناک ہی ہوتا ہے۔مگر ہمارے ناول نگار نے قصّے کی بُنت میں جا بجا ایسے نشاطیہ قصوں اور کرداروں کو شامل کیا ہے کہ قصّے کا حزن و ملال ناول کے ماحول پر حاوی نہیں ہونے پاتا۔ نیز کچھ اور دیگر خصوصیات جن میں مکالموں کی ندرت، لکھنوی زبان کے چٹخارے اور پُر کیف منظر نگاری نے بھی ناول کی فضا کو بوجھل ہونے سے بچالیا ہے۔ یہاں محض ظرافت پر توجہ مرکوز رکھنی ہے۔ آیئے ذرا تفصیل سے ناول کے ظریفانہ عناصر کی نشاندہی کریں۔

ناول امراؤ جان ادا کی ابتدا ایک مشاعرے کے تفصیلی بیان سے ہوتی ہے۔اس سے پہلے ہم جان چکے ہیں کہ امراؤ جان شاعرہ ہیں اور اہلِ نظر سے اپنے کلام پر داد و تحسین بھی حاصل کر چکی ہیں۔ مرزا رسؔوا کی شاعری کے چرچے بھی عام ہیں۔ بہرکیف کئی شعرا کی شعر گوئی کے بعد رسؔوا ایک نئے شاعر آغا صاحب سے غزل کی فرمائش کرتے ہیں۔آغا صاحب ایک طویل غزل پیش کرتے ہیں۔غزل کے تیور بتا رہے ہیں کہ ظریف شاعر ہیں۔ ہر شعر پر داد وصول کر رہے ہیں اور احباب بطورِ خاص رسؔوا اور امراؤ اشعار پر پُر لطف تبصرے بھی کرتے جا رہے ہیں۔کہیں کہیں تنقید بھی ہو رہی ہے۔مقطع کی قرأت کے بعد انکشاف ہوتا ہے کہ آغا صاحب قزاق تخلص رکھتے ہیں۔قزاق کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے اپنے استاد کے حوالے سے سرقے کا ذکر کرتے ہیں اور خود بھی اپنی شاعری میں ’سرقے‘ کے عمل دخل پر فخر کرتے ہیں۔ ناول کے ابتدائی صفحات میں مشاعرے کی یہ روداد ظرافت کی عمدہ مثال پیش کرتی ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

آغا صاحب: شعر سنیے:

ہمیں رشک آئے اپنے سے ہمیں سے غیر ہو پیدا
ہم ایسے دو نظر آئیں اگر معشوق احول ہو

احباب: آغا صاحب، سبحان اللہ! کیا نازک خیالی کی ہے۔

آغا صاحب: ابھی کم سن ہیں اُن کو شوق ہے لنگر لڑانے کا
تکلّا ڈور کا ہو اک نہ کنکیا نہ تکُّل ہو

اس شعر کا رُخ بھی نواب صاحب کی طرف تھا، اس لیے کہ آپ ہی کی سرکارِ عالی

جاہ سے کنکوے کی برات بڑی دھوم سے نکلی تھی۔

آغا صاحب: کوئی اُن سے کہے جو شعر معنی بند کہتے ہیں
کھلے کیا رازِ سربستہ جو دروازہ مقفّل ہو

رسوا: آغا صاحب کیا کہنا! امیراؤ جان، ذرا سنا کیا شعر کہا ہے۔

امراؤ جان: سبحان اللہ! میں پہلے ہی سمجھ گئی۔ جو چاہیں کہیں مالک ہیں۔

آغا صاحب: تو صاف کیوں نہیں کہتیں کہ دوزخ کا دربان ہوں۔ اچھا سنیے:
کسی صورت سے بہلا لیں گے اس معشوقِ کم سن کو
ڈبل پیسہ نہ ہو ریوڑی نہ ہو تو گول گپّل ہو

احباب: کیا کہنا۔

آغا صاحب: کبھی گالی سنا بیٹھے کبھی جوتا لگا بیٹھے
حکومت کا مزہ آئے اگر معشوق ارزل ہو

خاں صاحب: درست مگر آپ کی شرافت سے بعید ہے۔

آغا صاحب: جناب شریف کون ہے اس زمانے میں۔
خدا کے فضل سے اُترا تھا کیا ہی عرش سے جوڑا
نہ مجھ سا کوئی گرگا ہو، نہ تم سی کوئی شفتل ہو

نواب صاحب: خوب! مگر روئے سخن کس کی طرف ہے؟

آغا صاحب: یہ تو آپ ہی خوب سمجھ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ آپ محرمِ راز ہیں۔ السر عند کرام الناس مکتوم۔

خاں صاحب: آپ جواب دیجیے۔

آغا صاحب: آپ کیا جواب دیں گے۔ یہ شعر سنیے۔
ہم اس نازک ادا کی شوخیوں پر جان دیتے ہیں
شتر کے جس میں غمزے ہوں فرس کی جس میں چھل بل ہو

احباب: واہ ری ہمت۔

آغا صاحب: اچھا نہ سہی۔ یہ سنیے۔

میں دل کو چیر ڈالوں گا جو تم پہلو سے اُٹھ جاؤ
میں آنکھیں پھوڑ ڈالوں گا جو تم آنکھوں سے اوجھل ہو

احباب: خوب۔

آغا صاحب: تمھاری سادگی میں کچھ عجب عالم نکلتا ہے
نہ چوٹی ہو نہ کنگھی ہو، نہ مسّی ہو نہ کاجل ہو

امراؤ جان: اوئی! تو کیا دن رات سر جھاڑ منھ پہاڑ بیٹھا رہے۔

آغا صاحب: سادگی کا یہی مزہ ہے اور دوسرے خرچ کی بھی کفایت ہے۔

اس مذاق میں لطف یہ ہے کہ امراؤ جان کسی قدر خسیس مشہور تھیں۔

ٹکا ہم سے وہ جب مانگیں انہیں چپکے سے ہم دے دیں
نہ بک بک ہو نہ جھک جھک ہو نہ کچ کچ ہو نہ کل کل ہو

احباب: کیا مصرع کہا ہے!

خاں صاحب: اوپر کا مصرع بھی خوب لگایا۔ وہی ارزل کی رعایت چلی آتی ہے۔

امراؤ جان ہنستے ہنستے لوٹی جاتی تھیں۔

آغا صاحب: اچھا! تو اب ایسے شعر نہ پڑھیں، ہمارا معشوق ذلیل ہوا جاتا ہے۔ نازک خیالی سنیے۔

تری نازک کمر کے باب میں چھلک بنا دیں گے
وہ کیا سمجھے یہ باریکی طبیعت جس کی گھٹّل ہو

خاں صاحب: میں تسلیم کیے لیتا ہوں کہ میری طبیعت ایسی ہے جیسی آپ ارشاد فرماتے ہیں مگر برائے خدا اس چھلک کے معنی سمجھا دیجیے۔

آغا صاحب: خیر خاطر ہے سن لیجیے۔ محاسب لوگ خانہ پُری کے بجائے ندارد کے یہ نشان (x) بنا دیا کرتے ہیں۔ اس لیے اس سے یہ مطلب نکلا کہ کمر معدوم ہے، دوسرے ایک خط نے بیچوں بیچ سے دوسرے کو کاٹ دیا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوا کہ معشوق کی کمر کٹی ہوئی ہے اور پھر جڑی ہوئی بھی ہے۔

خاں صاحب: یہ کیوں کر؟

آغا صاحب: اب اس باریکی کو نہ پوچھیے۔ خیر حضرت واضح ہو کہ چہلک علمِ ریاضی میں علامت جمع کی ہے۔ لطف یہ ہے کہ علامت کی کوئی مقدار نہیں ہوتی مطلب یہ نکلا کہ کمر باوجود معدوم ہونے کے جسم کے دونوں حصوں کو جوڑے ہوئے ہے۔

احباب: حضرت! بس نازک خیالی کی حد ہوگئی۔ جو کوئی اتنے علم جانتا ہو وہ آپ کے شعر سمجھے۔

آغا صاحب: اسی سے تو میں ایسے ویسوں کے سامنے پڑھتا نہیں۔ افسوس استاد مرحوم زندہ نہ ہوئے، نہیں تو اِن شعروں کی کچھ داد ملتی۔ اب سمجھنے والوں میں کون رہ گیا ہے۔ خیر اب مقطع سن لیجیے۔ طبیعت کو کلفت ہوگئی۔ کوئی قدردان نہیں ہے۔

بس اے قزّاق بس! طبعِ قیامت خیز کو روکو

غضب ہو جائے گا فوجِ مضامیں میں جو ہلچل ہو

احباب: مقطع پھر عنایت ہو۔ (آغا صاحب نے دوبارہ پڑھا۔)

نواب صاحب: کیا زبردست تخلص رکھا ہے قزّاق۔

آغا صاحب: معاف فرمایئے گا، ہے تو کچھ ایسا ہی مگر کچھ نازیبا نہیں ہے۔ ایک تو خاندانی اعتبار سے اس لیے کہ فدوی کے آباؤ اجداد دشتِ قفچاق میں لوٹ مار کیا کرتے تھے، دوسرے اس سبب سے کہ استادِ مرحوم سارق تخلص فرماتے تھے اور یہ کچھ ایسا نامناسب نہ تھا اس لیے کہ (اُن کی روح شرمندہ نہ ہو۔) عمر بھر اگلے شاعروں کے مضمون چرا چرا کے شعر موزوں فرمایا کیے۔ سارا دیوان ملاحظہ کر لیجیے۔ شاید ہی کوئی شعر نیا ہو۔ جب اشہبِ خامہ کی لگام میرے دستِ اقتدار میں آئی تو میں نے سرقہ کو اپنی شان کے منافی سمجھ کے قزّاق تخلص رکھ لیا۔ کچھ نہ سہی اس میں ایک طرح کا بانکپن تو ہے۔ بندہ کا یہ دستور رہا ہے کہ شعرائے ماضی و حال کے مضامین زبردستی چھین چھین کے اپنے قبضۂ تصرّف میں کرلوں گا۔

اقتباس قدرے طویل ہے۔ مگر اس میں کئی امور غور طلب ہیں۔ سب سے پہلے آغا صاحب کی غزل مکالموں کو منہا کر کے پڑھنے کی کوشش کریں تو ہمیں یہ غزل 'مزاحیہ' کے زمرے میں رکھنی پڑتی

ہے۔بطورِخاص نفسِ مضمون اور قافیوں کی ندرت نے اس غزل کے بیشتر اشعار کو ''ظریفانہ'' کے زمرے میں داخل کر دیا ہے۔ دوئم احباب کے ذو معنی تبصروں اور مضحکہ خیزیوں نے اس اقتباس کے مجموعی تاثر کو شگفتہ بنا دیا ہے۔

سوئم محبوب کی نازک کمر کے تعلق سے بیان کئے گئے شعر کی وضاحتیں بھی قابلِ داد ہیں اور اس کی تفصیلات میں مزاح کا عنصر شامل ہے۔لفظِ 'چھلک' کی وضاحت کرتے تو آغا صاحب ہیں مگر علمِ ریاضی میں مہارت رسؔوا رکھتے ہیں۔ظاہر ہے کہ مصنف کی حیثیت سے یہ حصّہ رسؔوا کی علمیت کا بیّن ثبوت ہے اور آخر میں آغا صاحب کی قزاؔق کی وجہ تسمیہ جس کا ذکر ابتدا میں کیا گیا، نیز آغا صاحب کے استاد سارؔق اور ان کی اشعار کی چوری کی عادت نے بھی اس حصّے کی مضحکہ خیزی میں اضافہ کیا ہے۔ یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مندرجہ بالا اقتباس اصل قصّے سے قبل کا ہے۔مگر چونکہ اس میں قصّے کے سب سے اہم دو کردار بذاتِ خود یہاں موجود ہیں یعنی مرزا رسوا اور 'امراؤ جان ادا' چنانچہ اس کی اہمیت مسلّم ہے۔

ہم نے نورالحسن نقوی صاحب کا جو اقتباس ابتداً نقل کیا ہے اس میں یہ جملہ بھی غور طلب ہے کہ امراؤ جان سے رسؔوا کی نوک جھونک بعض جگہ بہت پُر لطف ہو جاتی ہے۔ایسی پُر لطف ملاقاتوں کے درمیان ہی بقول مصنف امراؤ نے اپنی کہانی رسؔوا کو سنائی تھی اور رسؔوا نے ان ملاقاتوں کو قصّے میں شامل کر کے ناول کو حقیقت سے قریب تر کر دیا ہے۔اس لیے بعض لوگوں کو امراؤ جان کے حقیقی ہونے کا شبہ گزرتا ہے۔خیر تو ان ملاقاتوں میں رسؔوا اور امراؤ جان کے درمیان کی بے تکلّف دوستی، راہ و رسم میں بے تکلّفی اور خوشگواری، مکالموں کی شگفتگی اور برجستگی نیز اشعار کی پیوندکاری نے خاص اہمیت حاصل کر لی ہے۔ان میں سے اکثر ملاقاتیں لطیف مزاح کا عنصر رکھتی ہیں۔ یہاں ایک منظر پیش کیا جاتا ہے۔امراؤ اور رسؔوا کی نشست ہے۔ ذکر گوہر مرزا کا ہو رہا ہے۔ جسے حقّے کی لت لگی ہوئی ہے۔اس کا تذکرہ امراؤ کرتی ہیں۔جس پر رسؔوا بات کو آگے بڑھاتے ہوئے افیون کا ذکر کرتے ہیں۔امراؤ بیماری کا ذکر کرتے ہوئے حکیم صاحب کے حکم کے مطابق افیون پینے کا تذکرہ کرتی ہیں۔افیون سے بات آگے بڑھتی ہے۔ یہاں سے مکالمہ ملاحظہ فرمائیں:

رسوا: اور وہ چیز نزلے کی روکنے والی۔

امراؤ: اب اس کا ذکر نہ کیجیے۔

رسوا: کیا تائب ہوگئیں۔

امراؤ: مدت سے۔

رسوا: واقعی کمبخت کیا بری چیز ہے۔اپنا تو یہ حال ہے ؎

بعد توبہ کے بھی ہے دل میں یہ حسرت باقی
دے کے قسمیں کوئی اک جام پلا دے ہم کو

امراؤ: ہائے کیا شعر کہا ہے، مرزا صاحب! قسمیں دلانے کو تو میں موجود ہوں پینے نہ پینے کا آپ کو اختیار ہے۔

رسوا: آپ بھی شغل کیجیے گا۔

امراؤ: توبہ!

رسوا: توبہ!

ابر بھی ہے ہوا بھی، باد بھی ہے
پھر وہ یادش بخیر یاد بھی ہے

امراؤ: لے بس اب طبیعت کو روکیے۔ جمائیاں آنے لگیں۔للّٰلہ اس ذکر کو جانے دیجیے۔

رسوا: جانے دیجیے۔

امراؤ: مذاق سے بھی معاف رکھیے۔

اب نہ ہم منھ لگائیں گے اُس کو
یاد آئی تو خیر یاد آئی

رسوا: واللہ! امراؤ جان کیا شعر کہا ہے؟

امراؤ: تسلیم!

دیکھ کر مشہدِ ادا ان کو
لالہ و گل کی سیر یاد آئی

رسوا: ماشاءاللہ طبیعت زوروں پر ہے۔ کیوں نہ ہو عالمِ شباب کے ذکر کی یہ تاثیر ہے۔

امراؤ: جی نہیں، شراب کے ذکر کی یہ تاثیر ہے۔

زاہدو آج ہم کو پھر وہ شے
جس سے ہے تم کو بیر، یاد آئی

رسوا: اہاہاہا۔ کیا قافیہ نکالا ہے اور کہا بھی خوب۔

کعبہ سے پھر کے ہم ہوئے گمراہ
پھر وہی راہِ دَیر یاد آئی

امراؤ: اے کیا کہنا یہ ''کعبہ سے پھر کے'' کیا خوب کہا ہے:
مرزا صاحب اسے مطلع نہ کر دیجیے۔

پھر کے کعبہ سے سیر یاد آئی
پھر وہی راہِ دَیر یاد آئی

رسوا: خاصہ۔

امراؤ: روشِ وحش و طیر یاد آئی
دشتِ وحشت کی سیر یاد آئی

رسوا: یہ بھی مطلع برا نہیں ہے۔

امراؤ: یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہم کو بنت العنب سے شکوہ ہے
کیوں ہمیں اُس بغیر یاد آئی

رسوا: میں تو کہتا ہوں کہ طبیعت آج جودت پر ہے۔ اچھا یہ شعر سن لیجیے اور پھر اپنا قصہ دُہرانا شروع کیجیے۔

ہوا بھی، ابر بھی، گلزار بھی، شراب بھی ہو
یہ سب بھی ہو مگر اگلا سا وہ شباب بھی ہو

امراؤ: واہ مرزا صاحب! آپ نے تو دل کو مُردہ کر دیا۔ خیر آمدم بر سرِ مطلب۔

رسؔوا اور امراؤ جان کے مابین اس نوع کے شگفتہ مکالمے ناول میں جگہ جگہ موجود ہیں اور ناول

کے حزنیہ ماحول کوایک نوع کی شگفتگی عطا کرتے ہیں۔ایسے اقتباسات میں اشعار کی کثرت طبیعت پر بارِ گراں نہیں بنتی کہ ہم جانتے ہیں کہ دونوں شاعر ہیں اوراشعاران کی نوکِ زبان پر ہیں۔اقتباس کا آخری مکالمہ قصّے کی لڑی کو جوڑتا ہے۔یعنی یہ مکالمہ جملہ معترضہ(اقتباسِ معترضہ کہنا زیادہ درست ہوگا یا مکالمۂ معترضہ بھی کہہ سکتے ہیں) کی حیثیت رکھتا ہے۔

ناول میں بسم اللہ جان کا کردار ماحول کوخوشگوار بناتا رہتا ہے۔نوچیوں میں اس کی خاص حیثیت ہے۔اس کے کئی عشاق ہیں جوسماج کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ان میں ایک نواب صاحب اورایک ان کے مصاحب حسنو بھی ہیں۔حسنو نے مکروفریب سے نواب کی دولت پر قبضہ کرلیا ہے۔چنانچہ پہلے چوری چھپے آتے تھے اب بانگ دہل آگئے ہیں۔بسم اللہ ان کے حالات سے پوری طرح واقف ہیں۔ایسی ہی ایک محفل میں حسنو اور بسم اللہ کے درمیان مکالمہ،بسم اللہ کی قاتلانہ شرارت، حسنو کی کم عقلی اور بے وقوفی کی بدولت طنز ومزاح کے حربوں سے مزین ہوگیا ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

حسنو: دیکھو بسم اللہ جان! نواب سے تو اَب کوئی اُمید نہ رکھو، میں جو کچھ کہو وہ دے دیا کروں۔غریب آدمی ہوں زیادہ تو میری اوقات نہیں۔جونواب صاحب دیتے تھے اس کا نصف بھی ممکن نہیں مگر ہاں کسی نہ کسی طرح آپ کوخوش رکھوں گا۔

بسم اللہ: غریب آدمی ہو، یہ نہیں کہتے کہ نواب کی دولت کاٹ کے گھر میں بھرلی اور پھر ہم سے غریبی بیان ہوتی ہے۔ایسے غریبوں کوتاؤ تو نومن چربی سے کم نہ نکلے۔

حسنو: ہیں۔ہیں تم توایسا نہ کہو وہ نواب کے پاس تھا ہی کیا جو میں گھر بھرلیتا۔کیا میری والدہ صاحبہ کے پاس کچھ کم تھا۔

بسم اللہ: آپ کی والدہ صاحبہ بوافرخندہ نواب سرفراز محل کی خاصہ والیوں میں تھیں نہ؟

حسنو: (جھینپ کر) وہ جو کوئی ہوں جب مری ہیں تو کوئی چار ہزار کا زیور چھوڑ کے مری ہیں۔

بسم اللہ: وہ آپ کی بیوی کے یار کے ساتھ نکل گئیں۔آپ کے پلّے کیا پڑا؟ میرے آگے ذرا شیخی نہ بگھاریے، مجھے رتی رتی آپ کا حال معلوم ہے۔

حسنو: توکیا والد کے پاس کچھ کم تھا۔

بسم اللہ: والد آپ کے نواب حسن علی خاں کے چڑی ماروں میں تھے۔

حسنو: چڑی ماروں میں؟

بسم اللہ: اچھا وہ مرغ بازوں میں سہی۔

حسنو: مرغ بازوں میں تھے؟

بسم اللہ: اچھا وہ بٹیر باز سہی۔ تھا تو چڑی مار کا کام۔

حسنو: لیجیے آپ تو مذاق کرتی ہیں۔

بسم اللہ: میں کھری کہتی ہوں اسی سے بُری مشہور ہوں اور کہتی بھی نہ تمھارے چھچھورے پن پر جی جل گیا۔ یوں تم آتے تھے۔ میں نے کبھی منع نہیں کیا۔ آج ہی تو نواب پر یہ واردات گزری، آج ہی آپ نے میرے منھ در منھ نوکری کا پیغام دیا۔ ہوش کی دوا کرو۔ تم کیا نوکر رکھو گے یہی نہ ایک مہینہ دو مہینہ تین مہینے سہی۔

حسنو: چھ مہینے کی تنخواہ جمع کر دوں؟

بسم اللہ: زبان سے۔

حسنو: یہ لو۔ (سونے کے جڑاؤ کڑے کمر سے نکال کے) تمہارے نزدیک کتنے کا مال ہوگا؟

بسم اللہ: میں دیکھوں (کڑے حسنو کے ہاتھ سے لے کر اپنے ہاتھوں میں پہن لیے) کل چھنا مل کے لڑکے کو دکھاؤں گی مگر بنے اچھے ہیں۔ اچھا آپ تشریف لے جایئے۔ اس وقت تو مجھے چھٹن باجی نے بلا بھیجا ہے ٹھہر نہیں سکتی۔ کل اسی وقت آیئے گا۔

حسنو: تو کڑے اُتار دیجیے۔

بسم اللہ: یا اللہ! کوئی چوروں سے بہوار ہے۔ میں تمہارے کڑے کچھ کھا نہ لوں گی۔ اس وقت میرے ہاتھ میں سادی ٹپریاں پڑی ہوئی ہیں۔ امّاں جان سے چھپ کے جاتی ہوں۔ ان سے کڑے مانگوں گی تو کہیں گی کیا کرو گی۔ اس لیے ذرا ہاتھ میں ڈال لیے صبح کو لے جانا۔

حسنو: کڑے دے دیجیے میرے نہیں ہیں۔ نہیں تو کیا بات تھی تم پر سے صدقے کیے تھے۔

بسم اللہ: تو کیا آپ کی اماں کے ہیں۔ انھوں نے انتقال کیا پھر بھی آپ کا مال نہیں۔

حسنو: میں نے یوں ہی تمھیں دکھائے تھے، میرا مال نہیں۔

بسم اللہ: جیسے میں پہچانتی نہیں، یہ وہی کپڑے ہیں جو نواب نے اس دن میرے سامنے گروی کو دیے تھے۔

حسنو: لو اور سنو، یہ کب؟

بسم اللہ: یہ جب کہ جس دن بہن امراؤ کے مجرے کی فرمائش ہوئی تھی۔ بہن امراؤ نے ضد کی کہ پورے سولوں گی۔ نواب کے پاس خرچ نہ تھا۔ میرے سامنے صندوقچے سے نکال کے کپڑے پھینک دیے تھے (پھر میری طرف مخاطب ہو کے دیکھا) بہن امراؤ یہ وہی کپڑے ہیں نہ؟

میں: مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔ کیا تم جھوٹ کہو گی۔

بسم اللہ: لے خشکا کھایئے۔ اب یہ کپڑے آپ کو نہ دیئے جائیں گے۔ نواب کے کپڑے ہیں۔ ہم نے پہچانے اب ہم نہ دیں گے۔

حسنو: لو اچھی کہی اور وہ روپے جو ہم نے دیے ہیں؟

بسم اللہ: روپے تم کہاں سے لائے وہ بھی نواب کا مال تھا۔

حسنو: جی سچ۔ مہاجن سے بیازونہ (سودی) لا کے دیے تھے۔

بسم اللہ: اچھا تو مہاجن کو بھیج دیجیے۔ ہم اس کو روپے دے دیں گے آپ ٹہلیے۔

حسنو: کپڑے تو میں لے جاؤں گا۔

بسم اللہ: میں تو نہ دوں گی۔

حسنو: تو کچھ زبردستی ہے۔

بسم اللہ: جی ہاں! زبردستی ہے۔ لے اب چپکے سے کھسک جایئے نہیں تو۔۔۔۔

حسنو: اچھا تو رہنے دیجیے، کل ہی دے دیجیے گا۔

بسم اللہ: کل دیکھا جائے گا۔

دیکھا جائے گا۔ بسم اللہ نے اس تیور سے کہا کہ میاں حسنو کو چپکے سے اُٹھ کے چلے جانا ہی پڑا۔ یہ اقتباس جہاں ایک طرف بسم اللہ جان کے کردار کی شوخیوں کی طرف اشارے کرتا ہے

وہیں کم عقل حسنو کے کردار پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔مکروفریب دونوں کے ہی کردار کا جزو ہے۔بسم اللہ جان فریب سے وہ کڑے حاصل کر لیتی ہے جو کبھی نواب صاحب نے گروی رکھنے کے لیے حسنو کو دیئے تھے۔ بسم اللہ اور حسنو کے مکالمے میں بسم اللہ جس طرح اس کے خاندانی پس منظر پر فقرے کستی ہے اور حسنو جس طرح اس کی صفائی پیش کرتا ہے وہ سارے مکالمے کو شگفتہ بنانے میں معاون ہوتا ہے۔ نیز سونے کے کڑوں کو چشم زدن میں ہڑپ لینے میں بسم اللہ جان کے کردار کی تیزی وطراری بھی سامنے آتی ہے۔مجموعی اعتبار سے یہ اقتباس دو کرداروں کی تحلیل نفسی بھی کرتا ہے اور ظرافت ایک زیریں لہر کی طرح اس کے باطن میں موجود ہے۔

ناول میں بسم اللہ جان کا کردار شوخی وشرارت اور طنز ومزاح سے پُر ہے۔وہ اپنے مداحوں کو خوب خوب ستاتی ہے۔ان کے ایثار ومحبت کا مذاق اُڑاتی ہے۔اُن کی عشقیہ بے چارگی سے کھیلتی ہے۔ انھیں اپنے دام میں رکھنے کے جتن کرتی ہے۔ چنانچہ جب جب امراؤ جان بسم اللہ جان کا تذکرہ کرتی ہے۔ناول کا ماحول بدل جاتا ہے۔اور حزنیہ سرگذشت کے درمیان ہلکے پھلکے مزاحیہ واقعات نہایت عمدگی اور بے ساختگی کے ساتھ کہانی میں آویزاں ہوجاتے ہیں۔ گذشتہ مثال میں بسم اللہ حسنو سے نواب صاحب کا بدلہ نہایت چالاکی بلکہ مکاری سے لے لیتی ہے۔یہ واقعہ اس دور کی معاشرتی زندگی کا عکاس بھی ہے کہ دورِ ابتلا میں طوائف کی بے بسی اور بے چارگی کا فائدہ ان کے مصائب کیسے اُٹھاتے ہیں۔مگر طوائف کی چشمِ بینا ان نزاکتوں سے کماحقہٗ واقف ہے کہ وہ بازار میں بیٹھی ہے اور معاشرے کے نشیب و فراز اور زمانے کی ستم ظریفیوں کا نزدیکی سے مشاہدہ کر رہی ہے۔بسم اللہ زمانے کے اُتار چڑھاؤ سے واقف ہے اور کس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔اس سے بھی واقف ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کڑے نواب صاحب کے حوالے بھی نہیں کرتی۔

ناول کے مشہور مناظر میں ایک منظر مولوی صاحب کے پیڑ پر چڑھ جانے کا ہے۔ ہمارے نقادوں نے کردار نگاری کے ضمن میں اس کا تذکرہ بطورِ خاص کیا ہے۔مگر اس کے مضحک پہلو پر زیادہ توجہ مبذول نہیں کی۔ یہ واقعہ بھی اپنے دامن میں ظرافت کی چاشنی رکھتا ہے۔ پہلے یہ منظر ملاحظہ فرمائیں۔منظر سے پہلے مولوی صاحب کا خاکہ (خدوخال) امراؤ کی زبانی سنتے چلیے:

''بسم اللہ جان کو عشق بازی میں بڑا ملکہ تھا۔انسان تو انسان فرشتہ ان کے جعل سے

نہیں نکل سکتا تھا۔ ہزاروں ان کے عاشق تھے اور وہ ہزاروں پر عاشق تھیں۔ سچے عاشقوں میں ایک مولوی صاحب قبلہ کا بھی چہرہ تھا۔ ایسے ویسے مولوی نہ تھے۔ عربی کی اونچی اونچی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ دور دور سے لوگ ان سے پڑھنے آتے تھے۔ معقولات میں ان کا مثل ونظیر نہ تھا۔ جس زمانے کا میں ذکر کرتی ہوں سِن شریف ستّر سے کچھ ہی کم ہوگا، نورانی چہرہ، سفید ڈاڑھی، سر منڈا ہوا، اس پر عمامہ، عبائے شریف، عصائے مبارک، ان کی صورت دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آپ ایک چھٹی ہوئی شوخ نوجوان رنڈی پر عاشق ہیں اور اس طرح عاشق ہیں۔''

مولوی صاحب کے اس مختصر تعارف میں ان کی مذہبی اور علمی قابلیت کے ساتھ ساتھ اُن کی عمر کی طرف بھی واضح اشارے کیے گئے ہیں۔ ان کی ظاہری وضع قطع کے بموجب ان کا ایک شوخ نوجوان رنڈی پر عاشق ہو جانا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ مگر طوائفوں کے کوٹھوں پر ایسے عجیب وغریب معاملات پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ یاد کریں، بوا حسینی کے ایک عاشق زار مولوی جو ہمیشہ کے لیے کوٹھے پر ہی مقیم ہو گئے تھے اور ہر طرح دونوں ایک دوسرے کا خیال کرتے تھے۔ خیر ذکر ہے بسم اللہ جان کے ایک عمر رسیدہ عاشق زار کا۔ چنانچہ اصل واقعے کی طرف رجوع کرتے ہیں جو بہ زبانِ امراؤ بیان ہوا ہے:

''ایک دن قریب شام صحن میں تختوں کے چوکے پر گاو سے لگی بیٹھی ہیں۔ میر صاحب مرحوم ان کے قریب تشریف رکھتے ہیں۔ مولوی صاحب قبلہ دوزانو بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس وقت ان کی بے کسی کی صورت مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ زیتون کی تسبیح، چپکے چپکے (شاید) یاحفیظُ یاحفیظُ پڑھ رہے ہیں۔ میں جوگئی تو بسم اللہ نے ہاتھ پکڑ کے مجھے برابر بٹھالیا۔ میں میر صاحب اور مولوی صاحب کو تسلیم کر کے بیٹھ گئی۔ بسم اللہ نے چپکے سے میرے کان میں کہا۔ تماشہ دیکھوں گی؟

میں: (حیران ہوکر) کیا تماشہ؟

بسم اللہ: دیکھو! یہ کہہ کے مولوی صاحب کی طرف متوجہ ہوئیں۔

مکان کے صحن میں ایک بہت پرانا نیم کا درخت تھا۔ مولوی صاحب کو حکم ہوا اس درخت پر چڑھ جاؤ۔

مولوی صاحب کے منھ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں، تھرتھر کانپنے لگے۔ میں زمین پر گری پڑی جاتی تھی۔ میر صاحب منھ پھیر کے بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب بے چارے کبھی آسمان کو دیکھتے تھے، کبھی بسم اللہ کی صورت کو۔ وہاں ایک حکم کرکے دوسرا حکم پہنچا اور فوراً تیسرا نادری حکم ''چڑھ جاؤ کہتی ہوں۔''

اب میں نے دیکھا کہ مولوی صاحب بسم اللہ کہہ کے اُٹھے۔ عبائے شریف کو تختوں کے چوکے پر چھوڑا۔ نیم کی جڑ کے پاس کھڑے ہوئے، پھر ایک مرتبہ بسم اللہ کی طرف دیکھا۔ اس نے اک ذرا چیں بچیں ہو کے کہا: ''ہوں۔''

مولوی صاحب پائیجامہ چڑھا کے درخت پر چڑھنے لگے۔ تھوڑی دور جا کر بسم اللہ کی طرف دیکھا۔ اس دیکھنے کا شاید یہ مطلب تھا کہ بس یا اور؟

بسم اللہ: اور۔

مولوی صاحب اور چڑھے۔ پھر حکم کا انتظار کیا۔ پھر وہی اور، اسی طرح درخت کی پھننگ کے پاس پہنچ گئے۔ اب اگر اور اوپر جاتے تو شاخیں اس قدر پتلی تھیں کہ ضرور ہی گر پڑتے اور جان بحق تسلیم ہو جاتے۔ بسم اللہ کی زبان سے اور نکلنے کو ہی تھا کہ میں قدموں پر گر پڑی۔ میر صاحب نے نہایت منّت کے ساتھ سفارش کی۔ بارے حکم ہوا اُتر آؤ۔ مولوی صاحب چڑھنے کو تو چڑھ گئے مگر اُترنے میں بڑی دقت ہوئی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب گرے اور جب گرے، مگر بخیر و عافیت اُتر آئے۔ بے چارے پسینے پسینے ہو گئے۔ دم پھول گیا۔ قریب تھا کہ گر پڑیں مگر اپنے کو سنبھال کے نعلین پہن کے تخت کے قریب آئے۔ عبائے مبارک زیب دوش کیا۔ چپکے بیٹھ گئے، تسبیح پڑھنے لگے۔ بیٹھ تو گئے مگر کسی پہلو قرار نہ تھا۔ چیونٹے ازار شریف میں گھس گئے تھے۔ اس سے بہت پریشان تھے۔

رسوا: بھئی واللہ بسم اللہ بھی عجب دل لگی باز رنڈی تھی۔

یہ پُر از مزاح واقعہ جہاں ایک طرف بسم اللہ کی فطری شرارتوں کا عکاس ہے وہیں ایک عمر رسیدہ بزرگ کی مضحکہ خیز صورتِ حال پر بھی روشنی ڈال رہا ہے کہ ایک رنڈی کے کہنے پر مولوی صاحب پیڑ کی پھننگ تک پہنچ گئے۔ بسم اللہ جان مزاجاً شوخ ہیں اور اپنے عشاق کو انگلیوں پر نچانے کا ہنر اچھی طرح جانتی ہیں بلکہ اس طرح کی باتوں میں حظ محسوس کرتی ہے۔ ایک طرف امراؤ جان ہے جو یہ قصہ بیان کر رہی ہیں اور مولوی صاحب کے پیڑ سے گر جانے کے خوف سے بے چین ہے بلکہ بسم اللہ سے منت سماجت

بھی کرتی ہے۔ دوسری طرف ستّر سال کے باشرع بزرگ ہیں جو اپنی محبوب (رنڈی ہی سہی) کے حکم پر آمنا وصدقنا کہتے ہیں اور عمر کا خیال نہ کرتے ہوئے درخت پر چڑھ جاتے ہیں۔ یہاں بطورِ جملہ معترضہ عرض ہے کہ اس فعل کو عشق کی کرشمہ سازیوں کے پس منظر میں سمجھنا چاہیے۔ یوں بھی ناول میں عشق کے عجب عجب پہلو اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ جس میں خانم اور جان کے عشاق امراؤ اور گوہر مرزا، امراؤ اور نواب سلطان، امراؤ اور ڈاکو فیض علی اور بوا حسینی اور مولوی صاحب اور بسم اللہ جان اور مولوی صاحب کے مابین عشقیہ معاملے ایک عمدہ مطالعے کا موضوع بن سکتے ہیں۔ جسے 'ناول امراؤ جان ادا میں 'عشق کی نیرنگیاں' کے عنوان سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ نقادوں نے ان رشتوں پر بھرپور اظہارِ خیال کیا ہے مگر ایک الگ نظر سے اسے دیکھنے کی ضرورت اب بھی موجود ہے۔

امراؤ جان نے مذکورہ بالا قصے کی ابتداء جس شعر سے کی ہے وہ آنے والے واقعے کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے اور امتحانِ وفا کی کارستانیوں اور زار و ناتواں، عاشق کی مضحکہ خیز صورتِ حال کی طرف اشارے کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے ؎

کچھ ان کو امتحانِ وفا سے غرض نہ تھی
اک زار و ناتواں کو ستانے سے کام تھا

اس شگفتہ اور نشاطیہ واقعہ پر مرزا رسوا کا تبصرہ جو دراصل بسم اللہ جان کے فطرت سے متعلق ہے، خوب ہے۔ یعنی ''عجب دل لگی باز رنڈی'' کہہ کر مرزا رسوؔا بسم اللہ کی شرارتوں اور فطرت پر طنز کرتے ہیں۔

آخر میں ایک اور قابلِ ذکر واقعہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب امراؤ لکھنؤ سے فیض علی کے ساتھ نکلی تھی اور راناؤ کے راستے کانپور جانے کا ارادہ تھا۔ واقعات کے اچانک پے در پے وقوع پذیر ہونے کے سبب جس میں فیض علی کے غائب ہو جانے اور پھر گرفتار ہو جانے کے پس منظر میں امراؤ جان یک و تنہا ایک مسجد میں پناہ گزیں ہوتی ہے اور وہاں ایک مولوی صاحب سے ملاقات ہوتی ہے۔ دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہے اس میں امراؤ کی بے باکی، ہوشیاری اور دور اندیشی کے ساتھ ساتھ اس کی حسِ مزاح کارفرما نظر آتی ہے۔ وہ اپنی پیشہ وارانہ اداؤں سے مولوی صاحب پر حاوی ہونے کی کوشش کرتی ہے اور مولوی صاحب اس کے مکر و فریب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بقول امراؤ ''میں مولوی صاحب کو خوب جھنجھوڑیاں دیتی رہی۔'' جھنجھوڑی کے معنی یوں تو جھنجھوڑنے کے ہیں مگر یہاں مراد

زچ کرنے کے ہیں۔یعنی مولوی صاحب کو ستاتی رہی۔اب مکالمے کی قرأت کرلیں:

''ایک پتلی سی گلی ملی۔اس گلی میں ایک مسجد تھی۔میں نے دل میں خیال کیا کہ سب سے بہتر خدا کا گھر ہے۔تھوڑی دیر یہیں جا کے ٹھہرنا چاہیے۔دروازہ کھلا ہوا تھا۔میں درّانہ اندر چلی گئی۔یہاں ایک مولوی صاحب سے سامنا ہوا۔کالے سے تھے۔سر منڈا ہوا تھا۔ایک نیلی تہمد باندھے ہوئے دھوپ میں ٹہل رہے تھے۔پہلے تو شاید سمجھے میں طاق بھرنے آئی ہوں بہت ہی خوش ہوئے۔جب میں جا کے چپکے سے صحن کے کنارے پاؤں لٹکا کے بیٹھ گئی تو قریب آ کے پوچھنے لگے، کیوں بی صاحب آپ کا یہاں کیا کام ہے؟

میں: مسافر ہوں۔خدا کا گھر سمجھ کے تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ گئی ہوں۔اگر آپ کو ناگوار ہو تو ابھی چلی جاؤں۔

مولوی صاحب اگرچہ بہت ہی بے تکے تھے مگر میری لگاوٹ اور دل فریب تقریر نے جادو کا اثر کیا۔بھلا جواَب کیا منھ سے نکلتا ہکّا بکّا اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔میں سمجھ گئی کہ دامِ فریب میں آ گئے۔

مولوی: (تھوڑی دیر کے بعد بہت سنبھل کے) اچھا تو آپ کا کہاں سے آنا ہوا؟

میں: جی کہیں سے آنا ہوا مگر بالفعل تو یہیں ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔

مولوی: (بہت ہی گھبرا کے) مسجد میں؟

میں: جی نہیں بلکہ آپ کے حجرے میں۔

مولوی: لاحول ولاقوۃ۔

میں: اوئی۔مولوی صاحب مجھے تو آپ کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا۔

مولوی: جی ہاں۔تو میں اکیلا رہتا ہوں، اسی سے تو میں نے کہا مسجد میں آپ کا کیا کام ہے؟

میں: یہ کیا۔۔۔خاصیت ہے کہ جہاں آپ رہیں وہاں دوسرا نہیں رہ سکتا۔مسجد میں ہمارا کچھ کام نہیں۔یہ خوب کہی۔آپ کا کیا کام ہے؟

مولوی: میں تو لڑکے پڑھاتا ہوں۔

میں :   میں آپ کو سبق دوں گی۔

مولوی: لاحول ولاقوۃ۔

میں :   لاحول ولاقوۃ۔ یہ آپ ہر دفعہ لاحول کیوں پڑھتے ہیں۔ یہ کیا شیطان آپ کے پیچھے پھرتا ہے؟

مولوی: شیطان آدمی کا دشمن ہے،اس سے ہر وقت ڈرنا چاہیے۔

میں :   خدا سے ڈرنا چاہیے موے شیطان سے کیا ڈرنا اور یہ کیا آپ نے کہا آدمی ہیں؟

مولوی: (ذرا بگڑ کے) جی ہاں اور کون ہوں؟

میں :   مجھے تو آپ جن معلوم ہوتے ہیں۔ اکیلے اس مسجد میں رہتے ہیں آپ کا دل بھی نہیں گھبراتا ہے؟

مولوی: پھر کیا کریں؟ ہمیں تو اکیلے کی عادت ہے۔

میں :   اُس سے تو آپ کے چہرے پر وحشت برستی ہے۔ وہ آپ نے نہیں سنا۔ ع

تنہا منشیں کہ نیم دیوانگی است

مولوی: اجی وہ کچھ سہی، جس حال میں ہم ہیں خوش ہیں۔ آپ اپنا مطلب کہیے۔

میں :   مطلب تو کتاب دیکھنے سے حل ہوگا، بالفعل زبانی مباحثہ ہے۔

مولوی: چہ خوش۔

میں :   چرا نہ باشد۔

یہاں امراؤ جان کی دور اندیشی اور حسِ مزاح ایک غیر معمولی صورتِ حال میں کارگر ثابت ہوتی ہے۔ یعنی ایک تو مسجد اس میں صرف ایک مولوی صاحب کی ذاتِ شریف اس پر امراؤ جان کا غیر معمولی صورتِ حال کا شکار ہونا یہ تمام کیفیات کسی بھی خاتون کے لیے ڈر، خوف اور مایوسی میں مبتلا ہونے کے لیے بہت ہیں مگر امراؤ جان اس ظریفانہ مکالمے کی بدولت خود کو ان حالات سے بحسن وخوبی نکال لیتی ہے۔ یہاں رسؔوا نے نہایت چابکدستی کے ساتھ امراؤ جان کے کردار کی بعض خوبیوں کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ مولوی صاحب سے گفتگو کے دوران فارسی وعربی کے فقروں کی ادائیگی کے پس منظر میں امراؤ جان اپنی شخصیت و علمیت کا رعب ڈالنے میں کامیاب ہوجاتی ہیں۔ یہ پورا منظر امراؤ جان کی پرکاری کی عمدہ مثال ہے۔

غرض یہ ہیں وہ چند مثالیں جن کے تجزیے سے ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ مرزا ہادی رسؔوا نے چند کرداروں اور چند مناظر کے ذریعے ناول کو ایک شگفتہ آہنگ عطا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ امراؤ جان ادا کی قدرے مایوس، یاس انگیز اور قنوطی کہانی میں یہ مزاحیہ حصص کہانی کو بوجھل ہونے سے بچا لیتے ہیں۔ المیہ میں طربیہ کی یہ شمولیت فنکار کی کامیابی کی ضامن ہے۔ موضوع کی سنجیدگی کے درمیان یہ خوشگوار واقعات اکثر کرداوں کی تحلیل نفسی میں بھی معاون ہوتے ہیں۔ جو ناول نگار کی حیثیت سے مرزا محمد ہادی رسؔوا کے مقام کو بلند تر کر دیتے ہیں۔

❒ **Dr. Mazhar Ahmed**
Associate Professor
Zakir Hussain Delhi College (Evening)
University of Delhi, New Delhi
Mobile: 9212089910
Email: mazhar.talat@gmail.com

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:226-248
Dr. Zubair Shadab Khan, Aazmaish, Taiyun-e-Qadr aur Sawalsazi ke Buniyadi Tasauwarat

زبیر شاداب خان

آزمائش، تعینِ قدر اور سوال سازی کے بنیادی تصورات

تدریس آموزش اور تعین قدر باہم منحصر سرگرمیاں ہیں ان میں سے کسی ایک کا فقدان باقی دوسری سرگرمیوں پر منفی اثر مرتب کرتا ہے۔ باوجود اس کے عملی طور پر جو اہمیت پہلی دو سرگرمیوں یعنی تدریس اور آموزش کو دی جاتی ہے وہ تیسری سرگرمی یعنی تعین قدر کو نہیں حاصل ہے جب کہ یہ تدریسی عمل، تحصیلِ تعلیم یا معلومات کی شرح اور اس کی خوبیوں کے مقدار و معیار کے تعین کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ مذکورہ تینوں سرگرمیوں کو معتدل طریقے سے عمل میں لانے کے لیے منصوبہ بند نظامِ تعلیم کی ضرورت ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ کسی بھی کام کو سلیقے سے کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ: کیا کرنا ہے؟ یعنی اس کا موضوع اور مواد کیا ہے؟ کیوں کرنا ہے؟ یعنی اس کے اغراض کیا ہیں؟ کیسے کرنا ہے؟ یعنی اس کا طریقۂ کار کیا ہوگا؟۔ چونکہ سرِ دست تعلیم و تعلم کے مسائل و معاملات کا محاسبہ کیا جا رہا ہے لہٰذا یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس کے اغراض کیا ہیں؟ اغراض کے لحاظ سے ہی مواد تیار کیا جاتا ہے اور مواد کے حساب سے طریقۂ کار استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے اغراض، مواد اور طریقۂ کار کے تصور سے واقف ہونا لازمی ہے۔

اغراض (Purposes)

آزمائش کے میدان میں اغراض سے مراد کسی شے کے وجود میں آنے یا وقوع پذیر ہونے کی وجہ ہے۔ یہ اصطلاح مدعا (Goals) منازلِ مقصود (Aims) اور مقاصد (Objectives) کے مترادف کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہے۔ تعلیم کے میدان، بالخصوص تدریسِ زبان اور زبان کی آزمائش میں مدعا، منازلِ مقصود اور مقاصد (Goals, Aims & Objectives) کے درمیان فرق

کیا جاتا ہے۔ مدعا (Goals) ایک وسیع اور بنیادی درجے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔منازلِ مقصود (Aims) مخصوص نشانے اور مقاصد (Specific Targets and Objectives) آموزگار کے رویہ جاتی ماحصل کی طرف اشارہ کرتے ہیں، لیکن اغراض (Purposes) ایسی اصطلاح ہے جو آزمائش کے ضمن میں مذکورہ تمام اصطلاحوں کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ اصطلاح ہمیں، ''کیوں تعین قدر کرنا ہے یعنی "Why to Evaluate" کا جواب مہیا کراتی ہے۔دوسرے لفظوں میں اس سے مراد یہ لیا جا سکتا ہے کہ آزمائش کیوں لی جا رہی ہے؟؛ طلبہ یا آموزگار کے مَیلان کی تشخیص کر کے کسی کورس میں داخلہ دینے کے لیے یا طالب علم کسی جماعت یا کورس میں جو کچھ پڑھ یا سیکھ چکا ہے، اس کی جانچ کر کے یا اس کا امتحان لے کر سند عطا کرنے کے لیے یا پھر کسی ملازمت کی نوعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مناسب ترین ملازم کا انتخاب کرنے کے لیے۔

مواد (Contents)

تدریس اور آزمائش میں 'مواد' کا استعمال مختلف معنوں میں ہوتا ہے۔تدریس کے تعلق سے عام مفروضہ یہ ہے کہ جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ مواد ہے اور آزمائش کے لیے وہی مواد آلہ ہے، کہ اسی کے ذریعے یہ طے کیا جاتا ہے کہ آموزگار نے کس حد تک جاننے یا سیکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ لہٰذا تدریس کے لیے فرض کیا گیا مواد آزمائش کا بھی مواد ہوگا۔ یاد رہے کہ ثانوی زبان کی تدریس میں ساخت اور مادری زبان کی تدریس میں مفہوم اہم مواد کا درجہ رکھتے ہیں۔ادب میں عملی موزونیت پر اور تعلیم میں شخصیت کی خوبیوں پر زور دیا جاتا ہے۔اس طرح سے مواد کی اصطلاح وسیع مفہوم کی حامل ہے۔اس کے تین اہم عناصر میں مواد (Contents) ایک اہم عنصر ہے جو تعین قدر کے نظریے کو تشکیل دیتا ہے۔تعین قدر کے دوسرے اہم عناصر، طریقہ ہائے کار (Methods) اور اغراض (Porposes) ہیں۔گویا مواد کا واضح مفہوم ''کس مضمون / موضوع کا تعین قدر کرنا ہے'' یعنی What to Evaluate سے ظاہر ہوتا ہے۔

طریقہ ہائے کار (Methods)

کسی کام کو منصوبہ بند طریقے سے تکمیل تک پہنچانے کے ذرائع یا عمل کو طریقۂ کار کہا جاتا ہے۔ یہ کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اختیار کیے گئے عمل یا منصوبے سے متعلق ہوتا ہے۔طریقہ ہائے

کار تفصیلی، منطقی اور منظّم منصوبے پر مبنی ہوتے ہیں۔

یہ اصطلاح آزمائش کے میدان میں اس عمل کی جانب اشارہ کرتا ہے جو متعینہ، مستحکم، منطقی اور باضابطہ منصوبے پر مبنی ہو۔ ذرائع، تکنیک، عمل وغیرہ اس تصور کے لیے مترادفات کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ یہ دراصل ''کیسے تعین قدر کرنا ہے'' یعنی How to Evaluate کا جواب ہے۔

تعین قدر کے اغراض (Purposes of Evaluation)

تعینِ قدر کے چھے غرض وغایت متعین کیے گئے ہیں۔

1. **تشخیص** (Diagnosis) اس کے ذریعے آموزش کی خامیوں کو نشان زد کیا جانا نیز اکتساب کی کمزوریوں کی شناخت کرنا ہے تاکہ ان کو ختم کیا جاسکے۔
2. **نگرانی** (Monitoring) اس کے ذریعے تدریس کے کارگر ہونے کا معاملہ طے ہوتا ہے۔ گویا تدریس وآموزش کی نگرانی کے لیے تعین قدر کی جاتی ہے۔
3. **رہنمائی** (Guidance) اس کے تحت طلبہ کو صلاح دی جاتی ہے کہ وہ مزید مطالعے کے لیے موافق موضوع رکورس اور پیشے کا انتخاب کرے۔
4. **پیش گوئی** (Prediction) یہ طلبہ کی ممکنہ لیاقت اور اہلیت کا قیاس لگاتی ہے۔ یعنی اس سے طالبِ علم کی امکانی صلاحیتوں، رویّوں اور رجحانات کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔
5. **انتخاب** (Selection) کسی گروپ، ادارے یا منصب کے لیے متعلقہ افراد کا انتخاب کیا جاتا ہے۔
6. **درجہ بندی** (Grading) کے ذریعے کسی طالب علم یا ملازم کو کسی مخصوص گروپ میں شامل کیا جاتا ہے۔ درجہ بندی کی بنیاد طلبہ کی اہلیت اور اس کی کارکردگی یا اندازِ پیش کش ہے۔

اغراض کے یہ چھے نکات باہم مربوط اور ایک دوسرے پر منحصر ہوتے ہیں لہٰذا انھیں نہ تو جدا کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی الگ کر کے سمجھا جاسکتا ہے۔ ان میں سے چند ایک مشاہداتی اور چند ایک غیر مشاہداتی ہیں۔ جب زبان جانچ کی بات آتی ہے تو ان کی ترتیب بدل جاتی ہے اور سیاق کے لحاظ سے ان اصطلاحات میں بھی کسی حد تک تبدیلی کرنی پڑتی ہے لیکن مجموعی طور پر زبان جانچ اور تعین قدر کے لیے بھی مذکورہ غرض وغایت یا مقاصد ہی مستعمل ہیں۔

جب ہم مذکورہ مواد، طریقہ ہائے کار اور اغراض پر ایک ساتھ نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندستان میں آزمائش کے شعبے کو جدید ترین طریقوں سے واقفیت حاصل کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ جہاں تک مواد کا سوال ہے، اس کا براہِ راست تعلق ہمارے نصابِ تعلیم (Curriculum) سے ہے اور یہ ہمارے نصاب (Syllabus) میں پہلے ہی متعین ہوتا ہے گویا کوئی ممتحن یا استاد اس میں چاہ کر بھی کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا ہے۔ اسی طرح 'اغراض و مقاصد بھی پہلے سے طے ہیں ان میں تبدیلی کرنا اس قدر ضروری بھی نہیں ہے لیکن ایک ممتحن کے دائرۂ کار میں یہ ضرور ہے کہ وہ تعین قدر کے طریقوں میں مناسب تبدیلی کرسکتا ہے تا کہ اس پورے عمل کو زیادہ کارگر، قابلِ یقین، معروضی اور سائنسی بنا سکے۔ لیکن یہ تبھی ممکن ہو سکے گا جب تعلیم کے اغراض و مقاصد یعنی شخصیت سازی اور شخصیت کے ہمہ جہت فروغ سے متعلق حلقوں/دائروں (Domains) اور ان کے ذیلی اجزا سے واقفیت ہو۔

تعلیمی طریقیات (Educational Taxonomies) میں تعلیمی مقاصد کی تکمیل کے لیے شخصیت کو تین زمروں میں مندرج کیا گیا ہے:

(i) ادراکی یا تفہیمی حلقہ (Cognative Domain)

(ii) جذباتی حلقہ (Affective Domain)

(iii) نفسی حرکی حلقہ (Psychomotor Domain)

تفہیمی حلقے کا تعلق ہماری فکر اور ہمارے تخیل سے ہے۔ جذباتی یا موثراتی حلقہ شخصیت کے جذباتی پہلو سے سروکار رکھتا ہے اور نفسی حرکی حلقہ ہمارے عملی مظاہرے سے متعلق ہے۔ درج ذیل میں تینوں حلقوں کے ذیلی اجزا پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تفہیمی حلقہ Cognative Domain

1. علم/معلومات (Knowledge)
2. تفہیم (Comprehension)
3. اطلاق (Application)
4. تجزیہ (Analysis)
5. ترکیب (Synthesis)

6. تعینِ قدر (Evaluation)

تفہیمی حلقے کے مذکورہ چھے ذیلی اجزا میں پہلے دو کو بنیادی لیاقت کے دائرے میں رکھا جاتا ہے اور آخری تین بلند ترین لیاقتیں ہیں۔

جذباتی حلقہ Affective Domain

1. موصولیت(Receiving)
2. ردِعمل (Responding)
3. قدرشناسی (Valuing)
4. تنظیم (Organisation)
5. کردارسازی بذریعہ قدر (Characterisation)

نفسی حرکی حلقہ Psychomotor Domain

1. نقل/ تقلید(Imitation)
2. کاردستی (Manipulation)
3. اجمال (Precision)
4. سلیقۂ تنظیم (Articulation)
5. فطرت کاری (Naturalization)

اس حلقے کے پہلے جزو یعنی نقل یا تقلید کو بنیادی لیاقت تسلیم کیا جاتا ہے۔فطرت کاری اس حلقے کا نقطہ انتہا ہے۔کاردستی، اجمال اور سلیقۂ تنظیم کو بالترتیب بلند، بلندتر اور بلند ترین لیاقتیں تصور کیا جاتا ہے۔

مذکورہ سولہ ذیلی اجزا کی اجمالی تعریف پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔کیوں کہ انہیں لیاقتوں کی جانچ یا آزمائش وتعین قدر کرنا اصل مدعا ہے کیوں کہ آموزگار/طالب علم کی شخصیت میں ان کا فروغ پانا ہی حصول تعلیم کی منزل مقصود ہے۔ ان کی جانچ کے لیے سوال نمونے (Question Items)اس طرح تیار کیے جائیں کہ شخصیت اور رویّے کے ان اجزا کی مجموعی جانچ ممکن ہوسکے۔اس کے لیے ہرایک جزو کی تعریف کے ساتھ اس کے چند فعلی فقرے دیے جارہے ہیں جو اس جزو کے داخلی

عوامل کو ظاہر کرتے ہیں۔ سوالوں میں ان فعلی فقروں کا استعمال کر کے ہم آموز گار کی شخصیت میں موجود عوامل کے کسی مخصوص جزو کی معیار و مقدار کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

1. علم / معلومات (Knowledge): فلسفے میں 'علم' کا دائرہ بہت وسیع اور معنی بہت بلیغ ہیں۔ یہاں علم کی حدیں 'کشف' سے جا ملتی ہیں لیکن تعلیم کے میدان میں اس سے مراد کسی تصور کی معلومات سے ہے جو علم کی بنیادی یا شروعاتی سطح ہے اور اس کا براہِ راست تعلق آموز گار کے قوتِ حافظہ سے ہے۔ اس کا دائرۂ کار نئے تصورات، افکار اور معلومات سے واقفیت اور ضرورت پڑنے پر ان کی بازیابی ہے۔ اس کی پرکھ کے لیے فعلی طریقہ یعنی 'واضح کیجیے'، 'پہچانیے'، 'نشان زد کیجیے'، 'بتایئے' وغیرہ ہیں جو علم یا معلومات کے اجزاء و عوامل کو ظاہر کرتے ہیں۔ سوالوں میں ان فعلی ترکیبوں کا استعمال کر کے آموز گار یا طالب علم کی معلومات کو جانچا جا سکتا ہے۔

2. تفہیم (Comprehension): یہ سمجھنے کی وہ قوت ہے جو اس حلقے کی دیگر قوتوں کے فروغ کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہے۔ تعلیم کی لغت کے مطابق تفہیم کا مطلب کسی متن یا مواد کے معنوی تہداری اور اس میں مضمر تصورات کو سمجھنا ہے۔ جب کہ معلومات یا علم وہ قوت ہے جس کے ذریعے ہم کسی سبق کا پورا مطلب سمجھے بغیر بھی اس کی قرأت یا اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی قاری یا طالب علم کسی تخلیق کو شروع سے آخر تک زبانی یاد کر لیتا ہے اور اسے بغیر دیکھے سنا سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو متعلقہ تخلیق کی معلومات ہے اور اگر معنی کی مختلف صورتوں کو بتانے میں بھی کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس نے اس تخلیق کی تفہیم بھی کر لی۔ مثلاً اقبال کی نظم 'جبریل و ابلیس' کو زبانی یاد کر لینا معلومات کا حصہ ہے لیکن اس کے تاریخی، تلمیحی، علامتی اور سیاقی معنی کے ساتھ ساتھ اقبال کے تصورِ تحرک و عمل تک رسائی حاصل کر لینا تفہیم کے دائرے میں آتا ہے۔ آموز گار کی تفہیمی لیاقت معلوم کرنے کے لیے سوالات میں درج ذیل نوعیت کے فقرے استعمال ہوتے ہیں:

اپنے لفظوں میں بیان کیجیے، ترجمانی کیجیے، تشریح کیجیے، واضح کیجیے، تقابل کیجیے، امتیاز کیجیے، محاکمہ کیجیے، ترجمہ کیجیے وغیرہ۔

3. اطلاق (Application): یہ کسی اصول یا نظریے کو زندگی میں برتنے کا عمل ہے۔ مثلاً نظم 'جبریل و ابلیس' کے فکری اور مستحسن پہلو یعنی تحرک کے نظریے پر عمل پیرا ہونا۔ استعمال کریں، مکمل

کریں، تطبیق کریں، لاگو کریں جیسے فقروں کا استعمال کر کے ہم کسی سوال کے ذریعے آموز گار کی اس قوت یا وصف کو جانچتے ہیں۔ مثال کے طور پر (زبان و ادب کے شعبے میں) کسی تخلیق میں کردار کی داخلی کیفیت اور قدرتی مناظر کی تصور کشی کے درمیان تعلق قائم کرنا۔ قواعد کی بنیاد پر کسی تحریر کی خامیوں کو اجاگر کرنا، شعری یا نثری اقتباس کے الفاظ کو ان کے مخرج کے لحاظ سے جمع کرنا اور دیے گئے اشارے کی بنیاد پر نظم، افسانہ یا مضمون لکھنا۔

4. تجزیہ (Analysis): یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے کسی مسئلے میں مضمر عوامل کا حل تلاش کرنے کے مقصد سے انھیں الگ الگ کرتے ہیں۔ مثلاً 'جبریل و ابلیس' کے کردار کی متاثر کرنے والی خوبیوں اور خامیوں کا تجزیہ کرنا یا اپنے اوپر اطلاق کیے گئے عوامل کا تجزیہ کر کے مناسب و نامناسب کے مابین فیصلہ کرنا۔ واضح کریں، نتیجہ اخذ کریں، امتیاز کریں وغیرہ ایسے فعلی فقرے ہیں جن سے مزین سوالوں کے استعمال سے ہم آموز گاروں کی تجزیاتی قوت کی جانچ کر سکتے ہیں۔

5. ترکیب (Synthesis): اس تصور کے ذریعے ہم منتشر اطلاعات کوئی ہیئت میں پیش کرنے یا نیا نتیجہ اخذ کرنے کے مقصد سے جمع کرتے ہیں۔ خوبیاں ظاہر کیجیے، مفصل تحریر کیجیے، بالترتیب واضح کیجیے، جیسے فقرے استعمال کر کے سوالات بنائے جاتے ہیں تاکہ امتحان دہندہ کی ترکیبی لیاقت کو جانچا جا سکے۔

6. تعینِ قدر (Evaluation): اسے بنجامن بلوم اور دوسرے ماہرینِ تعلیم نے کسی شخص کی معلوماتی یا علمی سطحوں کے چھے مراتب میں سب سے بلند مرتبہ سطح تسلیم کیا ہے۔ اس کو کسی فکر، عمل، اصول، نظریے کی چیز یا انسان کے متعلق مناسب فیصلہ لینے کا طریقۂ کار بتایا گیا ہے۔ استدلال پیش کریں، محاکمہ کریں، موازنہ کریں، جائزہ لیں، امتیاز کریں، تقابل کریں جیسے فقرے استعمال کر کے سوال بنائے جاتے ہیں تاکہ امتحان دہندہ یا کسی بھی شخص کی قوتِ تعینِ قدر کی جانچ کی جا سکے۔

موثراتی حلقہ (Affective Domain)

1. موصولیت (Receving): اس سے مراد طالب علم کے اس احساس سے ہے جس کے ذریعے وہ اطاعات، فکر، ہنر، خیال یا کسی مسئلے کو اپنی مرضی سے منتخب کرتا ہے۔ فرق بتائیے، یکسانیت کی نشاندہی کیجیے، انتخاب کیجیے، الگ الگ کیجیے جیسے فقروں کا سوالوں میں استعمال کر کے اس کی قوتِ

موصولیت کی جانچ کی جاسکتی ہے۔

1. ردِعمل (Responding): یہ صحیح وقت پر مناسب طریقے سے فوری ردِعمل یا فوراً جواب دینے کی قوت ہے۔تقلید کریں، اتفاق کریں، اظہار کریں جیسے فقروں کو سوال کا حصہ بنا کر کسی فرد کی اس قوت کو جانچا جاسکتا ہے۔

2. قدر شناسی (Valuing): یہ کسی ٹھوس چیز یا خیال کے باقدر پہلوؤں کے محاکے کا طریقۂ کار ہے دلیل پیش کریں، موافق یا مخالف خیال کا اظہار کریں، جیسے فقروں کا استعمال کر کے سوالات بنائے جاتے ہیں تا کہ امتحان دہندہ کی قوتِ قدر شناسی جانچی جاسکے۔

تنظیم کاری (Organising): یہ ایسا وصف ہے جس کے ذریعے کسی شخص، چیز، گروہ یا فکر کو واضح طریقے سے منطقی انداز میں منظّم کیا جاتا ہے۔ اگر تعریف، تنظیم، تقابل، وضاحت اور محاکمہ وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کر کے سوالات تشکیل کیے جاتے ہیں تو اس وصف کی جانچ کی جاسکتی ہے۔

3. کردار سازی بذریعہ اقدار (Charecterising through Values): یہ شخصیت کے موثراتی حلقے کی پانچ سطحوں میں سب سے بلند سطح ہے۔ دورانِ تدریس پیش کردہ اقدارِ زندگی جب طالب علم کی شخصیت یا کردار کے جزوِ لازم بن جاتی ہیں تو اسے شخصیت سازی یا کردار سازی کہتے ہیں، گویا طالبِ علم ان اقدار کو نہ صرف یہ کہ اپنی شخصیت میں تحلیل کر لیتا ہے بلکہ دانستہ اور غیر دانستہ طور پر ان کا اطلاق بھی کرنے لگتا ہے۔ طالبِ علم نے اپنے کردار میں کن اقدار کو اخذ کیا ہے اس کی جانچ کے لیے درج ذیل فعلی فقروں کی مدد سے سوالات بنا سکتے ہیں:

مکمل کریں، ترمیم کریں، تبدیل کریں، حل بتائیں وغیرہ۔

نفسی حرکی حلقہ (Psychomotor Domain)

1. نقل رتقلید (Imitation): نقل یا تقلید ایسا عمل یا ایسی خوبی ہے جس کے ذریعے کوئی شخص کسی دوسرے کے رویّے یا طرز وغیرہ کو دہرایا کرتا ہے۔ آموزشی عمل میں اس کی بنیادی اہمیت ہے۔ بچہ یا آموز گار سب سے پہلے نقل و تقلید کے ذریعے ہی بولنا اور بات کرنا سیکھتا ہے۔ اس لیے ماہرین تعلیم نے اسے بالکل بنیادی سطح کی تقلید تصور کیا ہے۔ تقلید کریں، نقل کریں، دہرائیں، کوشش کریں، دوبارہ کریں جیسے ہدایتی افعال کے ذریعے قوتِ نقل و تقلید کے تعین قدر کرنے والے سوالات تیار کیے جاتے ہیں۔

2. کاردستی (Manipulation): ایسا رویہ یا برتاؤ ہے جس کے تحت ہدایات کی تعمیل کرنے اور پیش کرنے جیسے افعال کو منتخب کر کے اپنی روش کا حصہ بنانا نیز ان کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ بازتعمیر، بازتخلیق، اطلاق کریں، تطبیق کریں وغیرہ جیسے افعال کے استعمال سے سوال تشکیل کر کے اس قوت کی جانچ کی جاتی ہے۔

3. اجمال (Precision): اس سے مراد آزمائش وتعین قدر کے میدان میں یہ ہے کہ آموز گار اپنی حرکات وسکنات پر قابو رکھے اور تناسب واعتدال سے کام لے ساتھ ہی ضرورت پڑنے پر ان میں تبدیلی پیدا کر کے اپنی اجمالی قوت میں ترمیم واضافہ اور بہتری پیدا کرنے کے اوصاف کو ظاہر کرے۔ روشنی ڈالیں، مکمل کریں، واضح کریں، بروئے کار لائیں، مختصر کریں، مفصل کریں یا سوالات میں تکمیل ووضاحت اور اختصار وتفصیل جیسی اصطلاح کا حسبِ ہدایت استعمال کر کے آموزگار اپنی قوتِ اجمال کو ظاہر کرتا ہے۔

4. سلیقۂ تنظیم (Aritculation): اس سے مراد کسی کام کی تنظیمی صلاحیت سے ہے جس میں اتحاد ویکجہتی ہو۔ سلیقۂ تنظیم ہمیں مناسب وقت پر اعتدال کے ساتھ کام کرنا سکھاتا ہے۔ بتائیں، حل کریں، جوڑیں، ملائیں، یکجا کریں، موافق بنائیں، تشکیل کریں وغیرہ جیسے فعلی فقروں کی مدد سے بنائے گئے سوالات کے ذریعے اس صلاحیت کی جانچ کی جاسکتی ہے۔

5. فطرت کاری (Naturalisation): مذکورہ قوتوں یا صلاحیتوں سے مکمل طور پر مزین ہونے کے بعد فطرت کاری کا عمل دخل شروع ہوتا ہے۔ فطرت کاری کی صلاحیت پیدا ہوجانے کے بعد مذکورہ تمام صلاحیتوں کا صحیح طریقے سے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ فطرت کاری کی صلاحیت پیدا ہونے کے بعد یہ تمام صلاحیتیں یا خوبیاں انسان کی روزمرہ کی زندگی کا فطری حصہ بن جاتی ہیں۔ مخصوص تفصیل دیں، منظّم کریں، انعقاد کریں، صورت گری کریں وغیرہ فعلی فقروں کا استعمال کر کے بنائے گئے سوالوں سے اس صلاحیت کی جانچ کی جاسکتی ہے۔

کسی بھی موضوع پر غور وفکر کرتے وقت اُس کی تین صورتیں سامنے آتی ہیں۔ اس موضوع کا فلسفیانہ پس منظر، اس کے بنیادی اصول اور اس کے عملی طریقۂ کار۔ اس مضمون کی تکمیل ہم آزمائش وتعین قدر کے چند عملی اصولوں کی تعبیر وتشریح سے کرتے ہیں جن کو اپنانا مدرس یا امتحان کنندہ کے اپنے بس کی بات ہے۔ جانچ کی دنیا کا ایک عمومی اصول ہے کہ 'جو پڑھایا جائے اس کی جانچ کی جائے'۔ اس اصول کو

آنکھ بند کر کے قبول کر لینے کی وجہ سے ہی آج ہمارے تعلیمی امتحان کا نظام محض سبق یا نصاب پر منحصر طریقہ امتحان بن کر رہ گیا ہے لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ ہم جو کچھ پڑھاتے ہیں اس کی جانچ تو بہرصورت کریں ہی اس کے ساتھ ساتھ تعلیم و تعلم کے نتیجے میں طالب علم کی شخصیت میں کن استعداد اور عملی اوصاف کا فروغ ہوا ہے اس کی بھی جانچ اور تعین قدر کی جائے، بلکہ یہ بھی جاننے کی کوشش کی جائے کہ وہ لیاقتیں، استعداد اور عملی رویّے ہمارے عہد اور معاشرے کی ضرورتوں یعنی 'یقین محکم عمل پیہم' جدید طرزِ فکر و عمل، تخلیقیت یا پیداواریت (Productivity) یہاں تک کہ روحانیت کی تکمیل و تعمیل میں کس حد تک معاون ہیں۔

تدریسِ زبان کے شعبے کا نہایت نرم دلی سے محاکمہ کرنے پر یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ تعلیمی مقاصد کے سولہ اہم نکات میں سے بہ مشکل تین یا چار نکتوں یعنی علم یا معلومات، تفہیم، اطلاق اور تجزیے کی جانچ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اس امر کا قدرے سختی سے محاکمہ کرنے والے ماہرین کا کہنا ہے کہ تعلیمی مقاصد یا مہارت کے سولہ نکات میں سے صرف ڈیڑھ نکتوں کی ہی جانچ ہو پاتی ہے یعنی علم یا معلومات، اور کسی حد تک تفہیم جانچ کے دائرے میں آتی ہیں حالانکہ مذکورہ سولہ نکات یا مہارتوں کا اطلاق تدریس زبان ہی کیا سبھی مضامین و موضوعات پر ہوتا ہے۔ یعنی سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا تدریس زبان کی چار بنیادی مہارتیں ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ہمارا موجودہ تعلیمی نظام اور نظام امتحان ان چار بنیادی مہارتوں میں صرف ایک مہارت یعنی لکھنے کی مہارت پر مرکوز ہے باقی کی تین مہارتیں جانچ کے دائرے سے بڑی حد تک باہر ہیں۔

اگر سوالوں کو سائنسی نقطۂ نظر سے تیار کر کے جدید ذرائع ابلاغ کا سہارا لیتے ہوئے آزمائشیں تشکیل کی جائیں تو ان مہارتوں کو بھی جانچا جا سکتا ہے جو اب تک جانچ کے دائرے سے باہر ہیں۔ اس کے لیے تحریری امتحانات کے روایتی انداز میں ترمیم کرتے ہوئے امتحان لینے یا جانچ کرنے کے سمعی و بصری (Audio-visual) طریقوں کو بھی اپنانا اور مقبول کرنا ہوگا۔ سوالات کی تشکیل اور پیش کش کچھ اس انداز سے کرنی ہوگی کہ ایک ہی سوال سے ایک آخذی مہارت اور ایک پیداواری قوت کی شناخت ایک ساتھ ہو سکے۔ یہ عمل ایک تیر سے دو شکار کرنا یا ایک پنتھ دو کاج کے مترادف ہوگا۔ مثلاً املا آزمائش، آموزگار یا امتحان دہندہ کے سننے اور لکھنے کی مہارتوں کی ایک ساتھ جانچ کرتی ہے۔ اسی طریقے سے 'بلند

خوانی کی آزمائش' میں قرأت اور تلفظ کی جانچ ایک ساتھ کی جاسکتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ انتظامی امور میں دشواری پیدا ہونے سے سالانہ امتحانات میں ان طریقۂ کار کا استعمال کرنا ممکن نہ ہو، لیکن یومیہ، سہ روزہ، ہفتہ وار، ماہانہ، سہ ماہی اور شش ماہی امتحانات کے دوران ان کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ طلبا کے لیے دلچسپ بھی ہوگا اور معلومات افزا بھی، تعلیمی منصوبہ کار (Policy Maker) چاہیں تو سالانہ امتحانات میں بھی ان کی شمولیت کرسکتے ہیں جیسے سائنس کے مضامین میں عملی امتحان/جانچ، (Practical Test) کا انتظام ہوتا ہے ویسے ہی 'آزمائشِ زبان' کے شعبے میں بھی ان مہارتوں کی جانچ کے لیے 'مخصوص امتحانات' کا انتظام کیا جاسکتا ہے تاکہ طالب علم کی معلومات اور تفہیمی صلاحیت کی ہی نہیں بلکہ اس کی دیگر مہارتوں اور زندگی کی حقیقی صورتِ حال میں ان کے اطلاق کی قوتوں کی بھی آزمائش اور تعین قدر کیا جاسکے۔ یہ طریقۂ آزمائش آموزگار یا طالب علم کی شخصیت کے ہمہ جہت فروغ میں معاون ہوگا۔

یہ بات عرض کی جاچکی ہے کہ جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس کی جانچ یا آزمائش کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا آزمائش، امتحان، جائزہ، پیمائش اور تعین قدر کے تصورات اور سوالات کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے انھیں مفصل طریقے سے پیش کیا جارہا ہے۔

آزمائش (Test)

آزمائش، رویہ جاتی اوصاف اور بنیادی صلاحیتوں اور دوسری خوبیوں کو جانچنے کا ایک عمل یا آلہ ہے۔ آزمائش قبل از وقت اعلان کے مطابق اور نصاب کے کسی خاص حصہ پر مبنی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی بھی جماعت میں باضابطہ تدریسی عمل کو پرکھنے کے لیے عموماً ہفتہ وار یا پندرہ روزہ جو جانچ کی جاتی ہے اسے آزمائش کہتے ہیں۔ مقاصد کے لحاظ سے آزمائش کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مثلاً مَیلان آزمائش (Aptitude Test) تحصیل آزمائش (Achievement Test) مہارت آزمائش (Proficiency Test)۔

1. مَیلان آزمائش (Aptitude Test) کسی کورس میں داخلہ دینے کے لیے لی جاتی ہے۔ اس کا مقصد کسی طالب علم کی قدرتی صلاحیت اور اس کے فطری مَیلان کی جانچ کرنا ہے۔ نیز یہ بھی دیکھنا ہے کہ متعلقہ آموزگار یا طالب علم مستقبل میں کس موضوع، مضمون یا پیشے میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کرسکتا ہے۔ اس آزمائش میں درج ذیل نکات پر نظر رکھنی چاہیے۔

(I) استدلالی صلاحیت (Reasoning Ability) کے تحت مشاہدہ، تشخیص، کمیتی اور کیفیتی تجزیہ، تقابل، تعلق اور نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیتوں کی جانچ کرنی چاہیے۔

(II) تجزیاتی صلاحیت (Analytical Ability) کی شناخت کے لیے، عمومی اجزا کی شناخت، ان میں باہم تعلق، عمومیت سے تخصیصیت کی جانب مراجعت، تنظیمی اصول اور تعبیر وتوضیح کی صلاحیتوں کو جانچنا چاہیے۔

(III) ترکیب کاری کی صلاحیت (Synthesizing Ability) کو پرکھنے کے لیے اشتقاق، تنظیم، نیٹ ورکنگ، پیش کش اور تخصیصیت سے عمومیت کی جانب رجوع کرنے کی صلاحیتوں پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔

(IV) زبانی یا غیر تحریری صلاحیت (Verbal Ability) کی جانچ کرتے وقت بولنے، سننے، پڑھنے، طائرانہ اور تیز فہمی اور لکھنے کی صلاحیت کے علاوہ تلخیص کاری کے ہنر کو نظر میں رکھنا چاہیے۔

(V) غیر زبانی یا اشارتی صلاحیت (Non Verbal Ability) میں جسمانی ادا اور تصویری پیش کش وغیرہ کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

(VI) تخلیقی صلاحیت (Creative Ability) کے تحت تخیل، ایجاد، نموکاری، تخصیص کاری، روشن پہلوؤں کی عکاسی، توسیع کاری اور تخلیقیت / پیداواریت جیسے اوصاف کی تشخیص و آزمائش کی جانی چاہیے۔

مذکورہ مراحل سے ایمانداری کے ساتھ گزرنے کے بعد ہی تشخیص کا حق ادا ہو پاتا ہے اور متعلقہ طالب علم کی صلاحیت اور اس کے ہنر کے بہتر استعمال کے لیے راستہ ہموار کیا جا سکتا ہے۔

2. تحصیل آزمائش (Achievement Test) سند کے لیے لی جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر کسی پرگرام، کورس یا نصاب کی روشنی میں جو کچھ بھی سیکھا یا مطالعہ کیا جاتا ہے اس کی جانچ تحصیل آزمائش کے ذریعے کی جاتی ہے۔ چونکہ تحصیلِ علم کا مقصد مطلوبہ سمت میں شخصیت کا ہمہ جہت فروغ ہے۔ لہٰذا اس آزمائش کا تعلق تفہیمی حلقہ یعنی سوچنے، موثراتی حلقہ، یعنی محسوس کرنے اور نفسی حرکی حلقہ، یعنی عمل کرنے سے ہوتا ہے۔

ان حلقوں کا تفصیلی محاکمہ کرنے والوں میں بنجامن بلوم، کراتھول، سمپسن اور ایچ آر دوے کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

3. روانی یا استعداد آزمائش (Proficiency Test) ملازمت کے لیے لی جاتی ہے۔ اس کا مقصد علم، تربیت اور مشق کی بنیاد پر کسی کام کو ماہرانہ طریقے سے کرنے کی صلاحیت کو جانچنا ہے۔ اس کا سروکار دراصل اس صلاحیت کو پرکھنے سے ہونا چاہیے جو آموزگار میں کسی کورس کو مکمل کرنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ زبان کی آموزش کے بعد جو روانی یا استعداد کی آزمائش لی جاتی ہے اس میں زبان کو سلیقے سے بولنے، بولنے یا لکھنے میں الفاظ کا صحیح استعمال کرنے، جملوں کی مناسب ساخت تشکیل کرنے، تحریر میں ترتیب کا خیال رکھنے، زبان کے ادبی، تہذیبی اور تخلیقی استعمال پر دسترس حاصل کرنے جیسی صلاحیتوں کو ملحوظ رکھنا ہوتا ہے۔

روانی یا استعداد آزمائش، تحصیل آزمائش سے اس لحاظ سے مختلف ہوتی ہے کہ اس میں تحصیل آزمائش کی طرح اس امر پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی کہ آموزگار کتنا علم رکھتا ہے بلکہ اس بات پر خصوصی توجہ مرکوز کی جاتی ہے کہ متعلقہ مضمون کی معلومات کے علاوہ اُس کا طریقۂ اظہار کتنا پُرکشش، رواں اور تہذیب یافتہ ہے۔ گویا ان امور پر توجہ مرکوز کی جانی چاہیے کہ کسی ملازمت کا امیدوار معلومات رکھنے کے علاوہ کتنا تربیت یافتہ اور تجربہ کار (Skilled and Experienced) ہے۔ اس جانچ میں یہ دیکھنا لازمی ہونا چاہیے کہ جس کام کے لیے ملازم کا انتخاب کیا جا رہا ہے اُس کام کو کرنے میں وہ کتنی مہارت رکھتا ہے۔ یعنی ملازمت کے لیے کی جانے والی آزمائشوں میں اس بات کی بڑی اہمیت ہونی چاہیے کہ امیدوار، متعلقہ شعبے/مضمون/موضوع میں علم و ہنر رکھنے کے علاوہ عرضِ ہنر کا سلیقہ رکھتا/رکھتی ہے کہ نہیں؟

تُم بتاتے تو سمجھتی تمھیں دنیا عرفان

فائدہ عرضِ ہُنر میں تھا، ہُنر میں کیا تھا؟ (عرفان صدیقی)

امتحان

امتحان ایک جامع اور بڑی حد تک مکمل جائزہ ہے جس کے تحت طلبہ کو ایسے سوالات کے پرچے کو حل کرنا ہوتا ہے جو اس کے نصاب سے تعلق رکھتے ہوں۔ یہ امتحان تحریری ہونے کے ساتھ مقررہ وقت میں حوالہ جاتی مواد یا دیگر ذرائع کو استعمال کیے بغیر دیا جاتا ہے۔ ایلن اور ڈیوس (Allen &

(Davis کے مطابق امتحان کی اصطلاح پیمائش کی وسیع صورت ہے جبکہ آزمائش کی اصطلاح کسی مخصوص حصے یا اکائی پر منحصر ہوتی ہے۔لہٰذا آزمائش، امتحان کی ایک قسم یا جز کی حیثیت رکھتی ہے۔

امتحان اور آزمائش میں ایک اہم فرق یہ بھی ہے کہ امتحان عام طور پر سند حاصل کرنے کے لیے تعلیمی پروگرام یا کورسیز کو پورا کرنے کے بعد منعقد کیا جاتا ہے۔ جب کہ آزمائش عام طور پر طلبہ کی صلاحیت کے تدریجی فروغ کو جانچنے کے لیے سہ ماہی، ماہانہ اور ہفتہ وار حتی کہ روزانہ بھی منعقد کی جاسکتی ہے۔کبھی کبھی ان اصطلاحوں میں متعینہ مدت کے اعتبار سے بھی فرق ہوتا ہے۔مثلاً امتحان کے لیے دو یا تین گھنٹے کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ جب کہ آزمائش ایک گھنٹہ یا آدھے گھنٹے پر مبنی ہوتی ہے۔

جائزہ

جائزے کا تعلق کسی بھی شخص کے کسی خاص کام یا تعلیمی کورس سے متعلق کارکردگی کے بارے میں فیصلۂ قدر سے ہے۔ یہ کسی بھی شخص، پروگرام یا کسی کارکردگی کے حوالے سے اطلاعات جمع کرنے، ان کی تشریح کرنے اور ممکنہ حد تک معروضی انداز میں معیاری فیصلہ لینے کا ایک تجزیاتی عمل ہے۔ جائزہ، پیمائش کے مقابلے زیادہ وسیع اصطلاح تصور کی جاتی ہے۔ جائزے کا استعمال مجرد تصورات کے لیے ہوتا ہے جب کہ پیمائش کا استعمال مادی اشیا کے لیے۔

پیمائش

پیمائش کسی جماعت کے ہر فرد یا کسی شے کے ہر ایک جز و کو عدد تفویض کرنے کا ایک عمل ہے۔ یہ دو یا دو سے زائد طلبہ، امیدوار یا اشیا کے مابین تحصیل کی سطح اور خصوصیات کے فرق کو واضح کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔وسیع معنوں میں یہ استعداد یا صلاحیت کی موجودگی یا عدم موجودگی کو متعین کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ یہ شمار کاری سے مختلف ہے۔ پیمائش ایک امتیازی اصطلاح ہے جب کہ آزمائش معروضی پیمائش کے لیے استعمال ہوتی ہے اسی طریقے سے تعین قدر موضوعی فیصلے کے لیے ایک مناسب اصطلاح ہے۔

تعین قدر

تعین قدر اصل میں مواد، طریقۂ کار، حل، امور اور تصورِ اقدار وغیرہ کے متعلق فیصلہ سازی کا ایک عمل ہے۔ یہ عمل داخلی شواہد یعنی منطقی درستگی و استقامت اور خارجی معیار کے ضوابط کے ساتھ موازنے

کے ضمن میں کیا جاتا ہے۔آزمائش کے میدان میں یہ عملی طور پر کارکردگی کا فیصلہ یا صلاحیت میں ہونے والے فروغ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ باالفاظ دیگر یہ رسمی اور غیر رسمی آزمائشوں اور تکنیکوں کے ذریعے تحصیل،نشوونما،تخلیقی صلاحیت اوران میں ہونے والی تبدیلیوں کو جانچنے کا بھی ایک عمل ہے۔علاوہ ازیں یہ پہلے سے طے شدہ یا متعینہ مقاصد میں سے طلبہ کے حصول کی حد کو متعین کرنے کا ایک نظامِ عمل بھی ہے۔ اسے حقائق اور شواہد کی بنیاد پر فیصلہ ٔ قدر کو متعین کرنے کا ایک عمل بھی کہا جاتا ہے۔

زبانی آزمائش

یہ وہ آزمائش ہے جس میں ممتحن یا ماہرین کی جماعت طالب علم یا امیدوار کا بالمشافہ انٹرویو لیتی ہے۔اس آزمائش کا خاص مقصد طالب علم کی تقریری پختگی اور زبان کو برتنے کی صلاحیت کے علاوہ معلومات کا جائزہ لینا ہے۔ یہ وقت طلب طریقۂ آزمائش ہے۔اس میں سوالات پہلے سے متعین نہیں ہوتے۔ یہ بات چیت، مختصر تقریر یا سوالات اور مباحثے پر مشتمل ہوتی ہے۔اس کی خامی یہ ہے کہ اس میں ممتحن اپنے پسندیدہ طالب علم یا امیدوار سے اس طالب علم یا امیدوار کی دلچسپی کے لحاظ سے سوال کر کے اسے لائق و فائق ثابت کر دیتا ہے اور جس طالب علم کو غیر تعلیمی بنیاد پر ناپسند کرتا ہے اس سے وہ سوالات کر کے ناکارہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے جن کے تشفّی بخش جواب وہ خود بھی نہیں دے سکتا۔

تحریری آزمائش

تحریری آزمائش وہ آزمائش ہے جس میں طلبہ کی مختلف مہارتوں کی جانچ تحریری شکل میں کی جاتی ہے۔اگرچہ آزمائش کے لیے دوسرے ذرائع بھی موثر تعین قدر کے مقاصد کی وکالت کرتے ہیں لیکن واقعتاً تحریری آزمائش ہی سے نظام تعین قدر کے ہر ایک مرحلے میں بہتر نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

سوال ہر قسم کی جستجو اور معلومات کے جوابات حاصل کرنے کا آلہ ہے۔اس کا تفصیلی جائزہ لینے کے لیے سوال کی اقسام اور استعمال کے مقاصد پر روشنی ڈالی جائے گی۔

سوالات اور سوال سازی کی تکنیک اور قسمیں

سوال جاننے اور پرکھنے کا ذریعہ ہے۔تعلیم کے میدان میں یہ ایک ایسا آلہ ہے جس کا استعمال استاد کی تدریسی کارکردگی اور طالب علم کے ذریعے حاصل کردہ علم کے احتساب، اُس کی پیمائش

اور اُس کے جائزے کے لیے کیا جاتا ہے۔اب یہ ہمارے ملک کے تعلیمی نظام کا المیہ ہے کہ اس کی جواب دہی صرف طالب علم کی ہوتی ہے۔سوال کی ہیئت کو بنیاد بنا کر اسے دو حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: معروضی اور موضوعی۔معروضی سوال کا جواب طے شدہ ہوتا ہے اور اس کا استعمال بنیادی مہارتوں یا صلاحیتوں کی جانچ کے لیے کیا جاتا ہے جب کہ موضوعی سوال امتحان دہندہ کی اعلیٰ سطحی صلاحیتوں کی جانچ کرتا ہے۔یہ عام طور سے استفہامیہ جملے سے بنائے جاتے ہیں اور جس سوال میں استفہام نہیں ہوتا اُسے آئیٹم کہتے ہیں۔سوال یا آئیٹم تشکیل کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس میں ابہام نہ ہو۔

سوال سازی کے دوران اس بات کا خیال بھی رکھنا چاہیے کہ سوال کیوں، کیا، کیسے، کب، کہاں اور کس سے پوچھنا ہے۔کیوں کہ ان سوالیہ یا استفہامی حروف سے نہ صرف یہ کہ سوال کے ابعاد تبدیل ہو جاتے ہیں بلکہ مقصد بھی بدل جاتا ہے۔لہٰذا سوال ساز کو معلوم ہونا چاہیے کہ:

'کیوں' کا تعلق مقصد سے ہے۔

'کیا' کا تعلق موضوع سے ہے۔

'کیسے' کا تعلق طریقۂ کار سے ہے یعنی سوال تحریری صورت میں کرنا ہے یا زبانی طور پر۔

'کب' اور 'کہاں' کا تعلق امتحان کی نوعیت اور سروکار سے ہے، گویا سوال مَیلان کی جانچ یعنی داخلے کے لیے کیا جارہا ہے یا تحصیل کی جانچ یعنی سند کے لیے یا پھر استعداد یا روانی کی جانچ یعنی ملازمت کے لیے۔

'کس' سے سوال کرنا ہے یعنی آموزگار یا امتحان دہندہ کی ذہنی اور طبیعی عمر، اس کا درجہ اور اس کا معاشرتی معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے سوالات تیار کیے جانے چاہئیں۔

(الف) معروضی سوال:

یہ سوال کی وہ قسم ہے جس کا صرف ایک ہی طے شدہ جواب ہوتا ہے۔اس میں امتحان دہندہ کو درست جواب کے لیے پورے نمبر عطا کیے جاتے ہیں اور غلط جواب کے لیے کوئی نمبر نہیں دیا جاتا۔اس قسم کے سوالات کی جانچ میں ممتحن کے تاثرات یا پسند و ناپسند کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔موضوعی سوالات میں امتحان کنندگان کے مناسب و نامناسب تاثرات کا عمل دخل جب حد سے تجاوز کرنے لگا تو صحیح تعینِ قدر کا فقدان ہو گیا جس کے ردّ عمل میں معروضی سوالات کا وجود ہوا۔اس نوعیت کے سوالات سے جانچ

میں شفافیت تو آ گئی لیکن اعلیٰ سطحی صلاحیتوں کی جانچ متاثر ہونے لگی۔ کیوں کہ معروضی سوالات سے صرف ادنیٰ صلاحیتوں کی جانچ کرنا ہی ممکن ہو پاتا ہے۔ معروضی سوالات کی پانچ قسمیں ہیں:

(1) ذو متبادل (Constant Alternative)

(2) کثیر متبادل (Multiple Choice)

(3) کثیر پہلو (Multiple Facet)

(4) ازسرِ نو ترتیب (Rearrangement)

(5) مِلان (Matching)

(1) ذو متبادل: یہ معروضی سوال کی وہ قسم ہے جس میں امتحان دہندہ کو دو متبادلات میں سے صحیح جواب کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ اس کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں مگر عام طور سے اس میں سوال / ساق (Stem) کے ساتھ 'صحیح۔غلط'، 'ہاں۔نہیں'، 'اتفاق۔انکار' وغیرہ متبادل دیے جاتے ہیں اس میں طلبہ کے انتخاب کرنے کی صلاحیت کو پرکھا جاتا ہے۔

(2) کثیر متبادل: عموماً اس میں چار متبادلات دیے جاتے ہیں جن میں سے امتحان دہندہ کو صحیح جواب کی نشاندہی کرنی ہوتی ہے۔ اس کے دو حصے ہوتے ہیں ساق (سوال) اور متبادلات۔ ساق ایک مکمل سوال کی صورت میں بھی ہوسکتا ہے اور ایک نامکمل بیان کی صورت میں بھی۔ نامکمل بیان کی صورت میں درست متبادل کی مدد سے امتحان دہندہ اسے مکمل کرتا ہے۔

معروضی سوالات کی تمام قسموں میں کثیر متبادل سوالات کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل۔ کثیر متبادل سوالات کی تشکیل میں بڑی توجہ، دقّتِ نظر اور عرق ریزی کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ اس کے متبادلات کی نوعیت سے سوال کے معیار میں شدید قسم کی تبدیلی رونما ہو جاتی ہے۔

(3) کثیر پہلو: کثیر پہلو سوال بنیادی طور پر کثیر متبادل سوالات کا مجموعہ ہوتا ہے، لیکن اس کے تحت معروضی سوالات کی دیگر اقسام کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ اس میں کسی متن، تصویر یا ڈائیگرام کو پیش کر کے اس سے متعلق مختلف سوالات کیے جاتے ہیں۔ اس کے ذریعے کسی ایک موضوع پر مختلف معلومات یا صلاحیتوں کی جانچ کی جاسکتی ہے۔ اس قسم کے سوالات تفہیم کی جانچ کے لیے زیادہ موزوں ہوتے ہیں۔

(4) ازسرِ نوترتیب: ازسرنوترتیب، سوال کی وہ قسم ہے جس میں کسی اطلاع یا مواد کو بے ترتیب پیش کر کے امتحان دہندہ سے درست ترتیب دینے کے لیے کہا جاتا ہے۔اس کی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں مگر عام طور سے اس میں مختلف واقعات کو تاریخ وار ترتیب دینا، کسی بے ترتیب مصرعے، محاورے یا ضرب الامثال وغیرہ کو درست ترتیب دینے کو کہا جاتا ہے۔اس نوع کے سوالات سے امتحان دہندہ کی ترتیب دینے کی صلاحیت کو پرکھا جاتا ہے۔

(5) مِلان: یہ سوال کی وہ قسم ہے جس میں دو کالم ہوتے ہیں۔اس میں امتحان دہندہ کو پہلے کالم میں مندرج مواد کو دوسرے کالم میں مندرج مواد سے صحیح مِلان کرنا ہوتا ہے۔کالم میں مندرج مواد علامتوں،لفظوں،فقروں یا بیانوں کی صورت میں ہوسکتے ہیں۔عام طور سے دونوں کالموں میں اندراج کی تعداد یکساں ہوتی ہے مگر کبھی کبھی دوسرے کالم میں اندراج کی تعداد پہلے کالم کی تعداد سے ایک عدد زیادہ ہوتی ہے۔اس کا مقصد قیاس آرائی کے امکان کو کم کرنا ہوتا ہے۔اگر دونوں کالموں میں اندراج کی تعداد یکساں ہو تو اسے سہل ملان اور اگر دوسرے کالم میں اندراج کی تعداد زیادہ ہو تو اسے پیچیدہ ملان والا سوال کہا جاتا ہے۔

یہاں معروضی سوالات کی مذکورہ پانچ قسموں کی بنیادی ہیئت وساخت سے متعارف کرایا گیا ہے۔اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ سوال سازی ایک فن ہے لہٰذا اس کی دیگر صورتیں بھی ممکن ہیں۔معروضی سوالات کے ذریعے عموماً بنیادی یا ادنیٰ صلاحیتوں کی جانچ کی جاتی ہے۔یعنی معلومات (Knowledge)، تفہیم (Comprehension) اور اطلاق (Application) ۔مگر کثیر پہلو سوالوں کے ذریعے کسی حد تک اعلیٰ صلاحیتوں کی جانچ بھی ممکن ہے۔معروضی سوالات کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کے ذریعے کسی آزمائش میں زیادہ سے زیادہ سوالات کو شامل کر کے نصاب کے زیادہ تر حصّوں کا احاطہ کیا جاسکتا ہے۔اس کی جانچ معروضی ہوتی ہے لہٰذا طلبہ وطالبات،اساتذہ کی مناسب ونامناسب پسند وناپسند سے آزاد ہوتے ہیں۔

یہ جانچ کا ایسا طریقہ ہے جس میں مختلف ممتحن ایک ہی نتیجے پر پہنچتے ہیں اور کسی کارکردگی کے لیے لازمی طور پر یکساں نمبر دیتے یا نہیں دیتے ہیں۔

(ب) موضوعی سوال:

موضوعی سوال سے مراد وہ سوال ہے جس میں جواب پہلے سے متعین نہیں ہوتا۔یعنی امتحان

دہندہ اپنی معلومات کی بنیاد پر اپنے انداز میں سوال کا جواب رقم کرسکتا ہے۔اس کی جانچ بھی معروضی کے برعکس موضوعی ہوتی ہے یعنی کسی ایک ہی سوال کے جواب کی جانچ میں مختلف ممتحن اپنی پسند و ناپسند کی بنیاد پر الگ الگ نمبر دے سکتے ہیں۔موضوعی سوال کی بھی مندرجہ ذیل پانچ قسمیں ہیں:

(1) سہل سوال (Simple Question)

(2) تکمیلی سوال (Completion Item)

(3) مختصر جوابی سوال (Short Answer Question)

(4) طویل جوابی سوال (Long Answer Question)

(5) مسئلہ حل سوال (Problem Solving Question)

(1) سہل سوال سے مراد موضوعی سوال کی وہ قسم ہے جس کا جواب محض چند الفاظ یا ایک جملے میں دینا ہوتا ہے۔

(2) تکمیلی سوال: اس میں کسی جملے، عبارت، عدد یا تصویر وغیرہ سے ایک حصے یا ایک سے زیادہ حصوں کو حذف کر دیا جاتا ہے اور امتحان دہندہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ حذف کردہ حصے کو پُر کرے تاکہ عبارت، بیان، عدد یا تصویر مکمل ہو سکے۔

(3) مختصر جواب والے سوال: یہ موضوعی سوال کی وہ قسم ہے جس میں امتحان دہندہ سے کسی موضوع پر مختصر نوٹ یا مختصر جواب لکھنے کو کہا جاتا ہے۔اس کے جوابات عام طور سے ایک یا دو اقتباس پر مبنی ہوتے ہیں۔

(4) طویل جواب والے سوال: موضوعی قسم کا یہ وہ سوال ہے جس کا جواب عام طور پر طویل ہوتا ہے۔اسے مضمون نما سوال بھی کہا جاتا ہے۔اس قسم کے سوال کا جواب محدود اور غیر محدود ہوسکتا ہے۔لیکن عموماً طویل جوابی سوال غیر محدود ہوتے ہیں جس میں امتحان دہندہ کو کسی موضوع پر آزادانہ طور پر اپنی معلومات یا رائے کے اظہار کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔اس نوعیت کے سوالات کے ساتھ چند امتیازی اشارے دینا مناسب ہوتا ہے،اس سے جواب دہندہ کے بھٹکنے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔

(5) مسئلہ حل سوال: اس سوال میں امتحان دہندہ کو مسئلے کے طور پر کوئی صورت حال دی جاتی ہے جس کا وہ بطور جواب حل پیش کرتا ہے۔ یہ جواب یا حل زبانی تشریح، تحریر یا اعداد و شمار کی صورت میں ہوسکتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں غیر مختتم حل مسائل (Open Ended Problem) اور مختتم حل مسائل (Close Ended Problem)۔ مختتم حل مسائل میں جواب کی ایک ہی صورت ممکن ہوتی ہے جبکہ غیر مختتم مسائل میں جواب کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔

موضوعی سوالات کی مذکورہ بالا پانچ قسموں پر یہاں اختصار سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان سوالات کے ذریعے عام طور سے اعلیٰ صلاحیتوں یعنی اطلاق (Application)، تجزیہ (Analysis)، انضمام (Synthesis) اور تعینِ قدر (Evaluation) وغیرہ کی جانچ کی جاتی ہے۔ ان سوالات میں تکمیلی سوال اور سہل سوال کے ذریعے ادنیٰ صلاحیتوں کی ہی جانچ ممکن ہو پاتی ہے۔ تخلیقیت، فکری تنظیم اور تحریری و تنقیدی صلاحیت وغیرہ کی جانچ کے لیے بھی موضوعی سوالات ہی موزوں تصور کیے جاتے ہیں۔ اس کی جانچ موضوعی اور وقت طلب ہوتی ہے۔

معروضی و موضوعی سوالات کے چند بنیادی اصول بھی ہیں جسے سوال سازی کے وقت ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ یہ اصول مندرجہ ذیل ہیں:

1. سوال کسی نہ کسی تعلیمی مقصد، مہارت یا اہلیت پر مبنی ہونا چاہیے۔
2. سوال کا معیار تعلیمی سطح کے مطابق ہونا چاہیے۔
3. سوال نصاب کی کسی نہ کسی اکائی یا نصاب میں شامل سبق کے اہم مواد پر مبنی ہونا چاہیے۔
4. سوال میں معلوماتی جزو (Educative Part) کو بھی شامل کیا جانا چاہیے۔
5. معروضی سوال ایسا ہونا چاہیے کہ جس کے جواب میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ ہو اور اس کا صرف ایک ہی حتمی جواب ہو۔ مثلاً اس طرح کے سوالات سے گریز کرنا چاہیے کہ: اردو کا سب سے بڑا شاعر/ناول نگار/مرثیہ نگار/قصیدہ گو/افسانہ نگار/غزل گو/نقاد وغیرہ کون ہے؟ عین ممکن ہے کہ اس طرح کے سوالات کا ایک جواب نہیں ہوسکتا۔ کسی کی نظر میں میر تقی میر سب سے بڑے شاعر ہوں گے تو کسی کی نظر میں غالب یا اقبال۔ اسی طرح کسی کے نزدیک انیس سب سے بڑے مرثیہ نگار

ہوں گے تو کسی کی نظر میں دبیر۔کوئی سودا کو سب سے بڑا قصیدہ گو کہے گا تو کوئی ذوق کو۔کوئی پریم چند کو بڑا افکشن نگار تسلیم کرے گا تو کوئی قرۃ العین حیدر کو۔لیکن جب اسی نوعیت کے موضوعی سوالات اعلیٰ سطحی صلاحیتوں کو جانچنے کے لیے کیے جائیں گے تو جواب دہندہ کی تفہیمی، اطلاقی اور ترکیبی صلاحیت کی جانچ کے علاوہ تعین قدر کی صلاحیت بلکہ موصولیت، ردّعمل، قدر شناسی، تنظیم، کردار سازی بذریعۂ قدر، تقلید، کاردستی، اجمال، سلیقۂ تنظیم اور فطری تخلیق، یعنی اس کی مجموعی صلاحیت کی سلیقے سے ایماندارانہ جانچ کی جاسکتی ہے۔شرط یہ ہے کہ جانچ کرنے والا شخص، امتحان دہندہ کے علاقے، مذہب، رنگ اور اس کی ذات یا نسل سے مثبت یا منفی لحاظ سے متاثر نہ ہو۔

6. اگر سوال کو مشکل بنانا ہو تو اس کے تمام متبادلات ایک ہی قبیل کے ہونے چاہئیں اور اگر آسان بنانا ہو تو متبادلات الگ الگ مضامین/شعبے کے ہونے چاہئیں۔
7. ''ان میں سے کوئی نہیں'' یا ''ان میں سبھی'' وغیرہ جیسے متبادلات سے گریز کرنا چاہیے۔
8. جواب/کلید کی ترتیب غیر منظّم ہونی چاہیے۔
9. سوال کی زبان سادہ اور واضح ہونی چاہیے۔
10. سوال میں افعال کا مناسب استعمال ہونا چاہیے تاکہ سوال کے ذریعے جس صلاحیت یا مہارت کی جانچ کی جانی ہے، اس کی بھرپور وضاحت ہو سکے۔
11. سوال میں کوئی ایسا اشارہ پوشیدہ نہیں ہونا چاہیے جو جواب کی طرف رہنمائی کرے۔
12. سوالات کی مختلف قسموں میں سے موزوں ترین قسم کو ترجیح دینی چاہیے۔
13. سوال کو مقررہ نمبر اور وقت کے لحاظ سے تشکیل دیا جانا چاہیے۔
14. سوال کو بہر حال کسی نہ کسی مسئلے پر مبنی ہونا چاہیے۔

یہاں معروضی اور موضوعی سوالات کی مختلف قسموں، ان کی ہیئت وساخت اور سوال سازی کے بنیادی اصول واطلاق وغیرہ پر مختصراً روشنی ڈالی گئی۔لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ مذکورہ نکات کے علاوہ بھی چند باتیں ایسی ہیں جو سوال سازی کے اصول وضوابط اور طریقۂ کار کو متاثر کرتی ہیں۔مثلاً آزمائش یا جانچ کے میدان میں کیا؟ کیسے؟ اور کیوں؟ کی بڑی اہمیت ہے۔یعنی یہ سوال کہ کیا جانچ کرنا ھے؟ کیسے جانچ کرنا ھے؟ اور کیوں جانچ کرنا ھے؟۔اسی طرح میلان آزمائش

(برائے داخلہ)، تحصیل آزمائش (برائے سند) اور مہارت آزمائش (برائے ملازمت) کے لیے بھی سوال سازی کے تقاضے مختلف ہو جاتے ہیں۔

تحصیل نشان طریقۂ کار (Scoring Procedure)

یہ کسی بھی آزمائش یا کسی بھی چیز کی خصوصیات کے تعین قدر کا عمل ہے اور طلبہ، امتحان دہندہ یا آموزگار کے ذریعے دیے گئے جوابات کے صحیح یا غلط ہونے کی جانچ پر مشتمل ہوتا ہے۔

تحصیل نشان طریقۂ کار کی مختلف اقسام ہیں۔

(1) تجزیاتی تحصیل نشان — Analytical Scoring

(2) شمارکاری تحصیل نشان — Enumerative Scoring

(3) مجموعی خصوصیات کا تحصیل نشان — Global Quality Scoring

تجزیاتی تحصیل نشان (Analytical Scoring)

یہ طویل یا مضمون نما جوابات کے لیے درجہ بندی کا ایک طریقۂ کار ہے۔ اس کے لیے سوال سے متعلق چند اہم اشارے (Cues) کی فہرست تیار کرنی ہوتی ہے جس کی بنیاد پر جوابات کی جانچ کی جاسکتی ہے۔ اس میں ہر جواب کی خوبیوں اور خامیوں کی مناسبت سے نمبر دیے یا کم کیے جاسکتے ہیں۔

شمارکاری تحصیل نشان (Enumerative Scoring)

یہ وہ طریقۂ کار ہے جس کا استعمال اس وقت کیا جاتا ہے جب جانکاری کے مختلف اجزا سے متعلق آزادانہ طور پر صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ لیا جاتا ہے اور اس میں ممتحن کی ذاتی رائے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

مجموعی خصوصیات کا تحصیل نشان (Global Quality Scoring)

طویل یا مضمون نما جوابات کی درجہ بندی کے لیے اس کا استعمال تجزیاتی تحصیل نشان کے متبادل کے طور پر ہوتا ہے۔ یہ جوابات کی مجموعی خصوصیات کے جائزے میں کارآمد ہوتا ہے۔ اس طریقۂ کار میں ممتحن جوابات کو پڑھ کر اپنے تاثرات کی بنیاد پر نمبر دیتا ہے۔ یہ طریقۂ کار ممتحن کو یہ آزادی عطا کرتا ہے کہ وہ اپنے تجربات کی روشنی میں دیے گئے نمبروں پر دوبارہ غور کرسکتا ہے۔

اس مضمون کی تعمیر و تشکیل میں مندرجہ کتب سے مدد لی گئی ہے۔

1. اصطلاحاتِ تعین قدر کی توضیحی کتاب، 2013، مرتبہ پون سبیّہ، ہندستانی زبانوں کا مرکزی ادارہ، میسور

1. David George, 2005, Trends in Measurement and Evaluation Techniques, Commonwealth Publishers, New Delhi.
2. Gronlund and Robert L. Linn, 1990, Measurement and Evaluation in Teaching, Macmillan Publication Company, New York.
3. KS Sindhu, 2007, New Approaches to Measurement and Evaluation, Sterling Publishers, Pvt.Ltd., New Delhi.
4. Lucantoni P, 2009, Teaching and Assessing Skills in English as a Second Language,Cambridge University Press, London.
5. Macintosh H G & R B Morrison, 1962, Objective Testing, University of London Press, London.

❒ **Dr. Zubair Shadab Khan**
Associate Professor
CPDUT (Urdu Academy)
Aligarh Muslim University
Aligarh-202002
Mobile: 7892803619
Email: zubairk73@gmail.com

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:249-263
Dr. Shahab Zafar Azmi, Asloob-e-Mujtaba ke Tashkili Anasir

شہاب ظفر اعظمی

اسلوب مجتبیٰ کے تشکیلی عناصر

یہ بات تقریباً ہر ادب پڑھنے والا جانتا ہے کہ ادب کو غیر ادب سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ اسلوب ہے۔اسلوب یعنی پیریۂ اظہار، انداز بیان ۔ یہ بات بھی درست ہے کہ ہر صنف اور ہر موضوع اپنا اسلوب خود لے کر آتا ہے لیکن نثر میں دیگر اصناف مثلاً افسانہ، ناول، سوانح وغیرہ میں قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اسلوب کے ساتھ ساتھ مواد اور موضوع کا بھی رول اہم ہوتا ہے، اگر پڑھنے والا اسلوب سے متاثر نہ ہو سکے تو کہانی، واقعہ اور بیان اس کا دامن تھام لیتے ہیں۔مگر طنز ومزاح، انشائیہ یا کالم جیسی غیر افسانوی اصناف کی مقبولیت کا مکمل دارومدار صاحب قلم کے اسلوب اور انداز بیان پر ہی ہوتا ہے۔اسلوبِ بیان پر کشش ہوا تو ابتدائی سطروں سے ہی قاری اُس کی گرفت میں آجاتا ہے اور اگر نہ ہوا تو قاری فوراً کالم چھوڑ کر خبروں کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے۔مجتبیٰ حسین اُن خوش نصیب اہل قلم میں تھے جن کی تحریروں میں جملۂ اول سے ہی قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لینے کی قوت ہوتی تھی۔ دراصل مجتبیٰ حسین کا اسلوب ایسا بہتا دریا ہے جس کی روانی میں قاری غیر محسوس طور پر بہتا چلا جاتا ہے۔ان کی زنبیل میں طنز ومزاح کے وہ سارے حربے موجود ہیں جنہیں حسب موقع بخوبی استعمال کرنے کا وہ ہنر جانتے ہیں۔

ایک صاحب طرز انشاپرداز اور اعلیٰ درجہ کے طنز ومزاح نگار کی حیثیت سے جو شہرت ومقبولیت مجتبیٰ حسین کے حصے میں آئی وہ اِس صنف کے بہت کم فنکاروں کو نصیب ہوئی ہے۔ یہ شہرت غلط نہیں، بلا شبہ وہ اس کے مستحق تھے۔انہوں نے اپنے کالموں، مضامین، خاکوں اور سفرناموں کے ذریعہ طنز ومزاح کی صنف کو وزن، وقار، گہرائی و گیرائی، بصیرت وآگہی اور فنی عظمتوں کی معراج عطا کی ہے۔طنز ومزاح

کے فن کو اپنی تحریروں میں انہوں نے با قاعدہ برتا ہے۔ یہ تحریریں بے ہنگام یا مضحکہ خیز واقعات کا ایسا مجموعہ ہیں جسے پڑھ کر ہمارے جذبہ تفریح یا نفرت کو تحریک ہوتی ہے۔ان تحریروں سے کوئی نہ کوئی سنجیدہ نتیجہ ضرور برآمد ہوتا ہے۔انہوں نے معاشرتی زندگی میں افراد یا اشیاء کے اندر جہاں بھی بدنظمی یا کسی قسم کی خرابی محسوس کی اس پر مزاحیہ انداز میں اظہار خیال کیا۔ان کی تضحیک یا طنز میں کسی کی دل آزاری یا تحقیر مقصود نہیں بلکہ ایک عالمانہ شان پائی جاتی ہے۔

مجتبیٰ حسین متنوع اور پہلودار شخصیت کے مالک تھے۔وہ بچوں میں بچوں جیسی باتیں کرتے، طالب علموں کے ساتھ اُن کے مذاق کو ملحوظ رکھتے۔سنجیدہ محفلوں میں ان کی سنجیدگی اپنی مثال آپ ہوتی تو بے تکلف احباب میں زعفران زار ہو رہے ہوتے۔مجتبیٰ حسین کا اسلوب بھی اُن کی شخصیت ہے،اس لیے ان کی تحریروں میں اسلوب کے کئی رنگ ملتے ہیں۔کسی جگہ حلم،وقار اور تدبر ہے تو کہیں طنز میں تبسم زیر لب کی کیفیت اور معنی خیز شوخی۔کبھی مزاح میں مسکراہٹ اور فقرے بازی تو کبھی متانت آمیز قہقہہ۔مجتبیٰ حسین کے قلم کی جولانی کہیے جو اُن کے ہر نوع کے اسلوب میں رواں دواں ہے اور ایسا جادو جگاتی ہے کہ موضوع کی عظمت دوبالا ہو جاتی ہے۔

مجتبیٰ حسین کے بعض دوستوں نے بیان کیا ہے کہ وہ طالب علمی کے دور سے ہی بڑے حاضر جواب، قہقہہ بر دوش، ظریف اور بذلہ سنج تھے۔دوستوں کی محفل میں لطیفہ گوئی اور فقرے بازی کے عادی تو تھے ہی، رفتہ رفتہ اس کا اظہار وہ اپنی تحریروں میں کرنے لگے۔مجتبیٰ حسین نے محاوروں، کہاوتوں کے برجستہ، معنی خیز اور پر مزاح استعمال کے ذریعہ اپنے خاص اسلوب کی تشکیل کی ہے۔وہ ذو معنین الفاظ کے استعمال سے مزاح کو ابھارنے کا ہنر جانتے ہیں اور لطیف مگر گہرے طنز سے بھی انفرادیت قائم کرتے ہیں۔

اسلوب کی تشکیل میں زبان و بیان پر قدرت کا بڑا اہم رول ہوتا ہے۔صاحبِ اسلوب نثر نگار نہ صرف نفس مضمون سے پوری طرح واقف ہوتا ہے بلکہ زبان و بیان کی باریکیوں پر بھی نظر رکھتا ہے کہ موضوع اور اسلوب ہم آہنگ ہو جائیں۔مجتبیٰ حسین نہ صرف یہ کہ نفس مضمون سے کما حقہ واقف رہتے ہیں بلکہ لفظوں کے اچھے نباض اور رمز شناس بھی ہیں۔اُن کے یہاں مضمون کی لالہ کاری بڑی حد تک لفظوں کے حُسن اور فقروں کی جادوگری کی رہینِ منت ہے۔وہ لفظوں کی نفسیات اور اُن کے مزاج سے ایک ماہر طبیب کی طرح آگاہ ہوتے ہیں اور الفاظ سے یوں بے تکلف ہوتے ہیں کہ اُن کی بناوٹ بھی سادگی معلوم

ہوتی ہے۔انہیں جو کچھ کہنا ہوتا ہے بڑی آسانی سے کہہ گزرتے ہیں۔ بات بڑی اور کڑی ہوتی ہے لیکن قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے غور وفکر اور تکلف سے شاید ہی کام لیا ہوگا۔مثلاً یہ جملے دیکھئے:

''جب آدمی کا پیٹ بھرا ہو تو وہ آرٹ اور کلچر کی طرف راغب ہوتا ہے''

(دیمکوں کی ملکہ سے ملاقات)

''اچھا شعر اور برا وقت پوچھ کر نہیں آتے''(صادقین)

''چھوٹے آدمی کا بڑا پن بڑا کھوکھلا ہوتا ہے''(راج بہادر گوڑ) 1؎

مجتبیٰ حسین کسی بات یا کسی چیز کے لئے مروج لفظ کو چھوڑ کر نیا لفظ اختراع کر لینے یا کوئی نئی ترکیب وضع کر لینے میں بھی ماہر ہیں۔مثلاً سر بکف کی طرح برش بکف کہہ دینا،آنکھیں چار ہونا محاورے کی جگہ آنکھیں تین ہونا،عمر چھپانے والے کو''عمر چور'' کا خطاب دے دینا،لفظ''غصیلا'' کی جگہ''جھٹ خفا'' ایجاد کر لینا،ضرورتِ شعری کی طرح ضرورت پروفیسری اور ضرورتِ موسیقی جیسی ترکیبیں وضع کر لینا، یہاں تک کہ 'ایش ٹرے' کو 'بحث پیا' بنا دینا مجتبیٰ حسین کا وہ کارنامہ ہے جو قاری کو غیر متوقع طور پر چونکا دیتا ہے۔چونکانا بھی ان کا ایک خاص عمل ہے۔ساقی فاروقی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ساقی فاروقی دو تین برسوں کے وقفہ سے ایک بار اپنی جڑوں کی تلاش میں ہندستان آتے ہیں۔انہیں جڑیں ملتی ہیں یا نہیں یہ ہم نہیں جانتے ،البتہ ہندستان میں اُن کے ساتھ کچھ جڑی بوٹیوں کو ہم نے ضرور دیکھا ہے۔'' 2؎

قاری کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا کہ ساقی فاروقی کے تلاش خاندان کے ضمن میں جڑی بوٹیوں کا طنزیہ استعمال بھی ہو سکتا ہے۔ندرت پیدا کرنا اور قاری کو چونکانا مجتبیٰ حسین کا امتیازی وصف ہے۔

اردو میں مزاح نگاری کے دو پیرایۂ اسالیب پائے جاتے ہیں۔ایک وہ جس میں واقعات کے سہارے مزاح پیدا کیا جاتا ہے،یعنی حسنِ بیان پر زیادہ اور لطفِ زبان پر کم توجہ دی جاتی ہے۔اور دوسرا پیرایۂ اسلوب وہ ہے جس میں واقعات کے بجائے مزاح نگار الفاظ سے کھیلتا ہے اور زبان کے مخصوص استعمال سے مزاح پیدا کرتا ہے۔مجتبیٰ حسین ان دونوں اسالیب اظہار سے کام لیتے ہیں۔سفر ناموں اور خاکوں میں زیادہ تر وہ واقعات کا کثرت سے استعمال کر کے اس کے مضحک پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔اس میں ان کے مشاہدے کی گہرائی قابل توجہ ہوتی ہے، جو روزمرہ زندگی میں پیش آنے

والے معمولی واقعات میں بھی مضحک پہلو ڈھونڈ لیتی ہے۔سماج کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد،ان کے طرز زندگی،مسائل، عادات واطوار اور طرز فکر کا انہوں نے گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔وہ ان کا ذکر افسانوی اورڈرامائی انداز میں کر کے قاری کو اپنی طرف متوجہ تو کرتے ہی ہیں، واقعات کے درمیان لطیفوں اور پیکروں کا ایک ایسا سلسلہ خلق کرتے ہیں جو قاری کی دلچسپی ایک پل کے لئے بھی کم نہیں ہونے دیتا۔صرف یہی نہیں وہ تصادم، کشمکش، کلائمکس اور تجسس پیدا کر کے اس میں مزاحیہ ڈراما یا مزاحیہ فکشن کا حُسن پیدا کر دیتے ہیں۔جاپان چلو جاپان چلو،سفر لخت لخت، آدمی نامہ، چہرہ در چہرہ اور آخر کار وغیرہ کے مضامین میں اسلوب کا رنگ واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کے اسلوب کا دوسرا پیرایہ زبان و بیان پر اُن کی بے پناہ قدرت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔یہاں وہ لفظ کے رنگا رنگ استعمال کا سلیقہ پیش کرتے ہیں۔جملوں کی ساخت سے نیرنگئ اسلوب کے کرشمے دکھاتے ہیں۔بات سے بات پیدا کرنے کے ہنر سے واقفیت کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے مافی الضمیر کو کم سے کم الفاظ میں قطعیت، جامعیت اور شگفتگی کے ساتھ ادا کرنے پر قدرت کا ثبوت دیتے ہیں۔الفاظ اور زبان کی اِس پرکھ نے مجتبیٰ حسین کے اسلوب میں ایسے عناصر پیدا کر دیے ہیں جو ادب کی تاریخ میں ان کی انفرادیت کے ضامن بن کر موجود ہیں۔ان عناصر میں بذلہ سنجی، فقرے تراشنے کا آرٹ، قول محال، تکرار الفاظ، تضاد، اختصار، صنایع کا خوبصورت استعمال، اشعار میں تصرف اور قطعیت وغیرہ اہم ہیں۔مجتبیٰ حسین کے کالم اور مضامین میں اس کی مثالیں بکثرت مل جاتی ہیں۔

مجتبیٰ حسین کے اِس پیرایۂ اسلوب میں سب سے زیادہ تب وتاب اُن کی بذلہ سنجی (wit) سے ہے۔آل احمد سرور نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ’’مجتبیٰ حسین دراصل wit کے مردِ میداں یعنی بذلہ سنجی اور ذکاوت کے پیکر ہیں۔میرے نزدیک wit مزاح کا ایک موثر آلہ ہے اور اس کی مثالیں مجتبیٰ حسین کے یہاں جابجا ملتی ہیں‘‘۔آپ بھی چند مثالیں دیکھیے:

’’شاعر جب پان کھاتا ہے تو اس کی پیک تھوکتا ہے۔اور بعض شاعر تو ایسا فی البدیہہ تھوکتے ہیں کہ اُن کے تھوکنے پر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے‘‘(مسقط کی صفائی اور قصہ اردو شاعر کا)

’’علامہ کے کلام کی واحد خصوصیت یہ تھی کہ اُس میں ترنم کے سوائے کچھ نہ تھا۔اگر ان کے کلام میں سے ترنم کو نکال دیا جائے تو کلام میں تخلص کے سوا کچھ

باقی نہیں بچ جاتا تھا‘‘3

’’جناب صدر تو وہ ہے جو ڈائس پر اپنے سامنے پھولوں کے ہار رکھے ہوئے یوں بیٹھا ہے جیسے شیر اپنے مارے ہوئے شکار کو سامنے رکھتا ہے۔‘‘4

بذلہ سنجی کسی شئے کو کسی اور شئے سے مماثل یا متضاد قرار دے کر مزاح اور ہنسی کو متحرک کرنے کے کام آتی ہے۔مجتبیٰ حسین کے یہاں بھی یہی بات ملتی ہے۔ان کے ہر مضمون میں دو چار فقرے ایسے ضرور ملیں گے جو بذلہ سنجی کا اعلیٰ نمونہ یا حاصلِ مضمون کہے جا سکتے ہیں۔مثلاً:

’’جب ریس کا سیزن آتا ہے تو اچھا خاصا آدمی بے لگام ہو جاتا ہے‘‘

(دوڑا دیے گھوڑے ہم نے)5

’’اردو کی مٹھاس اور چاشنی پر جان دیتے ہیں۔چوں کہ وہ ساری شاعری کو حلوائی کی دکان سمجھتے ہیں اسی لیے تو انہیں مشاعروں میں پابندی سے بلایا جاتا ہے۔‘‘(ایک مشاعرے کی رننگ کامنٹری)6

کبھی کبھی تو مجتبیٰ حسین صرف ایک ’لفظ‘ کی ہیر پھیر سے پورے مضمون کو مزاح کے رنگ میں ڈبو دیتے ہیں۔اُن کے سفر نامہ ’جاپان چلو جاپان چلو‘ کا باب ’یونیسکو کی چھتری‘ یاد کیجئے۔یہ محض ایک لفظ ’چھتری‘ سے مزاح کا عمدہ نمونہ بن گیا ہے۔ملاحظہ کیجئے:

’’وہ ہمیں ٹوکیو میں دوسرے دن ملی اور ہم نے اسی دن اپنی بیوی کو خط لکھا ’وہ ہمیں آج ملی ہے، دیکھنے میں کچھ خاص نہیں مگر پھر بھی اچھی ہے،اب ہمیں اسی کی رفاقت میں ٹوکیو کے شب و روز گزارنے ہیں،اسی کے سائے میں رہنا ہے‘‘۔7

ہر جملے کی تانیث چھتری کی طرف بھی راجع ہے اور محبوبہ کی طرف بھی۔ابتدا میں ایک بار ذکر کر کے مجتبیٰ حسین نے اس کو غائب کر دیا ہے۔بیوی کے خط میں ’چھتری‘ لفظ لکھنے سے رہ گیا ہے اور اس طرح ابہام سے شبہہ پیدا ہوا ہے۔اس کی وجہ سے میاں بیوی میں جو نوک جھونک ہوتی ہے وہ قاری کی تفریحِ طبع کے لئے اچھا خاصا سامان فراہم کر دیتی ہے۔یہاں محض ایک لفظ چھتری سے پورے باب کو مزاح کا شاہکار بنا دیا گیا ہے۔

مزاح سے یاد آیا کہ پروفیسر مظفر حنفی نے لکھا ہے کہ مجتبیٰ حسین مزاح عمدہ لکھتے ہیں مگر طنز سے بہت کم واسطہ رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ رائے سرسری مطالعے کا خیمہ ہے یا مجتبیٰ حسین کی اولین تحریروں کو پڑھ کر قائم کی گئی ہے۔ مجتبیٰ حسین کی کالم نگاری کے دوراول میں مزاح کے عناصر یقیناً زیادہ تھے مگر انہوں نے جب کالم نگاری کا دوسرا دور 'سیاست' میں شروع کیا، اس کے بعد اُن کی تحریروں میں طنز کی زہرنا کی شدت کے ساتھ پائی گئی ہے۔ سند باد جہازی کا سفر نامہ، ہوٹل شبانہ، ڈائرکٹر کا کتا، مشاعرے اور مجرے کا فرق، مرزا غالب کی پریس کانفرنس، تعزیتی جلسے اور علامہ نارسا کی وفات مسرت آیات پر وغیرہ کو پڑھ جایئے تو آپ کو مجتبیٰ حسین کے مزاح میں طنز کی شدت کا احساس شدت کے ساتھ ہوگا۔ ان کے قلم کی کاٹ ان کی گہری بصیرت اور سماج کو بدلنے کے لیے ان کی بے تابی کا مظہر ہے۔ اُن کے مزاح میں طنز کے گہرے نشتر ہیں اور نشتروں کے آر پار دیکھا جائے تو اصلاح معاشرہ کی خواہش اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود نظر آتی ہے۔ مثلاً یہ جملے دیکھیے:

''فی زمانہ اصولوں کو توڑنا ہی سب سے اچھا اصول سمجھا جاتا ہے بلکہ جو شخص اصولوں کو نہیں توڑتا لوگ اُسے ہی توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔'' (ذکرِ خیر سید حامد کا) 8

''مہنگائی کا عالم یہ ہے کہ اِس شہر میں اپنے سوا کوئی چیز اور سستی نظر نہیں آتی''۔ (اس دور میں ہوتے حاتم طائی) 9

''ایک دن مژدۂ جانفزا ملا کہ 'تناظر' کا کاتب کہیں غائب ہوگیا۔ بعض کاتب اس طرح ادب کی بڑی خدمت انجام دیتے ہیں۔'' (بلراج ورما نے تناظر نکالا) 10

مجتبیٰ حسین نے اپنے اسلوب کو ہر طرح کی مسخرہ پنی اور پھکڑ پن سے پاک وصاف رکھا ہے۔ انہوں نے نہ سوقیانہ قسم کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور نہ عامیانہ تاثرات ومشاہدات کو پیش کیا ہے۔ اگر کوئی ناگوار لفظ لکھنا بھی ہو تو اس انداز میں لکھتے ہیں کہ اہانت یا کراہیت کا شبہ تک نہیں ہوتا۔ اچھے مزاح نگار کے لیے لفظوں کے استعمال کے اس ہنر سے واقف ہونا ضروری ہے۔ عصمت چغتائی نے اپنے بھائی کے لیے لفظ 'دوزخی' لکھا تھا، مگر اِس طرح کہ دوزخی عظیم بیگ چغتائی کے لیے اہانت کی بجائے محبت کا استعارہ بن گیا اور قاری کو اُس دوزخی سے پیار ہو گیا۔ مجتبیٰ حسین نے بھی اِس فنکاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ دیکھیے وہ اپنے ہم عصر فکر تونسوی کے گنوار پن کا ذکر کس خوبصورتی سے کر رہے ہیں:

''میں نے فکر کو جس قدر قریب سے دیکھا اس سے یہی اندازہ لگایا کہ اس بڑے طنز نگار کے اندر ایک معصوم گنوار بیٹھا ہے۔ یہ گنوار انہیں اپنے گھر کے خوبصورت صوفہ پر اُکڑوں بیٹھواتا ہے۔ یہی گنوار اُن کے کان میں سگریٹ کا ادھ جلا ٹکڑا رکھوا دیتا ہے۔ یہی گنوار اُنہیں چائے کی پیالی میں سگریٹ کی راکھ جھاڑنے پر مجبور کرتا ہے۔ اور تو اور یہی گنوار اُن سے ریفریجیٹر میں 'بدنام کتاب' کے نسخے رکھواتا ہے۔'' (فکر تونسوی) 11؎

دیکھیے گنوار کو گنوار کہنا ہمارے لیے کتنا مشکل کام ہے، مگر مجتبیٰ حسین نے اِس فنکاری کے ساتھ اس لفظ کا استعمال کیا ہے کہ قاری پر اِس لفظ کا منفی اثر پڑتا ہی نہیں ہے، بلکہ اسے فکر تونسوی کی معصومیت سے محبت ہو جاتی ہے۔

اچھی مزاحیہ نثر کا اسلوب تشبیہات و استعارات یا صنایع کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔ میرا خیال ہے کہ شاعری کے بعد سب سے زیادہ تشبیہات و استعارات یا صنایع کی ضرورت طنز و مزاح میں ہی ہوتی ہے۔ مجتبیٰ حسین بھی اپنی تحریروں کو نت نئی تشبیہات سے پر لطف بنا دیتے ہیں۔ وہ کبھی یک سطری تشبیہات سے کام لیتے ہیں جیسے

''تعزیتی جلسے اچانک یوں منعقد ہوتے ہیں جیسے آسمان پر یکا یک قوسِ قزح نکل آتی ہے۔'' (تعزیتی جلسے) 12؎

''انہوں نے مجھ سے اس طرح مصافحہ کیا جیسے بجلی کے تار کو چھونے جا رہے ہوں۔'' (عمیق حنفی) 13؎

''ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا کہ ایک پنسیری میں مینڈکوں کو پکڑنا'' (ازبکستان کے ادیبوں کے درمیان) 14؎

اور کبھی کبھی تشبیہ کو اتنا پھیلا دیتے ہیں کہ وہ تمثیل بن جاتی ہے۔ مثلاً یہ اقتباس دیکھیے:

''ہم ذاتی طور پر نئے سال کی خوشی اس لئے نہیں مناتے کہ نیا سال آ گیا ہے بلکہ خوشی اِس لئے مناتے ہیں کہ پرانا سال گذر گیا اور ہم نہیں گزرے۔ تب ہم پرانے سال کی طرف اس طرح حقارت کی نظر ڈالتے ہیں جیسے کشتیوں کے دنگل

میں فتح پانے کے بعد کوئی پہلوان ہارے ہوئے پہلوان کی طرف فاتحانہ نظر ڈالتا ہے۔ سچ پوچھیے تو پرانا سال بھی ایک پہلوان ہوتا ہے جس سے آپ مسلسل ۳۶۵ دن فری اسٹائل کشتی لڑتے ہیں۔ وہ آپ کو گھونسے رسید کرتا ہے، کبھی دھوبی پٹخنی دے ڈالتا ہے، کبھی آپ اس کے سینے پر سوار ہوتے ہیں اور وہ کبھی آپ کے سینے پر مونگ دلنے لگتا ہے۔'' (نیا سال پرانا جال) 15

دیکھا آپ نے، کیسے انہوں نے ایک غیر مرئی چیز کو مرئی چیز سے تشبیہ دے کر پرانے سال کے متعلق احساسات کی تجسیم کر دی ہے۔ اسی قسم کی فنکاری وہ استعارے کے استعمال میں بھی دکھاتے ہیں۔ مثلاً کنہیالال کپور کے بارے میں انہوں نے خاکے میں لکھا ہے:

''کسی طرح اعتبار نہ آتا تھا کہ جو قطب مینار برسوں سے لیٹا ہوا تھا وہ آخر کس طرح اُٹھ کھڑا ہو گیا ہے۔''

ظاہر ہے یہ کام وہی کر سکتا ہے جو لفظوں اور صنعتوں کا پارکھ ہو۔ مجتبیٰ حسین لفظوں کے مزاج داں ہیں اور انہیں اپنی مرضی کے مطابق جیسے چاہتے ہیں استعمال کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ انہوں نے مختلف صنایع مثلاً صنعت تجنیس، تجاہل عارفانہ، تضاد، تکرار، ابہام اور مبالغہ وغیرہ کا استعمال بھی اسی ہنرمندی سے کیا ہے۔ مثلاً صنعت تجنیس پر مشتمل جملے ملاحظہ کیجئے:

''سابق کی پابندی غالباً اس لئے رکھی ہے کہ میں بھی تو سابق شاعر ہوں۔ کیا کروں میرا سابقہ بھی تو سابقوں سے ہی پڑتا رہتا ہے۔'' (مرزا غالب کا خط میرزا مجتبیٰ کے نام) 16

''ابھی علامہ نے اپنی غزل کا مطلع ہی سنایا تھا کہ مطلع صاف ہو گیا۔ طلبہ تو طلبہ پولس کی پوری جمیعت بشمول سب انسپکٹر پولس مقام حادثہ سے غائب تھی'' (علامہ نارسا کی وفات مسرت آیات پر) 17

''بعض لوگ بذریعہ ڈاک کچھ ایسی رقت کے ساتھ آپ کی مزاج پرسی کرتے ہیں کہ لگتا ہے مزاج پرسی نہ کر رہے ہوں بلکہ پرسہ دے رہے ہوں''۔ (اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے) 18

شاعری اور طنز و مزاح میں ایک اور صنعت کثرت سے استعمال ہوتی ہے اور وہ ہے صنعت مبالغہ۔ اس صنعت کو نثر میں فن کی سطح پر لے جانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ مجتبیٰ حسین اِس وصف کو جانتے ہیں لہٰذا ان کے مضامین میں مبالغہ کے کئی لطیف پہلو ملتے ہیں۔ باتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے والا فنکار مبالغہ آمیزی میں ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ موضوع اور انشا کی لطافت پر کوئی آنچ نہ آئے۔ ایسی طوالت پیدا نہ ہو کہ موضوع کا جوہر دور جا پڑے۔ موضوع کی شادابی سے مبالغے کی دلنوازی کا رشتہ قائم رہنا چاہیے۔ مجتبیٰ حسین نے تجربے کی لطافت، انوکھے پن، دلکشی اور تازگی کو برقرار رکھنے کے لیے مبالغہ آرائی کی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

''جب سے ہمارے گھٹنے کا درد پیچیدہ ہوا ہے بہت سے ہمارا دل رکھنے کے لئے خود بھی لنگڑا کر چلنے لگے ہیں''۔ (ذکر قاضی سلیم کا)

مزاح کی خاطر مجتبیٰ حسین واقعات کو مبالغہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں مگر اسی حد تک کہ مبالغہ غلو یا کذب کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ مثلاً

''ایک مکان کی بالائی منزل پر عید منائی جارہی ہے، گلے ملے جارہے ہیں مگر اسی مکان کی نچلی منزل پر روزہ چل رہا ہے۔ استدلال اس خصوص میں یہ پیش کیا جاسکتا ہے کہ صاحب بالائی منزل چوں کہ اونچائی پر واقع ہے اس لئے بالائی منزل والوں کو کل ہی چاند نظر آ گیا تھا اور نچلی منزل چوں کہ بہت نیچے واقع ہوئی ہے اس لئے نچلی منزل والوں کو آج چاند نظر آئے گا۔'' (جمہوری عید)

رویت ہلال کے تعلق سے اِس مبالغے میں کس قدر طنز چھپا ہوا ہے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مجتبیٰ حسین لفظوں سے کھیلنے کے ماہر ہیں۔ کبھی کبھی وہ تکرارِ الفاظ سے نہ صرف بیان میں شدت پیدا کردیتے ہیں بلکہ معنی کی کئی جہتیں پیدا کر دیتے ہیں۔ حالانکہ پروفیسر بیگ احساس نے کہیں کہیں تکرار الفاظ کو عیب بھی قرار دیا ہے، اور مثال میں ایک اقتباس پیش کیا ہے جس میں ڈبہ اور ڈبیہ کی تکرار انہیں ناگوار گزرتی ہے۔ مگر مجھے مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں یہ عیب خال خال ہی نظر آیا۔ اکثر و بیشتر جگہوں پر صنعت تکرار کو انھوں نے اسلوب میں دلکشی اور طنز یا مزاح میں تیکھا پن پیدا کرنے کا حربہ بنایا ہے۔ مثلاً یہ اقتباس دیکھیے:

''ہم نے کہا بیگم، ہم تمہاری بات سے صد فی صد متفق ہیں۔۔۔۔ ہمارا جی بھی یہی چاہتا ہے کہ قدرت ہم سے ہماری بصارت چھین لے۔ ہم نے سچ مچ دنیا بہت دیکھ لی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب تمہیں دیکھتے تو دیکھتے رہ جاتے تھے۔ اب تمہیں دیکھنے کا لطف بھی جاتا رہا۔ دوستوں کی کرم فرمائیاں دیکھیں، حالات کی بے مہری دیکھی۔ اب اس دنیا میں دیکھنے کو باقی ہی کیا بچا ہے۔ اپنا انجام دیکھنا ہے سو وہ ہم نہیں دیکھتے، تم دیکھ لو۔ تمہاری آنکھیں بھی تو ہماری آنکھیں ہیں۔'' (سورج گہن کی یاد میں)

الفاظ کی تکرار یا ہم معنی، ہم قافیہ الفاظ کے استعمال سے اسلوب میں مزاحیہ رنگ پیدا کرنے کی کوشش کئی مزاح نگاروں نے کی ہے۔ مگر مجتبیٰ حسین نے ایک سابقے کو کئی اسماء کے ساتھ استعمال کر کے کئی معنوی جہتیں وا کی ہیں۔ مثلاً یہ جملے دیکھیے، وہ ساقی فاروقی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ایسے خوش طبع اور شگفتہ مزاج کہ جس محفل میں بیٹھیں لوگوں کو ہنسا ہنسا کر رلادیں۔ کھلے دل، کھلے دماغ، کھلے گریباں اور کھلے منہ (منہ زیادہ ہی کھلا ہوا ہے) کے آدمی ہیں۔'' (کچھ ذکر خیر وشر ساقی فاروقی کا)19ء

اسی طرح اشتیاق عابدی کے تعلق سے لکھا ہے:

''ایک تو سوویت یونین کا سفر اور اوپر سے اشتیاق عابدی جیسا ہم سفر نصیب ہوجائے تو کیا کہنے۔ وہ ہمارے ہم نوالہ، ہم پیالہ، ہم دم، ہم مشرب اور ہم مشروب تو ہیں ہی، اب ہم رکاب اور ہم رکابی بھی بن جائیں گے۔'' (ایروفلوٹ میں ہمارا پہلا سفر)20ء

صنعت تکرار کی طرح صنعت تضاد کو بھی انہوں نے فنکاری کے ساتھ برت کر دکھایا ہے۔ جیسے

''تاریخ عالم ایسی شخصیتوں کے کارناموں سے بھری پڑی ہے جنہوں نے مر کر اپنی جان بچائی'' (اس دور میں ہوتے حاتم طائی)21ء

''صاحبو! یہ تمہید جو ذرا لمبی ہوگئی ہے اس لئے باندھی گئی ہے کہ ہمیں تمہید کو کھولنا نہیں آتا'' (میں نہیں آؤں گا)22ء

مجتبیٰ حسین کے اسلوب کی تشکیل میں محاوروں اور کہاوتوں کے برجستہ،معنی خیز استعمال کا اہم حصہ ہے۔یوں تو انہوں نے مختلف صنایع کا استعمال کیا ہے مگر محاوروں اور کہاوتوں کے استعمال میں جس تصرف سے کام لیا ہے اس نے سنجیدہ محاوروں اور کہاوتوں میں بھی مضحک پہلو پیدا کر دیا ہے۔محاوروں اور کہاوتوں کے حسن استعمال کا لطف اٹھانے کے لئے صرف ایک اقتباس کافی ہے جو'یہ رکشا والے' سے اخذ کیا گیا ہے۔ملاحظہ ہو:

''اتنے برسوں تک بھانت بھانت کے رکشاؤں میں بیٹھنے کے بعد، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جب گھوڑے کی قسمت پھوٹتی ہے تو وہ رکشا چلاتا ہے اور جس شخص کی قسمت کسی وجہ سے پھوٹنے نہیں پاتی بلکہ پھوٹنے کی منتظر رہتی ہے تو وہ رکشا میں بیٹھ جاتا ہے۔ہزار بار رکشا والوں کو سمجھاتا ہوں کہ میاں سلامتی کی چال چلو کہ زندگی میں یہی کلید کامیابی ہے تو مجھ سے کہتے ہیں''حضور سلامتی کی چال چل کر تو اس نوبت کو پہنچے ہیں اور اب مزید سلامتی کی چال چلیں تو زمانہ قیامت کی چال چل جائے گا اور ہم منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔''(یہ رکشا والے)23؎

پوری عبارت محاوروں اور کہاوتوں سے بُنی گئی ہے مگر روانی اور برجستگی ایسی ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

نثر میں طنز و مزاح پیدا کرنے کا ایک حربہ تحریف، پیروڈی یعنی اشعار یا مصرعوں میں تصرف بھی رہا ہے۔مجتبیٰ حسین کے یہاں بھی اشعار یا مصرعوں میں ردو بدل کر کے صورت حال یا زبان کو مضحک بنا دینے کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔اعلیٰ پائے کی تحریف اتنی ہی اہم ہوتی ہے جتنی اس کی اصل۔مجتبیٰ حسین کے مضامین میں شامل اس کا ہر شعر یا مصرع صحیح خدوخال میں ظاہر نہیں ہوتا۔مجتبیٰ ان کی شکل و شباہت سے کھیلتے ہیں اور معمولی الفاظ کے ردو بدل سے انہیں مضحک بنا کر اپنے نفس مضمون سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔مثال کے طور پر یہ جملے ملاحظہ کیجئے:

''آج جب جگہ جگہ'غالب میموریل فنڈ'' قائم کئے جارہے ہیں تو مجھے یہ پوچھنے کا حق پہنچتا ہے کہ حیراں ہوں پھر'مشاہرہ' ہے کس حساب میں''۔(مرزا غالب کی پریس کانفرنس)24؎

''سردی کے دن تھے اس لئے روز یہ معمول بن گیا تھا کہ کھانا دوبار گرم ہوتا تھا،اک مرے آنے سے پہلے اک مرے آنے کے بعد'' (حسن الدین احمد۔ لفظوں کا آدمی) 25ے

مگر زیادہ تر مجتبیٰ حسین شعر یا مصرعے کو کسی تبدیلی کے بغیر نثر کا حصہ بنا دیتے ہیں،اس طرح کہ اس میں مزاحیہ پہلو پیدا ہو جائے۔مثلاً

''پھر وہ لڑکی وہاں سے غائب ہوئی تو کہیں نظر نہیں آئی اور میں کوئے یار سے سوئے دار چلا آیا'' (فیض احمد فیض)

''ساری بلیاں مر گئیں۔اب یہ ایک بلّی رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے'' (کچھ ذکر خیر وشر ساقی فاروقی کا) 26ے

''اقبال کے وہ سچے عاشق ہیں تبھی تو اپنی خودی کو اتنا بلند کئے ہوئے ہیں کہ ہم جیسوں کو ان سے گڑگڑا کر پوچھنا پڑتا ہے کہ آخر ان کی رضا کیا ہے'' (جگن ناتھ آزاد کا اعمال نامہ)

اشعار اور مصرعے ہی نہیں مجتبیٰ حسین نے فلمی ڈائیلاگ اور گانوں میں بھی تصرف کر کے انہیں اپنی تحریروں کا خوبصورت حصہ بنا دیا ہے۔

''ہمیں ان کی یہ بات بہت ناگوار گزری کیوں کہ ہم نہ صرف پرانے زمانے کے آدمی ہیں بلکہ 'انگریزوں کے زمانے کے جیلر بھی ہیں' (پروفیسر علی محمد خسرو)

''ہم عادت سے مجبور پہلے دوستوں کے جھرمٹ میں ہی گئے۔کیوں نہ جاتے، آخر کو انہیں لوگوں نے لے لینا دوپٹہ میرا' (ہم نے ایک ہی دن میں چار بار بریک فاسٹ کیا)

غرض اِن پیروڈیوں،تصرفات کے مطالعے سے جہاں مجتبیٰ حسین کی جودت فکر،ندرت بیان اوران کے مخصوص اسلوبی پیرائے کا اندازہ ہوتا ہے وہیں وہ بحیثیت زبان داں کے بھی اپنا سکہ قارئین کے دلوں پر بٹھا دیتے ہیں۔اسلوبِ مجتبیٰ کے دیگر عناصر مثلاً فقرہ بازی،قول محال،تکرار،تضاد،مبالغہ،ترکیب سازی،تشبیہات واستعارات کی نیرنگی وغیرہ دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ زبان کا اتنا بھرپور،برجستہ اور تخلیقی

استعمال آسان کام نہیں۔ یہ عناصر اُن کے اسلوب میں سادگی، عام فہمی کے ساتھ تخلیقیت اور حُسن بھی پیدا کرتے ہیں۔ان سے نہ خیالات میں کہیں الجھاؤ پیدا ہوتا ہے نہ بیان میں ثقالت کا احساس ہوتا ہے۔ مشاہدوں اور خیالوں کا ایک بہاؤ ایک فطری انداز میں شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔مجتبیٰ حسین کا مطالعہ مرقع نگار،انشاپرداز،خاکہ نویس یا کالم نویس کسی حیثیت سے کیا جائے اُن کے اسلوب کی انفرادیت ہر جگہ نمایاں ہے۔وہ صحیح معنوں میں صاحب طرز ادیب تھے۔اُن کی چند سطروں کا مطالعہ یہ باور کرادیتا ہے کہ کون کہہ رہا ہے۔اورکون کہہ رہا ہے کا جواب خود بخود اس مسئلے کو بھی حل کر دیتا ہے کہ کیا کہا جارہا ہے۔شاعری میں تو گنجینۂ معانی کا طلسم ہر روز دیکھنے کو ملتا ہے لیکن نثر میں اس کا مظاہرہ چند فنکاروں نے ہی کیا ہے۔ان میں مجتبیٰ حسین کا نام صف اول میں شامل ہے۔لفظیات پر اس قدر بے پناہ قدرت بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔اس قدرت نے ہی ایک ایسے اسلوب کی طرح ڈالی اور اس کو بارآور کیا جو ان کا صرف ان کا اپنا ہے۔الفاظ کی پرکھ اور استعمال کی ندرت نے ان کی تحریر کو اُن تمام اوصاف سے مزین کیا جن سے ایک منفرد اسلوب عبارت ہوتا ہے۔اسلوب کی یہ انفرادیت،زبان کی شگفتگی اور فکر کی تازگی ایسی نعمتیں ہیں جنہیں زوال نہیں۔ انہیں کی بدولت ادبی معیار و مباحث کی ہزار ہا تبدیلیوں کے باوجود ہمیشہ مجتبیٰ حسین زندہ اور تابندہ رہیں گے۔ بہ قول مجروح سلطانپوری

مرے پیچھے یہ تو محال ہے کہ زمانہ گرم سفر نہ ہو
نہیں ہے مرا کوئی نقش پا کہ دلیل راہ گزر نہ ہو

حوالہ جات:

1. حسین،مجتبیٰ،مجموعہ 'ہوئے ہم دوست جس کے'، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت،لال کنواں، دہلی، 2011، ص9
2. حسین،مجتبیٰ، (اودیس سے جانے والے بتا) مجموعہ 'سفر لخت لخت' م')، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی، 2011، ص14
3. حسین،مجتبیٰ، (علامہ نارسا کی وفات مسرت آیات پر، تکلف برطرف) ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی، 2011، ص40
4. حسین،مجتبیٰ، (جنابِ صدر) مجموعہ 'بہرحال'، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی، 2011، ص13

5. حسین،مجتبیٰ،قطع کلام،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،لال کنواں،دہلی،2011،ص43
6. حسین،مجتبیٰ،مجموعہ'بالآخر'ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،کوچہ پنڈت،لال کنواں،دہلی،2011،ص71
7. حسین،مجتبیٰ،'جاپان چلو،جاپان چلو'،ایم آر پبلی کیشنز،کوچہ چیلان،دریا گنج،نئی دہلی،2010،ص59
8. چشتی،حسن۔مجتبیٰ حسین کے منتخب کالم،جلد اول،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،کوچہ پنڈت، لال کنواں،دہلی،2004،ص146
9. چشتی،حسن۔مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں جلد اول،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،کوچہ پنڈت،لال کنواں،دہلی،2001،ص273
10. حسین،مجتبیٰ،مجموعہ'بالآخر'،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،کوچہ پنڈت،لال کنواں،دہلی،2011،ص85
11. حسین،مجتبیٰ،مجموعہ'آدمی نامہ'،ایم۔آر۔پبلی کیشنز،کوچہ چیلان،دریا گنج،دہلی،2010،ص64
12. حسین،مجتبیٰ،مجموعہ'بہرحال'،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،کوچہ پنڈت،لال کنواں،دہلی،2011، ص31
13. حسین،مجتبیٰ،مجموعہ'آدمی نامہ'،ایم۔آر۔پبلی کیشنز،کوچہ چیلان،دریا گنج،دہلی،2010،ص71
14. حسین،مجتبیٰ،مجموعہ'سفر لخت لخت'، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،کوچہ پنڈت ،لال کنواں، دہلی، 2011،ص112
15. حسین،مجتبیٰ،قطع کلام،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،لال کنواں،دہلی،2011،ص71
16. چشتی،حسن۔مجتبیٰ حسین کے منتخب کالم، جلد اول،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،کوچہ پنڈت،لال کنواں،دہلی،2004،ص53
17. حسین،مجتبیٰ،تکلف برطرف،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،کوچہ پنڈت،لال کنواں،دہلی،2011، ص41
18. چشتی،حسن۔مجتبیٰ حسین کے منتخب کالم، جلد دوم،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،کوچہ پنڈت،لال کنواں،دہلی،2004،ص243
19. حسین،مجتبیٰ،مجموعہ'سفر لخت لخت' ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،کوچہ پنڈت ،لال کنواں، دہلی، 2011،ص94

20. حسین ،مجتبیٰ،مجموعہ 'سفر لخت لخت' ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،کوچہ پنڈت ،لال کنواں،دہلی ، 2011،ص19
21. چشتی،حسن۔مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں جلداول،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،لال کنواں، دہلی ، 2011،ص472
22. چشتی،حسن۔مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں جلداول،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،لال کنواں، دہلی ، 2001،ص62
23. حسین،مجتبیٰ،قطع کلام،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،لال کنواں،دہلی،2011،ص33
24. حسین،مجتبیٰ،قطع کلام،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،لال کنواں،دہلی،2011،ص21
25. حسین،مجتبیٰ،مجموعہ 'آدمی نامہ'،ایم۔آر۔پبلی کیشنز،کوچہ چیلان،دریا گنج،دہلی،2010،ص95
26. حسین ،مجتبیٰ،مجموعہ 'سفر لخت لخت' م'، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،کوچہ پنڈت ،لال کنواں، دہلی ، 2011،ص49

❐ **Dr. Shahab Zafar Azmi**
Head, Department of Urdu
Patna University, Patna
Mob: 8863968168
Email: drshahabzafar.azmi@gmail.com

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:264-279
Dr. Ameena Tahseen, Mamlukat-e-Aasfia mein Taleem-e-Niswan ka Aagaz-o-Irteqa

آمنہ تحسین

مملکتِ آصفیہ میں تعلیمِ نسواں کا آغاز وارتقاء

دکن کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ عرصہ دراز سے یہاں کے مختلف علاقوں میں علم کی ترسیل و ترویج ہوتی رہی ہے۔قدیم دور کی مروجہ تعلیم وتدریس کے کئی ایک حوالے جہاں تاریخ کی کتابوں میں دستیاب ہیں وہیں بالخصوص عربی ،فارسی ،اردو کے علاوہ دیگر مقامی زبانوں میں تحریر کردہ کتابوں سے بھی ایسے شواہد مل جاتے ہیں جو تعلیم کے ابتدائی ذرائعوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔دکن کے علاقوں میں جو شاہانِ وقت رہے وہ نہ صرف خود مختلف زبانوں کے ماہر تھے بلکہ علوم وفنون میں بھی اپنی مہارت رکھتے تھے۔علم پرور بادشاہوں نے ریاستوں کے استحکام کے ساتھ ساتھ زبان وادب اور علم کی ترویج واشاعت پر بھی خاصی توجہ دی۔ 1

آصف جاہی عہد(1724 تا 1948ء) کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بخوبی علم ہوتا کہ یہاں تعلیم کے فروغ کی مختلف النوع کوششیں کی گئیں۔سلاطینِ آصفیہ تعلیم کے فروغ کے لیئے ہمیشہ کوشاں رہے۔اگرچہ آصف جاہی سلطنت کے قیام کا ابتدائی دور عدم استحکام کا دور رہا لیکن بہت جلد یہ مملکت ایک مستحکم اور ترقی یافتہ مملکت میں تبدیل ہوگئی۔اس کے پسِ پردہ سلاطین کے دانشورانہ معاملات واقدامات کے علاوہ بے شمار عالم وقابل اور مدبر افراد کی ریاست میں موجودگی اور مجموعی ترقی میں ان کی شراکت داری وکوششیں رہی ہیں۔ابتداء میں آصف جاہی سلطنت کا پایہ تخت' شہراورنگ آباد کو بنایا گیا تھا۔کچھ عرصہ بعد یعنی 1770ء میں پایہ تخت شہر حیدرآباد کو منتقل کیا گیا۔سلطنت کے قیام کے ابتدائی دور میں جو مدرسے قائم ہوئے ان میں لڑکیوں کے مدارس کا ذکر موجود نہیں ہے۔ابتدائی دور کے مدارس میں مولوی قمرالدین اور شیخ الاسلام کے مدرسے کافی مشہور تھے۔پایہ تخت کی حیدرآباد منتقلی کے بعد ریاست کی مجموعی ترقی اور جدید طرز

تعلیم کے فروغ کے لیے باقاعدہ کوششیں شروع ہوئیں۔ مدرسہ شجاعیہ، مدرسہ مولوی نورالعلیٰ، مدرسہ قطبِ عالم اور مدرسئہ مکہ مسجد وغیرہ کو ابتدائی مدارس کے ضمن میں خاص اہمیت حاصل تھی۔ ان کے علاوہ مندروں، مسجدوں، خانقاہوں اور مقبروں سے ملحقہ بے شمار ایسے مدارس قائم تھے جہاں مذہبی تعلیم کے علاوہ زبان وادب کی تعلیم کا بھی نظم تھا۔ جبکہ ان مدارس میں ذریعہ تعلیم تلگو، فارسی یا عربی ہوا کرتا تھا۔ ابتدائی درجات میں اردو زبان محض تفہیم وتشریح کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ خانقاہوں، درگاہوں سے ملحق مدرسوں میں عربی، فارسی، اردو اور مضمون ریاضی کے ساتھ ساتھ مقامی زبانیں بھی سکھائی جاتی تھیں۔ رفتہ رفتہ ان مدارس میں عربی، فارسی کی جگہ اردو ذریعہ تعلیم کی شروعات ہونے لگی۔ امیر پائیگا شمس العمراء ثانی نواب فخر الدین علی خاں نے مروجہ نصاب سے انحراف کرتے ہوئے ریاضی علم ہئیت، طبعیات، کیمیاء اور دوسرے سائنسی علوم کی کتابیں خود تصنیف وتالیف کیں۔ انھوں نے ماہرین السنہِ سے ترجمے کرائے اور حیدرآباد میں پہلا پریس ''مطبع سنگی شمسی الامراءٗ'' کے نام سے 1825ء میں قائم کیا۔ 1835ء کے بعد اس مطبع سے مسلسل مختلف علمی وادبی موضوعات پر کتابیں شائع ہوتی رہیں۔2ے

دراصل آصف جاہی عہد میں نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع (1244ھ تا 1273ھ) کا دورِ حکومت کئی اعتبار سے کافی اہم رہا۔ اسی دور سے قدیم طرزِ تعلیم سے ہٹ کر جدید تعلیم کے آغاز کی شروعات ہوئی۔ علاوہ ازیں سماجی سطح پر بھی کئی اصلاحی کام انجام دیے گئے۔ ان ہی کے دور میں یعنی 1843ء میں نواب محمد فخر الدین خاں شمس الامراء ثانی نے حیدرآباد میں پہلا ہائی اسکول ''مدرسہ فخریہ'' قائم کیا۔ اس اسکول میں سائنس کا مضمون بھی پڑھایا جانے لگا۔ 1848ء میں ''حیدرآباد میڈیکل اسکول'' قائم ہوا۔ جس میں پہلی مرتبہ طب کی کتابیں اُردو میں ترجمہ کرا کے دی جانے لگیں۔ 1855ء میں سالار جنگ نے ایک اور مدرسہ ''مدرسہ دارالعلوم'' قائم کیا۔ جہاں عربی، فارسی کے ساتھ ساتھ ریاضی اور سائنس کی تعلیم اُردو میں دی جاتی تھی۔3ے

انیسویں صدی کے وسط سے نہ صرف مستقر حیدرآباد میں مدارس کا اضافہ ہونے لگا بلکہ اطراف واکناف کے اضلاع میں بھی کئی مدارس قائم کیے گئے۔ جس کے نتیجے میں ابتدائی سطح پر جدید تعلیمی نظام مستحکم ہوتا گیا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے کالج کی ضرورت بھی محسوس ہونے لگی۔ جدید تعلیم کے بڑھتے رجحان نے مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم کی ضرورت کا بھی احساس بیدار کیا۔ یہ احساسِ بیداری ایک تحریک

کی شکل اختیار کر گئی جس کے نتیجے میں 1918ء میں جامعہ عثمانیہ کی بنیاد پڑی اور 1919ء سے جامعہ میں باقاعدہ تعلیم کی شروعات ہوئی۔اسی ماحول نے تعلیم نسواں کے لیے بھی سازگار ماحول فراہم کیا۔چنانچہ اس ضمن میں بھی مختلف النوع اقدامات اپنائے گئے۔

علم وخرد سے عاری ہمارا کلام تھا　　　تعلیم کا خیال نہ کچھ انتظام تھا

محکوم سب کے ہم تھے، یہی اپنا کام تھا　　　اور ''ناقصات العقل'' ہمارا ہی نام تھا

ہم سب کے سر کا بوجھ تھے دنیا پہ بار تھے

خود اپنی ہی نظر میں ذلیل اور خوار تھے 4

بشیر النساء بشیر کی نظم ''حدیثِ نسواں'' کے مذکورہ بالا اشعار ہندوستان میں عورت کی نہ صرف تعلیمی وسماجی پست حیثیت کو ظاہر کر رہے ہیں بلکہ ان کے متعلق سماج کی سوچ وفکر کے بھی ترجمان ہیں۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ انیسویں صدی کے اختتام تک بھی ہندوستانی عورتیں باقاعدہ تعلیم کے حصول سے کافی دور تھیں۔ماضی میں تعلیمِ نسواں کا کوئی مناسب نظم نہیں تھا اس لیے کہ لڑکیوں کے لیے تعلیم غیر ضروری تصور کی جاتی تھی۔ان کی تعلیم گھر پر ہوا کرتی تھی۔تعلیم کا وہ قدیم طریقہ کار بھی صرف جاگیردار اور امیر امراء یا علماء کے گھرانوں میں رائج تھا۔عام گھرانوں میں بالکل اس طرف توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ عورتوں کا بڑا طبقہ خواہ وہ کسی مذہب یا ذات سے تعلق رکھتی ہوں ناخواندہ ہی تھا۔

چونکہ مملکتِ آصفیہ ہندوستان کی مالی طور پر مستحکم ریاست تھی اور یہاں کئی ایک امیر وجاگیر دار افراد بستے تھے۔ان کی لڑکیوں کو تعلیم دینے کے لیے استانیاں معمور تھیں۔ یہ استانیاں اس دور کی مروجہ تعلیم کی نسبت سے علم وہنر میں ماہر تھیں اور اپنی علمی صلاحیتوں کا استعمال بھی کر رہی تھیں۔ان میں زیادہ تر ایسی خواتین تھیں جو صوفی، عالم وفاضل یا امیر امراء افراد کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔نصیر الدین ہاشمی نے آصف جاہی عہد کے حوالے سے ایسی چند خواتین کا ذکر کیا ہے۔جنھیں حکومتِ آصفیہ سے یومیے جاری ہوا کرتے تھے۔ان میں قابل ذکر، امتہ الرسول، (ایک روپیہ یومیہ)، حفیظ بیگم (چار آنے یومیہ)، سعید النساء (دو آنے یومیہ)، چاند بی بی (دو آنے یومیہ)، وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔5

اگر چہ انیسویں صدی کی شروعات سے ہی قومی سطح پر تعلیمِ نسواں کے متعلق شعور بیدار ہونے لگا تھا۔ بلکہ اصلاحِ معاشرہ کی تحریک کے نتیجے میں جہاں خواتین سے جڑے مسائل کے خاتمہ کی کوششیں

ہونے لگی تھیں وہیں تعلیمِ نسواں کو فروغ دینے کا رجحان بھی پیدا ہو گیا تھا۔ تاہم سماجی و تہذیبی سطح پر بے شمار رکاوٹیں تھیں جس کی وجہ سے ہندوستان میں تعلیمِ نسواں کو عام کرنے میں سخت دقتیں پیش آ رہی تھیں۔ مملکتِ آصفیہ میں بھی تقریباً وہی حالات تھے۔ اس کا اہم ثبوت ہمیں مردم شماری کی شماریات سے مل جاتا ہے۔ مملکتِ آصفیہ میں پہلی مرتبہ 1881ء میں مردم شماری منعقد کی گئی۔ اس کے مطابق ریاست میں اس وقت اکتیس لاکھ تین ہزار نو سو اٹھارہ (313918) مرد خواندہ تھے جبکہ صرف چار ہزار نو سو باسٹھ (4962) خواتین خواندہ تھیں۔6 چونکہ مملکتِ آصفیہ میں بھی عرصہ تک تعلیم نسواں کا کوئی باقاعدہ نظم نہیں تھا۔ اسی لیے خواندہ خواتین کی تعداد بالکل کم تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ سربراہانِ حکومت کے ساتھ ساتھ ذی شعور افراد نے بہت جلد اس اہم مسئلہ کی جانب توجہ دی اور لڑکیوں کے لیے مدارس قائم کرنے شروع کیے۔ مدارس کے قیام سے جہاں لڑکیوں کے لیے ابتدائی تعلیم کی بنیادیں استوار ہونے لگیں وہیں ۱۷ ؍اگست 1919ء میں جامعہ عثمانیہ میں تعلیم کی شروعات کے بعد سے انھیں اعلیٰ تعلیم کے مواقع بھی میسر آنے لگے جس کے نتیجے میں خواتین کی تعلیمی و سماجی حیثیت میں ایک انقلاب آفرین تبدیلی آتی گئی۔ جس کا حوالہ بشیر النساء بشیر کی اسی نظم ''حدیثِ نسواں'' میں ملتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں

علم و ادب سے آج ہر اک گھر ہے بوستاں　　فنی، تمدنی، ہوئیں حاصل ترقیاں
یہ اک کرشمہ شہ عثمان ہے اب یہاں　　لڑکوں کی طرح پاتی ہیں اسناد لڑکیاں

بنیاد عہد شہ میں ہوئی گرل گائیڈ کی
اس دور میں زنانہ کلب کی بنا ہوئی

قائم ہوئی ہیں انجمنیں اور بھی یہاں　　جلسے کہیں ہیں اور کہیں بزمِ سخنوراں
محرومِ علم اب نہ تو لڑکے نہ لڑکیاں　　گھر گھر سے اب ترقی تعلیم ہے عیاں

ممنون و مطمعین نظر آتے ہیں آج ہم
سرکار کے طفیل سے کرتے ہیں راج ہم

بہ طورِ مثال پیش کیے گئے ان اشعار کے حوالے سے خواتین کی تعلیم اور ترقی کے متعلق آصف جاہی سلطنت کے آخری بادشاہ میر عثمان علی خاں کی کاوشوں اور ان کے اثرات کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ دراصل عہدِ عثمانی (1911ء تا 1948ء) میں لڑکیوں کی تعلیم اور ان کی مجموعی ترقی کی طرف خاص طور پر

توجہ دی گئی۔

نظامِ ہفتم، میر عثمان علی خاں کا دورِ حکومت وہ دور تھا جب ہندوستان میں ہر طرف انقلاب رونما ہو رہے تھے۔ سیاسی، سماجی، علمی، ادبی تہذیبی اور صنعتی ترقی کے لیے جد وجہد کا آغاز ہو رہا تھا۔ آصف سابع نے پہلی بار طبقہ نسواں کے مسائل حل کرنے کی کوشش کی۔ جہالت، توہم پرستی اور تعصّبات کے پردوں کو گرا کر انھوں نے تعلیم ضروری قرار دی اور تعلیم کے مواقع فراہم کیے۔ زنانہ مدارس کھلے اور جامعہ عثمانیہ کے ساتھ ساتھ کلیہ اناث بھی وجود میں آیا۔ اس طرح خواتین کا احساس خوابیدہ بیدار ہوا۔ تعلیمی اور تمدنی حالت میں فرق ہوا اور انھیں اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع ملا۔7

اگر چہ کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد سے تعلیمِ نسواں کے رجحان میں تیز گامی آتی گئی اور لڑکیاں اعلیٰ تعلیم میں پیش رفت کرنے لگیں لیکن جامعہ کے قیام سے قبل یعنی آصف جاہی سلطنت کے بادشاہ ناصر الدولہ اور ان کے بعد میر محبوب علی خاں کے عہدِ حکومت میں تعلیم کو فروغ دینے کے لیے سرکاری اور سماجی سطح پر کی گئی کوششوں کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔8 ناصر الدولہ نے ریاست میں جدید تعلیم کی شروعات پر توجہ دی جبکہ تعلیمِ نسواں کی شروعات میر محبوب علی خاں کے دور سے ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اس دور میں لڑکیوں کے لیے ابتدائی سطح کی تعلیم کو فروغ دینے کی کوششیں نہیں ہوئی ہوتیں تو جامعہ عثمانیہ میں اعلیٰ تعلیم کے حصول تک پہنچنے میں لڑکیوں کو اور بھی برسوں کا وقت لگ جاتا۔ چونکہ تعلیمِ نسواں کے فروغ میں کئی ایک رکاوٹیں حائل تھیں لہٰذا بیک وقت مختلف سماجی برائیوں، جیسے کم عمری کی شادی، کثیر زوجگی نظام، بیوہ کی دوبارہ شادی کی ممانعت اور سخت پردہ کے نظام کے تدارک کی بھی کوششیں کی گئیں۔ اس ضمن میں "محکمہ تعلیمات" کو نہایت فعال بنایا گیا اور جدید طرزِ تعلیم کے مدارس قائم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کو اس محکمہ کا ناظم بنایا گیا تھا۔

1873ء میں نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی حیدر آباد آ گئے تھے اور مختلف اہم عہدوں پر خدمات انجام دے رہے تھے لیکن ناظمِ تعلیمات کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد سے انھوں نے ریاست میں تعلیم کو فروغ دینے کی ان تھک کوششیں کیں اور بہت سے جدید اصلاحات اپنائے۔ مملکتِ آصفیہ میں روایتی تعلیم سے ہٹ کر جدید تعلیم کو عام کرنے، اسکولوں اور کالجوں کو قائم کرنے میں عماد الملک کے کردار کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی کوششوں سے ایک مدرسہ نسواں بھی قائم کیا گیا تھا۔ یہ پہلا مدرسہ نسواں تھا۔ جہاں

عربی، فارسی اور انگریزی کی تعلیم کے ساتھ سوزن کاری اور امورِ خانہ داری کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ لڑکیوں کی آمد و رفت کے لیے شکرام کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔9؎ جبکہ عماد الملک کی صاحبزادی طیبہ بلگرامی (بیگم خدیو جنگ) لکھتی ہیں کہ

''حیدر آباد میں میری والدہ کی کوششوں سے لڑکیوں کے لیے ایک مدرسہ کھولا گیا تھا۔ جس میں خود اعلیٰ حضرت غفرانِ مکاں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ یہاں بہت سی ایسی بیبیاں موجود ہیں جو وہاں سے تعلیم پائی ہیں۔ دوسرا، اسکول لیڈی کیا ہن واکر صاحبہ کی کوششوں سے قائم ہوا۔ اس میں کل یوروپین معلمین ہیں۔ اس میں ہر قسم کی تعلیم لڑکیوں کو دی جاتی ہے۔''10؎

مذکورہ حوالوں سے یہ وضاحت نہیں ہو پاتی ہے کہ عماد الملک اور ان کی بیگم نے علیٰحدہ طور پر دو الگ مدرسے قائم کیے تھے یا یہ ایک ہی مدرسہ تھا جس کا ذکر مختلف جگہ کیا گیا ہے۔ بحرِ حال یہ شواہد بتاتے ہیں کہ بیسویں صدی سے عرصہ قبل ہی مملکتِ آصفیہ میں لڑکیوں کے ابتدائی مدارس قائم ہونے لگے تھے اور خواتین بھی اس مقصد کی تکمیل کے لیے آگے آ رہی تھیں۔ دراصل انیسوی صدی میں عالمی اور قومی سطح پر رونما ہونے والی سیاسی و سماجی تبدیلیوں، بشمول تعلیمِ نسواں کی اہمیت کا رجحان ہندوستان کے بیشتر ریاستوں میں نظر آنے لگا تھا۔ اسی دور میں مملکتِ آصفیہ کے علاقوں میں بھی تعلیمِ نسواں کا رجحان پیدا ہونے لگا۔ ابتدائی دور میں متمول گھرانوں کے تعلیم یافتہ اور باشعور افراد اپنی حویلیوں یا گھروں پر مدرسے قائم کرنے لگے۔ مثلاً ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادھیائے (سروجنی نائیڈو کے والد)، جنھیں عماد الملک نے نظام کالج کا پرنسپل مقرر کیا تھا۔ انھوں نے 1881ء میں لڑکیوں کے لیے ایک اسکول شروع کیا تھا۔ اس اسکول میں ہندو اور مسلم دونوں مذاہب کی لڑکیاں تعلیم حاصل کرنے جایا کرتی تھیں۔ وہاں مختلف زبانوں کی تعلیم کے علاوہ تاریخ اور جغرافیہ جیسے مضامین بھی پڑھائے جاتے تھے۔ ابتدائی دور میں قائم کیے گئے اسکولوں میں ''مدرسہ پکھراج پیٹھ'' (ضلع ناندیڑ) بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ مدرسہ 1882ء میں قائم کیا گیا جہاں لڑکیوں کو مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ دیگر زبانیں بھی پڑھائی جاتی تھیں۔ دیگر اسکولوں میں، مدرسہ نور النساء بیگم، اسٹینلی گرلز اسکول (قیام 1895ء) نوبلز اسکول (قیام 1900ء) وغیرہ بھی قابلِ ذکر ہیں۔

مملکتِ آصفیہ میں کرسچن مشنیریز بھی کافی سرگرم رہیں۔ مشنیریز کے تحت 1834ء میں چرچ

آف انگلینڈ کے پادری نے حیدرآباد میں ''رومن کیتھولک'' اسکول قائم کیا تھا۔لڑکیوں کو تعلیم دینے کی غرض سے یہ اسکول سینٹ جارج چرچ سکندرآباد میں قائم کیا گیا۔1865ء میں جب چرچ کی جدید عمارت تیار ہوگئی تو قدیم عمارت اسکول کے لیے وقف کر دی گئی اور اس میں باقاعدہ تعلیم کا نظم کیا گیا۔اس اسکول کا نام ''سینٹ جارج گرامر اسکول'' رکھا گیا۔1850ء کے بعد سے ہی اپنی لڑکیوں کی تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر کرسچن مشنیریز والوں نے ''گرلس سمیٹری'' کے نام سے ایک اسکول شروع کیا تھا۔شروعات میں اس اسکول میں ان کی ہی لڑکیوں کو داخلہ دیا جاتا تھا۔مذکورہ مدارس کے علاوہ ''رادھا بائی کالوجی، رکمنی بائی پنگلے'' کی یادگار میں ان کے فرزند رنگ راؤ کالوجی نے چادرگھاٹ کے علاقہ میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔اسی برس وشنو پنڈت نارائن ڈنگرے نے ریزیڈنسی میں ایک اسکول قائم کیا۔اس سے کچھ عرصہ قبل یعنی 1880ء میں ''پاٹ شالہ'' کے نام سے ایک اسکول قائم کیا گیا تھا۔اس میں لڑکیوں کو بھی تعلیم دی جاتی تھی۔1884ء سے اس مدرسہ کو سرکارِ عالی سے ماہانہ امداد اور وظیفہ جاری ہوا تھا۔مذکورہ مدارس غیر سرکاری سطح پر قائم ہوئے تھے لیکن بعد میں میر محبوب علی خاں نے ان میں سے بیشتر مدارس کو امداد فراہم کی اور سرکارِ آصفیہ کی نگرانی میں لینے کا حکم جاری کیا۔اسی دور میں جہاں غیر سرکاری مدارس قائم ہونے لگے وہیں باقاعدہ سرکاری مدارس کی شروعات بھی ہوئی۔اس ضمن میں سب سے قدیم مدرسہ ''زنانہ مدرسہ'' کا نام قابلِ ذکر ہے۔یہ مدرسہ 1890ء میں نامپلی علاقہ میں قائم کیا گیا۔پہلے برس صرف سولہ طالبات نے داخلہ لیا تھا۔ابتداء میں اس اسکول کا نصابِ تعلیم پنجاب یونی ورسٹی سے ملحق رکھا گیا تھا لیکن ان کو سرکاری طور پر امتحان دینے کی اجازت نہیں مل پائی تھی اسی لیے کچھ برسوں تک طالبات ''میٹریکیولیشن سرٹیفیکٹ'' کے لیے غیر سرکاری طور پر شریکِ امتحان ہوتی تھیں۔بعد میں اس اسکول کا الحاق مدراس یونیورسٹی سے ہوگیا اور لڑکیوں کو باقاعدہ امتحان لکھنے کی اجازت بھی مل گئی۔لہٰذا 1907ء میں اس اسکول کا باقاعدہ افتتاح عمل میں آیا اور قابل و تربیت یافتہ خاتون اساتذہ کی تقرری عمل میں لائی گئی۔مذکورہ اسکول کے احیاء کے بعد سے تعلیمِ نسواں کے رجحان میں اضافہ ہوتا گیا۔11

تعلیمِ نسواں کے فروغ میں ایک اور اہم سنگِ میل ''محبوبیہ گرلس اسکول'' کے قیام کو قرار دیا جاسکتا ہے۔یہ اسکول بھی 1907ء میں شروع کیا گیا۔محبوبیہ اسکول کا قیام سر اکبر حیدری، ان کی بیگم آمنہ حیدری (بہ موسوم لیڈی حیدری)، سروجنی نائیڈو، مسز سراب جی، مسز نندی اور طیبہ بیگم بلگرامی (مسز خدیو

جنگ) کا مرہونِ منت ہے۔ان افراد کی کوششوں سے میر محبوب علی خاں نے اس اسکول کے لیے سالانہ 1000 روپے امداد مقرر کی تھی۔اس اسکول کی ابتدا میں عموماً امیر امراء کی لڑکیاں ہی داخلہ لیا کرتی تھیں لیکن بعد میں عام گھرانوں کی لڑکیاں بھی داخلہ لینے لگیں۔نصابِ تعلیم جدید طریقہ تعلیم پر مبنی تھا اور کیمبرج یونیورسٹی کے نصاب کے مطابق رکھا گیا تھا۔ابتداء میں زیادہ تر اساتذہ انگریز یا یوروپین خواتین تھیں۔ ان کے ساتھ حیدرآباد کے علاوہ ہندوستان کے دیگر مقامات کی قابل خواتین کو بھی درس وتدریس کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔اسی دور میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی شائق طالبات کو حکومت کی جانب سے مراعات اور وظائف بھی دیے جانے لگے تھے تاکہ وہ دوسری ریاست یا ملک سے باہر جاکر اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکیں۔ اس ضمن میں ایک اہم مثال سروجنی نائیڈو کی لی جاسکتی ہے۔انھیں انگلینڈ جاکر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے آصف جاہی حکومت سے وظیفہ دیا گیا تھا۔

مملکتِ آصفیہ میں چونکہ سخت پردہ کا نظام رائج تھا اسی لیے ابتداء میں مخلوط تعلیم کے بجائے لڑکیوں کے لیے علیحدہ اسکولس قائم کیے گئے حتیٰ کہ مشنیری اسکولس کے کنڈرگارٹن کی تعلیم میں بھی مخلوط تعلیم کا نظم نہیں تھا۔کچھ عرصہ بعد یہ تبدیلی آئی کہ جہاں مشنیری اسکولس میں لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کو بھی داخلہ دیا جانے لگا وہیں پرائمری سطح پر ایسے سرکاری اسکول قائم ہوئے جس میں مخلوط تعلیم ہونے لگی۔ مملکتِ آصفیہ میں اعلیٰ تعلیم کی شروعات نظم کالج سے ہوئی۔یہ کالج 1887ء میں قائم ہوا۔تعلیم کے فروغ میں اسے ایک اہم سنگِ میل قرار دیا جاسکتا ہے۔اس کالج کا الحاق برسوں تک مدراس یونی ورسٹی سے رہا۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد مدراس یونی ورسٹی سے اس کا الحاق ختم کردیا گیا۔چونکہ عرصہ تک لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے علیحدہ کالج قائم نہیں تھے اسی لیے زنانہ اسکول، نامپلی کی لیونگ سرٹیفکیٹ کامیاب لڑکیوں کو نظام کالج میں داخلہ کی اجازت دی گئی تھی۔اس طرح لڑکیوں کے لیے مخلوط تعلیم اسی کالج سے شروع ہوئی جس سے چند ایک لڑکیوں نے استفادہ کیا۔

1909ء میں شائع شدہ ایک رپورٹ کے مطابق لڑکیوں کے لیے قائم کیے گئے ہائی اسکول کی تعداد (14)، مڈل اسکولز (178) اور (877) پرائمری اسکولز ریاست میں قائم تھے جبکہ (18) ''تعلیم المعلمات'' کے ادارے قائم کیے گئے تھے۔جہاں ٹیچرز ٹریننگ کی سہولت دستیاب تھی۔اسی دوران آصف سابع، میر محبوب علی خاں کے حکم سے ریاست میں تعلیمِ نسواں کے متعلق جائزہ لیا گیا اور میہو کی جانب سے

1911ء میں ایک رپورٹ پیش کی گئی۔اس رپورٹ میں اس وقت مروجہ تعلیمی نظام اور نصاب کے نقائص اور تربیت یافتہ خاتون اساتذہ کی کمی کی نشاندہی کی گئی۔چنانچہ اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد''مدرسے برائے تعلیم المعلمات'' زیادہ سے زیادہ قائم کیے گئے۔نصابِ تعلیم پر بھی توجہ دی جانے لگی اور ضرورتِ وقت کے مطابق مضامین شامل کیے جانے لگے۔12

تعلیم وترقی نسواں کے ضمن میں ''حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس'' کا قیام اور اس انجمن کے تحت کیے جانے والے اقدامات کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔اس کانفرنس کے قیام (1324ف م1914ء) کی ابتداء ہی سے تعلیمِ نسواں کو اس کے مقاصد میں شامل رکھا گیا تھا۔اس کانفرنس کے تحت ضرورت مند وغریب لڑکیوں کو تعلیم کے حصول کے لیے مالی امداد دی جاتی تھی۔دور دراز علاقوں سے غریب لڑکیوں کی اسکول کو آمد ورفت کے لیے'' شکرام'' کا انتظام بھی کرنا ہوتا تھا۔سرکارِ اعلی سے امداد حاصل کر کے اس کانفرنس کی جانب سے شہر حیدرآباد کے علاوہ مضافات میں لڑکیوں کے اسکول اور ان کی صلاحیتوں کے فروغ کے لیے تربیتی ادارے قائم کیے گئے تھے۔13

گذشتہ صفحات پر پیش کی گئی تفصیلات سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ مملکت آصفیہ میں تعلیمِ نسواں کو فروغ دینے کی کوششیں دراصل ایک تحریک کی شکل اختیار کرگئی تھیں۔اس ضمن میں نہ صرف مدارس قائم کیے جارہے تھے بلکہ انجمنوں کا قیام،حقوقِ نسواں کے موضوعات پر جلسوں کا انعقاد، تعلیمِ نسواں کی ضرورت واہمیت پر مضامین کی اخبارات ورسائل میں اشاعت نے گویا سماج میں بیداری پیدا کردی تھی جس کے نتیجے میں تعلیمِ نسواں کا رجحان تیزی سے فروغ پانے لگا تھا۔سماجی مسائل اور تعلیم نسواں پر شعور بیداری میں حیدرآباد سے شائع ہونے والے رسائل کی اہم حصّہ داری کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔حیدرآباد سے شائع ہونے والے رسائل میں اگرچہ ادبی مضامین کی کثرت ہوتی تھی لیکن وہیں سماجی مسائل اور تعلیمِ نسواں کی اہمیت پر مختلف مضامین نیز جدید نصابِ تعلیم پر مباحث بھی شائع ہوا کرتے تھے۔خواتین کی ادارت میں شائع ہونے والے رسائل سے صرفِ نظر اس دور کے قابلِ ذکر رسالے ''خیالِ محبوب (1887ء)،رسالہ معلمِ نسواں (1894ء)، رسالہ دلگداز (1897ء)، دکن ریویو (1902ء)، رسالہ صحیفہ (1905ء)، رسالہ ادیب (1908ء)، رسالہ المحب (1910ء) رسالہ تاج (1914ء)، رسالہ ارتقاء (1921ء)، رسالہ ترقی (1922ء)، رسالہ تجلی (1927ء)، مجلّہ

مکتبہ(1928ء)، نظام کالج میگزین (1923ء)، رسالہ سب رس(1936ء)، رسالہ شہاب (1933ء)،مجلّہ عثمانیہ(1927ء)، الموسیٰ(1933ء)، رسالہ نظام ادب(1940ء)، رسالہ نیا زمانہ(1947ء)،رسالہ مینا(1947ء)''وغیرہ چند اہم نام ہیں۔14؎

مذکورہ رسائل میں رسالہ ''معلم ِنسواں'' کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔مولوی محبّ حسین نے رسالہ ''معلمِ نسواں'' 1894ء سے شائع کیا۔''معلمِ نسواں'' حیدرآباد میں خواتین کے متعلق شائع ہونے والا پہلا رسالہ تھا۔اس میں خواتین کی تعلیم ومسائل سے متعلق ہی مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ مولوی محبّ حسین تعلیمِ نسواں کے زبردست حامی اور سخت پردے کے نظام کے بڑے مخالف تھے۔ان موضوعات پر وہ خود بھی لکھتے رہے اور دوسرے قلم کاروں بشمول خواتین قلم کاروں میں بھی وہی رجحان پیدا کیا۔رسالہ ''معلمِ نسواں'' سے ان کا تحریر کردہ ایک قطعہ ملاحظہ کیجیے۔

اس جہل کی تکلیف سہوگی کب تک　　غیروں سے اعانت کو کھوگی کب تک
اے عورتو، پڑھ لکھ کے حقوق اپنے لو　　مردوں کی غلامی میں رہوگی کب تک15؎

مملکتِ آصفیہ میں تعلیمِ نسواں کے متعلق شعور بیدار کرنے میں کئی خواتین آگے آئیں اور انجمنوں کی صدارت کے ساتھ ساتھ رسالوں کی ادارت کی ذمہ داریاں بھی سنبھالیں۔ان رسائل میں تعلیمِ نسواں کے علاوہ دیگر سماجی برائیوں نیز حقوقِ نسواں کے متعلق مضامین شائع ہوتے رہے۔جس کے نتیجے میں خواتین کی تعلیم وترقی کے لیے راہیں ہموار ہوتی رہیں۔خواتین کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالوں میں'' ماہ نامہ النساء'' کی اہمیت مسلم رہی ہے۔یہ رسالہ اپریل1920ء سے صغرا ہمایوں مرزا کی ادارت میں شائع ہونے لگا۔''النساء'' کے مشمولات میں خواتین کی تعلیم وترقی سے جُڑے تمام موضوعات پر مضامین اور شاعرات کے کلام شامل کیے جاتے تھے۔صغرا ہمایوں مرزا کی ادارت میں1940ء سے ''رسالہ زیب النساء'' بھی نکلنے لگا۔یہ رسالہ لاہور سے شائع ہوا کرتا تھا۔رسالہ ''ہمجولی'' جولائی1931ء سے شائع ہوا۔اس رسالہ کی مدیرہ سیدہ بیگم خویشگی تھیں۔1932ء میں رسالہ ''سفینہ نسواں'' کا اجراءعمل میں لایا گیا۔یہ رسالہ صادقہ قریشی اور اختر قریشی کی ادارت میں شائع ہونے لگا۔''رسالہ مومنہ''صبیحۃ النساء بیگم اور محترمہ صغریٰ بیگم کی ادارت میں1941ء سے شائع ہونے لگا۔اس رسالہ کی اجراء کے مقاصد میں بھی طبقہ نسواں کی تعلیم اور اصلاح شامل تھی۔رسالہ ''خیابانِ دکن''1944ء سے شائع ہونے لگا۔اس

رسالہ کی مدیرہ حمیدہ عسکری تھیں۔علاوہ ازیں لڑکیوں کے مدارس و کالجوں سے شائع ہونے والے رسالوں میں، زنانہ ہائی اسکول میگزین، محبوبیہ اسکول میگزین، زنانہ کالج میگزین اور کلیہ اناث میگزین' قابلِ ذکر ہیں۔ان رسائل کے ذریعہ نہ صرف طالبات میں اعلیٰ تعلیم کا شوق بیدار کرنے میں مدد ملی بلکہ ان میں تخلیقی ذوق کی آبیاری بھی ہوتی رہی۔مملکتِ آصفیہ کے انضمام سے قبل شائع ہونے والے مذکورہ اردو رسائل کے علاوہ تلگو زبان میں بھی رسائل شائع ہوتے رہے جو تعلیم اور حقوقِ نسواں کی تحریک کو آگے بڑھانے میں مددگار و معاون بنتے رہے۔

خواتین کی تعلیم و ترقی میں خواتین کی انجمنوں کی خدمات بھی فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ مملکتِ آصفیہ میں یوں تو بہت سی انجمنیں نہایت فعال تھیں اور ان سے وابستہ افراد نے تعلیمِ نسواں کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دیے تھے لیکن یہاں صرف چند ایک ابتدائی انجمنوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔۱۹۰۳ء میں طیبہ بیگم (بیگم خدیو جنگ) کے گھر پر چند ایک حیدرآبادی اور یوروپین خواتین کی موجودگی میں ''حیدرآباد لیڈیز اسوسی ایشن'' کی بنیاد ڈالی گئی اور یہ طے کیا گیا کہ آئندہ برسوں میں ایک ایسی قومی انجمن قائم کی جائے جس کا مقصد تعلیمِ عام اور خاص تعلیمِ نسواں رہے۔اس کے ممبر ہر سال ایک جلسہ مثل مردانہ ایجوکیشنل کانفرنس کے منعقد کریں گے۔16؎ آگے چل کر طیبہ بیگم نے 1913ء میں ''انجمن خواتینِ اسلام'' قائم کی۔اس انجمن نے حیدرآباد میں خواتین کی فلاح و بہبود اور تعلیم کے فروغ کے لیے بہت سے کام کیے۔انجمن سے جڑے تمام افراد سے مالی امداد لی جاتی تھی اور حیدرآباد کے علاوہ قرب و جوار میں لڑکیوں کی تعلیم کا نظم کیا جاتا تھا۔ان مدارس میں غریب لڑکیوں کو تعلیم کے ساتھ مختلف ہنر بھی سکھائے جاتے تھے۔17؎

تعلیمِ نسواں کے فروغ میں فعال کردار ادا کرنے والی خواتین میں طیبہ بیگم کے بعد دوسرا اہم نام' بیگم صغراء ہمایوں مرزا کا لیا جاتا ہے انھوں نے تعلیم اور ترقی نسواں کے لیے دامے، درمے اور سخنے ہر طرح سے اپنی حصّہ داری نبھائی بلکہ انھوں نے اس کاز کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر رکھی تھی۔صغرا ہمایوں مرزا نے 1919ء میں ''انجمن خواتینِ دکن'' قائم کی تھی۔اس انجمن کے تحت کئی علمی و ادبی اور تربیتی ادارے بنائے گئے اور خواتین میں تعلیم نیز اپنے حقوق اور مقام و مرتبہ کے متعلق شعور بیداری پیدا کرنے کی کوششیں کی گئیں۔رسالہ ''النساء'' بھی اسی انجمن کے تحت شائع ہوا کرتا تھا۔صغراء ہمایوں مرزا نے تعلیم

اور حقوقِ نسواں کے متعلق شعور بیداری کے لیئے اپنی تحریروں سے خوب مدد لی۔ان موضوعات پر ان کے کئی ناول،افسانے،مضامین اورنظمیں منظرِ عام پر آئے۔وہ خود اپنی ایک نظم میں لکھتی ہیں:

اے حیا میں بادہ حبّ وطن سے مست ہوں　　وقفِ تعلیم النساء میرا جہاں زندگی

خدمتِ قومی میں گذرے عمر کے تینتیس سال　　کیا سناؤں آپ کو میں داستان زندگی 18

واقعہ یہ ہے کہ مملکتِ آصفیہ میں تعلیمِ نسواں کو عام کرنے کے لیے ابتدائی سطح پر جو کوششیں کی گئیں گویا وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے سازگار ماحول فراہم کر گئیں۔لہٰذاء جب جامعہ عثمانیہ میں تعلیم کی شروعات ہوئی اس کے چند برسوں بعد ہی لڑکیاں بھی اعلی تعلیم کی سطح تک پہنچ گئیں۔چونکہ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں نہ صرف مستقر حیدرآباد میں مدارس کا اضافہ ہونے لگا تھا بلکہ اطراف واکناف کے اضلاع میں بھی کئی مدارس قائم ہو گئے تھے اورلڑکیاں تعلیمی مدارج طے کرنے لگی تھیں وہیں آگے تعلیم کو جاری رکھنے کے لیے انھیں کالج کی ضرورت بھی محسوس ہونے لگی تھی۔چنانچہ لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ عثمانیہ کے تحت 1924ء میں ''کلیہ اناث (بہ موسوم ویمنس کالج۔کوٹھی)'' کا قیام عمل میں لایا گیا۔اس کالج کی شروعات تعلیمِ نسواں کے لیے ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوئی۔اس کالج میں پہلی مرتبہ طالبات کے لیے ایف اے (انٹر میڈیٹ) کی تعلیم 1924ء سے شروع کی گئی۔بعد میں گریجویشن کے کورس کی بھی شروعات ہوگئی۔یہ کلاسس پہلے زنانہ اسکول (نامپلی) کے زیرِ انتظام اسی عمارت میں ہوا کرتی تھیں۔'' موجودہ گورنمنٹ جونیر کالج ، نامپلی میں ویمنس کالج برسوں سمایا رہا۔جہاں نرسری سے ڈگری تک کی جماعتیں شامل تھیں۔1941ء میں زنانہ کالج کی کلاسس ''گولڈن تھریشولڈ'' میں منتقل کی گئیں۔19

اس موقع پر سلطانہ شرف الدین کی تحریر سے ایک اقتباس پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔جو انھوں نے 1941ء کے برس کی یادیں تازہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

> '' پہلی بار کوئی پچاسی طالبات نے انٹر کے سالِ اوّل میں داخلہ لیا تھا۔ہم نے جب بلبلِ ہند کی ''سنہری چوکھٹ (گولڈن تھریشولڈ)'' میں قدم رکھا۔بے خوف اور مسرور۔اعلیٰ تعلیم کا ارمان لیے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے فضائیں ہماری منتظر ہوں۔۔۔۔فرسٹ ایر میں شہر سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ریاستِ حیدرآباد کے اضلاع سے بھی اچھی خاصی تعداد آئی تھی۔برہمن

اور مرشد زادیاں، قدیم کائست اور کھتری گھرانوں کی پردہ نشین لڑکیاں، جنگ
دولہ کی پڑھائی سے بے نیاز بیٹیاں اور بھانت بھانت کی لڑکیاں‘‘20

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ریاست میں اردو ذریعہ تعلیم عام تھی۔لہٰذا اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ عثمانیہ میں ذریعہ تعلیم اردو ہونے کے باوجود تعلیم حاصل کرنے والوں میں تمام مذاہب کی لڑکیوں نے داخلہ لیا تھا اور مختلف مضامین میں اعلیٰ تعلیم کے مدارج طے کی تھیں۔انھیں وہ تمام تر مواقع اا ور سہولتیں فراہم کی گئی تھیں جس سے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول تک پہنچ پاتیں۔جامعہ عثمانیہ کے تحت قائم کردہ ویمنس کالج، جیسا کہ پچھلے سطور میں لکھا گیا کہ 1941ء سے گولڈن تھریشولڈ کی عمارت میں کام کرتا رہا۔پھر نواب علی یاور جنگ، وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ کی کوششوں سے 1948ء میں یہ کالج ’’برٹش ریسیڈینسی (کوٹھی)‘‘ میں مستقل طور پر منتقل ہوگیا۔اس وقت بیگم زین یار جنگ کالج کی پرنسپل تھیں۔علی یاور جنگ نے جامعہ کے طلبا و طالبات کو اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ و امریکہ بھیجنے کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ اگر چہ کہ یہ سلسلہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے چند برسوں بعد شروع کیا گیا تھا لیکن پہلی جنگ آزادی کے بعد روک دیا گیا تھا۔ دوبارہ شروعات کے بعد زیادہ تر لڑکیوں نے اس سے استفادہ کیا۔21

چونکہ ریاستِ حیدرآباد میں پردہ کا سخت نظام رائج تھا۔اگر چہ کہ اس میں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔باوجود اس کے بیشتر خاندانوں کی لڑکیاں ’’ویمنس کالج‘‘ میں ہی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔جبکہ نظام کالج کے علاوہ آرٹس کالج (جامعہ عثمانیہ) کے مختلف شعبہ جات میں بھی انھیں داخلہ دیا جانے لگا تھا۔جہاں پردہ کی پابندی کے ساتھ مخلوط تعلیم میں شامل ہونے کی انھیں اجازت دی گئی تھی۔

آرٹس کالج (عثمانیہ یونی ورسٹی) کے قیام کے بعد کئی برسوں تک اس کے باب الداخلہ سے لڑکیوں کو آمدرفت کی اجازت نہیں تھی بلکہ عمارت کی دوسری جانب کھلنے والے دروازہ سے انھیں کالج میں داخل ہونا پڑتا تھا۔اس دور میں گاڑی، رکشہ یا شکرام پر پردے لگے ہوتے۔ان ہی سواریوں سے لڑکیاں کالج آتیں اور ان کے لیے مختص کردہ دروازے سے داخل ہوجاتیں۔ کلاس رومس میں پچھلی نشستوں پر ان کے بیٹھنے کا انتظام ہوا کرتا تھا۔کلاس روم کے درمیانی حصّہ میں بھی پردہ لگا ہوتا۔سامنے کی نشستوں میں لڑکوں کے بیٹھنے کا انتظام ہوتا تھا۔کلاس کے باہر ایک خادمہ ہمہ وقت ان کے لیے حاضر رہتی۔چند برسوں بعد نظامِ پردہ ختم کردیا گیا۔ابتداء میں صرف چند لڑکیاں آرٹس کالج آیا کرتی تھیں لیکن

جیسے جیسے سماج میں ذہنی تبدیلی آتی گئی اور لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کی اہمیت سمجھ آنے لگی ویمنس کالج کے علاوہ آرٹس کالج میں داخلہ لینے والی لڑکیوں کی تعداد میں بھی خوب اضافہ ہوا۔ دراصل آصف جاہ ہفتم میر عثمان علی خاں کی جانب سے جامعہ عثمانیہ کا قیام اور تعلیمِ نسواں کے ضمن میں اٹھائے گئے تمام تر اقدامات نہایت کارگر ثابت ہوئے۔ چنانچہ اس دور میں تعلیم کے لیے آگے آنے والی خواتین مختلف مضامین میں علم کے حصول کے بعد اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر سماج میں اپنی بھرپور شناخت بنائی اور بعد کے آنے والی نسلوں کے لیے راہیں ہموار کیں۔22؎

مملکتِ آصفیہ کے 1947ء میں انضمام تک جامعہ عثمانیہ ذریعہ تعلیم اردو ہی تھا۔ جبکہ اس تمام عرصہ میں مختلف زبانوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ سائنسی وسماجی علوم، انجینئرنگ، میڈیسن، وکالت اور دیگر مضامین کے نہ صرف شعبے قائم ہوئے بلکہ جامعہ عثمانیہ کے تحت مختلف مقامات پر کالج قائم کیے گئے۔ تمام شعبہ جات اور کالجس نہایت کامیابی سے کام کرتے رہے۔ ان شعبہ جات سے استفادہ کرنے والوں میں مختلف زبانوں کے بولنے والے مرد وخواتین شامل تھے۔ خاص طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بھرپور وسائل اور مواقع نے خواتین کی تعلیم وترقی کے لیے نئی راہیں فراہم کی تھیں جن پر چل کر خواتین آگے بڑھتی رہیں اور مختلف شعبہ ہائے حیات میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ اگرچہ ابتداء میں علم کے حصول کے بعد روزگار سے جڑنے کا رجحان کم ہی رہا۔ اس کی بنیادی وجہ اس دور کے سماجی نظریات اور رجحانات کے علاوہ ریاست کے عوام کی خوشحالی کو بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ چونکہ خواتین کی معاشی حصّہ داری کی ضرورت اتنی شدت سے محسوس نہیں کی جاتی تھی جتنی کہ آج محسوس کی جارہی ہے۔ اسی لیے روزگار سے جڑنے کا رجحان ابتدائی دور میں کم تھا۔ تاہم چند شعبوں جیسے تعلیم، صحت، بچوں کی نگہداشت یا سماجی بہبود وغیرہ میں دھیرے دھیرے خواتین اپنی خدمات انجام دینے لگیں بعد میں دیگر شعبوں میں بھی ان کی حصّہ داری بڑھنے لگی۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد سے اعلیٰ تعلیم کے مواقع، علمی وادبی اور سماجی انجمنوں کا قیام، تربیتی اداروں کی شروعات اور صنفی مسائل کے تدارک کی کوششوں کے نتیجے میں لڑکیوں کو تعلیم کے حصول اور ترقی کے زیادہ سے زیادہ مواقع ملنے لگے لہٰذا ان کے موقف میں بھی نمایاں تبدیلیاں آتی گئیں اور مختلف شعبہ ہائے حیات میں ان کی ترقی تیز گام ہوتی گئی۔ خواتین کی تعلیم اور ترقی کے ضمن میں ہونے والی تبدیلیاں صرف ریاستِ حیدرآباد تک محدود نہیں رہیں بلکہ وہ نہ صرف قومی سطح پر مجموعی ترقی کا حصّہ بھی بنتی رہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی مختلف میدانوں میں کامیاب وکامران ہوئیں۔ جن کا سلسلہ جاری ہے۔

مملکتِ آصفیہ میں تعلیمِ نسواں کے فروغ کی کوششوں نے ریاست میں خواتین کی تعلیم و ترقی کے لیے گویا مستحکم بنیادیں استوار کیں۔ جن پر بعد کے برسوں میں کامیابی کی شاندار عمارتیں تیار ہوتی رہیں۔ اس ضمن میں جامعہ عثمانیہ کے تحت فراہم کردہ تمام تر وسائل ہوں یا اس سے قبل کی گئی چھوٹی بڑی بنیادی کوششیں انھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان کی اہمیت سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے مرد اساس سماج میں تعلیمِ نسواں کی شروعات اور اس کو فروغ دینے کی کوششیں ہمیشہ ایک چیلنج بنی رہیں۔ باوجود اس کے مملکتِ آصفیہ کے سلاطین اور ذی شعور افراد نے اپنی جاں توڑ کوششوں سے تعلیمِ نسواں کو عام کرنے کی نہایت کامیاب سعی کی۔ جس کے نتائج آج ہم قومی ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر مختلف میدانوں میں کامیاب و کامران خواتین کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ خواتین کی یہ تصویر بنانے میں ماضی کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ وہ کوششیں ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم و روشن باب ہیں۔ باوجود اس کے تاریخ نگاروں نے تعلیمِ نسواں کے حوالے سے مملکتِ آصفیہ میں کیے جانے والے اقدامات کا ذکر فراموش کر رکھا ہے۔ جس کی طرف توجہ دینے اور ماضی کے ان اہم اقدامات کو متعارف کروانے کی ضرورت ہے۔ تاکہ دنیا یہ جان سکے کہ ہندوستان میں تعلیمِ نسواں کو فروغ دینے میں مملکتِ آصفیہ کی بھی اہم حصّہ داری رہی ہے۔

حوالے:

1. آمنہ تحسین ''حیدرآباد میں اردو کا نسائی ادب''، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی، ص 71
2. مصطفیٰ کمال ''حیدرآباد میں اردو کی ترقی''، حیدرآباد، 1990، ص 217-208
3. نصیر الدین ہاشمی ''دکن میں اردو''، (دوسرا ایڈیشن)، قومی کونسل برائے فروغِ اردو، دہلی، 2002، ص 360
4. بشیر النساء بشیر، نظم ''حدیثِ نسواں'' مشمولہ ''نذرِ دکن''، 1929ء، ص 101-99
5. نصیر الدین ہاشمی ''سلطنت آصفیہ میں تعلیمِ نسواں کی ابتدائی تاریخ''، ص 20
6. مانک راؤ وٹھل راؤ، '' بستانِ آصفیہ'' (حصہ دوّم)، 1925ء، ص 350
7. طیبہ بیگم، ''میر عثمان علی خاں اور ان کا عہد''، حیدرآباد، 1993، ص 249
8. حسن الدین احمد، ''جامعہ عثمانیہ''، حیدرآباد، 1980ء ص 14-12

9. مولوی فیض محمد، ''نواب عمادالملک سید حسین بلگرامی''، حیدرآباد، 1940ء، ص23-20

10. طیبہ بیگم، ''رسائلِ طیبہ'' مرتبہ سکینہ بیگم، حیدرآباد، 1954ء، ص127

11. الف۔ زرینہ پروین، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی (شعبہ تاریخ۔ عثمانیہ یونیورسٹی 2000ء)
Contributions of Non Mulkis for the Development of Administration and Literature in Hyderabad

ب۔ نصیرالدین ہاشمی، ''خواتین عہد عثمانی''، 1936ء، ص17، 37-29

12. نصیرالدین ہاشمی، ''خواتین عہد عثمانی''، 1936ء، ص13-12

13. محمد فاروق اور محمد نصیرالدین ہاشمی (مرتب) ''رپورٹ'' حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس''، ص18

14. محمد انورالدین، ''حیدرآباد دکن کے علمی وادبی رسائل''، حیدرآباد، ص356-351

15. رسالہ معلمِ نسواں، جلد14، نمبر5، 1318ھ

16. سکینہ بیگم (، مرتب) ''رسائل طیبہ''، حیدرآباد، 1940ء، ص23-22

17. Minault Gail, 1998,Secluded Scholars: Muslim Education and Muslim Social reform in Colonial India.Delhi

18. آمنہ تحسین، ''حیدرآباد میں اردو کا نسائی ادب''، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی، 2016ء، ص95

19. محمد رضی الدین صدیقی، ''جامعہ عثمانیہ''، کراچی، 1984ء، ص42-41

20. بیگم سلطانہ شرف الدین ''اب تک اثر خواب ہے''، مضمون مشمولہ ''ارمغان''، جشنِ الماس جامعہ عثمانیہ، 1979ء، ص110

21. محمد رضی الدین صدیقی، ''جامعہ عثمانیہ''، کراچی، 1984ء، ص90

22. راست گفتگو بذریعہ ٹیلی فون۔ پروفیسر بیگ احساس، سابق صدر شعبہ اردو، عثمانیہ یونی ورسٹی اور یونیورسٹی آف حیدرآباد اور پروفیسر فاطمہ بیگم پروین، سابق صدر شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی

❐ **Dr. Ameena Tahseen**

Assistant Professor
Department of Women Education
Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Mob: 9885017580
Email: amtahseen123@yahoo.com

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:280-301
Dr. Mohd Akhtar, Maulana Abulkalam Azad ka Siyasi aur Qaumi Nazariya

محمد اختر

مولانا ابوالکلام آزاد کا سیاسی اور قومی نظریہ

مولانا ابوالکلام آزاد ایک بالغ نظر اور دور اندیش سیاست داں تھے۔ ان کی نگاہ میں قوموں اور ملکوں کے عروج وزوال کی ایک لمبی داستان تھی۔ وہ تاریخ کے جبر، تغیر وتبدل اور عواقب وعوامل سے بھی کماحقہ آگاہ تھے۔ مسلمانوں کی خستہ سامانیاں، اجتماعی درماندگیاں، اقتصادی مجبوریاں اور سیاسی بدگمانیاں انھیں مزید پریشانی میں ڈالے ہوئے تھیں۔ وہ سرسید کے سیاسی نظریے اور مسلم لیگ کے رویے سے بھی بہت زیادہ پرامید نہ تھے، بلکہ اسے مسلمانوں کے لیے خطرناک اور ناعاقبت اندیشی پر محمول نظریہ قرار دیتے تھے۔ مولانا آزاد برطانوی سیاست کی شاطرانہ چالوں کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے اور مسلمانوں کو ان کی بچھائی ہوئی جال میں پھنستا دیکھ کف افسوس ملتے تھے۔ برطانوی حکومت کے مکروفریب سے آگاہ کرنے اور آزادی کی تحریک میں مسلمانوں کی شراکت کو لازمی بنانے کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد نے ہفتہ وار 'الہلال' جاری کیا تھا۔ صحافتی میدان میں ان کا جوش وولولہ قابل رشک تھا۔ ان کا انداز بیان ساحرانہ اور طرز تخاطب آتشیں آہنگ سے لبریز تھا۔ وہ مسلمانوں کی غفلت شعاری، تحریک آزادی سے دوری اور انگریزی حکومت کا ایک ہتھیار بنتا دیکھ کر پکار اٹھے تھے:

> ''آہ! کاش مجھے وہ صور قیامت ملتا، جس کو لے کر میں پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا۔ اس کی صدائے رعد، عصائے غفلت شکن سے سرگشتگانِ خواب کو ذلت ورسوائی سے بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ اٹھو بہت سوچکے اور بیدار ہو، کیونکہ اب تمھارا خدا تم کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔ پھر تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ دنیا کو دیکھتے ہو، پھر اس کی نہیں سنتے ہو جو تمھیں موت کی جگہ

حیات، زوال کی جگہ عروج اور ذلت کی جگہ عزت بخشتا ہے۔‘‘(1)

انیسویں صدی ہو یا پھر بیسویں مسلم سیاست انتشار واختلاف کا شکار تھی۔ برطانوی حکومت اپنی پالیسی ’’لڑاؤ اور حکومت کرو‘ پر عمل پیرا ہوکر ہندوستان کی مشترکہ تہذیب وثقافت اور اہل وطن کے درمیان اتحاد واتفاق کی فضا کو مسموم بنا رہی تھی۔ مسلمانوں نے سرسید کی آواز پر لبیک کہہ کر عملی سیاست سے پہلے ہی کنارہ کشی اختیار کر لی تھی، دوسری طرف مسلم لیگ کا معاملہ بھی دراصل برطانوی دوستی پر مبنی تھا۔ کچھ مسلمان ایسے بھی تھے جو ترکی، مصر وشام کی طرف اب بھی امید کی نظروں سے دیکھ رہے تھے، لیکن اسلامی ممالک کی خستہ حالی اور بے بسی انھیں ناامید کر رہی تھی۔ ایسی غفلت اور گھٹا ٹوپ تاریکی میں ’الہلال‘ طلوع ہوتا ہے۔ یہ ایک دردمند دل کی پکار تھی اور للکار بھی! بقول سید جواد علی زیدی: ’’الہلال کی آتش نوائیوں نے ملک بھر میں ایک آگ لگا دی۔‘‘(2) سیاست نے مولانا آزاد کو صحافت کے میدان سے جنگ آزادی کے میدان میں لا کھڑا کیا تھا۔ مولانا آزاد نے برطانوی استبداد کے رخ سے نقاب کھینچ کر اصل چہرہ اہل ہند کے سامنے پیش کر دیا اور مسلمانوں کو سچی مذہبی تعلیمات کی روشنی میں آزادی اور حریت کا مفہوم سمجھایا۔ مولانا آزاد کی قومی اور سیاسی پالیسی بڑی حد تک مذہبی تعلیمات کی روشنی میں تھی۔ وہ مسلمانوں میں اسلام کی سچی روح اور سلف وصالحین کا عکس دیکھنا چاہتے تھے، لیکن یہاں ابھی کوئی ان کا ہم نوا اور ہم زبان نہ تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد جس راستے پر بھی چل پڑے، دوسروں سے بہت آگے نکل گئے۔ صحافت وسیاست میں تو کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ یہی بنیادی وجہ ہے کہ ’الہلال‘ نے بہت جلد مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کر کے، انھیں تحریک آزادی میں حصہ لینے پر مجبور کیا۔ یہ اخبار بہت جلد اپنے انقلابی رنگ وآہنگ کی وجہ سے آزادی کا نقیب بن گیا۔ ہندو مسلم اتحاد کی ہر سو باتیں ہونے لگیں۔ مولانا آزاد نے آزادی کی تحریک کو حقیقی معنوں میں ایک قومی تحریک بنایا اور ہندوستان کے مسلمان آزادی کے میدان میں دوسروں کے شانہ بہ شانہ نظر آنے لگے۔ ’الہلال‘ کا بنیادی مشن ہی ہندو مسلم اتحاد تھا، کیونکہ مولانا آزاد اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ بغیر اس کے ہندوستان کو آزادی نہیں مل سکتی ہے۔ اسی لیے انھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا، مسلم علما ودانشوروں کو جھنجھوڑا، انھیں ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں اور خالص اسلامی تعلیمات کی روشنی میں آزادی اور تحریک آزادی کی معنویت پر

روشنی ڈالی۔ ان کی خوابیدہ غیرت کو للکارا اور ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کی فرضیت پر زور دے کر قرآن کے احکام کو یاد دلایا، جوان کے ذہن وفکر سے محو ہو چکا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی سوچ اور فکر بہت بلند تھی۔ وہ بیسویں صدی کے لیڈروں کے حرص وطمع سے بھی خوب واقف تھے، لیکن ان کے پیش نظر اسوۂ ابراہیمیؑ اور محمدیؐ تھا، جن کے طریق عمل کو اسلام نے 'حکمت' اور 'سنت' جیسے جامع لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ مولانا آزاد اسی طریقۂ عمل کو اپنا کر ہندوستانی مسلمانوں کی مسیحائی کرنا چاہتے تھے۔ وہ خدا کی تسلیم ورضا کو اولیت دیتے تھے اور مسلمانوں کو ان کا قومی اور سیاسی فریضہ یاد دلا کر انھیں خوف وہراس، حرص وطمع اور بزدلی سے باہر نکالنا چاہتے تھے۔ کسی دنیاوی اقتدار کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے بجائے، اس کے ظلم وجور اور غلامی سے انسانوں کو نجات دلانا، ان کے فریضۂ منصبی میں شامل سمجھتے تھے۔ مولانا آزاد نے 'الہلال' کے پہلے شمارہ میں اس کی غرض وغایت پر تفصیل سے روشنی ڈالی تھی۔ 'الہلال' کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں حکمت وعمل کی دعوت دینا اور 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کی طرف بلانا تھا، تاکہ وہ ہر قسم کے جبر واستبداد کی مخالفت اور ہندوستان کی آزادی کے لیے ہر ممکن سعی وعمل کریں۔ 'الہلال' کے حکمت عملی پر روشنی ڈالتے ہوئے سید مظفر حسین برنی لکھتے ہیں:

> ''انھوں (مولانا ابوالکلام آزاد) نے مذہب کے نام پر مسلمانوں سے اپیل کی کہ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں شریک ہوں۔ 'الہلال' کے صفحات کے ذریعہ انھوں نے مسلمانوں کو برطانوی حکومت کی وفاداری کے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی، جس کا سبق سرسید احمد خاں اور مسلم لیگ کے رہنماؤں نے پڑھایا تھا۔ (مولانا) آزاد نے مسلمانوں کو سیاسی اور اخلاقی خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی اور ان میں سیاسی شعور بیدار کیا۔'' (3)

مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر عالمی سیاست پر تھی۔ ان کے خیال میں ساری دنیا کے مسلمانوں کا تعلق ایک ہی خاندان اور برادری سے ہے۔ 'الہلال' کے صفحات میں مسلم ممالک کی زبوں حالی اور مظلومیت کو تفصیل سے بیان کر کے مولانا آزاد نے سامراجی قوتوں کے مظالم کو نمایاں کرنے کی کاوش کی۔ وہیں دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات کا حوالہ دے کر انھیں آزادی کی جدوجہد

میں شامل ہونے پر مجبور کیا اور ان کے ذہن ودماغ سے ہندوا کثریت کے خوف وہراس کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔مولانا آزاد نے مسلمانوں کی غیرت کو للکارتے ہوئے لکھا:

''اسلام اس سے بہت ارفع واعلا ہے کہ اس کے پیروؤں کو اپنی پولیٹکل پالیسی قائم کرنے کے لیے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر شرم انگیز سوال نہیں ہوسکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹکل تعلیموں کے آگے جھک کر اپنا راستہ پیدا کریں۔ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں۔وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنے والے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔''(4)

مولانا ابوالکلام آزاد پیدائشی مسلمان نہ تھے، جو کچھ انھیں خاندانی ورثے میں ملا تھا، اس پر قناعت کرنے سے انکار کردیا تھا اور پھر ایک خالی دل ودماغ لے کر ''طلب وجستجو'' کی راہ میں نکل پڑے تھے۔اندھی تقلید اور شخصیت پرستی سے انکار کرتے ہوئے اپنی فہم وفراست کے مطابق قرآن مجید کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔کامل ۲۷ربرس تک قرآن حکیم ان کی فکر ونظر کا موضوع رہا تھا، ایک ایک سورہ، ایک ایک آیت اور ایک ایک حرف پر وادیاں قطع کی تھیں۔تفاسیر کے مطبوعہ ذخیرے کا ایک بڑا حصہ ان کے مطالعے میں رہ چکا تھا۔قدیم وجدید کی تقسیم بھی ان کے یہاں بے معنی تھی۔جو کچھ قدیم ہے وہ انھیں ورثے میں ملا تھا اور جو کچھ جدید ہے، اس کے لیے اپنی راہ خود نکالی تھی طلب وجستجو کی راہ میں ''جو عقیدہ کھویا تھا، وہ تقلیدی تھا اور جو عقیدہ پایا، وہ تحقیقی تھا۔''(5) مولانا آزاد دراصل منہج سلف وصالحین پر عمل پیرا تھے اور عقائد وعبادات کے معاملے میں وہ کسی طرح کا سمجھوتہ کرنا گوارا نہ کرتے تھے۔فکری آوارگی کے بعد اسلام کی سچائیاں جب ان پر روشن ہوئیں تو پھر دنیا جہان کے تمام مسائل کا حل انھیں قرآن میں نظر آیا۔اسی بنا پر مذہب وسیاست میں انھیں کوئی تضاد نظر نہیں آرہا تھا، بلکہ وہ: ع ''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی'' کے قائل تھے۔'الہلال' میں مولانا آزاد یہ اعلان بار بار کرچکے تھے کہ تہذیب ومعاشرت سے لے کر ملکی وخاندانی تمام مسائل ومشکلات کا حل قرآن مجید میں موجود ہے۔اس لیے مسلمانوں کو قلت وکثرت کی بنا پر خوف کھانے یا کسی دوسرے مذہب سے کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں، بلکہ اللہ رب العزت نے تمھیں خیر الامم بنا کر بھیجا ہے، تم دنیا کی رہنمائی اور اللہ کی نیابت کے لیے بھیجے گئے ہو۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے مرتبے اور مقام کو پہچانیں۔ افسردگی، بے ہمتی، خوف و ہراس سے باہر نکل کر برطانوی حکومت کے خلاف مشترکہ (ہندو مسلمان مل کر) جدوجہد کریں۔ مولانا آزاد نے اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ ہندو مسلم متحد ہونے کے بجائے ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں، آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ مولانا آزاد نے 'الہلال' کے ذریعہ مسلمانوں کو یہ پیغام دیا کہ وہ غیر ملکی اور غیر آئینی حکومت کے خلاف متحد ہوں، حکومت سے کسی طرح کا تعاون نہ کریں۔ اس مسئلے میں مولانا آزاد گاندھی جی کے بھی پیش رونظر آتے ہیں۔ گاندھی جی نے انگریزوں کے خلاف اپنی تحریک 1919ء میں شروع کی تھی، جبکہ 'الہلال' اس دعوت سے 1914ء سے قبل فارغ ہو چکا تھا۔

مولانا آزاد نے ہر طرح سے ہندوستانی مسلمانوں کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی انھیں ان کا منصب یاد دلایا اور ہندوؤں کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر ملک کی تعمیر و ترقی میں بھرپور حصہ داری پر زور دیا، جس کا ثمرہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا انداز فکر و عمل ہی بدل گیا۔ بقول سجاد انصاری: ''الہلال' نے ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس طرح بیدار کیا، جس طرح نفخ صور سے لاکھوں برس کے سوئے ہوئے انسان زندہ ہو جائیں گے۔'' (6) مولانا کا انداز تخاطب اور طرز اسلوب بالکل جداگانہ تھا۔ ان کے رنگ و آہنگ اور خیالات میں جدت تھی، وہ مذہبی تعلیمات کو نئے رنگ اور ڈھنگ سے پیش کر کے مسلمانوں کے ذہن پر پڑے ہوئے جالوں کو صاف کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہوئے تھے۔ بقول فضل الدین احمد: ''الہلال کا سب سے بڑا کارنامہ جو ہمیشہ تاریخ ہند میں یادگار رہے گا، وہ پائیدار مذہبی انقلاب ہے، جو یکا یک مسلمانوں میں اس کی دعوت حق سے پیدا ہو گیا۔ علما و مشائخ کا گروہ جو اپنے مدرسوں اور حجروں سے کبھی جھانک کر بھی دنیا کی حالت پر نظر نہیں ڈالتا تھا۔ 'الہلال' نے ان کو یکا یک نکال کر جدوجہد کے میدان میں کھڑا کر دیا۔'' (7) 'الہلال' اردو صحافت کی تاریخ میں ایک انقلاب ثابت ہوا۔ مولانا آزاد کی بے باک تحریروں نے ایک طرف اگر مسلمانوں میں بیداری پیدا کی تو دوسری طرف برطانوی حکومت کی نیند حرام کر دی۔ 'الہلال' کی آواز کو دبانے کی ہر ممکن کوشش ہوئی، لیکن حکومت کو جب اس میں کامیابی نہ ملی تو دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی۔ مولانا آزاد نے ضمانت کی رقم فوراً جمع کرا دی۔ حکومت جب کسی طرح مولانا کے عزائم کو شکست نہ دے سکی تو پھر دوبارہ دس ہزار کی ضمانت کا مطالبہ کیا۔ مولانا آزاد نے یہ

رقم بھی سرکاری خزانے میں جمع کرادی۔حکومت کے لیے یہ بات نا قابل برداشت ثابت ہو رہی تھی، کیونکہ 'الہلال' کی تحریروں کا جادو بڑھتا جارہا تھا۔دوسری طرف مولانا آزاد کے باغیانہ تیوراور بے باکی میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ بالآخر حکومت نے نومبر 1914ء میں 'الہلال' پریس کے ضبط کرنے کا حکم صادر کردیا، لیکن 'الہلال' اپنے مشن کو تین سال میں بڑی حد تک کامیاب بنا چکا تھا۔اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں:

> ''الہلال' نے تین سال کے اندر مسلمانان ہند کی مذہبی وسیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کردی۔ پہلے وہ اپنے ہندو بھائیوں کی پولٹیکل سرگرمیوں سے نہ صرف الگ تھے، بلکہ ان کی مخالفت کے لیے بیوروکریسی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح کام دیتے تھے۔گورنمنٹ کی تفرقہ انداز پالیسی نے انھیں اس فریب میں مبتلا کررکھا تھا کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان اگرآزاد ہوگیا تو ہندو گورنمنٹ قائم ہوجائے گی۔مگر 'الہلال' نے مسلمانوں کو تعداد کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی اور بے خوف ہوکر ہندوؤں کے ساتھ مل جانے کی دعوت دی۔ اس سے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں، جن کا نتیجہ خلافت یا سوراج ہے...... 'الہلال' تمام تر آزادی یا موت کی دعوت تھی۔''(8)

مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کو اللہ اوراس کے احکام پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی ۔ مسلمانوں کو ہندو اکثریت سے خائف ہونے کے بجائے ان سے تعاون اوران پر اعتماد کرنے کا مشورہ دیا۔مولانا آزاد نے مسلمانوں کو یہ یاد دلایا کہ اسلام تمام غیرآئینی اور غیر پارلیمانی حکومتوں کو ناجائز ٹھہراتا ہےاوراس طرح کی حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی دعوت دیتا ہے۔انھوں نے ۱۹۱۳ء میں تحریر فرمایا: ''ایک چراغ جو روشن ہوکر پھرنہیں بجھتا، وہ حریت صحیحہ کا چراغ ہے۔''مسلمان ہندوستان میں رہتے ہیں۔اسی سرزمین پر پیدا ہوتے ہیں اوریہیں دفن ہوتے ہیں،اسی کی آب وہوا میں پلے بڑھے ہیں۔اس لیے ہندوستان کی سرزمین کی حفاظت ان کا دینی فریضہ ہے۔یاد رکھیں جس جوش ایمانی کے ساتھ مسلمانوں نے جنگ طرابلس و بلقان اورکانپور کی مسجد کے معاملہ میں حصہ لیا۔آزادیٔ وطن کے معاملہ میں بھی اسی جوش وخروش کا مظاہرہ ہونا چاہیے۔

مولانا آزاد کے ابتدائی مخاطب مسلمان تھے اور 'الہلال' کے قارئین بھی اولاً مسلمان تھے۔ اس لیے مولانا آزاد نے سخت سے سخت الفاظ میں اور مذہبی اصطلاحات کی مدد سے ان کو 'علی گڑھ تحریک' کی غلط پالیسی اور ہندو مجارٹی کے خوف سے باہر آنے کی دعوت دی اور مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ہندو اکثریت کا خوف بے بنیاد ہے۔ پختہ فکر و عمل کے حامل مولانا آزاد نے سر سید کی عظمت کے اعتراف کے باوجود ان کے سیاسی نظریہ کو رد کیا اور اسے مسلمانوں کے لیے مہلک قرار دیا۔ ایک خطبے میں اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد فرماتے ہیں:

> ''مسلمانوں کے اس سیاسی جمود کا واحد سبب وہ رہنمائی تھی، جو انیسویں صدی کے ربع آخر میں اس ادارے کے بانی سر سید نے انھیں دی تھی۔ علی گڑھ پارٹی نے اس حکمت عملی کو اپنایا اور ہندوستانی مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس سے الگ رکھنے کی کوشش کی اور کچھ برگزیدہ شخصیات کو چھوڑ کر عام طور پر انھیں کامیابی نصیب ہوئی۔''(9)

مولانا ابوالکلام آزاد گرچہ سر سید کے بعض افکار و نظریات سے بہت متاثر تھے، لیکن ان کے سیاسی نظریے کے وہ بالکل قائل نہ تھے۔ مولانا آزاد نے مذہبی تعلیمات کا سہارا لے کر مسلمانوں کا رخ تحریک آزادی کی طرف موڑا اور نہایت ولولہ انگیز طریقے سے مسلمانوں کو برٹش سامراج کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین کرائی کہ اسلام میں دین و دنیا کی تقسیم نہیں ہے، شریعت الٰہی تمام نوع انسانی کی ہدایت وسعادت کا کفیل و سرچشمہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کو تمام اعمال و معتقدات میں صرف کتاب اللہ و سنت نبوی پر عمل پیرا ہونے کی دعوت ہے۔ خواہ تمدنی مسائل ہوں، سیاسی مسائل ہوں، معاشی ہوں، اخلاقی یا تعلیمی یا پھر کوئی اور مسئلہ مسلمانوں کو ہر جگہ اور ہر معاملہ میں مسلمان ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کا سرمایہ زندگی یہی ہے کہ وہ خیر کے داعی اور برائی کے خلاف کھڑی ہونے والی جماعت ہے۔ خدا کا بندہ کسی کا مقلد یا غلام نہیں ہوسکتا، وہ دنیا کی ہر قسم کی مصنوعی بندشوں سے آزاد اور صرف احکام شریعہ کا پابند ہوتا ہے۔ اسی لیے ایک سائل کے جواب میں/ استفسار میں جو بعض معاملات میں رہنمائی کے آرزومند تھے۔ مولانا آزاد نے نہ صرف ان کی رہنمائی فرمائی، بلکہ خط کے بعض بنیادی نکات کے حوالے سے ان کے شبہات کو دور کرنے کی کوشش بھی کی۔

مولانا آزاد نے توحید وعقیدے کے متعلق تفصیل سے لکھا اور مسلمانوں کو یاد دلایا کہ تم خیر الامم ہو، زمین پر خدا کے خلیفہ بنا کر بھیجے گئے ہو۔ لہٰذا ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ خوف و بزدلی، افلاس و مفلسی کے بجائے خودداری، بے خوفی اور ہمت و استقامت کا مظاہرہ کرے۔ مسلمان تو دوسروں کی خیر خواہی چاہنے والے، فتنہ وفساد کو روکنے والے، شخصی اور دنیاوی اقتدار کی مخالفت کرنے میں پیش پیش رہنے والی جماعت ہے۔ وہ کسی ایسے اقتدار کے آگے سر تسلیم خم نہیں کر سکتی، جس کی بنیاد ظلم و جبر پر ہو، کیونکہ یہ حق تو اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ رسولوں کو بھی عطا نہیں کیا۔

مولانا ابوالکلام نے آزادی اور حریت کے مسئلے پر تفصیل سے اظہار خیال فرمایا ہے۔ ’الہلال‘ کے صفحات اس طرح کی دعوت اور پالیسی سے مملو ہیں۔ مولانا آزاد نے قرآن وحدیث کی روشنی میں آزادی کو ہر انسان کا پیدائشی حق قرار دیا اور ملک کی آزادی کے لیے تمام طرح کی کاوش مسلمانوں کا مذہبی فریضہ مولانا آزاد نے یہ بھی فرمایا کہ جس طرح عبادات ہم پر فرض ہیں، اسی طرح صداقت وعدالت کی شہادت بھی ہم پر فرض ہے۔ مولانا آزاد نے یہ بات بھی ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ آزادی کھو کر غلامی کی زندگی گزاریں۔ مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیے، یا پھر آزاد رہنا چاہیے، اسلام میں دوسرا اور کوئی راستہ نہیں۔ مولانا آزاد نے اپنے عہد کے سیاسی ماحول کو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی، حیات نبویﷺ اور عہد صحابہ کے سیاسی وسماجی تجربات کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں کے سامنے جمہوریت اور آزادی کے معانی ومفاہیم واضح کیے۔ سیاست میں ان کا استدلال بالکل نیا اور چونکانے والا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد ابتدا سے ہی نیشلسٹ تھے۔ انھوں نے اسلام کے بنیادی مزاج کی تفہیم وتعبیر کے ذریعے مسلمانوں کے ذہن وفکر میں ایک وسعت اور بلندی پیدا کی اور یہ بات ذہن نشین کرائی کہ اسلام صرف عبادات کا مجموعہ نہیں، بلکہ انسانی زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں، جس کے متعلق شریعت اسلامی کا واضح حکم موجود نہ ہو۔ اسلام اخلاقی اور روحانی مقاصد کی تکمیل چاہتا ہے۔ مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت کا اعتراف کرتے ہوئے جواہر لال نہرو نے بہت عمدہ بات لکھی ہے:

> ’’اسلام کی صحیح روایات میں رچے ہوئے مولانا آزاد اپنی علمی بصیرت اور فضیلت سے اسلامی ممالک میں غیر معمولی شہرت رکھتے تھے۔ انھوں نے ترکی اور دوسرے

ممالک میں حریت کی آواز بلند ہوتے دیکھی تھی۔اس لیے ان کا نظریۂ سیاست پرانے مسلمان لیڈروں سے جداگانہ تھا۔انھوں نے مذہبی تنگ نظری سے کام نہیں لیا۔وہ ہر بات میں عقلیت (Rationalism) کے علم بردار تھے۔(10)

مولانا آزاد کی انتھک کوششوں کے بعد مسلمانوں کا جھکاؤ کانگریس کی طرف ہوا،ان کے شکوک وشبہات بھی بڑی حد تک دور ہوئے۔مسلمانوں کے ذہن ودماغ پر ہندو اکثریت کا خوف جس طرح بٹھایا گیا تھا،اس کی وجہ سے یہ جماعت یکدم مفلوج اور بے عمل ہوگئی تھی اور خود اعتمادی اور خودداری کی دولت سے محروم مولانا آزاد نے ان تمام توہمات سے چھٹکارا دلایا اور 18/دسمبر 1912ء کے'الہلال' میں لکھا:

''ہندومجارٹی کے عفریت کا خوف بھی اب خدا کے لیے دل سے نکال دیجیے۔یہ سب سے بڑا شیطانی وسوسہ ہے، جو مسلمانوں کے قلب پر القا کیا گیا۔طاقت محض تعداد پر نہیں، بلکہ اور باتوں پر موقوف ہے۔اصل شے قوموں کی معنوی طاقت ہے، جو اس کے اخلاق،اس کے کردار اور اس کے اتحاد...... سے پیدا ہوتی ہے......آپ کی تمام بے راہ روی،نفس پرستی،اغراض پسندی،باہمی جنگ وجدال،ایثار وفدیت فراموشی اور ہر قسم کے اشغال ضلالت صرف اس لیے ہیں کہ سامنے کوئی کوشش نہیں اور جس بلائے ہوش کو ہم دیکھ رہے ہیں،آپ نے ابھی دیکھا ہی نہیں،جس دن ایک اچٹتی ہوئی نظر بھی 'آزادی' کے حسن پر پڑ گئی، پھر آپ خود بخود یہ تمام قصے بھول جائیں گے۔''(11)

مولانا ابوالکلام آزاد کی صدائیں بیکار نہ گئیں۔انھوں نے مسلمانوں کے دل ودماغ میں یہ بات جاگزیں کی کہ جان فروشی اور قربانی تمھارا قدیم اسلامی ورثہ ہے۔اس لیے تمھیں اس میدان میں سبھی کو پیچھے چھوڑ دینا چاہیے اور ایک وقت ایسا آیا کہ جب مسلمان تحریک آزادی میں سب سے زیادہ پیش پیش رہے،دوسروں سے زیادہ جان ومال کی قربانی دی اور ہندو،سکھ،عیسائی بھائیوں کے ساتھ مل کر ملک کو آزادی کی نعمت بخشی ۔مولانا آزاد نے ہندومسلم اتحاد کا ایک حسین خواب دیکھا تھا۔اس کے بغیر تو وہ سوراج کے بھی قائل نہ تھے،کیونکہ ہندومسلم اتحاد کا فقدان عالم انسانیت کا نقصان تھا۔اس مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا آزاد فرماتے ہیں:

''ہماری جدوجہد کی بنیاد کا کیا حال ہے۔میرا اشارہ ہندو مسلم اتحاد کی طرف ہے۔ یہ ہماری تعمیرات کی وہ پہلی بنیاد ہے، جس کے بغیر نہ صرف ہندوستان کی آزادی بلکہ ہندوستان کی وہ تمام باتیں جو کسی ملک کے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لیے ہوسکتی ہیں، محض خواب وخیال ہیں۔صرف یہی نہیں کہ اس سے ہمیں قومی آزادی نہیں مل سکتی، بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی اصول بھی اپنے اندر پیدا نہیں کرسکتے۔آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اتر آئے اور دلی کے قطب مینار پر کھڑے ہوکر یہ اعلان کردے کہ سوراج چوبیس گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے، بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہوجائے تو میں سوراج سے دست بردار ہوجاؤں گا، کیونکہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا، لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔''(12)

مذکورہ بالا اقتباس کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ مسلمان اپنے مذہبی تشخص یا اسلامی روایات سے دست بردار ہوجائیں، بلکہ مولانا آزاد نے مسلمانوں کو ثابت قدم رہنے اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں زندگی گزارنے کی بھرپور تلقین کی ہے۔'الہلال' اور 'البلاغ' کے صفحات اس طرح کے دعوت وارشاد سے مملو ہیں۔ہندو مسلم اتحاد واتفاق کی بات بھی مولانا آزاد نے قرآن وسنت کی روشنی میں کہی ہے۔مارچ 1940ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کا جلسہ رام گڑھ میں منعقد ہوا۔اس اجلاس میں مولانا آزاد نے جو صدارتی خطبہ دیا تھا۔وہ کئی اعتبار سے تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔مولانا آزاد نے اس خطبے میں اسلام اور مسلمانوں کے مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی سعی کی ہے کہ کانگریس صرف ہندوؤں اور ان کے مفادات کی نگہبان جماعت ہرگز ہرگز نہیں ہے، بلکہ وہ ملکی مسائل و مشکلات کے ہر مسئلے کے حل کے لیے پابند ہے اور جو لوگ مسلمانوں کے اندر شک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش میں ہیں۔مولانا ابوالکلام آزاد اپنی سیاسی بصیرت اور لیاقت کی وجہ سے بہت جلد ہندوستانی سیاست پر چھا گئے تھے۔مولانا آزاد اعلا سیاسی اقدار پر ایقان رکھتے تھے۔انسانی جماعتوں میں ہم آہنگی، مذہبی گروہوں میں صلح وآشتی، جمہوری طرز حکومت، حقوق انسانی کی پاسبانی کو وہ اولیت دیتے

تھے۔ ہندوستان جیسے کثیر لسانی وثقافتی ملک میں، مختلف مذاہب اور تہذیب وثقافت کی ضمانت کو کیسے یقینی بنایا جائے، تاکہ ملکی سالمیت کو مستقبل میں کوئی خطرہ درپیش نہ ہو۔ ملک کی آزادی، اس کی بقاوسالمیت اور تعمیر وترقی کے لیے مولانا آزاد ہمہ وقت فکر مند رہا کرتے تھے۔ ہندوستان کے سیاسی وسماجی، تہذیبی وتمدنی، نسلی ولسانی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا آزاد فرماتے ہیں:

> ''ہندوستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی۔ ان ہی قافلوں میں ایک آخری قافلہ ہم پیروان اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ بہتے رہے، لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے، دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا، ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔''(13)

برطانوی حکومت، فرقہ پرست ہندو اور مسلم لیگ بار بار اس بات پر اصرار کر رہی تھیں کہ ہندو مسلم دو قومیں ہیں، اس لیے ان کا ایک ساتھ رہنا مشکل ہے۔ افتراق وانتشار ان کا مقدر ہے۔ مولانا آزاد نے ایسے متشدد اور ناعاقبت اندیش لوگوں کے سامنے ''میثاق مدینہ'' کا ذکر کیا اور پھر ہندوستان کی تہذیب وثقافت، مشترکہ کلچر اور شعروادب کے حوالے سے بھی سمجھانے کی حتی الوسع کوشش کی اور فرمایا کہ ایک جگہ، ایک ملک میں رہنے والے سبھی ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا مذہب جدا ہو سکتا ہے، لیکن قدرت مشترک زندگی کا جو سانچہ ڈھالتی ہے، وہ ہماری پسند اور ناپسند کے باوجود ایک دائمی حقیقت رکھتی ہے۔ مولانا آزاد نے مسلمانوں کو یہ بھی یاد دلایا کہ ہندوستان کا کوئی شعبہ یا گوشہ یا کونہ ایسا نہیں ہے، جس پر تمھارے تمدن وثقافت کی چھاپ نہ پڑی ہو۔ لہٰذا تقسیم کی صورت میں اسلامی ورثے کی ایک بڑی دولت سے محروم ہو جانا ہے زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے، جس کی تعمیر وتشکیل میں اہل اسلام کا تعاون نہ رہا ہو، راہ فرار اختیار کرنے کی صورت میں یہ مشترکہ تہذیب وتمدن، سیاست ومعاشرت پاش

پاش ہوکر رہ جائے گی۔اس لیے اہل اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے مولانا آزاد نے فرمایا:

''ہماری گیارہ صدی کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ہماری زبانیں ، ہماری شاعری،ہمارا ادب،ہماری معاشرت، ہمارا ذوق،ہمارا لباس، ہمارے رسم ورواج،ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں،کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے،جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو۔ہماری بولیاں الگ الگ تھیں،مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے،ہمارے رسم ورواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے۔مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کرلیا۔ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جاسکتا ہے،مگر اب وہ ہمارے جسم پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے۔'' (14)

برطانوی استعمار،گزشتہ کئی برسوں سے اہل ہند کے درونی اختلافات کو ابھارنے میں مصروف تھی۔تاکہ اس انتشار وافتراق کا وہ بھرپور فائدہ اٹھا سکیں اور اہل ہند کو دو فرقوں میں تقسیم کرکے انھیں بے وقعت اور کمزور بنا سکیں۔مولانا آزاد نے ہندو،مسلمانوں کو ان کی مشترکہ تہذیب وثقافت کی دہائی دیتے ہوئے،اس فتنہ سے دور رہنے کی نصیحت کی ۔ساتھ ہی اتحاد واتفاق اور متحدہ قومیت پر زور دیا،تاکہ ہندوستان نہ صرف آزاد ہوسکے، بلکہ اپنے تعمیروترقی کا سامان بھی فراہم کرسکے۔مولانا آزاد کو اپنے مشن میں کامیابی ملی اور مسلمانوں کو کانگریس کی طرف مائل کرنے میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔

نئی نسل اور نئے ہندوستان کی صلاحیتوں پر مولانا آزاد کا ایقان تھا۔ہندوستان کے مستقبل پر ان کو پورا بھروسہ تھا۔چین،روس،امریکہ وغیرہ جیسے ممالک میں جب مختلف مذاہب کے پیرو آپس میں گھل مل کر ایک ساتھ رہ سکتے ہیں تو پھر ہندوستان جو اپنی وسیع المشربی،رواداری کی وجہ سے پوری دنیا میں ممتاز ہے۔یہاں پر لوگ کیوں آپسی اتحاد واتفاق اور بھائی چارہ کے ساتھ نہیں رہ سکتے! جب کہ ہزارہا برس سے ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے معاشرتی،تمدنی،تہذیبی اور سماجی سطح پر بہت سی مماثلتیں خود بخود ایک دوسرے کے اندر در آئی ہیں۔دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ناممکن سا ہوگیا ہے۔اس تناظر میں دو قومی نظریے کا دعوا نہ صرف کھوکھلا ، بلکہ بے بنیاد ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستانی مسلمانوں کو

مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

’’مسلمانوں کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے حقوق اور مفادات کے لیے جس قسم کی جدوجہد کرنا چاہیں کریں۔ یہ ان کا اندرونی قضیہ ہے، لیکن انھیں کسی حالت میں کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیے جو ہندوستان کی آزادی کے خلاف دلیل لایا جاسکے۔‘ (15)

مولانا آزاد نے آزادی کی تحریک کو دھار دار بنانے کے لیے ہندو مسلم اتحاد پر کافی زور دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ صداقت و حق پرستی کے بہترین فرائض ادا کرنے کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں کو سب سے آگے ہونا چاہیے۔ خود مولانا آزاد اس کے لیے بڑی سی بڑی قیمت چکانے کیے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے، لیکن ان کو یہ قطعاً برداشت نہ تھا کہ اتحاد و یکجہتی کے راستے میں کوئی جماعت رکاوٹ پیدا کرے۔ وہ وحدت میں کثرت کے قائل تھے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے وہ زندگی بھر ایک خاص لباس زیب تن کرتے رہے۔ ان کا یہ خیال بجا تھا کہ اپنی انفرادیت اور مذہبی معاملات کو چھوڑنا قومیت کے لیے لازمی نہیں ہے۔ مسلمانوں کو متحدہ قومیت کی تعمیر وتشکیل کا اٹوٹ حصہ قرار دیتے ہوئے مولانا آزاد نے انھیں تاریخ اسلام کے زریں عہد اور اسوۂ نبوی کے مطالعے کا مشورہ دیا۔ ہجرت کے پہلے سال رسول کریمؐ نے مدینہ اور اس کے قرب وجوار کی حفاظت اور فلاح و بہبود کے لیے مہاجرین اور انصار کے ساتھ مل کر دوسری مذہبی جماعتوں (یہودی، نصرانی وغیرہ) اور بت پرست قبیلوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا۔ سب کو ملا کر ایک سیاسی جماعت تشکیل دی تھی، تاکہ قریش مکہ اور دیگر شر پسند گروہوں سے باشندگان مدینہ کو محفوظ رکھا جاسکے۔ اس میثاق کو باقاعدہ ایک قانونی شکل دی گئی تھی اور محمدﷺ نے ایک قانونی دستاویز مرتب کرایا تھا، جس کو اسلامی تاریخ میں ’میثاق مدینہ‘ یا ’عہد نامۂ مدینہ‘ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ’’میثاق مدینہ‘‘ کی طرف مسلمانوں کی توجہ مبذول کرانے کا اصل مقصد ہندو مسلم اتحاد کا اعادہ اور سنت نبوی کی روشنی میں دو قومی نظریے کی تردید تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد تا عمر متحدہ قومیت کے نقیب بنے رہے۔ انھوں نے قرآن وحدیث کی روشنی میں ہندو و مسلم اتحاد کا ایک نیا فارمولہ پیش کیا اور دو قومی نظریے کو باطل قرار دیا۔ مولانا آزاد کے الفاظ کچھ اس طرح تھے:

’’ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان ہندوستان کے بائیس کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندوستان کی ایک قوم بن

جائیں۔آپ میں سے اب مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہو سکتی ہے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان تھی۔اس وجود مقدس نے عہد نامہ لکھا۔بجنسہٖ یہ اس کے الفاظ ہیں'انہ امۃ واحدۃ' ہم ان تمام قبیلوں سے جو اطراف مدینہ میں بستے ہیں، صلح کرتے ہیں، اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر ایک نیشن بننا چاہتے ہیں۔ایک قوم بننا چاہتے ہیں۔'' (16)

مولانا آزاد ہندوستان میں متحدہ قومیت اور ملک کی سالمیت کو پروان چڑھتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔قلت و کثرت کی عفریت کا خوف بھی انھوں نے مسلمانوں کے دلوں سے دور کیا اور اس مسئلہ پر (دو قومی نظریے) قرآن و حدیث کی روشنی میں گفتگو کر کے فریق مخالف کو قائل کرنے کی حتی الوسع کاوش کی۔جب مسلم لیگ ''دو قومی نظریے'' کا زور شور سے پروپیگنڈہ کرنے لگی تو مولانا آزاد نے تمام ہندوستانیوں اور خاص طور سے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ یہ مسٹر جناح اور ان کے ساتھیوں کی اختراع نہیں ہے، بلکہ لارڈ ڈفرن اور سر آکلینڈ کالون بہت پہلے اس بیج کو ڈال چکے ہیں۔برطانوی سامراج کی خواہش یہ تھی کہ اہل ہند کو ہندو مسلم سماج میں تقسیم کر کے ان کی طاقت کو کمزور کر دیں۔اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہماری حکومت دیرپا ہوگی اور ان کی آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔اس منصوبے کے تحت انھوں نے چند ضمیر فروشوں کو اپنا آلۂ کار بنایا، جو ان کے اشاروں پر شاداں و رقصاں رہتے تھے۔مولانا آزاد نے رام گڑھ کے خطبۂ صدارت میں اس بات کو بہت ہی واضح الفاظ میں کہا تھا کہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی ہم ہندوستانی قومیت کا جز و لاینفک ہیں۔اسلامی شعار اور متحدہ قومیت میں خدا واسطے کا بیر بھی نہیں ہے۔کانگریس نے مسلم لیگ سے ہر ممکنہ سمجھوتے کی کوشش کی، لیکن مسٹر جناح کے بے لچک رویے کی وجہ سے مصالحت کامیاب نہ ہو سکی، بلکہ ان کے نازیبا اور ناروا تبصرے سے معاملات اور بھی پیچیدہ ہو گئے۔مولانا آزاد کو مسٹر جناح کے رویے سے سخت رنج و افسوس ہوا۔9/جون 1938ء کو ایک بیان شائع ہوا جس میں مولانا آزاد نے کہا:

''ایسے وقت میں جب کہ لیگ اور کانگریس کے مابین مصالحت کی گفتگو ہو رہی ہے اور کانگریس اپنے عزیز مقصد ہندو مسلم اتحاد کے لیے اتنا آگے بڑھ چکی

ہے۔ایک دوسرے پراعلانیہ الزام تراشی اور عام جلسوں میں بے کار کے مسائل چھیڑنا زیب نہیں دیتا۔کم ازکم سردار لیڈروں کو اپنی پوزیشن اور وقت کی نزاکت کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے خیالات کے ایسے پر جوش اظہار سے باز رہنا چاہیے۔ یہ رنج کی بات ہے کہ پچھلے دنوں مسٹر جناح کی تقریروں کے جو حصے اخباروں میں شائع ہوئے ہیں،ان میں خلاف توقع عام طور پر الزام تراشی سے کام لیا گیا ہے۔'' (17)

مولانا آزاد مسٹر جناح کے بے وقت کی راگنی سے کافی نالاں تھے۔ پھر بھی وہ کانگریس کے سرکردہ لیڈروں سے گزارش کر کے ان سے بات چیت کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے،تاکہ ملک کی سالمیت کو جو خطرہ درپیش ہے، وہ ٹل سکے۔نومبر ۱۹۳۹ء میں گاندھی جی اور جواہر لال نہرو دوبارہ مسٹر جناح سے ملے، تاکہ ہندو مسلم مسئلے کا کوئی حل نکل سکے۔ گاندھی جی اور مولانا آزاد کی تمام کاوشیں بیکار ثابت ہوئیں۔مسٹر جناح اپنے رویے میں کوئی لچک پیدا نہ کر سکے، بلکہ اس سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر یہاں تک فرما دیا کہ جب تک کانگریس نظریۂ پاکستان قبول نہیں کر لیتی،تب تک گفت وشنید بے کار ہے۔ یہ ایک ایسی شرط تھی جس کے تمام قوم پرست لیڈران مخالف تھے۔خاص طور پر مولانا آزاد اور گاندھی جی اس کے سخت مخالفین میں تھے۔مسٹر جناح مسئلے کا حل ڈھونڈھنے کے بجائے اسے الجھانے پر آمادہ نظر آتے تھے۔نتیجتاً دونوں جماعتوں کے درمیان خلیج دن بدن بڑھتی چلی جا رہی تھی اور تقسیم ہند کا عفریت بار بار سر اٹھا رہا تھا۔اس کے سر کو کچلنے کی ہر ممکن سعی ہوئی،لیکن قدرت کا فیصلہ اٹل تھا اور آگ کے اس دریا کو پار کرنا ہمارا مقدر بن چکا تھا۔

مولانا آزاد ''آئین نو سے ڈرنا،طرز کہن پہ اڑنا'' کے قطعاً قائل نہ تھے۔ان کی دوررس نگاہیں مستقبل کی طرف دیکھ رہی تھیں۔مسلم لیگ کا ساحرانہ اور خود غرضانہ انداز سیاست مصائب کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور آج اس 'خیالی ارم' کا حال سبھی کے سامنے ہے۔ جذباتی اور تعصّباتی سیاست کا نشہ ہرن ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔تقسیم نے مسلمانوں کو کمزور اور بے بس بنا دیا۔ جناح اور ان کے حوارین انگریزوں کی دی ہوئی 'برگ حشیش' کو 'شاخ نبات' سمجھ کر خوش تھے،جب کہ مولانا آزاد قیام پاکستان کے سخت مخالفین میں سے تھے اور ہندوستانی مسلمانوں کو جو سبز باغ دکھایا جا رہا تھا،اس کی حقیقت سے باخبر بھی

!مولانا آزاد نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''تم کو یہ سبز باغ دکھایا جارہا ہے۔آیندہ جب اس کے ہولناک نتائج سامنے آئیں گے اورتم ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے،تب تم کو ہوش آئے گا اور اپنی غلطی کا احساس کرو گے اورتمھاری حمایت کا دم بھرنے والے بالکل ہی غائب ہوجائیں گے۔'' (18)

مولانا آزاد کا یہ خیال بالکل درست تھا کہ تقسیم سے مسلمان نہ صرف کمزور ہوں گے، بلکہ احساس کمتری کا شکار ہوکر ذہنی طور پر یکدم مفلوج ہوجائیں گے۔ادھر پاکستان میں بھی وہ غیر محفوظ اور معاشی اعتبار سے پس ماندہ ہوں گے۔گویا پاکستان مسئلے کا حل نہیں،خطرات کا پیش خیمہ ہے۔مولانا آزاد نے مسلم لیگ کی تجویز کو نامکمل اور ادھورا بتاتے ہوئے فرمایا تھا:

''مسلم لیگ نے پاکستان کی جو اسکیم تجویز کی ہے،اس پر میں نے ہر پہلو سے غور کیا ہے۔ایک ہندوستانی کی حیثیت سے میں نے سوچا ہے کہ پورے ہندوستان کے مستقبل پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ایک مسلمان کی حیثیت سے میں نے دیکھا ہے کہ مسلمانوں کے مستقبل پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔''

''اسکیم کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ نہ صرف بحیثیت مجموعی ہندوستان کے لیے، بلکہ خاص طور پر مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہوگی اور دراصل جتنے مسئلے اس کے ذریعے حل ہوں گے،ان سے زیادہ نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔'' (19)

پاکستان کی اسکیم اور پوری صورت حال کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد مولانا آزاد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یہ مسلمانوں کے لیے کسی طرح سے بھی سودمند نہیں ہے، نیز حفاظتی/ جماعتی نقطۂ نظر سے بھی یہ تقسیم مسلمانوں کے حق میں نہیں ہے۔مولانا آزاد نے ہر پہلو اور ہر نکتہ پر غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ سنایا تھا اور حامیانِ پاکستان کو از سرِ نو غور و فکر کی دعوت دی تھی۔پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد جو مسائل پیدا ہوں گے، اس سے بھی خبردار کیا۔آزادی کی تحریک کا یہ سپہ سالار کس طرح قومی فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔اسے اپنے سے زیادہ دوسروں کی فکر دامن گیر تھی۔اسی لیے وہ بار بار تقسیم کو ٹالنے کا مشورہ دے رہا

تھا۔ تقسیم سے قبل مولانا آزاد نے فرمایا تھا:

> ''بٹوارہ قدرتی ہے یا غیر قدرتی اس بحث میں نہ پڑو، نیت فرنگ اس کے حق میں ہے۔ شاید وہ کامیاب ہو جائے۔ یہ فساد اس بڑے فساد کا پیش خیمہ ہے، جو موہومہ تقسیم کے بعد ہوگا۔ تم لوگ مٹ جاؤ، مگر کوشش کرو کہ یہ حادثہ خونیں اوراس کے اسباب تخلیق کامران و بامراد نہ ہوں۔ اسلام کے نزدیک یہ جغرافیائی حدود ، دوائر رحمت کی وسعتوں کے خلاف ہیں۔ انسانیت محبت واخوت کی محتاج ہے۔ یہی ایک طرز عمل نسلی تفریقوں کو انس ومواخات کے قالب میں ڈھال سکتا ہے۔'' (20)

تقسیم قدرتی تھا یا غیر قدرتی اس کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے، لیکن تقسیم کے بعد جس طرح کا خونی کھیل کھیلا گیا۔ حیوانیت اور بہیمیت کا جو ننگا ناچ ہوا، اس سے انسانیت کا جامہ تار تار ہو گیا۔ دونوں طرف کے جنونی ہندو مسلم وحشی کا روپ دھار چکے تھے، ایک دوسرے کے جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ یہی بنیادی وجہ تھی کہ مولانا آزاد تقسیم کو کسی بھی صورت میں قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ گاندھی جی نے ایک مرتبہ مولانا آزاد سے پاکستان سے متعلق ان کی رائے جاننی چاہی تو مولانا آزاد نے نہایت ہی واشگاف لفظوں میں فرمایا تھا کہ اس تقسیم سے مسائل سلجھنے کے بجائے اور پیچیدہ ہوں گے اور مجموعی اعتبار سے یہ نقصان دہ ثابت ہوگا۔

مولانا آزاد حالات کی سنگینی کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے اور پاکستان کے قیام سے مسلمانوں کو جو خسارہ ہوگا، اس سے بھی بڑی حد تک واقف تھے! لیکن ان کا اخلاص، جنوں کے سامنے ہار گیا اور وہ مسلمانوں کو کسی طرح قائل نہ کر سکے۔ مسلم لیگ کے قائدین اور موقع پرستوں نے اپنے مفاد کو سامنے رکھا اور ایک ایسی ہیجانی فضا تیار کی، جس کی رو میں سادہ لوح مسلمان بہہ گئے۔ ہندو شدت پسندوں نے بھی اس مسئلے کو ہوا دی اور ناعاقبت اندیش یہ سمجھ بیٹھے کہ جب ہندو قیام پاکستان کے مخالف ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس میں مسلمانوں کا کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور پوشیدہ ہے۔

مولانا آزاد نے صورت حال کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد یہ رائے قائم کی تھی کہ تقسیم مسلمانوں کے حق میں کسی طرح بھی سودمند نہیں اور اگر کوئی اس اسکیم کے فوائد مجھے سمجھا دے تو سب سے

پہلے میں اس کا وکیل بن کر رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کروں گا،لیکن حقیقت سب پر عیاں تھی۔ تقسیم کے بعد مسلمان جس صورت حال سے دوچار تھے، کوئی کم ظرف ہوتا تو کنارہ کش ہوجاتا اور کہتا کہ جاؤ اپنے آقاؤں کے فرمان بجالاؤ، ان کو سجدہ کرو۔ مگر نمک پاشی کے بجائے مولانا آزاد مسلمانوں کے ہمدرد، بہی خواہ اور غمگسار بن کر سامنے آئے۔ سارے گلے شکوے بھول کر ان کی آبادکاری اور فساد کی تباہ کاریوں کو دور کرنے میں لگ گئے۔ دسمبر 1947ء میں لکھنؤ میں مسلمانوں کی ایک کل جماعتی کانفرنس منعقد ہوئی، جس کا مقصد خاص غیر جذباتی ہوکر مستقبل کے بارے میں سوچنا اور ایک لائحہ عمل تیار کرنا تھا۔ اس موقعے پر تقریر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے فرمایا:

> ''میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی جس کا ہم ستر برس سے خواب دیکھ رہے تھے، برباد نہ ہو، اور بربادی کے کسی نئے دروازے میں نہ گھس جائے، تو ہمارا یہ فرض ہوجاتا ہے کہ جس دروازے سے یہ فرقہ پرستی آئی ہے، اسی دروازے کو بند کردیں اور اسے ختم کردیں۔'' (21)

یہ بات سچ ہے کہ صورت حال کے پیش نظر مسلمانوں کے ذہن ودماغ میں طرح طرح کے سوالات اور شبہات باقی تھے۔ مسلم لیگی تو اپنی جنت بے نظیر میں پہنچ چکے تھے۔ بھلا انھیں مسلمانوں اور خاص طور پر ہندوستان کے بے یارومددگار مسلمانوں سے کیا سروکار تھا، جو چند حضرات کسی وجہ سے بچ بھی گئے تھے، وہ بے حد حیران وپریشان تھے۔ لہٰذا انھوں نے اپنی سراسیمگی کو عام مسلمانوں میں پھیلانا شروع کیا۔ تقسیم کے بعد بہت سخت اور کڑا وقت آیا۔ مولانا آزاد دل خراش اور انسانیت سوز واقعات سن کر نڈھال ہوجایا کرتے تھے۔ وزیر تعلیم ہونے کے بعد بھی مولانا آزاد جامع مسجد دہلی کے باہر پناہ گزیں کیمپ میں جاکر، وہاں کے لوگوں کا حال جانتے تھے، ان کے درمیان بیٹھتے تھے۔ لوگوں کی تکالیف اور پریشانی دیکھ کر/سن کر مغموم ہوجاتے تھے۔ نہایت نازک دور میں انھوں نے مسلمانوں کے حق میں آواز بلند کی، جس سے شمالی ہند کے مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے قدم رک گئے۔ دہلی کے جامع مسجد میں ایک اجتماع سے اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا آزاد نے فرمایا:

> ''ابھی کچھ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے کہا تھا...... یہ ستون جس پر تم نے بھروسہ کیا ہے، نہایت تیزی سے ٹوٹ رہا ہے، لیکن تم نے سنی ان سنی کردی اور یہ نہ

سوچا کہ وقت اوراس کی تیز رفتاری تمھارے لیے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمھارا بھروسہ تھا، وہ تمھیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے۔۔۔میں نے ہمیشہ کہا اور آج بھی کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو۔شک سے ہاتھ اٹھالو اور بدعملی ترک کردو۔یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے، اس پر غور کرو۔اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے پر آمادہ کرو۔پھر دیکھو کہ تمھارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں؟'' (22)

مولانا آزاد نے مسلمانوں سے بار بار یہ سوال کیا کہ تم کہاں اور کیوں جا رہے ہو؟ وہاں کا مستقبل کیا ہے! تمھارا شاندار ماضی تم سے سوال کر رہا ہے، تمھاری تہذیب وثقافت تم سے سوال کناں ہے، بقول مولانا آزاد:

''یہ دیکھو مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے جمنا کے کنارے تمھارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمھیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے، جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمھارا جوش وخروش بے جا تھا، اسی طرح آج تمھارا یہ خوف وہراس بے جا ہے۔مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اوراشتعال، ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔مسلمانوں کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔'' (23)

مولانا آزاد نے مسلمانوں کو خوف وہراس ترک کر کے ایک باعمل زندگی گزارنے کی تلقین کی اور وہی بات دہرائی جو عہد برطانوی میں وہ کہا کرتے تھے۔دراصل مولانا آزاد ہندوستانی مسلمانوں کے مسیحا بن گئے، جب انھیں سہارا دینے والا اور ڈھارس بندھانے والا کوئی نہیں تھا، تو یہ فرشتۂ ارضی ہمہ وقت ان کے لیے تڑپ رہا تھا۔بے سہارا، ٹوٹ چکے اور ناامید مسلمانوں کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ان کی ہر طرح سے مدد کر رہا تھا، انھیں قرآن مجید کا حوالہ دے کر ثابت قدم رہنے کا مشورہ دے رہا تھا۔مولانا آزاد نے مسلمانوں کے اضطراب وبے چینی کو دور کرنے کی ہر ممکن سعی کی۔ان میں نیا جوش اور ولولہ پیدا کیا۔

آباواجداد کی تاریخ وتہذیب کا حوالہ دے کران کی سوئی ہوئی غیرت اور دینی حمیت کو للکارا، اللہ پر بھروسہ رکھنے کی ہر حال میں تلقین کی اور فرمایا:

''عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو، یہ نہ کہو کہ تم اس تغیر کے لیے تیار نہ تھے، بلکہ اب تیار ہو جاؤ، ستارے ٹوٹ گئے ،لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔اس سے کرنیں مانگ لو اوران اندھیری راہوں میں بچھادو، جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔'' (24)

مولانا ابوالکلام آزاد کی بصیرت، دانشمندی اور ہوش مندی سے ہندوستان میں باقی ماندہ مسلمانوں کو ایک نئی زندگی ملی۔شاید وہ پہلے اور آخری شخص تھے، جنھوں نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سیاسی اور قومی مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی۔ بقول، پی۔اے۔راجپوت: ''ابوالکلام آزاد جانتے تھے کہ مذہب کا لوگوں کے ذہنوں پر کتنا زبردست قابو ہوتا ہے۔اس لیے انھوں نے ایک خالص سیاسی تحریک کو مذہبی جھلک دے دی۔'' (25) اور حیات نبوی کے سیاسی، سماجی اور معاشی تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے جمہوریت اور متحدہ قومیت کے جدید رجحانات کو اسلامی اصول سیاست سے ہم آہنگ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔انھوں نے اسلامی تاریخ اور دوسری قوموں کی تاریخ کے نشیب وفراز کا بغور مطالعہ کیا تھا۔وہ تاریخی عوامل اور محرکات کے مسلسل عمل اور رد عمل کا شعور بھی رکھتے تھے۔اسی لیے وہ مسلمانوں کو بار بار تبدیلی کے ساتھ چلنے کا مشورہ دے رہے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد میں قیادت کے سبھی اوصاف بدرجۂ احسن موجود تھے۔گاندھی جی، جواہر لال نہرو جیسے صاحب بصیرت بھی ان کی دانش وری اور مدبرانہ صلاحیتوں کا ہمہ وقت اعتراف کرتے رہتے تھے۔وہ صرف مسلمانوں کے ہمدرد اور رہنما نہیں تھے، بلکہ ان کا سینہ ہندو و مسلم سبھی کے درد وغم سے معمور تھا۔تقسیم کا صدمہ مولانا آزاد کو اندر ہی اندر کھائے جارہا تھا۔وہ عزم وحوصلے کے بل پر چل تو رہے تھے،لیکن اندر سے بالکل ٹوٹ چکے تھے، انھوں نے سقراط کی طرح زہر کا پیالہ پیا تھا۔دو قومی نظریے اور فرقہ وارانہ ذہنیت کو وہ ہندوستان کے لیے بہت خطرناک سمجھتے تھے۔وہ سچائی اور خلوص کے پیکر تھے۔ ان کا ایقان تھا کہ ایک ایسی زندگی جس میں خلوص اور سچائی ہو غیر فانی ہوتی ہے اور وہ کبھی مٹ نہیں سکتی۔ مولانا آزاد کی تعلیمات، ان کے سیاسی اور قومی نظریات آج بھی جدید ہندوستان کے لیے مشعل راہ ہیں۔ اس صداقت سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ہندوستان میں متحدہ قومیت اور جمہوریت کو فروغ بخشنے میں گاندھی جی کے بعد سب سے اہم کارنامہ مولانا ابوالکلام آزاد نے انجام دیا ہے۔

حوالہ جات

1. عبدالستار دلوی (مرتب) مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی،2015ء،ص248
2. ابوسلمان شاہجہاں پوری (مرتب) مولانا ابوالکلام آزاد:ایک سیاسی مطالعہ،ص271
3. رشید الدین خاں (مرتب) مولانا ابوالکلام آزاد: ایک ہمہ گیر شخصیت ،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی،2004ء،ص269-268
4. ’الہلال‘ جلد اول ودوم،(8/ستمبر 1912ء) اتر پردیش اردو اکادمی،لکھنؤ،2010ء،ص203
5. مولانا ابوالکلام آزاد(مرتب: مالک رام) غبار خاطر،ص60
6. ابوسلمان شاہجہاں پوری (مرتب) مولانا ابوالکلام آزاد:ایک سیاسی مطالعہ،ص168
7. ابوسلمان شاہجہاں پوری (مرتب) مولانا ابوالکلام آزاد:ایک سیاسی مطالعہ،ص168
8. ابوسلمان شاہجہاں پوری (مرتب) مولانا ابوالکلام آزاد:ایک سیاسی مطالعہ،ص172
9. ابوسلمان شاہجہاں پوری (مرتب) مولانا ابوالکلام آزاد:ایک سیاسی مطالعہ،ص156
10. ابوسلمان شاہجہاں پوری (مرتب) مولانا ابوالکلام آزاد:ایک سیاسی مطالعہ،ص419
11. ’الہلال‘ جلد اول ودوم،(8/ستمبر 1912ء)،ص499
12. مولانا ابوالکلام آزاد(مرتب: مالک رام) خطبات آزاد،ص205
13. مولانا ابوالکلام آزاد(مرتب: مالک رام) خطبات آزاد،ص298
14. مولانا ابوالکلام آزاد(مرتب: مالک رام) خطبات آزاد،ص300-299
15. عبدالستار دلوی (مرتب) مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ،ص173-172
16. محمد فاروق قریشی،مولانا ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست،ص104
17. ابوسلمان شاہجہاں پوری (مرتب) مولانا ابوالکلام آزاد:ایک سیاسی مطالعہ،ص309
18. ابوسلمان شاہجہاں پوری (مرتب) مولانا ابوالکلام آزاد:ایک سیاسی مطالعہ،ص437-436
19. محمد فاروق قریشی،مولانا ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست،ص290
20. ابوسلمان شاہجہاں پوری (مرتب) مولانا ابوالکلام آزاد:ایک سیاسی مطالعہ،ص335

21. ابوسلمان شاہجہاں پوری (مرتب) مولانا ابوالکلام آزاد: ایک سیاسی مطالعہ،ص339-340
22. ابوسلمان شاہجہاں پوری (مرتب) مولانا ابوالکلام آزاد: ایک سیاسی مطالعہ،ص27
23. ابوسلمان شاہجہاں پوری (مرتب) مولانا ابوالکلام آزاد: ایک سیاسی مطالعہ،ص217-218
24. ابوسلمان شاہجہاں پوری (مرتب) مولانا ابوالکلام آزاد: ایک سیاسی مطالعہ،ص440
25. پی۔اے۔راجپوت،ابوالکلام آزاد،لوئن پریس،لاہور،پاکستان (بدون تاریخ)،ص128

❐ **Dr. Mohd. Akhtar**
Head, Department of Urdu
Vasant College for Women
Rajghat, Varanasi (UP)
Mob: 6307336616
Email: akhtarvcr@gmail.com

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:302-317
Dr. Mohd. Jabir Hamza, Tanisiat aur Nisai Hissiat: Momasalat-o-Iftraqat

محمد جابر حمزہ

تانیثیت اور نسائی حسیت: مماثلت وافتراقات

تانیثیت اور نسائی حسیت دونوں کا تعلق عورت سے ہے، باوجود اس کے کہ دونوں میں فرق ہے۔ایک کا تعلق جہاں عورت کی ادبی، سماجی، سیاسی، مذہبی، اقصادی حیثیت سے ہے تو وہیں دوسری کا تعلق عورت کے ان احساسات و جذبات سے ہے جو خالص ایک عورت کے ہوتے ہیں جو مرد کے احساسات وجذبات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔نسائی حسیت کے برعکس تانیثیت میں عورت کے ساتھ مرد بھی اس کے یعنی عورت کے مسائل پر بحث کرتے ہیں۔اردو میں ایک مدت تک یا یوں کہیں کہ عصر حاضر میں بھی عورت سے متعلق ہر تخلیق، تنقید اور تحقیق کو تانیثیت سمجھ لیا جاتا ہے، یہ درست نہیں ہے۔تمام تر تعلیقات زن کو تانیثیت کے خانے میں نہیں رکھا جا سکتا۔بقول شمس الرحمٰن فاروقی۔

''تانیثیت کو نسائیت یا زنانہ پن کہنا تانیثیت کے تمام اصولوں کی نفی کرنا ہے۔''(1)

تانیثیت (Feminism) اور نسائی حسیت (Feminine Sensibility) دو الگ الگ اصطلاحات ہیں۔شعوری یا غیر شعوری طور پر دونوں کے مابین فرق کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، جبکہ اول الذکر کا تعلق عورت کے تشخص سے اور ثانی الذکر کا اس کے ادراک سے ہے۔اگر ہم ان دونوں کے معنی ومطالب پر غور کریں تو اس فرق کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

تانیثیت

تانیثیت لفظ تانیث سے مشتق ہے، تانیث کے معنی مونث (عورت، مادہ) ہونا، مونث بنانا، نسوانیت، مونث کی علامت وغیرہ کے ہیں۔اسی طرح انگریزی میں ,Womanism, Womanish Womanishness وغیرہ الفاظ کا استعمال عورت کے لیے کیا جاتا ہے جس کے معنی زنانہ پن، عورت

کے جیسا، کے ہیں۔ وقت کے ساتھ یہ الفاظ اور ان کے معنی میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔ جیسے Womanish یا Womanism کے لیے Feminism کا لفظ وجود میں آیا۔ Feminism سے پہلے Feminine اور Feminist جیسے الفاظ ملتے ہیں۔ جس میں Feminine کے معنی 'عورت سے متعلق' اور Feminist جو Feminism (تانیثیت) کی رعایت سے "تانیثیت کا حامل" کا مفہوم ادا کرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن یہ ایک تحقیق طلب معاملہ ہے کہ لفظ Feminism بطور اصطلاح کب، کہاں اور کس نے استعمال کیا؟ اب تک کی تحقیق کے مطابق Feminism کا لفظ سب سے پہلے ایک فرانسیسی فلسفی Francois Marie Charles Fourier نے استعمال کیا ہے۔(i) لیکن اس کے بعد مختلف مقامات پر کئی دانشوروں کے یہاں Feminism اور Feminist کا لفظ ایک ہی معنی میں آیا ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ اس وقت تک اس تحریک یا رویے کے خدوخال بہت واضح نہیں تھے۔ فوریر نے اپنے ایک مضمون میں Feminism لفظ کا استعمال کیا ہے۔ فوریر کے مطابق عورت اور مرد کو برابر کے مواقع ملنے سے انسانی صلاحیتوں کا فروغ ہوتا ہے جس سے سماجی توازن برقرار رہتا ہے۔ اس کے مطابق ملازمت میں جنس کے اعتبار سے نہیں قابلیت کی بنا پر انتخاب ہونا چاہیے۔ New word Encyclopedia کے مطابق 1837ء میں Fourier نے لفظ Feminism (تانیثیت) کا سب سے پہلے استعمال کیا۔(ii) مشہور صحافی "Cristen Congern" نے اپنے مضمون The Man Who Coined Feminism میں Charles Fourier کو لفظ Feminism (تانیثیت) کا وضع کرنے والا مانا ہے۔(iii)

پروفیسر شہناز نبی کے مطابق:

> "محققین کا کہنا ہے کہ لفظ 'فیمنز م' کا استعمال فرانسیسی فلاسفر چارلس فوریر (Charles Fourier) نے 1837ء میں کیا تھا۔"(2)

اس رائے میں بھی ہمیشہ اختلاف رہا ہے کہ لفظ "Feminism" کا استعمال سب سے پہلے کس نے کیا۔ دسمبر 1896ء میں لندن کے ایک اخبار میں Eugenie Potonie Pierre نام کی ایک عورت نے واضح کیا کہ Feminism کی اصطلاح کا استعمال اس نے اور Peer جو کہ ایک فرنچ فیمنسٹ تھی ساتھ مل کر کیا تھا۔ یہ بات پائری نے 1896 میں برلن کی ایک بین الاقوامی کانگریس میں کہی تھی، وہ اس وقت International Congress for Women's Right کی سیکریٹری تھی۔(iv)

ڈاکٹر آمنہ تحسین لکھتی ہیں کہ:

’’یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ اصطلاح "Feminism" کب وجود میں آئی۔ تاہم خیال کیا جاتا ہے کہ لفظ ’فیمینسٹ‘ (Feminist) پہلی مرتبہ فرنچ میڈیکل ٹکسٹ میں 1871ء میں استعمال ہوا۔ یہ لفظ ایسے مرد افراد کے لیے استعمال کیا گیا۔ جن میں نسوانی خصوصیات پیدا ہوگئی ہوں۔‘‘(3)

وہ مزید لکھتی ہیں کہ:

’’فرانس کی ہی ایک تخلیق کار Alexander Dumas Fils نے ایک چھوٹی سی کتاب ’’I Homme-Femme‘‘ لکھی۔ جو Adultery (بدکاری) کے موضوع پر لکھی تھی۔ اس کتاب میں Alexander نے لفظ ’Feminist‘ ایسی عورتوں کے لیے استعمال کیا جن کا برتاؤ مردانہ رہا تھا۔‘‘(4)

Feminism کے معنی میں ترمیم و اضافہ ہوتا رہا ہے۔ یہ لفظ 1852ء میں The Oxford English Dictionary کے Record میں آیا جب کہ، نیدرلینڈ میں 1872ء، برطانیہ میں 1890ء، اٹلی میں 1897ء، اسپین میں 1902ء، امریکہ میں 1910ء کے آس پاس میں اس کا استعمال کیا گیا۔ عام خیال ہے کہ 1890ء میں انگلینڈ میں خواتین کے مساویانہ حقوق کی لڑائی میں پہلی بار یہ لفظ استعمال ہوا۔ ابتدائی دور میں Feminism یا Feminist لفظ کا استعمال بطور اصطلاح نہیں ہوتا تھا بلکہ کبھی کسی نے اسے عورتوں کے حقوق کے لیے تو کبھی کسی نے مرد کے اندر نسوانی خصوصیات یا عورتوں کے مردانہ برتاؤ وغیرہ کے لیے اس کا استعمال کیا۔ لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ ہر جگہ یہ لفظ ایک مخصوص سماجی احتجاج کے تعلق سے ہی استعمال کیا جاتا رہا ہے اسی لیے جب تحریک نسواں کے خدوخال زیادہ واضح اور روشن ہونے لگے تو یہی لفظ اس تحریک سے متعلق ایک اہم اصطلاح کے طور پر رائج ہوگیا۔ چنانچہ آج ہم Feminism یا Feminist کو بطور ایک اصطلاح کے ہی استعمال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تانیثیت جیسی اہم اور کلیدی نوعیت کی اصطلاح پر سنجیدگی سے غور کرنے اور اسے سمجھنے کی ضرورت ہے کیونکہ جیسا کہ راقم الحروف ابتدا میں یہ عرض کر چکا ہے کہ ان دونوں اصطلاحات کا استعمال مختلف سیاقیات میں کیا جاتا رہا ہے۔

انسائکلو پیڈیا آف برٹانیکا (Encyclopedia of Britannica) کے مطابق:

"Feminism, the belief in the social, economic and political equality of the sexes."(5)

پروفیسر سید عقیل رضوی تانیثیت کی تعریف کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''جہاں تک سمجھ میں آتا ہے، تانیثیت ایک نیا فکری تصور ہے جو بیسویں صدی کے نصف کے بعد سے مغربی فکر اور تنقیدی تصورات میں روز بروز اپنا دباؤ ڈالتا جا رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی احتجاجی صورتوں کو بھی واضح کرتا جا رہا ہے۔ احتجاج ان معنوں میں کہ مرد کی بنائی ہوئی اس سوسائٹی میں نہ صرف یہ کہ عورتوں کو زندگی میں مواقع کم فراہم کیے جاتے ہیں بلکہ زندگی کی ارتقائی پیش قدمیوں میں عورت کو یا تو پیچھے ڈھکیل دیا جاتا ہے یا اس کی کوششوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔''(6)

کملا بھاسن کے خیال میں:

''تانیثیت ایک احساس کا، کہ معاشرے میں عورت مظلوم ہے اور اس کا استحصال کیا جاتا ہے اور اس صورتحال کو بدلنے کی کوشش کا نام ہے۔''(7)

تانیثیت کے متعلق مذکورہ بالا جو چند تعریفیں پیش کی گئی ہیں ان کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک اصطلاح ہے جس کا کوئی مخصوص معنی یا تعریف ممکن نہیں ہے۔ مختصراً تانیثیت کا مقصد عورتوں کو سماج میں ان کا جائز مقام دلانا ہے۔ ایک غلط سماجی رویے کے سبب سے عورت کے اندر اس بات کا احساس پیدا ہو گیا کہ وہ ہر اعتبار سے کمزور و ناتواں بلکہ بے صلاحیت و نا اہل ہے۔ تانیثیت عورت کو اسی احساس کم تری سے باہر نکالنے کے لیے وجود میں آنے والی ایک اجتماعی فکر قرار دی جا سکتی ہے۔ تانیثیت اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ عورت کو سماجی، سیاسی، اقتصادی اور دوسری سطحوں پر مساویانہ حقوق حاصل ہوں۔ پروفیسر انور پاشا کے خیال میں:

''تانیثیت کا تصور عورتوں کے ذریعہ خود اپنے تشخص کی تلاش، اپنے وجود کے آزادنہ اظہار اور مرد اساس معاشرے کے تمام تر اقدار و معیار پر سوالیہ نشان لگانے کے ساتھ ساتھ نئے اقدار و معیار کی تشکیل و تعبیر کی جہتوں کو وا کرنے سے عبارت ہے۔''(8)

دور حاضر میں نظریاتی سطح پر تانیثیت کی بہت سی شاخیں وجود میں آچکی ہیں۔ یہ شاخیں ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود ضروری نہیں کہ آپس میں متضاد بھی ہوں۔اب تک تانیثیت کی کئی شاخیں وجود میں آچکی ہیں۔جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

1. آزادخیال تانیثیت (Liberal Feminism)

آزادخیال تانیثی رویہ مردوں کے مقابلے عورتوں کو جسمانی اور ذہنی لحاظ سے کمزور وکم تر سمجھے جانے کے انتہائی ردعمل کے طور پر سامنے آیا ہے۔آزادخیال تانیثی رویے کی علم بردار خواتین یہ سمجھتی ہیں کہ وہ اپنی سوچ اور کارناموں سے مساوات کا درجہ پاسکتی ہیں۔ان کا خیال ہے کہ عورتوں کے تئیں امتیازی قوانین ہی عورت کی ہمہ جہت ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روکاوٹ ہیں۔اس لیے آزادخیال تانیثی رویہ مردوعورت دونوں کے لیے یکساں ومساوی قانون نیز زندگی کے دوسرے تمام شعبوں میں یکساں مواقع پر زور دیتا ہے۔بچوں کی پیدائش کے تعلق سے بھی اس طبقہ فکر کا یہ خیال ہے کہ تولید و وضع حمل کا معاملہ شوہر اور دیگر افراد خاندان کی مرضی ومنشاء کا تابع نہ ہوکر بچے کو جنم دینے والی عورت کی مرضی کو بھی شامل کر کے حل کیا جانا چاہیے۔

2. انتہاپسند تانیثیت (Redical Feminism)

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں ایک نیا تانیثی رویہ سامنے آیا جو انتہا پسند تانیثیت کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس تحریک کے علم برداروں کا مطالبہ تھا کہ دنیا کے ہر سماج نے عورتوں کو ہمیشہ سے محکوم بنا کر رکھا اور ان کا مسلسل استحصال کیا ہے۔عورتوں پر ظلم وجبر کی یہ داستان انتہائی قدیم ہے اور اس کا تعلق ہر قسم کے سماج اور اس میں پائے جانے والے خواتین کے ہر طبقے سے رہا ہے۔اس انتہا پسند تانیثی رویے کی علم بردار شلامتھ فائرسٹون (Shulamith Firestone) ہیں جن کا تعلق کنیڈا سے ہے۔ان کا کہنا ہے کہ عورتوں کی پسماندگی کے دو اسباب ہیں، پہلا یہ کہ عورتیں جسمانی طور پر مردوں سے اس لیے کمزور ہیں کہ انھیں بچہ پیدا کرنا پڑتا ہے۔دوسرا یہ کہ پیدائش کے بعد ان بچوں کی پرورش اور پرداخت بھی مکمل طور پر عورتوں کے ہی ذمے ہوتی ہے چونکہ بچہ پیدا ہونے کے بعد ایک مخصوص عمر تک اپنی تمام ضروریات کے لیے ماں پر انحصار کرتا ہے اس لیے عورتوں کی زندگی کا ایک بڑا حصہ بچے کی انہیں ضروتوں کو پورا کرنے میں گزر جاتا ہے۔فائرسٹون مزید لکھتی ہیں کہ جدید ٹکنالوجی کی ایجاد نے عورتوں کے لیے کافی

سہولتیں فراہم کی ہیں جن سے عورتوں کی حالت میں بہت ساری تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں مثلاً کرائے کی کوکھ، ٹیسٹ ٹیوب سے بچہ پیدا کرنا وغیرہ۔

3. سماجی تانیثیت (Social Femnism)

سماجی تانیثیت کو انتہا پسند تانیثیت اور مارکسی تانیثیت کے درمیان کی کڑی مانا جاتا ہے۔ کچھ ماہرین تو سماجی تانیثیت اور مارکسی تانیثیت دونوں کو ایک ہی مانتے ہیں۔ کیونکہ سماجی تانیثیت نے نہ صرف عورتوں کی غلامی کے لیے اینگلز کے نظریے کو اپنایا بلکہ مارکسی نظریے سے عورتوں کے استحصال کے سائیکل کو سمجھنے کی بھی کوشش کی ہے۔ سماجی تانیثیت کے علم بردار گھروں اور کھیتوں میں کام کرنے والی عورتوں کو متحد کر کے کی زمین و جائداد میں ان کے لیے برابر کی حصہ داری کی مانگ کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی پدری سماج میں وہ گھر اور سرمایادارانہ معاشرے میں عورت کا زمین میں حصہ چاہتے ہیں کیوں کہ عورت کے استحصال کے پیچھے انہیں دونوں کا اہم کردار رہا ہے۔

4. مارکسی تانیثیت (Marxist Feminism)

اشتراکیت میں عورتوں کے مسائل کو الگ سے دیکھنے کو کوئی کوشش نہیں ملتی۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ مارکس اور اس کے دوست اینگلز کے نظریات سے استفادہ کرتے ہوئے عورتوں کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش اور ان کی محکومیت کے اسباب پر روشنی ڈالنا ہی مارکسی تانیثیت ہے۔ مارکسی تانیثیت کے تحت یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح سرمایہ دارانہ نظام اور ذاتی املاک کے نظام کے ذریعے عورتوں کا استحصال ہوتا رہا ہے۔ مارکسی نقطۂ نظر کے مطابق معاشی سرگرمی اور پیداواری نظام میں وسیع پیمانے پر عورت کی حصہ داری اور مرد و عورت کے درمیان گھریلو ذمے داریوں کی یکساں تقسیم عورت کی سماجی حیثیت میں تبدیلی لاسکتی ہے۔ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام نے سماجی پیداوار کے میدان میں اس کی حصہ داری و شمولیت کو تو ممکن بنایا ہے لیکن چونکہ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادیں محنت کش طبقے کے استحصال پر استوار ہیں اور اس نظام میں مرد، عورت اور بچوں کو بغیر کسی امتیاز کے لیبر مارکیٹ کا حصہ بنادیا جاتا ہے۔ اس لیے عورتوں کی مساوی حیثیت اور شخصی آزادی کے لیے یہ ضروری ہے کہ موجودہ نظام ملکیت ختم کیا جائے تاکہ استحصال کا خاتمہ ہو کیونکہ موجودہ نظام ملکیت سرمایہ دارانہ بالادستی کو محفوظ رکھتا اور محنت کش طبقے کے حقوق کی نفی کرتا ہے۔ اس کے برعکس اشتراکی یا اشتمالی نظام کے قیام سے ہر قسم کے استحصال کا خاتمہ

کیا جا سکتا ہے اور اسی میں عورتوں کے حقوق کی ضمانت بھی دی جا سکتی ہے۔

5. سیاہ فام تانیثیت (Black Feminism)

سیاہ فام تانیثیت ایک ایسا نظریہ ہے جو اس بات سے بحث کرتا ہے کہ کس طرح جنسیت، طبقاتی جبر، ذاتی شناخت اور نسلی امتیاز باہم ایک دوسرے کو جکڑے ہوئے ہیں۔ ایسے تصورات جو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں اسے باہمی اتحاد (Intersectionality) کہتے ہیں۔ باہمی اتحاد کا نظریہ سب سے پہلے 1989ء میں قانون کی اسکالر کیمبری کرین شا (Kemberie Crenshaw) نے دیا تھا۔ کیمبری کے مطابق صرف سیاہ فام یا صرف عورت ہونے سے ایک سیاہ فام عورت ہونے کی کیفیت اور اس کے مسائل کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ ہر تصور کی شناخت آزادانہ طور پر ہوتی ہے لیکن اس میں تعاملات کا شامل کرنا لازمی ہوتا ہے جو ایک دوسرے کو مضبوط بناتے ہیں۔ ایک سیاہ فام شخص کس قسم کی سماجی و نسلی تفریق کا سامنا کرتا ہے یا ایک عورت کے ساتھ محض اس کی جنس کی وجہ سے نابرابری کا سلوک کیا جاتا ہے، یہ دو مسائل اس وقت اور بڑھ جاتے ہیں جب یہ کسی سیاہ فام عورت کی شکل میں یکجا ہو جاتے ہیں کیونکہ ایک سیاہ فام کے ساتھ روا رکھا جانے والا امتیازی سلوک اور ایک عورت کی سماجی ہتک کسی سیاہ فام عورت کے ساتھ ہونے والے سماجی رویے میں جمع ہو جاتے ہیں۔ 1974ء میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ سیاہ فام عورتوں کی آزادی تمام لوگوں کی آزادی کی راہ ہموار کرے گی۔ بیسویں صدی کی ساتویں اور آٹھویں دہائی میں سیاہ فام تانیثیت پسندوں کے کئی گروہ وجود میں آئے۔ جنہوں نے سیاہ قومیت کے حوالے سے سیاہ فام خواتین کے کردار اور ہم جنس پرستوں کی آزادی سے متعلق مباحث کو موضوع بحث بنایا۔ تانیثیت کی اس لہر نے کئی تنازیات کو جنم دیا اور انہیں تنازیات کی بنا پر سیاہ فام تانیثیت تانیثی تحریک کا مرکزی موضوع بن گئی۔

6. ہم جنس تانیثیت (Lesbian Feminism)

ہم جنس تانیثیت بیسویں صدی کی ساتویں اور آٹھویں دہائی میں میں سب سے زیادہ فعال رہی ہے۔ خاص طور پر شمالی امریکہ اور مغربی یوروپ میں اس کے اثرات زیادہ دیکھے گئے۔ ہم جنس تانیثیت کا نظریہ منطقی طور پر ہم جنسیت کی وکالت کرتا ہے۔ اس تحریک کے علم برداروں کا خیال ہے کہ جنسی خواہشات میں ترجیحات کا مسئلہ اہم ہے۔ جو جس طرح چاہے اپنی جنسی خواہش پوری کر سکتا ہے اور یہ ہر انسان کا قدرتی اور پیدائشی حق ہے۔ لیکن پدری نظام اسے ایک غیر اخلاقی فعل مانتا اور ہر سماج و معاشرے

کے اخلاقی نظام کے لیے اسے ایک خطرہ قرار دیتا ہے۔

7. تحلیل نفسی تانیثیت (Psychoanalytic Feminism)

تحلیل نفسی تانیثیت سماجی ڈھانچے اور جنس پر مرکوز نفسیات کی ایک شکل ہے۔ جو آسٹریا کے ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ کا نظریہ تحلیل نفسی کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ تحلیل نفسی کا نظریہ بنیادی طور پر انسان کی ذہنی صورت حال اور طرز عمل کے مطالعہ سے متعلق ہے لیکن اس نظریے کا اطلاق سماج پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ فرائڈ کے مطابق انسان کا جذبہ جنس ہی اس کے تمام شخصی وانفرادی رویے کے پس پشت کارفرما ہوتا ہے اس لیے اس کے تمام مسائل کا حل بھی اسی تناظر میں تلاش کیا جانا چاہیے۔ مطالعات نسواں اور ادب کے مطالعے میں تحلیل نفسی کے اصولوں کا استعمال کر کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ خواتین کے خلاف امتیازی سلوک اور خود خواتین میں موجود احساس کم تری وعدم تحفظ کے رجحان کے اسباب و عوامل کی تلاش ونشاندہی تحلیل نفسی کے اسی طریقہ کار کو بروئے کار لا کر کی جاتی ہے۔ تحلیل نفسی تانیثیت کا مقصد تانیثیت کے ان مسائل کو ظاہر کرنا ہے جو عورتوں کے ذہنی اور جسمانی استحصال کے سبب پیدا ہوئے ہیں۔ تحلیل نفسی کے نظریے نے اس بات پر بھی زور دیا کہ عورتوں کے استحصال کی جڑیں مردوں کے ذہن میں گہرائی تک پیوست ہوتی ہیں۔ اس لیے عورتوں کے تئیں مردوں کے امتیازی سلوک کے پس پشت کارفرما نفسیاتی محرکات کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔

8. وجودی تانیثیت (Existentialist Feminsm)

وجودی تانیثیت کے مطابق انسانی غیر برابری کا احساس وجود کے فلسفیانہ تصور کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ وجودی تحریک ایک فلسفیانہ اور تہذیبی تحریک ہے جس میں انسان کے وجود کو اہمیت حاصل ہے۔ بحیثیت فرد ایک انسان کیا سوچتا اور سمجھتا ہے، زندگی کے تئیں اس کا انفرادی رویہ کیا ہے، ان سب باتوں کی وجودی فلسفے میں بڑی اہمیت ہے۔ انسانی وجود کو سمجھنے کے لیے اخلاقی یا سائنسی نظریات کافی نہیں ہیں۔ انسان کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس طرح کا طریقہ کار اختیار کیا جائے جس میں وجود کے معنی کی دریافت کو اہمیت حاصل ہو۔ چونکہ مسلسل اور ہمہ گیر استحصال کے نتیجے میں عورت اپنے وجود کی اہمیت وانفرادیت سے بے خبر ہو کر مکمل طور پر احساس کم تری کا شکار تھی اس لیے یہ ضروری تھا کہ اسے اپنے وجود کی تفہیم کی جانب راغب کیا جائے جس کے نتیجے میں وہ بیدار ہو اور عملی طور پر ان زیادتیوں کے خلاف آواز

بلند کرے جو صدیوں سے اس پر روا رکھی جاتی رہی ہیں۔ یہی سبب تھا کہ سارتر، نطشے، کرکے گار جیسے فلسفیوں کے افکار کے نتیجے میں وجودی تانیثیت کے علم برداروں نے اجتماعیت پر انفرادیت کو ترجیح دی۔

9. جدید تانیثیت (Modern feminism)

جدید تانیثیت سائنسی ایجادات کی کامیابی کا نتیجہ ہے۔ سائنس کے بغیر جدیدیت کا تصور ناممکن ہے۔ تانیثیت کے دوسرے نظریات جیسے سماجی تانیثیت، انتہا پسند تانیثیت، مارکسی تانیثیت وغیرہ نے متفقہ طور پر سائنس اور ٹکنالوجی کو ایک تحفے کی شکل میں قبول کیا۔ چونکہ سائنسی نتائج ہر قسم کی عصبیت سے پاک اور صرف تجربے کی بنیاد پر مرتب کیے جاتے ہیں اس لیے عورتوں سے متعلق مسائل کا سائنٹفک حل بھی زیادہ قابل ترجیح ہونا چاہیے۔ یہی سبب ہے کہ جدید تانیثیت میں سائنس اور تکنالوجی کی ایجادات کی کامیابی کو خاصی اہمیت حاصل ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ جدید تانیثیت سائنس اور ٹکنالوجی کے نظریات اور انقلابات ہی کے بطن سے پیدا ہوئی ہے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ تقریباً ہر تانیثی مکتب فکر جدیدیت اور اس کے صحت مند نتائج کو اسی لیے قبول کرتا ہے کہ اس کی بنیاد میں سائنسی فکر و نظریات کارفرما ہوتے ہیں۔ سائنسی رویہ جدید فکر و نظر کی بنیاد بنتا اور قدامت پسندی کے خلاف ایک ردعمل کے طور پر سامنے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید تانیثیت سائنسی علوم پر بھی مردوں کی اجارہ داری کے خلاف ایک ردعمل کی شکل لے چکی ہے۔

10. مابعد جدید تانیثیت (Post Modern Feminism)

مابعد جدید لفظ سب سے پہلے ایک برطانوی مورخ نے دوسری عالمی جنگ کے بعد کے دور کے لیے استعمال کیا تھا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد جس طرح انسانی نیز اخلاقی اقدار پر سے لوگوں کا اعتماد و یقین اٹھ گیا تھا اس سے ایک قسم کی ناامیدی و یاس پیدا ہو گئی تھی، جسے ظاہر کرنے کے لیے مابعد جدید کا لفظ استعمال کیا گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد ہی ایک مخصوص دور تک محدود نہ رکھ کر مابعد جدید دور کا استعمال خاصا عمومی ہو گیا اور آج ہم اس سے کوئی بھی زمانہ، عہد، ثقافت، نظریہ، فلسفہ یا ادبی و تخلیقی رجحان مراد لے سکتے ہیں۔ تانیثی نظریات میں مابعد جدید نقطۂ نظر آج خاصی اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ دیگر تانیثی نظریات کے برعکس یہ نظریہ انفرادیت و وحدانیت کے بجائے اجتماعیت پر زیادہ زور دیتا ہے۔ یہ نظریہ عورت کو ایک علیحدہ گروپ ماننے سے انکار کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ عورت کے مسائل محض جنسی تفریق کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ اس تفریق میں دوسرے بہت سے عوامل بھی کارفرما ہیں۔ تانیثیت کا مابعد جدید نقطۂ نظر افتراقات کے

بجائے مماثلتوں اور مشابہتوں کا تجزیہ کرنے پر زور دیتا ہے جس کے لیے اس نظریے کے حاملین نے عالمگیریت اور عمومیت جیسی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ مابعد جدید فکر تانیثیت کے حوالے سے انحراف کے برعکس قبولیت کے تصور کو اہم قرار دیتی ہے۔ وہ ایک فسطائی مردانہ سماج اور زبان کے مدمقابل ایک دوسرے فسطائی تانیثی سماج و زبان کے قیام کو تسلیم نہیں کرتی۔

11. ماحولیاتی تانیثیت (Eco Feminism)

ماحولیاتی تانیثیت کا لفظ سب سے پہلے فیرینکوئس ڈی یوبون نے کیا تھا۔ یہ تحریک بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کی ابتدا میں سامنے آئی۔ ماحولیاتی تانیثیت اصلاً ایک تعلیمی تحریک اور فلسفہ ہے۔ یہ عورتوں کے مسائل کو ماحولیاتی تبدیلیوں کے حوالے سے دیکھتی ہے۔ اس تحریک کے مطابق عورتوں اور ماحولیات کی تاریخ بڑی حد تک یکساں رہی ہے۔ دونوں ہی عام انسانی زیادتیوں کا شکار رہی ہیں اس لیے دونوں کے تحفظ کو یقینی بنانا ایک مہذب اور سنجیدہ معاشرے کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ ماحولیاتی تانیثیت کی حامی امریکن خاتون سیلی میک فیگ جو ایک عیسائی عالمہ ہیں، اس زمین کو خدا یا بھگوان کے جسم کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں۔ ان کے مطابق زمین اور اس کے ماحول کا تحفظ ایک مذہبی فریضے کی حیثیت رکھتا ہے۔ عورتوں کے صحت سے متعلق مسائل کو بھی ماحولیاتی تانیثیت فطرت اور ماحول سے غیر ضروری چھیڑ چھاڑ کا نتیجہ قرار دیتی ہے۔

12. ثقافتی تانیثیت (Cultural Feminism)

ثقافتی تانیثیت عورتوں کے ان فطری خصائص یعنی مادرانہ جذبے، پرورش اطفال، ایثار و قربانی، جذباتیت، شرم وحیا، نسوانی جھجک وغیرہ کو منفی طور پر نہ دیکھ کر ان کے مثبت پہلوؤں پر زور دیتی ہے۔ تولیدی صلاحیت کو یہ تحریک عورت کی کمزوری نہ قرار دے کر اس کی ایک اہم قوت کے طور پر تسلیم کرتی ہے۔ اس تحریک کے علم برداروں کا خیال ہے کہ عورت کی فطرت نیز اس کے جذبات واحساسات بہرحال مردوں سے مختلف ہوتے ہیں لیکن جذبہ واحساس کا یہ اختلاف عورت کی کمزوری نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جس طرح مرد اپنے مکمل مردانے اوصاف وخصائص کے ساتھ سارے حقوق رکھتا ہے ویسی ہی آزادی عورت کو بھی دی جانی چاہیے۔ کسی بھی معاشرے میں بہت سی ایسی تہذیبی وثقافتی صورتیں پائی جاتی ہیں جن کی صورت گری مرد و عورت کے ذریعے مختلف طریقوں پر انجام پاتی ہے۔ فن موسیقی یا رقص،

شاعری یا نثری ادب ،مصوری یا گلوکاری ان تمام فنون لطیفہ پر مرد کی بالادستی ان فنون سے متعلق خواتین کے کارناموں کو نظر انداز کیے جانے کا سبب بنتی ہے۔اس لیے ان تمام سے متعلق عورتوں کی کاوشوں کو ان کے مزاج وفطرت کے حوالے سے دیکھے جانے کی ضرورت ہے۔

13. مابعدنوآبادیاتی تانیثیت (Postcolonial Feminism)

مابعدنوآبادیاتی تانیثیت تانیثی تحریکات کی ایک فلسفیانہ شکل ہے۔ مغربی اقوام بالخصوص برطانیہ کی استعماریت کے نتیجے میں وجود میں آنے والی مختلف نوآبادیوں کے خاتمے کے بعد کے وہ مسائل جو عورتوں سے متعلق ہیں اس تحریک کا موضوع ہیں۔ان موضوعات میں نقل مکانی کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ رہا ہے جو عورتوں پر بھی بے حد اثر انداز ہوتا ہے۔ روزگار کی تلاش یا خانہ جنگی کے نتیجے میں کی جانے والی نقل مکانی سے عورتیں ہی زیادہ متاثر ہوتی ہیں اور انہی کے مسائل میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ تحریک جنسی مسائل ، جبر ومزاحمت ،ایذارسانی وغیرہ جیسے مباحث کا جائزہ عورتوں کے مسائلی موضوعات کے حوالے سے لیتی ہے۔اس جدید تانیثی رویے کی علم بردار اروندھتی رائے ،لتامنی ،اومانزائن وغیرہ ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہر سماجی ، مذہبی، سیاسی یا ادبی تحریک سماج و معاشرے کے کسی نہ کسی اہم مسئلے کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئی ہے۔تانیثیت کی تحریک بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تحریک وجود میں کیوں آئی؟ ہم دیکھتے ہیں کہ اس تحریک کے علاوہ دیگر تمام تحریکات کی بنیاد میں ایسے سماجی مسائل رہے ہیں جن کا تعلق انسان کے معاشی حالات ،اقتصادی غیر برابری،مخصوص سیاسی بالادستی مبنی بر استحصال سماجی نظام وغیرہ سے رہا ہے۔یعنی دیگر تمام تحریکات کا تعلق بنی نوع انسان کے ان مسائل سے رہا ہے جو کسی جنسی تفریق سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ مثلاً غربت کا مسئلہ،سماجی وسیاسی استحصال کا مسئلہ، مذہب کے غلط استعمال کا مسئلہ،سماجی غیر برابری اور تشدد کا مسئلہ۔ یہ تمام مسائل بلاتخصیصِ مرد و زن پائے جاتے رہے ہیں۔یعنی ان تمام مسائل کا تعلق انسان سے رہا ہے پھر وہ چاہے مرد ہو یا عورت۔ اس کے برعکس تانیثیت کی تحریک اپنی بنیاد میں جس اہم مسئلہ کو رکھتی ہے وہ خالص جنسی وصنفی غیر برابری کی بنا پر وجود میں آیا ہے۔جنسی/صنفی اعتبار سے مرد عورت میں سے کون طاقتور ہے اور کون کمزور یہ کوئی ایسا طے شدہ امر نہیں جسے بآسانی بغیر کسی تر دد کے تسلیم کرلیا جائے۔جسم کی بناوٹ وساخت اور صنفی امتیازات کو کسی صنف کی کمزوری یا طاقت نہیں قرار دیا جاسکتا۔مخصوص جسمانی اوصاف مردوں میں بھی یکساں نہیں

پائے جاتے اور یہی صورتحال عورتوں کے ساتھ بھی ہے۔مختلف علاقوں کی جغرافیائی صورتحال،آب و ہوا وغیرہ بھی طاقت وقوت اور ناطاقتی وکمزوری کا سبب بنتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ابتدائی متمدن معاشرے میں جو تقسیم کار پائی جاتی ہے اس میں معاشی حقوق مرد کو حاصل تھے اور وہی اپنے گھر خاندان اور کنبے کی پرورش و پرداخت نیز کفالت کرتا تھا۔شاید یہیں سے عورتوں کے سماجی استحصال کا آغاز ہوا۔اور اس استحصال کا جواز مرد وعورت کی مخصوص جسمانی ساخت اور صنفی خصوصیات کے مابین پائی جانے والی عدم مماثلتوں میں تلاش کیا جانے لگا۔معاشی واقتصادی ذرائع پر مردوں کی بالادستی نے عورت کو سماجی طور پر کمزور کر دیا اور اس کی یہی کمزوری اس کی صنفی کمزوری قرار دی جانے لگی۔کوئی بھی دو چیزیں،اوصاف یا اشخاص ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن اس اختلاف کو کسی ایک کی کمزوری سمجھ لینا ہی وہ رویہ تھا جس نے عورت کو کمزور و مظلوم بنا کر پیش کیا۔تانیثیت کو اسی رویے کا اجتماعی ردعمل کہا جا سکتا ہے۔

نسائی حسیت

نسائی لفظ نساء سے ماخوذ ہے،جس کے معنی جنس اناث،عورتوں کی جنس وغیرہ کے ہیں۔اس کے لیے انگریزی میں لفظ Feminine استعمال ہوتا ہے جو کہ اطالوی زبان کے Femininus سے لیا گیا ہے، اس کے معنی عورتوں کی جنس،عورتوں کی خصوصیات،عورتوں کے جیسا وغیرہ ہیں۔اسی طرح حسیت عربی زبان کے لفظ 'حس' سے بنا ہے،جس کے معنی احساس کر لینے کی جبلت،احساس کی طاقت کے ہیں۔انگریزی میں اس کے لیے لفظ 'Sensibility' استعمال ہوتا ہے۔یہ اطالوی زبان کے 'Sensibilitas' سے مشتق ہے جس کے معنی محسوس کرنے کی قوت،احساس،گہرے احساس کا تجربہ وغیرہ ہیں۔

اردو ادب میں نسائی حسیت کو بطور اصطلاح یا بطور لفظ کب اور کس نے سب سے پہلے استعمال کیا یہ ایک تحقیق طلب امر ہے۔البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ نسائی حسیت کی اصطلاح اردو میں اکیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔اس سے پہلے اردو میں عورتوں کے تعلق سے کوئی باقاعدہ اصطلاح نہیں ملتی لیکن اس کے باوجود عورتوں کے مسائل پر تخلیقی،تنقیدی اور تحقیقی کام ہوتے رہے ہیں اور عورت کے احساسات و جذبات اور اس کے مسائل بیان کیے جاتے رہے ہیں۔مثلاً اردو ادب میں نسوانی کرداروں کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ،اردو افسانے میں نسائی مسائل،اردو ناولوں میں عورت کا تصور،اردو کی نسائی شاعری وغیرہ اس طرح کے بے شمار عناوین کتب،مضامین،تحقیقی اور تنقیدی مقالوں

کے ہوا کرتے تھے۔اردو ادب میں تانیثیت کی اصطلاح آنے کے بعد باقاعدہ طور پر عورتوں کے جذبات و احساسات اور ان کے مسائل پر کھل کر بات کی جانے لگی۔نسائی حسیت کی صطلاح انگریزی میں Feminine Sensibility کے نام سے جانی جاتی ہے۔یہ اصطلاح سترہویں صدی کے آخر میں گڑھی گئی اور اٹھارویں صدی میں رومانی ناولوں میں پوری طرح استعمال ہونے لگی لیکن یہ روایتی عورتوں کے جذبات سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ان روایتوں سے انحراف ہمیں Mary Wollstonecraft اور Virginia Woolf کی تحریریوں میں ملتا ہے۔جنہوں نے عورتوں کے احساسات اور جذبات پر بہت کچھ لکھا۔نسائی حسیت کی اصطلاح کا رواج یہیں سے عام ہوئی:

> ''نسائی شعور کی بیداری یا تحریک نسائیت کی ابتدا کا سراغ لگانا ذرا مشکل کام ہے لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس فضا میں کئی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ایسی ہی ایک آواز ورجنیا وولف کی بھی ہے جس نے اپنی مشہور اور اہم تصنیف ''A Room Of Ones Own'' کے ذریعے عورتوں کی بیداری کا پیغام دیا اور ان کی تہذیبی شناخت کا اثبات کیا،اور ادبی دنیا میں سوچنے کا ایک نیا انداز روشن کرایا جسے نسائی نقطہ نظر''Feminist Point of View'' کا نام دیا۔''(9)

حسیت سے مراد محسوس کرنے اور اس کے مطابق عملی صورت اختیار کرنے کی ایک ایسی صلاحیت ہے جو کم و بیش ہر انسان کے مزاج کا حصہ ہے۔حسیت عام محسوسات کو ایک نکھری اور ستھری شکل دیتی ہے۔یعنی انسانی آگہی پر مبنی رویوں کو زیادہ واضح،صاف اور دلکش صورت عطا کرتی ہے۔اس سے اطراف و جوانب کی صورتحال اور اشیا نیز مسائل و میلانات،رجحانات و افکار اور نظریات کے تئیں ایک مخصوص تفہیمی رویہ پیدا ہوتا ہے،جو مثبت تعین قدر کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔

حسیت یا حساسیت کسی شخص کی جذباتی کیفیت یا اس کے معیار کی نشاندہی کرتی ہے۔یعنی ایک انسان جذباتی طور پر کس قدر حساس ہے اور فکری یا عملی یا تخلیقی سطح پر کس طرح اپنے جذبات اور احساسات نیز رویے کا اظہار کرتا ہے۔عام طور پر خواتین کو مردوں کی بہ نسبت زیادہ جذباتی اور حسیاتی سطح پر زیادہ حساس قرار دیا جاتا ہے۔ان کے عام مزاج میں جذباتیت کا عنصر زیادہ واضح ہوتا ہے اور یہی سبب ہے کہ مردوں کے مقابل میں وہ اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار زیادہ واضح اور بہتر طور پر کرسکتی ہیں۔

جہاں تک نسائی حسیت کا تعلق ہے اس سے مراد کسی عورت کے جذبات و احساسات ہیں۔ جو اس کے اپنے مسائل یا اس کی اپنی مخصوص صورتحال کے نتیجے میں وجود میں آتے ہیں۔ اسی لیے جب ہم نسائی حسیت کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب کسی عورت کی نفسیات اور اس کے صنفی تقاضوں کی اہمیت و انفرادیت کو سماجی یا ادبی و تخلیقی سطح پر تسلیم کرتے ہیں:

> ''نسائی حسیت سے مراد خالص عورت کا ادراک ہے، اس کی حس اور اس کا احساس ہے جو کہ مرد کے اندر نہیں پیدا ہوسکتا ہے کیونکہ وہ عورت نہیں ہے لہٰذا اس کا احساس، تخیل اور حسیت عورت سے مختلف ہوتی ہے۔'' (10)

بحیثیت مجموعی نسائی حسیت نام ہے عورت کے ان نرم و نازک اور خالص دلی جذبات و احساسات کا جو مرد کے مقابل اسے ایک مخصوص شناخت عطا کرتے ہیں۔ وہ جذبات جو اس کے دل میں موجزن ہوتے ہیں اس امر کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس کے اطراف کی دنیا متاثر کرے لیکن نسائی حسیت عورتوں کی سوچ اور تجربات کے اظہار کو شعوری اور حسی اعتبار سے ابھرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ نسائی حسیت کا مطالعہ شعوری طور پر ایک عورت کی حیثیت سے اس کی صورت حال یعنی اس کے اوپر ہونے والے ظلم اور اسے ایک شئے سمجھے جانے پر غور و فکر کے ساتھ تحقیق کرنے پر توجہ دلاتی ہے۔ نسائی حسیت کا مطالہ مرد اساس سماج کے ذریعہ عورتوں پر ظلم کرنے کے لیے صنفی امتیاز کیے گئے طریقوں کی سمجھ اور نفسیات پر مبنی ہوتا ہے۔ حقیقی معنوں میں نسائی حسیت بطور عورت حیات و کائنات کو اپنے نظریہ سے دیکھنے کا نام ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی ''افسوس کہ یہ صورت حال اردو میں نہیں ہے اور یہاں تو لوگ تانیثیت کے معنی ہی نہیں جانتے اور اسے زنانہ پن کے مترادف سمجھتے ہیں۔''(v) فاروقی صاحب کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں، اتفاق ہی نہیں مجھے اس پر اصرار بھی ہے کہ ہمارے یہاں نسائی حسیت اور تانیثیت کا فرق بہت واضح نہیں ہے۔ دوران تحقیق ایسی کتب اور مضامین میری نظر سے گزرے ہیں کہ 15 سے 20 صفحے کا مضمون ہو یا 200 سے 300 صفحہ کی کتاب تانیثیت اور نسائی حسیت پر تحریر کی گئی ہے لیکن مصنفین یہ بتانے میں قاصر رہے ہیں کہ وہ تانیثیت پر بات کر رہے ہیں یا نسائی حسیت پر۔ نسائی حسیت اور تانیثیت دونوں الگ الگ اصطلاحات ہیں۔ نسائی حسیت کا تعلق جہاں عورت کے ادراک سے ہے، اس کے داخلی احساسات و جذبات سے ہے تو وہیں تانیثیت کا تعلق عورت کے سماجی، سیاسی، مذہبی، اقتصادی وغیرہ مسائل پر بحث سے ہے۔ ان دونوں کو باہم خلط ملط کرنا غلط ہوگا۔ دراصل ان دونوں کے مابین ارتباط

وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں عورتوں کے جذبہ نسائیت کو ان کی ایک کمزوری تسلیم کر کے انہیں سماجی ،جنسی اور معاشی تفریق کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔تانیثیت کو اگر ہم ایک تحریک قرار دیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ تحریک اس سلوک و رویے کے ردعمل کے طور پر سامنے آئی ہے جو عورتوں کے چند صنفی اوصاف کو ایک کمزوری مان کر ان کے تئیں روا رکھا گیا ہے۔یعنی اگر مرد و عورت کے صنفی اوصاف و خصائص کو محض ایک دوسرے سے مختلف سمجھا جاتا اور کسی ایک صنف کے خصائص و اوصاف کو اس صنف کی کمزوری نہ قرار دیا جاتا تو تانیثیت کی یہ تحریک وجود میں نہ آتی۔جب ہم نسائی حسیت کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد وہ قوت احساس ہے جو عورت کے اندر اس کے اپنے صنفی اوصاف کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ہم جسے نسائیت کہتے ہیں وہ عورت کی مخصوص فطرت ہے جس میں جذبہ قبولیت ،ہمدردی و شفقت ،نرم مزاجی ،جذباتیت ، جذبۂ ایثار و قربانی ،شرم و حیا وغیرہ جیسے مخصوص صنفی خصائص پائے جاتے ہیں۔ایسا بالکل نہیں کہ یہ تمام جذبات و احساسات مردوں میں بالکل نہیں پائے جاتے لیکن عورتوں میں ان کا وفور مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔مرد کی بالادستی و حاکمیت جیسے تصورات کے زیر اثر وجود میں آنے والے معاشرتی نظام میں عورتوں کے مندرجہ بالا انہی صنفی اوصاف کو ان کی صنفی کمزوری تصور کیا گیا اور زندگی و سماج کے اہم مسائل و وسائل میں ان کی شرکت و حصہ داری کو محدود کر دیا گیا۔ان سے یہ تقاضا کیا گیا کہ وہ ان حدود سے باہر قدم نہ نکالیں جو مردانہ حاکمیت پر مبنی سماجی نظام نے ان کے لیے متعین کر دی ہیں۔یہی وہ صورت حال ہے جس نے بحیثیت ایک صنف ان کو عام سماجی زندگی میں غیر موثر و ناکارگرد عنصر بنا دیا۔چونکہ اس امتیازی سلوک نے ملک و معاشرے کے معاشی وسائل پر ان کی دسترس بھی ختم کر دی جس کے سبب اپنی بقا کے لیے مردوں پر ان کا انحصار بڑھتا گیا اور یہیں سے ان کے استحصال کا آغاز ہوا جس کے نتیجے میں جو ردعمل سامنے آیا اس کی اجتماعی شکل کو ہم تانیثیت کہتے ہیں۔اس طرح نسائیت ،نسائی حسیت اور تانیثیت کے باہمی افتراقات کے باوجود انھیں نتیجے کے اعتبار سے ایک دوسرے کا لازمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔یہی سبب ہے کہ جب کبھی تانیثیت پر یا تانیثی تحریکات پر گفتگو ہوگی تو نسائی حسیت اور اس کی بنیاد میں کارفرما نسائیت کی اہمیت کو تسلیم کرنا ہی ہوگا۔

حوالہ جات:

1. تانیثیت کی تفہیم ،شمس الرحمٰن فاروقی ،کسوٹی جدید (نسائی ادب نمبر) ،اپریل تا ستمبر 2014 ،ص 13
2. فیمیزم : تاریخ و تنقید ،شہناز نبی ،رہروان پبلی کیشنز ،کولکاتا ،ص 17

3. مطالعات نسواں، آمنہ تحسین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2008، ص93

4. ایضاً، ص94

5. https://www.britanica.com/topic/feminism

6. تانیثیت: ایک تنقیدی جائزہ، پروفیسر سید عقیل رضوی، بیسویں صدی میں خواتین کا ادب، عتیق اللہ (مرتب) اردوئے معلیٰ سیریز، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی، 2002، ص35

7. مطالعات نسواں، آمنہ تحسین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2008، ص96

8. تانیثیت اور اردو ادب، پیش لفظ، انور پاشا (مرتب)، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2014، ص9

9. فاطمہ حسن، نسائی ادب اور تنقید، تانیثیت اور ادب، انور پاشا، (مرتب)، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2014، ص275

10. اردو ناولوں میں نسائی حسیت، حمیرہ سعید، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2009، ص24

حواشی:

i. Goldstein.L(1982). "Early Feminist themes in French Utopian Sociolism: The St. Simonians and Fourier", Journal of The History of Ideas, Vol.43, No.1

ii. http://www.newworldencyclopedia.org/entry/Feminism

iii. https://www.stuffmomnevertoldyou.com/blogs/the-man-who-coined-feminism.htm

iv. https://en.wikipedia.org/wiki/Pierie

v. تانیثیت کی تفہیم، شمس الرحمٰن فاروقی، کسوٹی جدید (نسائی ادب نمبر)، اپریل تا ستمبر 2014 ص13

❐ Dr. Mohd Jabir Hamza
Guest Faculty, Department of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad - 500032
Mobile: 6307336616
Email: mohdjabir786@gmail.com

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:318-334
Dr. Viquar Unnisa & Mr. Jahangeer Alam, Sosial Media aur Hamari Tahzeeb

وقارالنساء
جہانگیر عالم

سوشل میڈیا اور ہماری تہذیب

سوشل میڈیا لوگوں اور گروہوں کو جوڑنے کا ایک جدید ذریعہ ہے۔ اسے سماجی تعلقات کے جال کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ ہم سب سوشل میڈیا کا استعمال کررہے ہیں۔ ہم سوشل میڈیا کے مطلب کو سماجی ترسیل کے ذریعہ لوگوں کے آپسی ربط سے بھی سمجھ سکتے ہیں۔ اس کا استعمال لوگ باہمی گفتگو، روابط بڑھانے، معلومات کے حصول کے علاوہ دیگر طریقوں سے بھی کر سکتے ہیں۔ سوشل میڈیا انٹرنیٹ کے ذریعہ کام کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ ہم دوسرے لوگوں کے ساتھ مختلف موضوعات پر معلومات پر تبادلہ خیال کرنے کے ساتھ ساتھ سماجی واقعات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بھی اس کا استعمال کر سکتے ہیں۔ آج بچوں کے کھیلنے، پڑھنے، تصویر بنانے، موسیقی سننے وغیرہ میں تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ موجودہ دور میں تعلیم کے ساتھ تفریحی مقامات، ہوٹل کی معلومات، ڈاکٹر کے طبی مشورے، وکیل کے مشورے، اشتہار، دوستوں سے بات چیت وغیرہ کی سہولت گھر بیٹھے سوشل میڈیا ہمیں فراہم کرتا ہے۔ ہماری ساری زندگی سوشل میڈیا کے اردگرد گھومتی ہے۔ امیر ہو کہ غریب کوئی بھی اس سے بچا ہوا نہیں ہے۔ آج کی تہذیب کو اگر سوشل میڈیا کی تہذیب کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ تہذیبی وراثت کسی بھی قوم کی بنیاد ہوتی ہے، جو تمدن، ثقافت، تہذیب، اخلاق پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور یہی ایک قوم سے دوسری قوم کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہیں۔ عام طور پر تہذیب میں رسم ورواج، رہن سہن، خیالات وافکار، کھانا پینا، بول چال، عقائد، طرز زندگی، روایات، میلے، لباس، اور زندگی کے مختلف شعبوں پر فرد کا اپنا نظریہ شامل ہوتا ہے۔

سماجی ترسیل کی کہانی بھی انتہائی دلچسپ رہی ہے ۔ایک دور تھا ، جب گاؤں میں اپنے جذبات، تجربات اور نظریات پر گفتگو کرنے کے لیے چو پالیں لگتی تھیں اور یہی چو پالیں بچوں کی رہنمائی بھی کرتی تھیں، جہاں کئی بزرگ بچوں میں اپنے تجربات پیش کرتے تھے۔اس وقت چو پالوں کا ایک مقصد تفریح بھی ہوا کرتا تھا۔لیکن وقت کے ساتھ ساتھ چو پالیں بھی ختم ہونے لگیں۔اور چائے کی ہوٹلیں وجود میں آئیں، اور یہ کام اب ان چائے خانوں میں ہونے لگا ہے۔چائے خانوں پر لوگ گپ شپ کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں، گپ شپ کرنا انسان کے رویہ کا حصہ ہے، کئی تحقیقات بتاتی ہیں کہ اپنی بات شیئر کرنے، پرانی یادیں تازہ کرنے اور گپ شپ وغیرہ سے ذہن ہلکا ہوتا ہے اور اس سے ذہنی دباؤ بھی دور ہوتا ہے۔اس طرح اپنی بات شیئر کرنے کے لیے اب چو پالوں کا پلیٹ فارم ختم ہو چکا ہے۔اور چائے خانوں نے لوگوں کو مجتمع ہونے کی جگہ فراہم کی ہیں، جہاں وہ اپنے جذبات کو شیئر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے تجربات کو بھی بیان کر سکتے ہیں۔ابتدا میں مشترکہ خاندانی نظام کا رواج تھا۔سبھی خواتین ایک جگہ ٹھہر کر اپنے جذبات کو شیئر کیا کرتی تھیں۔وقت بدلا، مشترکہ خاندان کی جگہ فلیٹ کلچر (نیوکلیئر خاندان) نے لی جہاں انفرادی خاندان کا رواج وجود میں آیا۔جس میں خاندان اپنے آپ میں ہی محدود ہو کر رہ گئے۔جس کی وجہ سے مرد اپنے دوست و احباب کے ساتھ چائے خانوں پر ملاقات کرنے لگے اور عورتوں میں کٹی پارٹی (Kitty Party) کا رواج شروع ہو گیا۔بعد میں یہی کام ٹیلی فون اور چٹھیوں کے ذریعے ہونے لگا لیکن انسان کو اپنے معاملات کو اطمینان بخشنے کے لیے ایک نئے پلیٹ فارم کی ضرورت تھی جہاں وہ نئے انداز سے گپ شپ کر سکیں، نئے دوست بنائیں اور اپنے جذبات کو شیئر کر سکیں۔جس کے لیے سوشل میڈیا نے اسے فیس بک، واٹس ایپ اور انسٹاگرام جیسے پلیٹ فارم مہیا کرا کر اس کی مشکل کو آسان کر دیا۔جس کے ذریعہ ہم مختلف نظریات و خیالات کے گروپ کے ذریعہ مربوط ہو کر اپنے جذبات کو شیئر کر سکتے ہیں، دوسروں کے غم میں شامل ہو سکتے ہیں، دوسروں کے ساتھ خوشیاں بانٹ سکتے ہیں، اپنی یادوں کو تازہ کر سکتے ہیں، ان گنت لوگوں کے ساتھ اپنی تصویر شیئر کر سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

گذشتہ قریب ایک دہے سے دنیا میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔آج کے اس جدید دور کو سائنس اور ٹکنالوجی کا دور کہا جاتا ہے۔جس کی وجہ سے معاشرتی تبدیلی کی رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے، کہ کل کی بدعات بھی آج روایات معلوم ہوتی ہیں۔کچھ عرصہ سے شروع ہونے والے عقائد کو دیکھتے ہوئے

ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہم صدیوں سے ان کی پیروی کرتے رہے ہیں۔ آج ہمارے اردگرد بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہے۔ کچھ تبدیلیاں مثبت اور کچھ منفی ہوئی ہیں۔ تبدیلی کے اس دور میں موبائل، فون، لیپ ٹاپ، ٹیبلٹ، کمپیوٹر سے لے کر انٹرنیٹ، فیس بک، واٹس ایپ، یوٹیوب وغیرہ ہمارے لئے سب سے بڑا تحفہ ہیں۔ ان کے منفی اور مثبت دونوں پہلو ہیں۔

سوشل میڈیا کا مطلب ہے سماجی رابطے کے ذریعے لوگوں سے رابطہ قائم کرنا۔ اس کا نیٹ ورک آن لائن ہوتا ہے۔ اس میں فیس بک، واٹس ایپ، ٹویٹر، انسٹا گرام، یوٹیوب وغیرہ شامل ہیں۔ سوشل میڈیا پر، لوگ انٹرنیٹ استعمال کرتے ہوئے اپنے دوستوں، رشتہ داروں سے رابطہ کرتے ہیں۔ جہاں وہ اپنے خیالات، احساسات، تعلقات اور دلچسپیوں وغیرہ کا تبادلہ کرتے ہیں۔ سوشل میڈیا کے ذریعے ہم ملک و بیرون ملک اور ہمارے آس پاس کے واقعات کے متعلق واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔

آزادی کے بعد ہمارے ملک میں ماس میڈیا کے فروغ میں معیاری ترقی ہوئی ہے۔ اسی دور میں، ٹیلی ویژن کی آمد ہوئی۔ ریڈیو استعمال کرنے والے افراد کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ نوے کی دہائی کے بعد سوشل میڈیا نے بے مثال ترقی کی ہے اور ہندوستان میں بھی سوشل میڈیا پر سرگرم صارفین کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا ہے۔ 1995ء میں ہندوستان میں انٹرنیٹ کے متعارف ہونے کے بعد سے ہی، ہندوستان میں سوشل میڈیا صارفین کا گویا ایک دھماکا ہو گیا ہو۔ مائی اسپیس (My Space) اور لنکڈ ان (Linkdine) جیسی سائٹوں کو 2000 میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ 2005 میں، یوٹیوب نے لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جذبات، خیالات کا تبادلہ کرنے اور ان کا اشتراک کرنے کا ایک بالکل نیا طریقہ متعارف کیا۔ 2006ء تک، فیس بک اور ٹویٹر نے سوشل میڈیا کے میدان میں دھوم مچا دی۔ انسٹا گرام کو 2010ء میں لانچ کیا گیا تھا جس میں صارفین اپنے خیالات شیئر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی تصاویر بھی شیئر کر سکتے ہیں۔ اس کی مقبولیت ہمارے ملک میں بڑھ رہی ہے۔ آج سوشل میڈیا کے میدان میں تنوع دیکھا جا سکتا ہے۔ ہر سوشل سائٹ کی اپنی الگ شناخت اور اہمیت ہے۔

اس دور میں کسی خبر کو عوام الناس تک پہنچانے کے لیے اعلان یا ڈھول کی ضرورت نہیں ہے۔ اب ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے دن بھی ختم ہو گئے ہیں۔ اخبارات ڈیجٹل شکل اختیار کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح سوشل میڈیا نے ہماری زندگی، اقدار و اطوار کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اپنی بات

دوسروں کے ساتھ شئیر کرنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔انسانی نفسیات یہ بھی بتاتی ہے کہ اپنے دل کی بات دوسروں کے ساتھ شئیر کرنے سے انسانی ذہن ہلکا محسوس کرنے لگتا ہے۔دوسروں کے ساتھ اپنے جذبات،نظریات کو شئیر کرنے سے ہی کسی انسان کا تعلق معاشرتی رشتوں سے مربوط ہوتا ہے اور اسے سماج کے ساتھ بات چیت کا موقع فراہم کرتا ہے۔سوشل میڈیا کے ذریعہ کوئی بھی فرد اپنے جذبات کو اپنے خاندان کے علاوہ بھی شئیر کرنے لگا ہے۔کہا جاتا ہے کہ غم باٹنے سے کم ہوتا ہے اور خوشیاں باٹنے سے بڑھتی ہیں۔آج یہ دونوں کام سوشل میڈیا پر تیزی سے انجام پا رہے ہیں۔سوشل میڈیا پر کسی کے مرنے پر تعزیتی اجلاس یا اپنا غم باٹنے کے علاوہ سالگرہ،شادی بیاہ کی سالگرہ اور کسی بھی تہوار کی مبارکباد کا تانتا لگ جاتا ہے۔اس طرح سوشل میڈیا نے غم کا اظہار کرنے،مبارکباد دینے اور خوشیاں منانے تک کے لیے ایک پلیٹ فارم دیا ہے۔جس کا راست اور بالراست اثر ہماری قدیم تہذیبی روایتوں پر بھی پڑ رہا ہے۔

موجودہ دور میں سوشل میڈیا نے ساری دنیا کو آپس میں مربوط کر کے ایک نئی نسل کو جنم دیا ہے، جو سوشل میڈیا کے ذریعہ خود بیدار ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی بیدار کر رہی ہے۔یوٹیوب پر یہ نسل اپنا چینل بنا کر اپنے خیالات کو نشر کر رہی ہے،دوسروں کے افکار سے فروغ پا رہی ہے۔چوبیس گھنٹوں میں اٹھارہ گھنٹوں تک فیس بک پر سرگرم رہنے والی اس نسل نے واٹس ایپ پر بھی مختلف افکار کے گروپ بنائے ہیں جس کے ذریعہ یہ بیداری عام ہو رہی ہے اور اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر رہی ہے۔اس کے علاوہ تفریح بھی کر رہی ہے۔موجودہ دور کو اگر سوشل میڈیا کا دور کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔سوشل میڈیا نے پڑھنے پڑھانے اور رہن سہن کے طور طریقوں میں تبدیلی لانے کے ساتھ ساتھ سماج میں بھی تبدیلی لائی ہے۔اس دور میں پہلے جیسا کچھ نہیں رہا ہے۔سوشل میڈیا معلومات کے تبادلے کا ایک آن لائن پلیٹ فارم ہے۔فیس بک،واٹس ایپ،ٹیوئٹر،گوگل،انسٹاگرام جیسے سوشل سائٹس نے دنیا کو ایک دوسرے کے ساتھ جکڑ دیا ہے۔فیس بک سب سے بڑا پلیٹ فارم ہے۔آج چٹھی،خط،ٹیلی فون کی اہمیت کم ہوئی ہے۔موجودہ نسل سے ڈاکیہ جیسے لفظ ناپید ہو رہے ہیں۔اخبارات،رسائل وجرائد اور کتب ڈیجٹل شکل اختیار کر رہے ہیں۔جہاں ایک جانب سوشل میڈیا نے سماج میں بیداری کو فروغ دیا ہے تو وہیں دوسری جانب سوشل میڈیا نے سماج میں رائج توہم پرستی پر سخت قدغن لگایا ہے۔سوشل میڈیا پر معلومات کا ذخیرہ ہے۔آج اگر سوشل میڈیا کو نئی بیداری کا نقیب کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔

موجودہ دور میں فیس بک میں انقلابی تبدیلی اور رواج کو دیکھ کر مجھے اپنے اسکول کے دنوں میں پڑھی 'جی شرینواس راؤ' کی لکھی ہوئی کہانی 'پین پال' (قلمی دوست) کی یاد آ گئی۔ پین پال کا مطلب کسی دوسرے ملک کے لوگوں کو خط کے ذریعہ دوست بنانے کا طریقہ ہے، پہلے بیرون ملک کے لوگوں کو دوست بنانے کا ذریعے خط ہوا کرتے تھے۔ یہ فیشن اسکول، کالج میں زیادہ تھا۔ کسی اسکول کے طالب علم کے لیے بیرون ملک کے دوست کا خط آنا اس دور میں فخر کی بات سمجھی جاتی تھی۔ طلبہ اخبار سے نام اور پتے لے کر بیرون ملک چٹھیوں کے ذریعہ قلمی دوست بناتے تھے۔ جس سے وہ اپنے جذبات کو شئیر کرتے تھے۔ گفتگو کا تبادلہ چٹھیوں کے ذریعہ ہوتا تھا۔ یہ عمل بہت دھیما تھا، برسہا برس بیت جاتے تھے۔ قلمی دوست ایک دوسرے سے ملاقات کے بغیر، بغیر دیکھے اور ایک دوسرے کو سنے بغیر ہی صرف خطوط کے ذریعے سے اپنے جذبات کا اظہار کرتے تھے، لیکن آج فیس بک نے یہ بیانیہ ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔

موجودہ دور میں فیس بک پر اکاؤنٹ کھولتے ہی یہاں پر انسان ان سب کو تلاش کرتا ہے، جس سے وہ کبھی بات کرنا چاہتا تھا، یا کچھ سننا چاہتا تھا یا دوست بنانا چاہتا تھا۔ وہ ملے یا نہ ملے فیس بک پر نئے رشتے بنانے کا موقع سب کو ملتا ہے۔ آج فیس بک پر کم وقت اور کم خرچ میں ہی ساری دنیا میں کسی سے بھی دوستی کی بھی جاسکتی ہے، اور دوستی ختم بھی کی جاسکتی ہے۔ اپنے دل کی بات شئیر کی جاسکتی ہے۔ کسی کی دوستی پسند نا ہو تو دن میں کئی دوست بدلے جاسکتے ہیں۔ فیس بک نے ہمیں ساری دنیا سے مربوط کر دیا ہے۔ لوگوں کے اکیلے پن کو دور کر دیا ہے اور ہم خیال لوگوں کو ملا دیا ہے۔

آج تقریباً ہر ایک کی رسائی فیس بک تک ہے۔ ہمارے ملک کا بہت بڑا طبقہ اپنے جذبات اور خیالات کو فیس بک پر شئیر کرتا ہے۔ فیس بک پر ہر ایک کے ہزاروں دوست ہیں جنہیں وہ اپنی بات سناتے بھی ہیں اور سنتے بھی ہیں۔ آج سوشل میڈیا نے اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن سب کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ترسیل یا اظہار بیان کے میدان میں بڑی تبدیلی لائی ہے۔ واٹس ایپ کے چلن نے تو ٹیلی فون کو تقریباً ناپید ہی کر دیا ہے۔ آج ہم اپنے سے دور رہنے والوں سے یا بیرون ملک میں رہنے والے لوگوں سے بھی مفت میں بات کر سکتے ہیں۔ فون پر بات کرنے سے کافی رقم خرچ ہوتی ہے لیکن واٹس ایپ پر اتنا خرچ نہیں ہوتا۔ واٹس ایپ پر آڈیو، ویڈیو، لائیو چاٹ وغیرہ کی سہولت دستیاب ہے۔ آج واٹس ایپ اتنا عام ہوگیا ہے کہ اس کے استعمال کنندہ رات کے وقت اپنے دوستوں، رشتہ داروں یا واقفیت رکھنے والوں کو شب بخیر کہے بغیر نہیں سوتے۔

سوشل میڈیا کی وجہ سے، اپنی گفتگو، نظریہ یا قابلیت وغیرہ کو دنیا کے سامنے رکھنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ آج سوشل میڈیا کب کسی عام کو خاص بنا دے اور کسی خاص کو عام بنا دے پتہ نہیں چلتا۔ مثال کے طور پر، سوشل میڈیا کی وجہ سے، سونو منڈل جیسی گلوکارہ ریلوے اسٹیشن سے براہ راست بالی ووڈ پہنچ جاتی ہے اور بہار کی لوک گلوکارہ میتھلی ٹھاکر اس کی مثال ہیں۔ سوشل میڈیا نے کس طرح ان کی صلاحیتوں کو دنیا کے سامنے پیش کر کے انہیں اسٹار بنا دیا۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں ملیں گی۔

آج، فیس بک، انسٹاگرام، واٹس ایپ اور یوٹیوب وغیرہ کے توسط سے آپ کی بات لوگوں تک بہت کم وقت میں پہنچ سکتی ہے۔ اس کی وجہ سے، آج دنیا سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ آج ایک استاد ایک ہی وقت میں پوری دنیا میں اپنا لکچر سنا سکتا ہے۔ دنیا کی کسی بھی چیز کو دیکھا اور تلاش کیا جا سکتا ہے۔ آج کل سیاسی جماعتیں اپنے نظریے کی توسیع اور تشہیر کے لیے بھی سوشل میڈیا کا استعمال تیزی سے کرنے لگی ہیں۔ سوشل میڈیا لوگوں کو آپ کی تائید یا آپ کے مخالف بنانے کی قابلیت رکھتا ہے۔

آج کی نسل کے بچے اپنے دادا، دادی یا والدین سے پریوں کی کہانی نہیں سنتے، رات کو لوریاں نہیں سنتے۔ موجودہ دور کی، سوشل میڈیا کی ٹِک ٹوک نسل کو اپنے دادا دادی، نانا نانی اور والدین کو کچھ دینے کے لیے نہ ہی کوئی خواہش ہوتی ہے نہ دلچسپی، اور نہ ہی وقت، جس کی وجہ سے والدین اپنے بچوں میں جذباتی، اخلاقی اور تہذیبی اقدار جو انہوں نے خود اپنے بزرگوں سے سیکھے تھے ان میں ضم نہیں کرا پا رہے ہیں۔ بچوں کی پرورش اور نشوونما ان کے والدین کے ہاتھوں سے جاتی رہی ہے۔ یہی اہم وجہ ہے، جس کے نتیجے میں ہمارے بچے اپنی تہذیب، رسم و رواج، عقائد اور اقدار سے دور ہو رہے ہیں، جس کی وجہ سے یہ اقدار ہمارے معاشرے سے سمیٹ رہے ہیں اور ہمارے معاشرے میں ایک نئی تہذیب فروغ پا رہی ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے کے بزرگوں اور نوجوانوں کے مابین نظریاتی اختلافات بڑھ رہے ہیں۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

''جب سے آئی ہے تربیت موبائل کے ہاتھوں میں
کوئی بھی بچہ اپنے والدین پر نہیں جاتا!''

آج بہت سارے نوجوان ایسے ہیں جو سوشل میڈیا پر اپنی روایات کا مذاق اڑانے سے باز نہیں آتے۔ اس طرح کے خیالات اور تصاویر کو سوشل میڈیا پر دیکھا جا سکتا ہے، جن سے کسی کے جذبات

مجروح ہوتے ہیں۔اشتعال انگیز باتیں، افواہیں سوشل میڈیا پر وائرل ہوتی ہیں، جس کی وجہ سے ہماری تہذیب کی تنوعیت میں اتحاد جیسے اقدار کمزور تو ہو ہی جاتے ہیں، ساتھ ہی معاشرے سے بھائی چارے کے ساتھ ساتھ، امن چین بھی ختم ہو جاتا ہے۔اگر ہم سوشل میڈیا کی وجہ سے ملک اور بیرون ملک کے قریب جا رہے ہیں تو پھر ہم دوسری طرف اپنی تہذیب سے بھی دور جا رہے ہیں۔آج کل اس کی ایک وجہ گھریلو افراد کے بجائے سوشل میڈیا پر زیادہ وقت گزارنا ہے۔جس کی وجہ سے بچوں کی پرورش ایک طرح سے سوشل میڈیا کے ہاتھ میں چلی گئی ہے۔آج بچے دادا دادی سے اقدار نہیں سیکھتے ہیں اور نہ ہی اخلاقی کہانیاں سنتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں انھیں پرانی معلوم ہوتی ہیں۔لہٰذا آج ہمیں اپنی پر وقار تہذیب کو محفوظ کرنے کے لیے سوچنا ہوگا اور توازن برقرار رکھنا ہوگا۔

آج، سوشل میڈیا نے ہمارے معاشرے کو تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ بیشتر تہذیبی اقدار کو بھی تبدیل کر دیا ہے، آج کافی دور دراز کے لوگوں سے بیرونی ممالک تک ہمارے دوست ہیں۔آج سوشل میڈیا ہماری زندگی کا لازمی جزو بن گیا ہے۔

اگر آج دیکھا جائے تو ہماری مادری زبان سے زیادہ سوشل میڈیا میں انگریزی کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔سوشل میڈیا نے آج انگریزی زبان کی اہمیت میں اضافہ کیا ہے۔آج، کوئی بھی دو جملے سوشل میڈیا پر انگریزی میں لکھ کر فخر محسوس کرتا ہے۔سوشل میڈیا ہمارے معاشرے کو دو حصوں میں تقسیم کر رہا ہے۔سوشل میڈیا کے ذریعہ، غیر ملکی غذا، غیر ملکی لباس، غیر ملکی زبان ہمارے ملک میں فروغ پا رہی ہے۔ہماری تہذیبی قدریں زوال پذیر ہیں۔

آج ہمارا نوجوان طبقہ انگریزی تہذیب اور اس کے طرز زندگی کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ آج کی یہ نئی تہذیب قدیم تہذیب کے حدود کو ختم کرتی نظر آتی ہے، جس کے نتیجے میں ہمارے معاشرے میں ہماری نئی نسل اور ہمارے بزرگوں کے نظریات تنازعات کا شکار ہیں۔آج سوشل میڈیا ایک نئی تہذیب کی پرورش کرتا نظر آنے لگا ہے۔

ایک طرف، سوشل میڈیا پر، جہاں ہم ایک دوسرے کے ساتھ دوستی کرتے ہیں، اپنے جذبات بانٹتے ہیں، اپنے نظریات کو ایک دوسرے تک پہنچاتے ہیں، دوسروں کے نظریات کا مطالعہ کرتے ہیں، اتفاق رائے یا اختلاف درج کراتے ہیں، گپ شپ کرتے ہیں، بحث کرتے ہیں، جس سے ذہنی

راحت وسکون محسوس کرتے ہیں اور دوسروں کے دکھ درد میں بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں۔تو دوسری جانب، سوشل میڈیا پر مختلف نظریات کے لوگ بھی مجتمع نظر آتے ہیں۔اسی وجہ سے یہاں بھی زوردار جھڑپیں ہوتی ہیں۔جس کی وجہ سے باہمی اختلافات بڑھتے ہیں۔بالکل مختلف قسم کے حالات رونما ہوجاتے ہیں جس کی وجہ سے کبھی کبھی بات ناگوار واقعہ تک پہنچ جاتی ہے۔بعض اوقات سوشل میڈیا پر تصادم اور حالیہ امور پر بحث ومباحثے کا نتیجہ ذہنی افسردگی، اضطراب، تناؤ تک بڑھ جاتا ہے۔بعض بچے صرف اس وجہ سے مایوسی کا شکار ہوجاتے ہیں کہ ان سے دوستی ترک کردی گئی یا اسے مسدود کردیا گیا ہے۔آج کل سوشل میڈیا پر اخلاقی اور غیر اخلاقی امور کو نظرانداز کردیا جاتا ہے۔کبھی کبھی سوشل میڈیا پر سیاست، مذہب جیسے معاملات میں اشتعال انگیزی پر خطرناک بحث چھڑ جاتی ہے۔آج کا سوشل میڈیا نئی تہذیب کی پرورش کرتا نظر آتا ہے جس میں شائستہ وناشائستہ زبان کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا ہے۔دوسروں کے جذبات کو سخت چوٹ پہنچائی جاتی ہے جس کی وجہ سے کسی بھی ناخوشگوار واقعہ کا خدشہ رہتا ہے۔اس کی وجہ سے، آج معاشرے میں نفرت، تناؤ وغیرہ بڑھتا جا رہا ہے، جس کی وجہ سے عالمی بھائی چارا، اخوت اور تنوع میں اتحاد وتہذیبی قدریں کمزور ہورہی ہیں۔اس کے علاوہ سوشل میڈیا کا ایک منفی پہلو جھوٹی خبریں اور افواہیں بھی ہے۔ یہاں جھوٹی خبریں اور افواہیں بہت تیزی سے پھیلتی ہیں، جس کے برے نتائج سامنے آتے رہتے ہیں۔

تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ سوشل میڈیا پر زیادہ وقت گزارنے سے انسان ذہنی دباؤ کا شکار ہوجاتا ہے۔وہ تنہائی محسوس کرنے لگتا ہے، اس کی نیند اور صحت پر اثر پڑتا ہے۔آج ہمارا معاشرہ نئی نئی بیماریوں کا شکار ہو رہا ہے۔انسان کی ترسیلی صلاحیتوں اور جسمانی حرکات وسکنات جیسی مہارتوں میں کمی ہوتی جارہی ہے۔سونے جاگنے کا معمول بگڑ گیا ہے جس کی وجہ سے لوگوں میں سر درد، تناؤ اور بے خوابی جیسی بیماریوں میں اضافہ ہوا ہے۔

آج ،سوشل میڈیا کی وجہ سے معاشرے میں 'کارپرٹنل سنڈروم' اور 'نوموفوبیا' جیسی نئی بیماریاں وجود میں آرہی ہیں۔نوموفوبیا کا مطلب ہے 'نوموبائل فوبیا'، یعنی موبائل کا نشہ ہے۔اس بیماری میں ، جہاں موبائل کی ضرورت نہ ہو، اگر وہاں بھی موبائل نہ ہو تب بھی ہم آرام محسوس نہیں کرتے ہیں۔اسی کیفیت کو 'نوموفوبیا' کہتے ہیں۔نوموفوبیا میں، انسان کو موبائل فون ساتھ میں نہ رہنے کا خوف رہتا ہے، اور وہ تناؤ میں رہتا ہے۔کچھ ماہرین نفسیات بتاتے ہیں کہ اسمارٹ فون کی عادت نشے کی عادت سے

زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ یہ انسانی جسم کے ساتھ ساتھ اس کے دماغ کو بھی کمزور کر رہا ہے۔اس کے علاوہ کسی بھی چیز کا زیادہ استعمال غلط ہوتا ہے۔نوموفوبیا کی کچھ علامات حسب ذیل ہیں:

☆ فون کھو جانے کا مسلسل خوف۔

☆ ہر پانچ یا دس منٹ کے وقفہ سے مستقل طور پر فون چیک کرتے رہنا۔

☆ جب موبائل کی بیٹری ختم ہو جائے تو گھبراہٹ محسوس کرنا۔

☆ انٹرنیٹ ختم ہو جانے پر چڑ چڑا پن محسوس کرنا، بلڈ پریشر بڑھ جانا، بے چینی میں اضافہ ہو جانا۔

☆ فون کے بغیر نیند نہ آنا وغیرہ اس کی علامات ہیں۔

یہ تمام علامات ذہنی بیماری کی شکل اختیار کر رہی ہیں۔اس کے علاوہ، سوشل میڈیا کی وجہ سے، بار بار موبائل فون دیکھتے رہنے سے گردن میں درد، آنکھوں کے مسائل، نیند نہ آنا جیسے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔آج کا ہمارا معاشرہ پہلے جیسا نہیں رہا۔ ہمارا معاشرہ اپنی قدریں کھو بیٹھا ہے اور دکھاوا بڑھ رہا ہے۔ یوم ماں کے موقع پر ہم مبارکباد دینے کے لیے لمبے طویل پیغام تو لکھتے ہیں،لیکن ہمیں ماں کی دوائی یاد نہیں رہتی۔ہم دور بیٹھے دوست کو اس کے خیر خواہ ہونے کا تحریر کے ذریعہ احساس تو کراتے ہیں لیکن پڑوسی یا اہل خانہ کے مسائل سے ہم انجان بن جاتے ہیں۔سوشل میڈیا کی ورچوئل دنیا نے بھی معاشرے میں ظاہری شکل کو فروغ دیا ہے۔ پہلے پڑوس کے مکانات کی دیواریں نیچی ہوتی تھیں، زیادہ تر گھروں میں کھڑکیاں ہوتی تھیں۔اُس وقت لوگ اپنے پڑوسیوں، ان کے اہل خانہ سے جذباتی تعلقات رکھتے تھے، رشتوں کو کافی اہمیت دی جاتی تھی۔آج، ہماری نئی نسل سوشل میڈیا پر سماجی اور معاشرتی احساسات کو تلاش کر رہی ہے، حقیقی اور جذباتی تعلقات کو نظر انداز کرتے ہوئے ، ورچوئل اور مجازی جذبات سے خالی دنیا کے مجازی تعلقات میں، جس سے لوگوں کا اعتماد کم ہوا ہے۔جس کے نتائج توقعات سے بھی آگے جا رہے ہیں۔آج ہم سوشل میڈیا کی اس مجازی دنیا میں رہتے ہیں جہاں ایک ایک فرد کے ہزاروں دوست ہیں جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔جن کے ساتھ ہم گھنٹوں اپنا وقت بتاتے ہیں لیکن اپنے افرادِ خاندان، رشتہ داروں یا پڑوسیوں کی خبر ہمیں نہیں رہتی۔سوشل میڈیا پر دن میں کتنے ہی دوست بنائے جائیں،اس دوستی کو ختم بھی کیا جا سکتا ہے۔سوشل میڈیا نے ایک طرف جہاں رشتوں میں دکھاوے میں اضافہ کیا ہے تو وہیں جذبات اور لگاؤ وغیرہ کو بھی ختم کر دیا ہے۔

سوشل میڈیا نے آج جہاں ایک طرف ہماری تہذیب کو عام کرنے کے مواقع فراہم کیے ہیں وہیں دوسری طرف اس نے ہمیں دوسری تہذیبوں سے رابطے میں رہنے کے مواقع بھی فراہم کیے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہماری تہذیب میں نئی نئی چیزیں شامل ہو رہی ہیں۔اس طرح ہماری تہذیب بھی دوسرے ممالک میں پھیل رہی ہے۔سوشل میڈیا نے دنیا کو ایک عالمی گاؤں بنا دیا ہے۔جس میں تمام تہذیبیں ایک دوسرے میں شامل ہو رہی ہیں۔کچھ تہذیبیں تنزل کا شکار ہیں،تو بعض ترقی پا رہی ہیں۔ملکوں کے آپسی رابطوں کی وجہ سے غیر ملکی تہذیب کا اثر ہمارے کھانے،تقریر،لباس اور عقائد وغیرہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر ہمارے نوجوان مغربی تہذیب کی جانب راغب ہو رہے ہیں۔آج ، ہمارے ملک کے نوجوانوں کے کھانے،گفتگو،سوچ وغیرہ میں غیر ملکی تہذیب کا غلبہ دیکھا جاسکتا ہے۔

سوشل میڈیا کے اس دور میں جب بھی ہمارے معاشرے میں کوئی المناک واقعہ پیش آتا ہے، لوگ اپنے جذبات ، مذمت ، ندامت وغیرہ کو سوشل میڈیا پلیٹ فارم پر شیئر کرتے ہیں۔اپنی بھڑاس نکالتے ہیں،خود کو تسلی دیتے ہیں اور اپنے دماغ کو راحت پہنچاتے ہیں۔آج سیاسی جماعتوں نے بھی اپنی پارٹیوں کی تشہیر کے لیے سوشل میڈیا کا دامن تھام لیا ہے۔سیاسی پارٹیوں کی مہمات چلانے کے طریقے بدل گئے ہیں۔کتنے ہی سیاستدان روزانہ سوشل میڈیا پر تقریریں سنتے ہیں۔آج،سوشل میڈیا یہ بھی طے کرتا ہے کہ کس مسئلہ کو اٹھانا ہے اور کس مسئلہ کو دبانا ہے، کسے گمنامی کے گوشہ میں لے جانا ہے، کسے شہرت پر پہنچانا ہے اور کسے بدنام کرنا ہے،اس کا بھی انحصار سوشل میڈیا پر ہو گیا ہے۔

آج کل سوشل میڈیا ہمیں آگاہ کرنے میں بھی اہم کردار نبھا رہا ہے۔مصیبت میں پھنسے لوگوں کو بچانے میں بھی سوشل میڈیا اپنا اہم کردار ادا کر رہا ہے۔اس کے علاوہ سوشل میڈیا دبے کچلے لوگوں کی آواز بن کر ابھرا ہے۔مردوں کا غلبہ رکھنے والے معاشرے میں ، وہ خواتین جو صدیوں سے اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھاتی رہیں ان کے لیے بھی سوشل میڈیا نے پلیٹ فارم مہیا کیا ہے۔جو خواتین کی ترقی کے لیے کوشاں ہے۔آج کی عورت،مہادیوی ورما کی طرح دکھ بھری نہیں رہی ہے۔وہ مردوں کے برابر اپنا حق مانگ رہی ہے،حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے انہیں شکست دے رہی ہے۔لہٰذا،ان تمام خواتین کے لئے ، جو صدیوں سے بچپن کی شادی وغیرہ جیسی ظالمانہ روایتوں کا سامنا کر رہی ہیں،اور جو اپنی بات لوگوں تک نہیں پہنچا پاتی تھیں،سوشل میڈیا نے ان کی قابل رحم حالت اور ان پر ہونے والے مظالم کو بھی لوگوں

کے علم میں لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔آج سوشل میڈیا پر خواتین کو بااختیار بنانے کے بے شمار جماعتیں اور تنظیمیں سرگرم ہیں۔ جب بھی کسی عورت کے استحصال کی خبر آتی ہے تو یہ تنظیمیں سرگرم ہو جاتی ہیں اور مناسب کاروائی کر کے اس مسئلے کو حل کرتی ہیں۔

آج ہم سوشل میڈیا کے ذریعہ ہزاروں میل دور بیٹھے لوگوں کو لائیک (پسند)،شیئر اور چیٹ کرتے ہیں،لیکن اپنے قریبی پڑوسیوں کی پریشانیوں سے غافل رہتے ہیں۔ان کے دکھ درد اور اکیلے پن میں شامل نہیں ہوتے ہیں۔آج ہم سوشل میڈیا کی ورچوئل دنیا میں اس قدر گم ہو گئے ہیں کہ ہم حقیقی زندگی سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ہم اپنی سیلفی میں دکھاوے اور نقلی مسکراہٹوں کو تو قید کر لیتے ہیں،لیکن حقیقی زندگی میں کسی کی مسکراہٹ کی وجہ نہیں بننا چاہتے۔ایک طرف ،سوشل میڈیا کی وجہ سے ہماری دنیا بہت بڑی ہو چکی ہے۔وہیں دوسری طرف ،ہم اپنے اندر ہی سمٹ کر رہ گئے ہیں۔آج ہم لوگوں کو ظاہری طور سے خوش ہیں بتانے کی کوشش کر رہے ہیں،یعنی ہمارے اندر دکھاوے کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے،،دوسری طرف ہم باطنی طور سے خالی پن بھی محسوس کرنے لگے ہیں۔ایک طرف ہمارے دوستوں میں ان گنت اضافہ ہو رہا ہے تو دوسری جانب ہماری حقیقی زندگی کے جذبات سے وابستہ دوست کم ہوتے جا رہے ہیں۔آج سوشل میڈیا نے رشتہ داری نبھانے اور میل میلاپ کا بیانیہ ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔سوشل میڈیا نے ہمارے رہن سہن، کھانا پینا، ہمارے عقائد، رشتے ناطے،سماج اور زندگی کا فطری انداز،لباس، بول چال وغیرہ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ایک طرف جہاں اس نے دنیا کو عالمی گاؤں بنا کر رکھ دیا ہے،تو وہیں دوسری طرف ہماری تہذیب، معاشرت،صحت، سوچ اور ہماری نسل وغیرہ پر راست یا بالراست طریقہ سے اثر ڈالا ہے۔ عام طور پ تہذیب کے معنی کھانا پینا، رہن سہن، بول چال،عقائد وغیرہ لیے جاتے ہیں،جن پر سوشل میڈیا نے گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔

سوشل میڈیا نے ہمارے سماج میں رائج تعلیم کے شعبہ کو بھی متاثر کیا ہے۔آج ایک استاد ایک ہی وقت میں ساری دنیا کو اپنا لکچر سنا سکتا ہے۔سوشل میڈیا نے تعلیم کو گھر گھر تک پہنچانے میں اہم ترین رول ادا کیا ہے۔آج ہم کسی بھی مقام پر آن لائن ورکشاپ، سیمینار، ویبینار، کانفرنس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔اس کے علاوہ ویڈیو، آڈیو، پی ڈی ایف، پی پی ٹی، فائلیں وغیرہ بھی پڑھ سکتے ہیں،شئیر کر سکتے ہیں، تقریباً ہر طالب علم اور استاد کی اپنی ای میل آئی ڈی ہے، جو فیس بک اور واٹس ایپ پر فعال ہے۔ پرائمری

کے طلبہ یوٹیوب پر اپنے ذاتی چینلز بھی تشکیل دے رہے ہیں، اپنے نظریات کو دنیا کے ساتھ بانٹ رہے ہیں اور دوسروں کے نظریات سے ترقی پا رہے ہیں۔ آج سوشل میڈیا نے تعلیم کو فروغ دیا ہے۔ سیکھنے کے بے شمار دلچسپ اپلی کیشن دستیاب ہیں۔ جس کی مدد سے تعلیم آسان ہونے کے ساتھ ساتھ پر لطف اور دلچسپ ہوگئی ہے۔

اس کے علاوہ سوشل میڈیا کے ذریعہ روزگار کے بہت سارے راستے بھی ہموار ہوئے ہیں۔ آج ہم اپنی تعلیمی قابلیت کا خلاصہ (Resume) سوشیل میڈیا پر ڈال سکتے ہیں۔ کسی بھی کمپنی کی ملازمت میں بھرتی اوران کے سامان کی تشہیر اور فروخت کا اشتہار بھی سوشل میڈیا کے ذریعے کیا جارہا ہے۔ کتنے ہی یوٹیوب چینلز لوگوں کی تفریح کا سامان اور سماج میں بیداری لانے کا کام کررہے ہیں۔

سوشل میڈیا نے ادب کے میدان میں بھی انقلاب برپا کردیا ہے۔ تخلیقی تحریر کے میدان میں سوشل میڈیا نے انقلابی تبدیلیاں پیدا کی ہیں، آج کسی بھی کہانی، ناول، نظم وغیرہ کو سوشل میڈیا کے ذریعے منظر عام پر لایا جاسکتا ہے۔ سوشل میڈیا کے ذریعے اسے بہتر کیا جاسکتا ہے، ان باکس کے ذریعے مشورے لیے اور دیے جاسکتے ہیں، تنقید کی جاسکتی ہے۔ کتابوں، نظموں، ناولوں کی نوعیت کو ڈیجیٹلائز کیا جارہا ہے۔ چند لمحات میں ہی، ہزاروں لاکھوں لوگ سوشل میڈیا کی مدد سے کہانی، نظم وغیرہ پڑھ لیتے ہیں۔ سوشل میڈیا کی روز افزوں بڑھتی ہوئی مقبولیت کی وجہ سے یہاں پڑھنے والے افراد کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ فیس بک، یوٹیوب جیسے فورم ادب کو فروغ دے رہے ہیں۔ آج بہت سے مصنفین اپنی تحریر کے لیے سوشل میڈیا جیسے پلیٹ فارم کا انتخاب کررہے ہیں۔ لوگ راتوں رات شہرت پا رہے ہیں، اور سماج میں عدم مساوات پر طنز کررہے ہیں۔ اروند جوشی جیسے مشہور ادیب اپنی نظموں کو یوٹیوب کے ذریعے عوام کے سامنے لا رہے ہیں اور نیلیش مشرا جیسے کہانی نویس اپنی اور دوسروں کے ذریعہ لکھی گئی کہانیوں کو یوٹیوب اور ریڈیو کے ذریعہ دلچسپ انداز میں لوگوں تک پہنچا رہے ہیں۔ ان کے سننے والوں کی تعداد بھی لاکھوں میں ہے۔ اب مصنفین کو کتاب لکھنے اور قارئین تک پہنچنے کے لیے کتاب کی اشاعت کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا سوشل میڈیا اب اظہار خیال، تفریح، معلومات وغیرہ کا ایک وسیلہ ہی نہیں رہا بلکہ یہ نئے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کا ایک پلیٹ فارم بن کر ابھرا ہے۔ آج کسی بھی شاعر کو سوشل میڈیا پر دیکھا یا سنا جاسکتا ہے، اس سے بات کی جاسکتی ہے اور تنقید وغیرہ بھی کی جاسکتی ہے۔ آج

بڑے بڑے شاعر فیس بک، یوٹیوب وغیرہ جیسے سوشل سائٹس پر سرگرم نظر آتے ہیں۔ان کا اپنا بلاگ اور ویب سائٹ ہے۔ٹی وی پر 'واہ واہ کیا بات ہے' جیسے بہت سارے پروگرام ہیں، جو شاعروں کے لیے اپنی شاعری سامعین تک پہنچانے کے لیے پلیٹ فارم بن چکے ہیں۔کسی بھی وقت مشاعرہ اور کوی سمیلن کو سوشل میڈیا پر دیکھا جاسکتا ہے۔اپنے پسندیدہ شاعر یا ادیب کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ سنا بھی جاسکتا ہے،ان سے بات کی جاسکتی ہے۔اپنی تخلیقات یا ویڈیوز کو اپ لوڈ کیا جاسکتا ہے۔کسی بھی زبان کے ادب کا ترجمہ کیا جاسکتا ہے اور سمجھا جاسکتا ہے۔مشہور شاعر کمار وشواس بھی سوشل میڈیا پر کوی سمیلن چینل کے ذریعے ادب کی خدمت کررہے ہیں۔اس کے علاوہ، ریختہ کی اردو زبان کے تحفظ اور ترویج کے لیے کیے گئے کاموں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو سوشل میڈیا کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔جس نے خاص و عام تک اردو ادب کو قابل رسائی بنایا ہے جس کے پڑھنے والے لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔rekhta.org کے نام سے ریختہ نے 2013ء میں ویب سائٹ شروع کی تھی۔یہ ویب سائٹ بہت جلد اردو شاعری اور کتابوں کے لکھے جانے والی اردو کتابوں کے بارے میں دنیا کی سب سے بڑی ویب سائٹ بن چکی ہے۔جشنِ ریختہ، رنگِ ریختہ، شامِ ریختہ جیسے پروگرام ریختہ کے ذریعہ اردو کے فروغ میں مسلسل اپنا اہم کردار ادا کررہے ہیں جس نے اردو کی رسائی غیر اردو داں طبقہ تک بھی کرادی ہے۔ریختہ پر ہم شاعری کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ اپنی تخلیق کردہ غزلیں، نظمیں، کتابیں، کہانیاں، ناول وغیرہ کو بھی شیئر کرسکتے ہیں۔

سوشل میڈیا کے اس دور میں ہماری نوجوان نسل میں دوستی، محبت کرنے کے انداز میں بھی تبدیلی آئی ہے پیار اور دوستی بھی ڈیجیٹل ہوگئی ہے۔اب کسی عاشق کو اپنی معشوقہ کی گلی محلے یا ہاسٹل کے چکر لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔اب محبت کرنے کے لیے کسی سہیلی یا دوست یا کسی درمیانی فرد کی ضرورت نہیں ہے۔اب یہ کام فیس بک یا واٹس ایپ پر ایک اچھی سی ڈی پی لگا کر دوستی کی درخواست (Freind Request) بھیج کر سیکنڈوں میں دوستی ہوجاتی ہے۔سوشل میڈیا پر محبت کی شروعات ہائے، ہیلو سے ابتدا ہوکر تھوڑے سے وقت میں ہی ملاقات تک پہنچ جاتی ہے۔ملاقات کا مقام بھی سوشل میڈیا پر تلاش کیا جاسکتا ہے۔ڈیجیٹل ہوتی محبت چیٹنگ کے ذریعہ آگے بڑھتی ہے۔چیٹنگ کے ذریعہ ہی جذبات کو شیئر کیا جاتا ہے۔تصویر بھیجی جاتی ہے اور کبھی کبھار ویڈیو بھی۔ایک دوسرے کی مزاج پرسی سے لے کر کھانے پینے کی باتیں ہوتی ہیں۔بعض اوقات سوشل میڈیا پر عاشقین بہت جلد شادی تک پہنچ جاتے ہیں۔وہ اس

تصوراتی دنیا سے مستقبل کی دنیا میں گم ہو جاتے ہیں۔شادی کی شیروانی سے لے کر بچوں کے نام پر گھنٹوں بات چیت ہوتی ہے۔ یہ جوڑے گڈ نائٹ کہے بغیر نہیں سوتے۔ یہاں گھنٹوں بات چیت ہوتی ہے۔اکثر وبیشتر چیٹنگ کا اور بھیجی گئی تصویر کا غلط استعمال بھی ہوتا ہے۔ بے مطلب کی باتیں ہوتی ہیں،جس سے مایوسی میں اضافہ ہوتا ہے۔سوشل میڈیا کی مجازی دنیا میں محبت میں جذبات کا فقدان پایا گیا۔ یہاں جتنی تیزی سے رشتے بنتے ہیں اتنی ہی تیزی سے ٹوٹ بھی جاتے ہیں۔اس کی ایک وجہ یہاں رشتوں کی بھرمار ہے۔اسٹیٹس، ڈی پی، اور تصویر دیکھ کر دوستی کا انتخاب ہوتا ہے۔ دوستی کی درخواست بھیجی جاتی ہیں، ایک رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو دوسرا تیار رہتا ہے۔سب کے ہزاروں دوست ہیں ۔ایک دوسرے کو دیکھے بغیر بھی سوشل میڈیا پر محبت ہو جاتی ہے۔ڈیجیٹل محبت کا خاتمہ بعض اوقات افسوسناک ہوتا ہے، ڈیجیٹل جذبات میں وہ محبت پنپ نہیں پاتی۔سوشل میڈیا کی وجہ سے رشتوں کا مفہوم بدل گیا ہے۔

سوشل میڈیا کی رنگ برنگی دنیا نے کھانا بنانا سکھانے سے لے کر، ڈانس سکھانے تک، ٹیوشن پڑھانے سے لے کر ٹریننگ دینے تک، فیشن کے گُر سکھانے سے لے کر، کہانیاں، خبریں، مزاح، ترغیب، کھیل، سنیما، سیاست وغیرہ تک کے لیے ایک میدان مہیا کیا ہے۔سوشل میڈیا ہنرمندوں کو شہرت کے مقام تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ روزگار وغیرہ بھی فراہم کر رہا ہے۔سوشل میڈیا پر بہت ساری این جی اوز سرگرم نظر آتی ہیں۔موجودہ معاشرے میں شعور بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ، سوشل میڈیا پر سوشل ویلفیئر کے کام بھی انجام پا رہے ہیں۔سوشل میڈیا مظلوموں اور کمزوروں کی آواز بن کر ابھرا ہے۔دہلی میں 'بابا کا ڈھابا' اس کی ایک مثال ہے۔ یہاں سے بہت سارے سماجی مصلحین کو معاشرے میں پائے جانے والی برائیوں کے بارے میں بھی معلومات مل جاتی ہیں۔سوشل میڈیا نے موسیقار، گلوکار، مصنف، اداکار، آرٹسٹ، ملازم، استاد وغیرہ سب کے لیے ایک نئے میدان کے دروازے کھول دیے ہیں۔۔جس کی وجہ سے سماج میں تبدیلی واقع ہوئی ہے۔

سوشل میڈیا پر گندے ایس ایم ایس اور فحاشیت میں اضافہ کی وجہ سے ہماری تہذیبی قدریں تنزلی کا شکار ہو رہی ہیں۔آج کے بچے سوشل میڈیا پر اس قدر مصروف ہیں کہ گھر میں ساتھ رہتے ہوئے بھی گویا وہ ساتھ نہیں رہتے۔ ورچوئل دنیا میں حقیقی تعلقات کے علاوہ یہ تمام موبائل کے مجازی تعلقات میں مشغول رہتے ہیں۔اب بچے دادا دادی سے پریوں کی کہانیاں یا اخلاقی باتیں سننا پسند نہیں کرتے

ہیں۔ گھر میں بزرگ افراد خود کو اکیلا محسوس کرنے لگے ہیں۔ سوشل میڈیا پر اپنا بیشتر وقت صرف کرنے کے باعث بچے اپنی خاندانی وراثت اور خاندانی قدروں سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ علاوہ ازیں بچوں کی جانب سے سوشل میڈیا کے مہنگے آلات کے مطالبات سے گھر کی معیشت متاثر ہو رہی ہے۔

میڈیا کو جمہوریت کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے، غیر جانبدار میڈیا سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ میڈیا سماج، مذہب، ذات پات، نسل اور صنفی امتیازات کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جو تنوعیت رکھنے والے ہمارے ملک کے لیے ناگزیر ہے۔ تنوعیت میں اتحاد کے جذبے کو پروان چڑھانے کا کام کرتا ہے۔ میڈیا کا غلط استعمال منفی نتائج سامنے لاتا ہے۔ کتنی ہی ایسی فلمیں ہم دیکھتے ہیں جس میں کسی مخصوص طبقہ کی تضحیک کی جاتی ہے، کمزوروں کی توہین کرتے دکھایا جاتا ہے، گوروں کی تعریف کی جاتی ہے اور خواتین کی کاوشوں کو کمتر سمجھا جاتا ہے، دانستہ یا نادانستہ ایسا تبصرہ کر دیا جاتا ہے جس سے سماجی اتحاد کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ تھری ایڈیٹ، دنگل، آرٹیکل ۔15، ملک اور تیزاب جیسی کتنی ہی ایسی فلمیں ہیں جو سماجی عدم مساوات پر ضرب لگاتی ہیں اور سماج کو آئینہ دکھاتی ہیں۔ اس کے علاوہ فلموں کے اثرات ہمارے لباس، چال چلن، رہن سہن، بول چال اور کھانے پینے پر رونما ہو رہے ہیں۔ تہذیب بدل رہی ہے، غیر ملکی کھانے، لباس ہم پر حاوی ہو رہے ہیں۔ ہماری موجودہ نسل بیرونی تہذیب کی پیروی کر رہی ہے۔ سوشل میڈیا پر ایسے بہت سارے اشتہارات آتے ہیں جو ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہ بھی ہو تو اس کا احساس کراتے ہیں۔

موجودہ دور میں جہاں ایک طرف سوشل میڈیا نے سماج کو اونچا اٹھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے تو وہیں دوسری طرف سوشل سائٹس کی وجہ سے موجودہ نسل کے ذہنوں میں منفی اثرات اور مایوسی کے امکانات میں اضافہ کیا ہے۔ سوشل میڈیا پر افواہیں، جھوٹی خبروں کا بازار گرم رہتا ہے، جھوٹی خبروں اور نفرت انگیز تقریروں سے مذہبی منافرت بڑھتی ہے، سماج میں ٹکراو کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ سماج کے دو طبقوں کے درمیان دراڑ پیدا ہو جاتی ہے، سماج کا امن چین اور بھائی چارا متاثر ہونے لگتا ہے۔ کچھ گمراہ کن معلومات سماج میں انتشار کا باعث بنتی ہیں۔ اس کے علاوہ سوشل میڈیا کے زیادہ استعمال سے انسان میں جسمانی و دماغی صحت سے متعلق مسائل پیدا ہونے لگتے ہیں، سوشل میڈیا نے سوچنے کی طاقت وغیرہ کو کمزور کر دیا ہے۔ درحقیقت سوشل میڈیا ایک مجازی دنیا ہے، جس کی وجہ سے اس نے ہماری حقیقی زندگی،

تعلقات، رشتہ داروں اور پڑوسیوں سے دور کر دیا ہے۔ مزید یہ کہ سوشل میڈیا پر فحش اور بیہودہ زبان کا استعمال بھی بڑے پیمانے پر جاری ہے۔ جس کی وجہ سے سماجی اقدار تنزلی کی طرف مائل ہیں۔ ایک طرف جہاں ہم سوشل میڈیا پر دبے کچلے لوگوں کے لیے حق کی آواز بلا تاخیر پرزور انداز میں اٹھاتے ہیں تو وہیں دوسری طرف اس کی وجہ سے فحش تصاویر اور ویڈیو کی رسائی بچوں تک آسانی سے ہونے لگی ہے۔ جس کی وجہ سے ہم اپنی تہذیب اور اس کی قدروں وغیرہ سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ سوشل میڈیا پر فحاشیت یا بیہودہ زبان کے استعمال سے سماج میں منفی اثرات رونما ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے مجرمانہ سرگرمیوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔

آج ہمیں سوشل میڈیا کا استعمال اس کی اچھائیوں کے ساتھ کرنا ہوگا۔ سوشل میڈیا ہمارے سماج کو بیدار کر رہا ہے اور سماج کی برائیوں کے خاتمہ کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے اور ہر کسی کو اپنی بات آزادی کے ساتھ پیش کرنے کا پلیٹ فارم مہیا کر رہا ہے۔ مختلف قسم کے تخلیقی کاموں کو فروغ دے رہا ہے روزگار کے نت نئے طریقوں کو ایجاد کر رہا ہے۔ اور تعلیم کو آسان و نتیجہ خیز بنانے میں اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔ مزید یہ کہ جدیدیت کا ایک نیا باب اس پر لکھا جا رہا ہے۔ ایک نئے سماج کی تعمیر کے لیے ایک نئی نسل تیار کی جا رہی ہے۔ تو دوسری طرف اس کے کچھ منفی نتائج بھی سامنے آ رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہماری تہذیب زوال پذیر ہو رہی ہے، نتیجتاً سماج میں اختلافات کے اضافے کے ساتھ ساتھ ٹکراؤ کی صورتحال پیدا ہوگئی ہے۔ آج سوشل میڈیا ہی کی وجہ سے افواہیں اور جھوٹی خبریں ہوا کی طرح سماج میں پھیل جاتی ہیں اور جب تک اصل چیز کا پتہ چل پاتا ہے، تب تک دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سوشل میڈیا ایک نئی تکنیک ہے جس کا استعمال ہمیں پیار و محبت کو عام کرنے اور سماج میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے کرنا ہوگا۔ آج سوشل میڈیا ترقی کے ایک نئے بیانیہ کی تشکیل کر رہا ہے، سوشل میڈیا کے صحیح استعمال کے ذریعہ ہم سماج اور ملک دونوں کو ترقی کی راہ پر گامزن کر سکتے ہیں اس کے لیے ہمیں اس کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو دیکھنا ہوگا اور اس کے بارے میں گہرائی سے سوچنا ہوگا۔

حوالہ جات:

☆ 'سوشل میڈیا، وائرل ہوتی دنیا' کا مِنی، جون 2019ء ایچ ایم وی ایل پرکاشن

☆ ششی پربھا (2016)، کیسی ہوگی شکشا 2025ء میں، بھارتیہ آدھونک شکشا، جنوری 2016، این سی

ای آر ٹی، دہلی

☆ این. فاطمہ (2018)، خوشحال ودیالیہ اور خوشحال ودیارتھی۔ بھارتیہ آدھونک شکشا، اکتوبر.2018 این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

☆ American Academy of Pediatricians (2014). "The media, children and adolescents". Retrieved from www.acpeds.org..

☆ Conrad, D (2002). Community social presence and engagement in online learning (Doctoral Dissertation, University of Alberta, Department of Educational Policy Studies).

☆ Communications and Media (2016). "Media use by children younger than 2 years,diatrics, vol. 128, pp. 1040-1045. Retrieved from http://pediatrics. publications. org/content/128/5/1040.

☆ Cawley, (2010). "The economics of childhood obesity," Health Affairs, 2010 March. Retrieved from http://content.healthaffairs.org/content/29/3/364.full

☆ Halupa, C (2016). Risks: the impact of online learning and technology on student physical, mental, emotional, and social health. ICERI2016 Proceedings. Pages: 6305-6314. DOI: 10.21125/iceri.2016.0044.

❒ **Viquar Unnisa**
Associate Professor, Department of Education & Training
Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Mobile: 9247586963 Email: viquarunnisasiraj@gmail.com

❒ **Mr. Jahangeer Alam**
Assistant Professor, Department of Education & Training
Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Mobile: 8745049196 Email: Jahangeeralam255@gmail.com

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) September 2021, P:335-355
Mr. Rehan Ahmad, Taqseem Mulk, Fasadat aur Urdu Novel

ریحان احمد

تقسیم ملک، فسادات اور اردو ناول

انگریزوں نے ہندستان پر دوسو سال تک براہ راست یا بالواسطہ حکومت کی اور سونے کی چڑیا کہلانے والے اس ملک کو ہر اعتبار سے لوٹا۔ بالآخر ہندستان آزاد ہوا اس آزادی کی جنگ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ دوسرے مذاہب کے لوگوں نے بھی بے شمار قربانیاں دی تھیں۔ حصول آزادی کے لیے بچے یتیم ہو گے، عورتیں بیوہ ہو گئیں۔ ہندستانیوں کو اس بات کی امید تھی کہ ایک خواشگوار صبح نمودار ہوگی اور ہم آزاد معاشرے میں زندگی بسر کریں گے۔ لیکن یہ تمام اس قدر آسان نہ تھا انگریزوں نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی اپنائی اور وہ اس پالیسی میں کافی حد تک کامیاب ہوئے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کو ثمر آور بنانے میں چند مخصوص ذہنیت والے ہندستانی عوام کا بھی کردار رہا۔ اگر ہندستان کے ہندو اور مسلمان مناسب وقت پر یہ سمجھ لیتے کہ جن سے آزادی حاصل کرنا ان کا آخری خواب ہے تو بھلا ان کے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کو ناکام کیوں نہ بنایا جا سکتا تھا۔ ہندستان میں غلامی کی زنجیریں ابھی پوری طرح کمزور بھی نہیں ہوئی تھیں۔ آزادی ملنے کے آثار نمایاں ہوئے ہی تھے کہ خونی لکیر کھینچ گئی۔ نتیجتاً پاکستان دنیا کے نقشے پر نمودار ہو گیا۔ تقسیم ملک کے بعد ہجرتوں کا سلسلہ شروع ہوا، دوران ہجرت فسادات ہوئے۔ درندہ صفت لوگوں نے نہ صرف یہ کہ مدتوں سے استوار رشتوں کے تقدس کو تار تار کیا بلکہ انسانیت کو ایسے نہ مٹنے والے داغ دیے۔ جو برسوں تک ان کی پیشانیوں پر چمکتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نفرت کی لکیر صرف زمین پر نہیں کھینچی گئی تھی بلکہ دونوں اطراف میں بسنے والے لوگوں کے دلوں میں بھی کھنچ گئی تھی۔ سیاست اس عظیم کارنامے کو انجام دینے میں فعال کردار ادا کر رہی تھی۔ بعض لوگ جو امن کا درس دے رہے تھے انہیں بزدل کہا

گیا۔انسانوں کے وحشی بن جانے کی اس داستان کو تاریخ، سیاست، سماجیات اور صحافت نے اپنے اپنے انداز میں رقم کیا۔

ہندوستان میں فسادات برپا ہونے میں سیاسی جماعتوں کے نظریات کا عمل دخل بھی رہا ایک طرف مسلم لیگ مسلمانوں کے لیے الگ ملک کی مانگ کر رہی تھی وہیں دوسری طرف کچھ ہندو نواز شدت پسند تنظیمیں تھیں جو ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کو تار تار کرنے پر آمادہ تھیں۔ ہندو مہا سبھا کے ان نظریات کی وجہ سے مسلم لیگ کے خدشات میں مزید اضافہ ہو رہا تھا وہیں کانگریس ظاہراً تقسیم ملک کے خلاف تھی ماحول کی کشیدگی کو دیکھتے ہوئے مسلم لیگ مسلم ریاستوں کی مانگ کر رہی تھی ایسے ہی حالات نے نہ صرف یہ کہ ملک کی تقسیم کے لیے راستے آسان کیے بلکہ فسادات کے سلسلے کا سبب بھی بنے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو خودنوشت "The Discovery of India" میں فرقہ واریت (Communalism) کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''یقیناً یہ ہماری غلطی ہے اور ہمیں اس غلطی کو بھگتنا ہوگا لیکن میں برطانوی حکومت کے جان بوجھ کر انتشار پھیلانے کے فعل کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ باقی تمام زخم وقت کے ساتھ بھر جائیں گے لیکن فرقہ واریت کا طاعون مدتوں قائم رہے گا۔''(1)

نہرو کے مذکورہ خیال سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاست دان فرقہ واریت کی گہری جڑوں سے واقف تھے اور اسی لیے مفاہمت پر زور دیتے تھے، انھیں معلوم تھا کہ فرقہ واریت ناسور بن جائے گی۔ طلوع آزادی اور فسادات کی تصویر کشی بپن چندرا نے اپنی کتاب جدید ہندستان (Modern India) میں اس طرح کی ہے:

> ''خوشی کا یہ احساس جو بے تحاشا پرکشش ہوتا وہ درد اور اداسی کے ساتھ جا ملا۔ متحدہ ہندستان کا خواب چکنا چور ہو چکا تھا۔ جس کے نتیجے میں بھائی نے بھائی کو کھویا۔ یہ کتنا المناک تھا کہ آزادی کے اولین لمحات میں ہی فرقہ واریت اور ناقابل بیان ظلم وستم کی وجہ سے ہزاروں جانیں ہندستان اور پاکستان میں فرقہ وارانہ فسادات کی نذر ہو گئیں۔ لاکھوں مہاجرین اپنے آباؤ اجداد کی سرزمین

چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ سب گاندھی جی کے فلسفہ حیات یعنی عدم تشدد،صداقت ومحبت اوراخوت کی ناکامی کی علامتیں تھیں۔ایک ایسا آدمی جو ہندستان کے بہترین کلچر کی نشانی تھا۔''2؎

گاندھی جی نے آخری وقت تک چاہا کہ ملک دو حصوں میں نہ بٹے وہ جانتے تھے کہ اگر ایسا ہوا تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی بڑی آبادی نہ صرف یہ کہ بری طرح متاثر ہوگی بلکہ اپنی جان تک گنوادے گی۔ کیونکہ وہ اپنی بصیرت کی وجہ سے جانتے تھے کہ ہندستان کے ہندو اور مسلمان کس حد تک مذہب پرست ہیں۔شر پسند عناصر کے اکسانے پر کتنے بھیانک حالات برپا ہوں گے کیونکہ وہ 1922 کے چوراچوری کے تشدد کو محسوس کر چکے تھے۔جس کے بعد انھوں نے عدم تعاون کی تحریک کو روک دیا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر دو قومی نظریہ کو نہ مانا گیا تو فرقہ وارانہ تشدد بھڑک اٹھیں گے اور نہ رکنے والا خون ریزی کا سلسلہ جاری ہوجائے گا۔ابھی بٹوارہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ہندستان کے مختلف شہروں میں فسادات شروع ہوگئے۔بنگال میں فسادات کی شرح زیادہ تھی۔گاندھی جی نے انتھک محنت کی کہ فسادات نہ ہوں اور ملک تقسیم نہ ہو لیکن اس وقت کے حالات کو دیکھتے ہوئے تمام اعلیٰ سیاست دانوں کو لگ رہا تھا کہ اب ملک کا بٹوارہ نہ ہوا تو فرقہ وارانہ فسادات ملک کو نگل جائیں گے۔ان حالات کے متعلق بپن چندرا لکھتے ہیں:

''مستقبل قریب میں حاصل ہونے والی آزادی کی خوشی کو 1946 میں بڑے پیمانے پر ہونے والے فرقہ وارانہ تشدد نے مجروح کیا۔ ہندو اور مسلمان فرقہ پرست لوگ اس ہولناک قتل عام کے لیے ایک دوسرے کو ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے۔مہاتما گاندھی پر لوگوں میں بنیادی انسانیت کی عدم موجودگی کو دیکھ کر مایوسی چھا گئی اس وقت ان کی نظر سچائی اور عدم تشدد پر تھی۔انھوں نے پیدل بنگال اور بہار کا سفر فرقہ وارانہ فسادات کا جائزہ لینے کی غرض سے کیا۔ بہت سے ہندوؤں اور مسلمانوں نے فرقہ وارانہ فسادات کی لگی آگ کو بجھانے میں اپنی زندگیاں تلف کردیں۔ہندستانی قوم پرستوں نے تقسیم کو ایک ہندو ملک اور مسلم ملک کے طور پر قبول نہیں کیا بلکہ گذشتہ ستر سالوں سے یہ فرقہ واریت ہندوں اور مسلمانوں میں پروان چڑھ رہی تھی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ تقسیم

کے بغیر کوئی دوسرا متبادل سوائے لاکھوں معصوم لوگوں کے فرقہ وارانہ تشدد کا نوالہ بن جانے اور کچھ نہیں تھا۔'' 3

گاندھی جی نے ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد کے لے کام کیا وہ جانتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد سے ہی ہندستان کو آزادی مل سکتی ہے۔ 1947 سے پہلے بھی انھیں معلوم تھا کہ یہ دونوں قومیں آپس میں فرقہ واریت کا شکار ہیں وہ اپنی خودنوشت "An autiobiography or My experiments with truth" میں ہندو مسلم کے عدم اتحاد کے متعلق لکھتے ہیں:

''میں نے جنوبی افریقہ میں جلد ہی محسوس کرلیا تھا کہ ہندوں اور مسلمانوں میں کوئی حقیقی دوستی نہیں ہے۔ میں نے اتحاد کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کا ایک بھی موقع کبھی نہیں گنوایا۔ کسی کو بہکانا یا عزت نفس کی قیمت پر منحرف کرنا میری فطرت میں نہیں تھا۔ لیکن جنوبی افریقہ کے تجربات نے مجھے اس بات پر قائل کرلیا کہ یہ ہندو مسلم اتحاد کے سوال پر ہوگا۔ اگرچہ میرے نظریۂ عدم تشدد کو مشکل امتحان میں ڈال دیا جائے گا، اور اس سوال نے عدم تشدد میں میرے تجربات کے لیے وسیع تر میدان پیش کیا۔ میں نے زندگی کے ہر لمحے میں یہ محسوس کیا کہ خدا مجھے آزمائش میں ڈال رہا ہے۔'' 4

محمد علی جناح نے بھی پہلی گول میز کانفرنس میں 19 ؍نومبر 1930 کو اپنی تقریر میں یہ عندیہ دے دیا تھا کہ ہندستان کو اب مکمل آزادی کی ضرورت ہے۔ اسی تقریر میں انھوں نے کہا کہ مکمل آزادی نہ ملنے کی صورت میں وہ ہندستان جانے کے لیے تیار نہیں۔ انھوں نے جذبات میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ غلامی کی زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ کسی آزاد ملک میں میری آخری آرام گاہ بنائی جائے اور آزادی نہ ملنے کی صورت میں مجھے اسی ملک میں دفن کیا جائے۔ محمد علی جناح چاہتے تھے کہ ہندستان آزاد ہو لیکن ملک کی سماجی ابتری کو دیکھتے ہوئے وہ مسلمانوں کے لیے خصوصی درجہ دیے جانے کے قائل تھے۔ 1940 میں مسلم لیگ نے الگ ملک کا مطالبہ کیا یہ پہلا موقع تھا کہ جب ''پاکستان'' نام سے ملک کا مطالبہ مسلم لیگ نے کیا۔ اس طرح دو قومی نظریہ روز بروز پختگی حاصل کرتا گیا۔ اس سلسلے میں چودھری رحمت علی نے پہلی بار 28؍جنوری 1933 میں مسلمان اکثریتی ریاستوں کو الگ کرکے ایک ملک بنانے کی تجویز رکھی تھی اور

اسے پاکستان کا نام دیا تھا۔ان کا نظریہ یہ تھا کہ دو ملک بنے بغیر اب کوئی چارہ کار نہیں ہے۔اگر انگریزوں نے ہندستان کو آزاد کر دیا اور پاکستان کا قیام عمل میں نہ آیا تو یہاں ہندو مسلمانوں کو کچل ڈالیں گے۔ انھوں نے 28/جنوری 1933 کو ایک کتابچہ ابھی یا پھر کبھی نہیں (Now or Never) نام سے شائع کیا۔اس کتابچے نے اپنی افادیت کی بنیاد پر بہت شہرت پائی۔اس کتابچہ کے شائع ہونے کی وجہ سے نظریہ پاکستان کو فوقیت ملی۔انھوں نے اس کتابچے میں گول میز کانفرنس میں ہندستان کے لیے تجویز کردہ نام All India Federation کو مسلمانوں کے لیے موت کا پروانہ قرار دیا۔

چودھری رحمت علی کے مطابق مسلمانوں کی بقا صرف اور صرف پاکستان کے بننے میں ہی تھی۔ چودھری رحمت علی کے اسی کتابچے سے مسلمانوں کے لیے بننے والے ملک کا نام پاکستان تجویز کیا گیا۔ دوسری طرف کانگریس کے لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد کسی بھی قیمت پر تقسیم ملک کے لیے راضی نہیں تھے۔ آخر کار ملک کے لیے کی جانے والی آزادی کی بیش بہا محنتیں رائیگاں ہوگئیں اور تقسیم ملک کا ریزولیشن آ گیا۔ جس ریزولیشن کو محمد علی جناح کے ساتھ ساتھ پنڈت جواہر لعل نہرو اور سردار پٹیل نے بھی تسلیم کرلیا۔مولانا ابوالکلام آزاد "India Wins Freedom" میں لکھتے ہیں:

> ''کانگریس کی جانب سے تقسیم کو تسلیم کرلینا میرے لیے نا قابل برداشت ہے۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ورکنگ کمیٹی نے جو فیصلہ لیا وہ انتہائی افسوس ناک ہے۔تقسیم، ہندستان کے لیے المیہ ہے اور صرف ایک بات جو تقسیم کے حق میں کہی جاسکتی ہے وہ یہ کہ ہم نے تقسیم سے بچنے کی انتھک کوششیں کیں لیکن نا کام ہوئے ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ ملک ایک ہے اور اس کا کلچر ایک ہے اور ایک رہے گا۔ سیاسی اعتبار سے ہم نا کام ہو چکے ہیں جس کے نتیجے میں ملک بٹا ہمیں اپنی ہار تسلیم کر لینی چاہیے لیکن بیک وقت ہمیں اپنے کلچر کو بچانے کی تگ ودو بھی کرنی چاہیے۔.....سیاسی حقیقت پسندی نے ماونٹ بیٹن پلان کو قبول کرلیا اس نے کہا تھا کہ پنڈت پنت کی جانب سے پیش کردہ قرارداد کو قبول کیا جائے۔ جب اس ریزولیشن پر ووٹ پڑے تو 29 حق میں اور 15 مخالفت میں تھے۔ یہاں تک کہ گاندھی جی کی ووٹ کے متعلق اپیل بھی ممبروں کو اپنی طرف نہ لبھا سکی۔'' 5

اس طرح مولانا ابوالکلام آزاد کے قومی یکجہتی کے نظریہ کو زبردست دھچکا لگا ۔ 1947 میں ہوئے فسادات کی ایک مثال یاسمین خان کی کتاب "The Great Partiion" سے دینا مناسب معلوم ہورہا ہے۔

''تشدد، ہمیشہ تقسیم کی جڑوں میں موجود ہوتا ہے ۔ یہ تقسیم کے دوران ہونے والے قتل کا غیر معمولی حادثہ ہے۔اس نے خواتین،بچوں اور بزرگوں کے ساتھ ساتھ مسلم نوجوانوں کو بھی متاثر کیا۔ پنجاب میں تشدد کے سنگین مناظر فکشن، شاعری اور فلم میں بہتر انداز میں پیش کیے گئے ہیں بچوں نے اپنے والدین کو الگ ہوتے یا زندہ جلتے دیکھا ۔عورتوں کی عصمت دری کی گئی اور ان کی چھاتیوں اور اعضائے تناسل کو مسخ کیا،دیہی علاقوں کی پوری آبادی کو قتل کردیا گیا۔ پنجاب میں عینی شاہدین نے نعشوں کا انبار، دیواروں، اسٹیشنوں اور سڑکوں پر خون کے دھبوں کی گواہی دی۔'' 6

ادب نے جب اس عظیم سانحے کو موضوع بنایا تو وہ باقی مضامین یا ذرائع کے مقابلے زیادہ پر اثر اور حقیقی ثابت ہوا۔ 1947 کا سانحہ بہت ہی بھیانک تھا اس سانحے کا اثر اردو زبان نے بڑی شدت سے قبول کیا کیونکہ ہندستان اور پاکستان سے ہجرت کرنے والے اکثر لوگ اردو بولتے سمجھتے اور لکھتے تھے ان حالات کے متعلق بڑی تعداد میں افسانے اور ناول لکھے گئے ۔سردست چند ایسے ناولوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن میں 1947 کے بٹوارے سے پیدا ہوئے حالات کو موضوع بنایا گیا ہے۔

ممتاز شیریں فسادات کے متعلق ''معیار تنقید'' میں لکھتی ہیں:

''فسادات ہمارے لیے بالکل قریبی حقیقت ہیں: ہولناک، انتہائی بھیانک، ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی، آنکھوں کے سامنے کی حقیقت! یہی وجہ ہے کہ بنے گھڑے پلاٹ اور خالی رقت آفرینی، عبارت آرائی، لفاظی اور طنز کوئی اثر پیدا نہیں کرتے کیونکہ جن تجربات سے گذرنا پڑا ہے وہ عام ہو چکے ہیں۔ ہمیں اپنے گردو پیش کی زندگی میں ہر طرف فسادات کے بھیانک نظر آتے ہیں۔فسادات نے زندگی کو تہہ بالا کردیا تھا اس لیے فسادات نے ہمارے ادب

پر صرف اثر ہی نہیں ڈالا بلکہ ادب پر اس طرح چھا گئے کہ عرصہ تک اور کسی موضوع پر شاذ ہی لکھا گیا۔'' 7

''ہم وحشی ہیں'' کے دیباچہ میں لکھا گیا ہے:

''میں سوچتا ہوں کہ ملک میں امن قائم ہوجائے گا۔ اجڑے ہوئے کھیت پھر لہلہانے لگیں گے۔ ہم اپنے بازوؤں کی قوت سے دیو ہیکل مشینیں کھڑی کردیں گے لیکن ان قاتلوں کا ضمیر کیسے پاک ہوسکے گا۔ جنھوں نے ننگی عورتوں کا جلوس نکال کر اللہ اکبر۔ ست سری اکال اور ہر ہر مہادیو کے نعرے بلند کیے ہیں۔ جنھوں نے ماؤں کی دودھ بھری چھاتیاں کاٹی ہیں اور بچوں کی لاشوں کو نیزوں پر اٹھا کر قہقہے لگائے ہیں۔ ہم اس اناج کو کیسے کھا سکیں گے جوان کھیتوں سے پیدا ہوگا جن کی خاک میں ہزاروں بے گناہوں کی لاشیں کھاد بن گئیں ہیں۔'' 8

اس طرح ان فسادات نے ادیبوں کو تڑپایا۔ ادیبوں نے لوگوں کے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کرنے اور دل میں موجود رنج وغم کو بروئے کار لانے کے لیے کوششیں کیں۔ منٹو، پریم ناتھ اشک، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، حیات اللہ انصاری اور خواجہ احمد عباس نے بہترین افسانے لکھے۔ جب کہ کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، قدرت اللہ شہاب، قرۃ العین حیدر، رامانند ساگر، فکر تونسوی، عبدالصمد، خدیجہ مستور، عبداللہ حسین، کشمیری لال ذاکر اور علی امجد نے ناول کے ذریعے فسادات کی عکاسی کی۔

اب ایسے ناولوں کے متعلق بحث کی جاتی ہے۔ جن مین فسادات اور ہجرت کو موضوع بنایا گیا۔ اور انسان مر گیا: اردو میں فسادات، ہجرت اور اس سے پیدا شدہ حالات پر لکھا گیا پہلا ناول جو 1948 میں شائع ہوا۔ سانحہ تقسیم کے ساتھ زمانی اعتبار سے قریب ہونے کی وجہ سے اس ناول میں انسانوں سے سرزد ہونے والے ایسے دلخراش واقعات، سانحات اور حوانیت سے لبریز حقیقی جذبات کا ذکر ملتا ہے کہ جس کے مطالعے کے بعد انسانیت کی ذراسی رمق رکھنے والوں کے بھی رونگھٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ حساس طبعیت انسانوں کو اپنے اندر مظلوم انسانوں کی روح محسوس ہوتی ہے۔ اس ناول میں ایک طرف ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے برابر شریک ہونے کی بات کی گئی وہیں ان لوگوں نے مذہبی قوانین کو بالائے طاق رکھ کر جو تاریخ رقم کی اس نے نہ صرف گنگا جمنی تہذیب کو پامال کیا بلکہ وہ اپنے اپنے

مذہب کے بھی دشمن ٹھہرے۔اس افراتفری اور قتل وغارت کے دور میں بعض لوگوں نے اپنی جان بچانے کی خاطر جوابی کاروائی کی لیکن اکثر واقعات منصوبہ بند تھے۔مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر ہوئے ظلم کا بدلہ مغربی پنجاب میں ہندوؤں کو چکانا پڑا۔راوی نے قاری کے دھیان کو بار بار اس جانب کومنتقل کیا ہے۔ناول میں جا بجا اس امر کو بیان کیا گیا ہے کہ احتجاج یا کاروائی شر پسند ذہن رکھنے والوں کے خلاف ہونی چاہیئے نہ کہ کسی علاقے کی معصوم اقلیت کے ساتھ۔مشرقی پنجاب میں قتل کیے جانے والے افراد،عصمت دری کی گئیں عورتیں اور یتیم کیے گئے بچے معصومیت کے اعتبار سے مغربی پنجاب کے مقتول انسانوں جیسے ہی تھے۔مصنف نے مولنا اور آنند کے کردار کے ذریعے معاشرے میں انسانیت کی موجودگی کا احساس دلایا ہے۔یہ حقیقت ہے کہ درندوں کے کہرام میں حساس طبعیت انسان کتنی جانیں بچا پائیں گے۔لیکن اس وقت یہی کیا کم تھا کہ کسی ایک انسان کی ہی جان بچ جاتی،کوئی ایک بچہ داغ یتیمی سے بچ جاتا اور کسی ایک حوا کی بیٹی کی عصمت بچی رہتی۔آنند اور مولنا بہت سے مقامات پرلوگوں کی جان بچاتے ہیں۔ناول کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر زخم دینے والوں کو زخم نہیں لگتے۔جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر مذہب میں کچھ شر پسند تھے۔جو وقتاً فوقتاً فرقہ وارانہ وارداتیں انجام دے رہے تھے۔ناول کے ذریعے مصنف نے اس جانب بھی توجہ مبذول کی ہے کہ فتنہ اور فساد کرنے والے اکثر لوگ اس غم سے واقف نہیں ہوتے جو بے گناہوں پر کرنے سے ان کے خونی وجگری رشتہ داروں کو ہوتا ہے۔حالات اس قدر خراب تھے کہ تین بہن بھائی فسادیوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ جے ہند کے نعرے سے انکار کرنے پر دونوں لڑکیوں کوننگی عورتوں کے جلسوں کے آگے چلنے کو کہا گیا۔انکار کرنے پر انہیں زمیں پر گھسیٹا گیا۔ مولنا اس واقعے کے متعلق آنند کو بتاتے ہیں:

''انہوں نے زمین پر گھسیٹا جانا منظور کر لیا۔لیکن اپنی رضا اور رغبت سے ایک قدم بھی نہیں اٹھایا۔آخر میں کسی نے ان کے گریبان میں ہاتھ ڈال کران کے کپڑے بالکل چیر دیے اور وہ دونوں بالکل عریاں کر دی گئیں۔پھر بھی جب ان کی سرکشی نہ دب سکی تو ایک نوجوان نے طیش میں آکر اپنی تلوار کی نوک اس کی شرمگاہ میں اس طرح ٹھونس دی کہ چیرتی ہوئی لڑکی کے پیٹ تک آگئی۔اسی وقت چھوٹی بہن کو ایک اور نے سڑک پر لٹا لیا تھا اور کھلے عام کئی بہادروں نے وہیں دادعشرت حاصل کی۔

''یہ دیکھ کر چھوٹا بچہ چلایا اور اس نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو کسی نے لوہے کی ایک کند سلاخ اس کے پیٹ میں اس زور سے چھودی کہ وہ اسی پر ٹنگ گیا۔''9

ان فسادات کے دوران ہندستان اور پاکستان میں ہجرت کرنے والے لوگوں کو لانے لے جانے والی ریل گاڑیوں میں بھی قتل عام کیا گیا۔ اس قتل عام کے بعد جو لوگ ریل گاڑیوں میں بچ گئے انہوں نے زندہ رہنے کے لیے معصوم لوگوں کے خون تک چاٹا اور پیشاب کو بطور پانی پیاس بجھانے کے لیے استعمال کیا۔ مولنا آنند سے اس واقعے کے متعلق یوں بتاتے ہیں:

''۔۔۔۔۔۔اور اس گاڑی کے جواب میں کئی مسلم گاڑیوں کے ساتھ مشرقی پنجاب کے ساتھ جو کچھ کیا گیا۔ وہ بھی کم ہولناک نہ تھا۔ ان میں سے ایک گاڑی میں تیرہ ہزار انسانوں میں سے صرف پندرہ بچے لوگوں نے بھائیوں بیویوں اور بچوں کا خون چاٹا تھا۔ اپنے بدن کو کاٹ کر خون چکھا تھا اور انتہا یہ کہ کئی روز پیاسے رہنے کے بعد آخر انہوں نے ایک دوسرے کے منہ میں پیشاب کیا تاکہ حلق تو تر ہو سکیں۔''10

قرۃ العین حیدر نے خصوصی طور پر 'میرے بھی صنم خانے' اور 'آگ کا دریا' ناولوں میں تقسیم کے موضوع پر بحث کی ہے۔ 'میرے بھی صنم خانے' میں داخلی خود کلامی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔ ناول کے وسیع کینوس کو قرۃ العین حیدر نے بڑی چابک دستی سے قابو میں رکھا ہے۔ اس ناول میں کردار متعدد موقعوں پر داخلی خود کلامی کی شکل میں کسی مخصوص شخص یا صورت حال پر تبصرہ کرتے ہیں۔ لیکن ان کے ذہین کی پرواز لامحدود ہے اور ناول کا سارا مواد شعور کے پردے پر متحرک ہے۔

'میرے بھی صنم خانے' میں نہ صرف زمیندار طبقے کے زوال کی روداد ہے بلکہ برصغیر کی گنگا جمنی تہذیب کا مرثیہ بھی ہے۔ ناول میں جگہ جگہ کرداروں کے ذریعے طبقاتی برتری کی نشاندہی کی گئی ہے۔ روشی اور سلیم جذبہ محبت سے سرشار ہیں۔ لیکن طبقاتی کشمکش کی خاطر اقرار محبت سے خائف ہیں۔ روشی جہاں سلیم کو اعلیٰ دیکھنا چاہتی ہے وہیں سلیم کی کوششوں کے باوجود روشی کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا سلیم اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والی لیکن روشی سے کم حیثیت کی مالکہ قمر آرا سے شادی کر لیتا ہے۔ اس کے باوجود روشی اس سے پہلے کی طرح رہ کر اپنی بلند پروری کا ثبوت دیتی ہے۔ اس ناول میں قرۃ العین

حیدر نے عام روش کے برعکس کرداروں کی ذہنی تلاطم کے ذریعے تقسیم ہند کے منفی نتائج کو اجاگر کیا ہے۔ خصوصاً اعلیٰ طبقہ کے تقسیم پر ردعمل کا احاطہ کیا گیا ہے۔

''آگ کا دریا'' ایک نئی فنی تکنیک کے ذریعے وجود میں آیا۔اس سے پہلے ناول میں ابتدا، درمیانی نقطہ اور انتہا کا خیال رکھا جاتا تھا۔اس ناول میں کسی مروجہ پیرائے کو نہ اپنانا انسان کی حقیقی زندگی کے قریب ہونے کی دلیل ہے۔کیونکہ زندگی میں واقعات تسلسل کے ساتھ وقوع پذیر نہیں ہوتے۔ خیالات کا بھٹکنا فطرت انسانی میں مضمر ہے۔''آگ کا دریا'' میں ماضی، حال اور مستقبل گڈ مڈ ہو گئے ہیں۔واقعات کی ابتدا اور انتہا تک رسائی حاصل کرنا مشکل ترین امر ہے۔زماں کے اعتبار سے ناول میں اتنی وقوع پذیری ہونے کے باوجود تسلسل برقرار رہتا ہے۔قرۃ العین حیدر نے وسیع مطالعہ کی وجہ سے وقت کے بار بار بدلتے دھارے سے لبریز ناعل کے لیے ایلیٹ کی نظم FOUR QUARTENTS سے ایک اقتباس ERPIGAPH کے طور پر لیا کیونکہ اس نظم میں وقت اور ابدیت کے تعلق سے شاعرانہ انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ناول کا چوتھا دور تقسیم ہند اور منقسم ہندستان کے متعلق ہے۔جہاں اس حصّے میں قرۃ العین حیدر نے پاکستان کے معاشی، معاشرتی اور تہذیبی نظام پر تنقید کی ہے وہیں گنگا جمنی تہذیب کے منتشر ہونے پر بھی مصنفہ مایوس نہیں ہیں۔گو کہ اس وقت ہندستان کے حالات تاریخ کے بد ترین حالات کا نمونہ تھے۔لیکن پھر بھی بھائی چارے کی کچھ روایتیں اب بھی زندہ تھیں۔مجموعی طور پر اس ناول میں شعور کی تکنیک کا استعمال کر کے قرۃ العین حیدر نے وقت کے وسیع کینوس کو ناول کی شکل میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔تقسیم نے اتنے گہرے زخم دیے کہ ہندستان میں مدتوں سے برقرار کلچر کو نہ صرف ٹھیس پہنچی بلکہ مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کی جڑیں ہی کاٹ دی گئیں۔مسلمانوں نے بڑے پیمانے پر ہجرت کیا اور اسلامی جمہوریہ پاکستان چلے گئے۔جو مسلمان ہندستان رہے انہیں بھی پاکستان جانے کے لیے مجبور کیا گیا۔''آگ کا دریا سے ایک اقتباس اخذ کیا جاتا ہے جس میں تقسیم کے المیہ کی عکاسی ملتی ہے۔

> ''تقسیم کے بعد معلوم ہوا کہ اب ہندو کہتا ہے کہ جب تمہارا کلچر اور تمہارے نظریے علیحدہ ہیں تو جاؤ پاکستان یہ قوم مہاجرین بن کر پاکستان آئے یہاں انکشاف ہوا کہ ہندو سے چھٹکارا ملا۔مگر ایک اور مصیبت کا سامنا در پیش تھا لاہور میں پنجابی تھا۔ڈھاکے میں بنگالی۔''[11]

اس طرح قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں تقسیم ہند اور اس سے پیدا شدہ مسائل کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اور یہ بتانے کی بھی کوشش کی ہے کہ انگریز نفاق ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کو بروئے کار لانے میں کس طرح کامیاب ہو گئے اور ہندستان اور پاکستان میں شرنارتھی اور مہاجرین کی حالت کس نوعیت کی ہو گئی۔ قرۃ العین حیدر کے آزادی کے متعلق لکھے گئے دوسرے ناولوں میں 'آخر شب کے ہم سفر' اور 'چاندنی بیگم' اہم ہیں۔

کرشن چندر نے غدّار، مٹی کے صنم اور میری یادوں کے چنار نام سے آزادی اور اس کے بعد پیدا شدہ حالات کے متعلق ناول لکھے ہیں۔ ''غدّار'' میں کرشن چندر نے ہجرت کے دوران ہوئے فسادات کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ ناول میں کرشن چندر نے ہندستان اور پاکستان میں فرقہ وارانہ فسادات کی حقیقی اور تلخ حقیقت کو بیان کیا ہے۔ ناول میں بیان کیا گیا کہ ایسا نازک وقت تھا کہ برسوں اکھٹے رہنے کے باوجود لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے اور یوں بہو، بیٹیوں کی عزت کو تار تار کیا۔ ان ہی فسادات کی ایک اجتماعی عصمت دری کی عکاسی کرشن چندر ''غدار'' میں یوں کرتے ہیں:

''یہاں کیا راشن ملتا ہے''۔

ہاں یہاں "Sex" کا راشن ملتا ہے۔ وہ نوجوان ہنسا۔ بولا

''کیا مطلب؟''

وہ بولا ''ایک مسلمان لڑکی ہتھے چڑھی ہے۔ ہم لوگ اس کی بے عزتی کر رہے ہیں۔''

میں نے سامنے کے کیو میں کھڑے ہوئے لوگوں کو گنا مجھ سے آگے پچیس آدمی تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرے پیچھے پندرہ آدمی اور کھڑے ہو گئے۔

''یہ کیو کب تک رہے گا؟'' میں نے اس نوجوان سے پوچھا۔

''جب تک وہ لڑکی مر نہیں جاتی'' نوجوان نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر تک تو میں کیو میں کھڑا رہا۔ لوگ باری باری آگے بڑھتے تھے۔ پھر بھی کیو بہت لمبا تھا اور اس لڑکی کی چیخیں بڑی دل خراش تھی کھڑے کھڑے

میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔ جیسے کوئی میرے دل کو مٹھی میں لے کر دھیرے دھیرے مسل رہا ہو۔اس لڑکی کی چیخیں بڑی دردناک تھیں۔

''وے بھراوا! میں تیری بہن آں! وے ویرا! میں تیری بہن آں!

میں نے اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں دے لیں اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔''12ؔ

''غدّار'' کے مندرجہ اقتباس سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ انسان اپنی انسانیت کھو کر حیوانیت کے کس درجے تک پہنچ چکا تھا۔ایک نہتی لڑکی کی آبروریزی کی خاطر مردوں کا ایک جمگھٹا تھا اور کسی میں بھی انسانیت موجود نہیں تھی۔

عبداللہ حسین نے ''اداس نسلیں'' نام سے ناول لکھا۔ یہ ناول تقسیم کے المیہ پر لکھا گیا ہے۔ اس ناول کو عبداللہ حسین نے چار حصّوں برٹش انڈیا، ہندستان، بٹوارہ اور اختتامیہ کے ذیل میں بانٹا ہے۔اگر چہ ناول کی کہانی کا تعلق بیسویں صدی سے ہے لیکن مصنف نے فلیش بیک کی تکنیک کو اپناتے ہوئے 1857 کے واقعات کو ناول میں پیش کر کے ان سانحات کو تقسیم کے ساتھ جوڑا ہے۔ناول کے مرکزی کرداروں میں نعیم اور عذرا ہیں۔نعیم کا تعلق روشن پور گاؤں سے تھا اور اس کی شادی تقسیم سے قبل ہی ہو گئی تھی۔تقسیم کے وقت عذرا نے اپنے والدین کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان میں سکونت اختیار کی۔نعیم کا راستے میں ہی قتل کر دیا گیا۔نعیم پڑھا لکھا اور علی ان پڑھ تھا۔لیکن ناول نگار نے ناول کو نعیم کی موت کے المیہ پر ختم کرنے کے بجائے علی کے پاکستان جا کر نئے سرے سے زندگی کی شروعات کرنے پر ختم کیا ہے۔اس طرح ناول میں ایک نئی صبح نئے مستقبل کا اشارہ دیتی ہے۔اس ناول میں شہری اور دیہاتی زندگی کی عکاسی، زمینداروں کے حالات، فیکٹری مزدوروں کے ابتر حالات، خاندانی اقدار، قبائیلی رسم ورواج کے ذریعے اس دور کے رسم ورواج، سماجی اور معاشرتی حالات کو دستاویز کے طور پر پیش کیا ہے۔اس کے ساتھ ہی ساتھ عالمی جنگ میں ہندستانیوں کی حصّہ داری، تقسیم بنگال، کانگرس کے اجلاس کا تذکرہ، مسلم لیگ کے واقعات، جلیاں والا باغ، تحریک خلافت، سائمن کمیشن کے ہندستان میں بائیکاٹ کے واقعات کو پیش کر کے ناول کو تاریخی حیثیت عطا کی ہے۔ناول میں تاریخی واقعات کو اس حد تک فوقیت دی گئی ہے کہ تقسیم کے پس منظر میں ''اداس نسلیں'' کی شکل میں ایک تاریخی ناول وجود میں آیا۔تاریخی

واقعات کو پیش کرتے ہوئے ناول نگار نے واقعات کی تہہ تک جانے کی کوشش کی ہے اور ہر ایک واقعے کی مختلف پرتوں کو اجاگر کر کے اس تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ناول کے مطالعے کے دوران قاری کو اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ناول میں بہترین کردار نگاری کا فقدان ہے۔اس وجہ سے اس ناول کو حالات اور واقعات کی بہترین عکاسی کا ناول کہا جا سکتا ہے۔ ناول میں پیش کردہ ایک معمول کے واقعے کو یہاں قلم بند کیا جاتا ہے:

> ''پچھلے پچاس میل سے اچانک انہیں اپنے راستے میں مردہ اور نیم مردہ انسانی جسم ملنا شروع ہو گئے تھے جو سڑک پر اور آس پاس کے کھیتوں میں بکھرے پڑے تھے۔ اور بتا رہے تھے کہ ان کے آگے آگے ایک اور قافلہ رواں تھا ایک مہیب زخمی جانور کی طرح جو خون کی لکیر چھوڑ کر آگے آگے بھاگ رہا ہو۔''13

مندرجہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ 1947 سے پیدا شدہ حالات اور فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے انسان نے جس بربریت کا مظاہرہ کیا تھا، عورتوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ایسے واقعات کو تصّور میں لا کر معلوم ہوتا ہے کہ آدمیت کا لبادہ اوڑھے عصمت دری کرنے والے یہ بھول چکے تھے کہ انہیں بھی کسی عورت نے ہی جنم دیا ہے۔

''چاند گہن'' ناول میں انتظار حسین نے بٹوارہ سے قبل کے ہندستان کو موضوع بنایا ہے۔ یہ ناول بیانیہ اور ڈائری کی تکنیک میں آگے بڑھتا ہے۔ پاکستان بننے کے مقصد کو اس ناول کا موضوع بنایا گیا ہے لیکن پاکستان کے وجود میں آنے کے باوجود لوگوں کی آس اور امید پوری نہ ہوئی۔ انتظار حسین نے اس امر کی عکاسی کامیابی کے ساتھ کی ہے، کہ جس مقصد کی خاطر پاکستان وجود میں آیا وہ اسے حاصل کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہا۔ اس ناول میں ہجرت کے عمل کو بھی پوری شدت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ بیتی جگ بیتی سے زیادہ اثر رکھتی ہے۔ انتظار حسین نے ہجرت کا درد خود سہا تھا اس وجہ سے جب ہجرت کے واقعات کو قلمبند کرتے ہیں تو ان کی قلم کی نوک سے نکلنے والا ایک ایک لفظ صداقت کی گواہی دیتا ہے۔ ناول میں حقیقی تصویر کشی کا باعث ادیب کا ذاتی تجربہ ہے۔ تقسیم ہند کس حد تک لوگوں پر اثر انداز ہوئی ناول ''چاند گہن'' میں اس کی بہترین تشریح کی گئی ہے۔ نقل مکانی نے نہ صرف جسمانی نقصان پہنچایا بلکہ مشترکہ تہذیب کو بھی شدید نقصان ہوا۔

کشمیری لال ذاکر کا ناول ''کرماں والی'' جوانھوں نے 1982 میں لکھا ایک منفرد ناول ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ تو اس ناول میں انگریزوں کو موضوع بنایا گیا اور نہ ہی مسلم لیگ اور کانگریس کے باہمی اختلافات کو بلکہ اس ناول میں ان وجوہات کو موضوع بنایا گیا جن کا براہ راست اثر عوام پر پڑا۔لیکن مسلم لیگ اور کانگریس کے لیڈران واقعات سے نظریں چراتے رہے۔کشمیری لال ذاکر نے تفصیل سے بتایا ہے کہ کس طرح ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو چکے تھے۔لوگوں کو زندہ جلایا گیا۔بہو، بیٹیوں کو اغوا کر کے ان کی اجتماعی عصمت دری کی گئی۔لاکھوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔نفرت کی ایسی لہر چلی کہ لوگ بغیر کچھ سوچے سمجھے تباہی کے راستوں پر چل پڑے۔کرماں والی'' میں ایسے ہی ایک منظر کی عکاسی یوں کی گئی ہے:

''جانے کیسے اور کہاں سے ایک سرخ اور پیاسی آندھی اٹھی۔جنم جنم کی پیاسی جو سب کچھ چوس لینا چاہتی تھی ۔فصلوں سے ان کی ہریالی ، پھولوں سے ان کا رنگ ، افسانوں سے ان کی محبتیں ، دلہنوں سے ان کے سہاگ ، کنواریوں سے ان کے سپنے اور بچوں سے ان کی مسکراہٹیں اور معصوم جذبے، ایک دم سرخ اندھیرا بھر گیا تھا ۔ چاروں طرف ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا چہروں کے چوکھٹے بدل گئے تھے،آنکھوں کی شرم ڈھل گئی ۔لوگ گھروں کے کھلے کواڑ چھوڑ کر اجنبی راستوں پر نکل آئے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ وہ کہاں جائیں گے ۔کیونکہ کسی کو اپنی منزل معلوم نہیں ۔صرف راستے تھے اور راستوں کی دھول تھی اور جلتی ہوئی پیاس کے بگولے تھے۔''14

اس ناول میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ درندہ صفت لوگوں کے علاوہ کچھ ایسے انسانیت سے لبریز لوگ بھی تھے۔جن میں اس وقت بھی انسانیت زندہ تھی۔وہ دوسرے مذہب کے انسانوں کو انسان، درندوں کے ذریعے عصمت کھوئی عورت کو عورت اور گرنے والے خون کے ہر قطرے کو خون کا قطرہ ہی سمجھتے تھے۔ناول میں امید اور آس کی فضا بھی قائم کی گئی ہے۔کرماں والی تیس سال بعد اپنے بیٹے خوشیا سے ملتی ہے۔ جسے وہ سوتا ہوا چھوڑ کر پاکستان چلی گئی تھی۔خوشیا فاطمہ نامی لڑکی سے شادی بھی کر چکا تھا۔خوشیا لنگڑاتے ہوئے ماں سے ملا کیونکہ اس کے پیر میں چوٹ آئی تھی۔ماں بیٹے کی ملاقات کی عکاسی

کشمیری لال ذاکر یوں کرتے ہیں:

''چارپائی سے اٹھ کر لنگڑاتے ہوئے خوشے نے جب کرماں والی کو سینے سے لگایا تو فاطمہ کو لگا دونوں ماں بیٹا لڑکھڑا رہے تھے اس نے آگے بڑھ کر دونوں کو سنبھال لیا کتنا عجیب منظر تھا دونوں ماں بیٹا گلے مل کر رو رہے تھے اور آنسو کی اس ندی میں ماضی کے ان گنت لمحے ریت کے ذروں کی طرح پل بھر میں بہہ گئے تھے کرماں والی کو لگا جیسے وہ بائیس تیئیس برس کی جواں عورت تھی۔ جو اپنے چالیس برس بڑے بیٹے کو نہیں بلکہ پانچ برس کے چھوٹے سے بچے کو چوم رہی تھی اور اس کی بے جان چھاتیوں میں ممتا کا دودھ ہلکورے لینے لگا تھا اس نے اپنی کمزور باہوں میں خوشے کو ایک بار پھر کس لیا۔'' 15

بیٹے سے ملنے کے بعد کرماں والی اس محلے کے لوگوں کا شکریہ ادا کرتی ہے اور خاص طور سے گاؤں کے سرپرست نتھا سنگھ گرنتھی اور اس کی بیوی کا جنھوں نے ممتا کا پیار دے کر اس کے بیٹے کو پالا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس پرفتن دور میں چراغ رواداری کو جلائے رکھا اور ٹمٹماتے اسی چراغ کی روشنی کی وجہ سے اشرف المخلوقات کا بھرم قائم رہا۔

''بستی''، انتظار حسین کا ناول ہے اس ناول میں ہجرت سے پیدا شدہ حالات اور قیام بنگلہ دیش کے لیے ہونے والی جدوجہد کی عکاسی کی گئی ہے۔ ناول کے اہم کرداروں میں ذاکر سلامت، افضال، زورا، عرفان ہیں۔ ان سب کرداروں کی سوچ میں بھی کوئی یکسانیت نہیں۔ ناول کا سب سے اہم کردار ذاکر ہے۔ وہ اور اس کے والدین 1947 میں ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ جو بھی جائے پیدائش کو چھوڑے گا اسے وقتاً فوقتاً اپنے وطن کی یادیں ستائیں گیں۔ ایسا ہی ایک اقتباس ''بستی'' سے اخذ کیا جاتا ہے۔

''ا جی میں نے کہا کہ کوٹھری کے تالے کی چابی کہاں ہے''

''کوٹھری کون سی کوٹھری''

''اے ہے ابھی سے بھول گے اپنی حویلی میں کوٹھری نہیں تھی''

اچھا حویلی کی کوٹھری'' ابا جان چپ ہو گئے پھر بولے ذاکر کی ماں پچیس برس

گزر چکے ہیں‘‘

’’اجی میں نے کمرے کی چابی کو پوچھا ہے۔ برسوں کا حساب نہیں پوچھا‘‘

تم نے کوٹھری کی چابی کا پوچھا میں نے سوچا کہ تمہیں یہ بتادو کہ کتنا زمانہ گزر چکا ہے۔‘‘

’’اجی زمانے کا کیا ہے وہ تو گزرتا ہی رہتا ہے مگر کوٹھری کی چابی کھوگئی تو غضب ہوجائے گا ہماری تو ساری پشتی چیزیں اس میں بند میں میرا سارا جہیز کا سامان اسی میں ہے اور اللہ رکھے جب ذاکر پیدا ہوا تھا تو دادا نے پوتا ہونے کی خوشی میں چاندی کی رکابیوں میں بالوشاہئیں برادری میں بانٹی تھیں اس وقت کی بچی ہوئی بارہ رکابیں بھی وہیں رکھی ہیں۔اور وہاں تم نے جو کربلائے معلیٰ سے کفن منگوایا تھا وہ بھی وہیں اسی ٹرنگ میں رکھا ہے۔جس میں بڑے ابا کی مدینہ منورہ کی جائے نماز اور خاک شفا کی سجدہ گاہ رکھی ہے اور بڑی اماں کی پٹاری اور رحل رکھی ہے۔‘‘16ے

’’آگے سمندر ہے‘‘ بھی انتظار حسین کا ناول ہے۔اس ناول میں مصنف نے تقسیم کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرلیا ہے۔’’چاند گہن‘‘، ’’بستی‘‘ اور ’’تذکرہ‘‘ ناول میں پاکستان میں ذلت کی زندگی گزار رہے مہاجرین اپنی مٹی میں لوٹنے کو خواہاں ہیں۔لیکن ’’آگے سمندر ہے‘‘ کے کردار پوری آب وتاب کے ساتھ پاکستان کی تعمیر میں لگے ہیں۔انہیں معلوم ہے کہ اب ان کا وطن یہی ہے۔ناول کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ تقسیم ہند کے نتیجے میں ہی مسلمانوں کی کثیر آبادی کو نقل مکانی کرکے پاکستان جانا پڑا۔اس نقل مکانی کی وجہ سے ایسے مسائل پیدا ہوئے جن کا پہلے کسی نے تصوّر تک نہ کیا تھا۔

’’آگے سمندر ہے‘‘ میں پاکستان میں موجود تشدد کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس ناول کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس میں پیچھے مڑ کے دیکھنے کے بجائے نئی راہوں کے بنانے کی ترغیب دی گئی ہے۔

’’کالی ماٹی‘‘ علی امجد کا ناول ہے۔اس ناول میں جمشید پور میں کام کرنے والے مزدوروں کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔جمشید پور میں ٹاٹا فیکٹری کے مزدوروں کے متعلق بنائے گئے قوانین اور مزدور تحریک کے متعلق بنیادی جانکاریاں ملتی ہیں۔اس ناول میں فرقہ وارانہ جذبات کی عکاسی جذباتی ہونے

کے بجائے سنجیدگی سے کی گئی ہے۔ناول سے سلیم اور اودھیش کی گفتگو کو قلم بند کیا جاتا ہے:

’’پاکستان بن گیا تو گویا بھائیوں نے گھر کا بٹوارہ کر لیا ایک بھائی اپنا حصہ لے کر الگ ہو گیا یہ سب غیر جذباتی اور دوستانہ انداز ہوا تھا جو ہندوستان میں پاکستان کے متعلق سوچا جا سکتا ہے چلو ہو گیا تب؟

’’تب تم یہاں کیا کر رہے ہو۔تم نے تو اپنا حصہ الگ کر لیا پھر تم یہاں ساجھے کی ہانڈی میں کیوں شریک ہو؟ تم یعنی ہندوستان کے مسلمان پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے؟

پرانی تاریخ کو چھوڑو اپنی میری اور تمہاری زندگی میں بیتی اپنی آنکھوں کے سامنے گزری تاریخ کو لے لو پاکستان پنجابیوں ،سندھیوں اور پٹھانوں نے نہیں بنایا۔بہار اور یو پی کے مسلمانوں نے بنایا مسلمان نے سارے ہندستان میں سینہ تان کر کہا ،ہم علیحدہ قوم ہیں ہمیں الگ وطن چاہیے۔چلو مان لیا علیحدہ قوم ہو۔یہ بھی مان لیا اور تمہارا الگ وطن بن گیا پھر تمہارا اس ملک میں کیا حصہ؟

’’پاکستان کی تحریک چلی ہندوستان کے نام ہر شہر، ہر گلی ، ہر گاؤں اور قصبہ کو بانٹ کر دلوں میں تفرقہ ڈال کر مگر جب پاکستان بن گیا تو وہ تو پنجابی ، بنگالی پٹھان،سندھی اور بلوچ مسلمانوں کا وطن بنا۔‘‘ 17

مندرجہ اقتباس سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ کس طرح سانحہ تقسیم کی وجہ سے دلوں میں بھی دراڑیں پیدا ہو گئیں۔ایک لکیر کے قائم ہونے سے صدیوں سے اکھٹی رہنے والی اقوام فرقہ وارانہ فسادات کے باعث ایک دوسرے کی دشمن ہو گئیں۔

’’آنگن‘‘ خدیجہ مستور کا تقسیم ملک کے پس منظر میں لکھا گیا ناول ہے۔اس میں تقسیم کی وجہ سے تہذیبی اور معاشرتی تغیر کی عکاسی کی گئی ہے۔یہ ناول خانگی زندگی کا المیہ ہے۔جس کے ہر مسئلہ کی بنیاد میں سیاست نمایاں ہے۔بہ ظاہر ہر ایک گھر کا آنگن تہذیبی، معاشی اور معاشرتی پہلوؤں کی نشان دہی کر کے اس دور کے تمام گھروں کا آنگن بن جاتا ہے۔گرچہ ناول ایک خاندان کے مفروضات کا احاطہ کرتا ہے لیکن اس خاندان کے تمام افراد کی زندگیاں ملکی حالات سے مکمل طور پر اثر انداز ہیں۔

''آنگن'' میں پلاٹ کے روایتی انداز یعنی ابتدا، درمیان اور انجام کے اصولوں کی پابندی کی گئی ہے۔کہانی بیانیہ کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔اس ناول میں چھوٹے چھوٹے اور غیر اہم واقعات کے ذریعے انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کو خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ایک خاندان کے متعلق تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے مصنفہ نے ہندستان کے تنزل پذیر معاشرتی حالات کی نہ صرف عمدہ نقاشی کی ہے بلکہ تقسیم ہند کے المیہ کو ایک منفرد انداز میں پیش کرنے کی سعی بھی کی ہے۔

''یا خدا'' قدرت اللہ شہاب کا ناول ہے اس ناول میں مہاجرین عورتوں کی جنسی استحصال کو بیان کیا گیا ہے۔ نیز تقسیم ملک کے بعد ہندستان اور پاکستان میں ہوئے فسادات اور پاکستان میں مہاجرین کے کیمپوں میں ہونے والی بدکاری کو بھی موضوع بنایا ہے۔قدرت اللہ شہاب نے یہ ناول ایک رات میں تحریر کیا۔ بار بار مہاجرین کیمپوں میں جانے کی وجہ سے ناول کا پلاٹ ان کے ذہین میں بن چکا تھا۔اس کا مرکزی کردار دلشاد ہے۔جس کی پہلے تو ہندستان میں آبرولوٹی گئی اور پھر پاکستان میں مہاجرین کیمپ میں آبروریزی ہوئی۔فسادات اور ہجرت کے وقت تقریباً ہر عورت کے ساتھ یہی سکول کیا گیا۔ دلشاد کو اسی دن کی بچی تھی جس دن اسے ہندستان کے کیمپ سے پاکستان بھیجا گیا۔وہاں جاتے ہوئے اس کی ملاقات انور اور رشید سے ہوتی ہے تب اس سے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ امریک سنگھ اور اس کے ساتھیوں جیسے ہی ہیں جو اسکے جسم سے اپنی پیاس بجھانا چاہتے ہیں:

''یہ کیا جگہ ہے بھائی؟ دلشاد نے پوچھا۔

''لاہور ہے'' انور نے کہا

''تم کہا جاؤ گی!'' رشید نے پوچھا

''جہاں قسمت لے جائے''

''باپ رے باپ'' انور نے رشید سے سرگوشی کی۔

''بڑی سپورٹ ہے بھائی'' رشید نے انور کو آنکھ ماری

''آؤ بہن' تم ہمارے ساتھ چلو' دونوں ہم زبان ہو کر بولے۔

جب دلشاد ٹھیلہ کا سہارا لے کر اٹھی تو اس کے بھائیوں کو پہلی بار اپنی ننھی سی بھانجی کی جھلک دکھائی دی۔

''ارے'' انور حیرانی سے اچھلا۔

''یہ کیا بلا ہے؟'' رشید نے پوچھا

''لڑکی ہے جی۔'' دلشاد کچھ ہچکچائی، کچھ شرمائی

''بڑی چھوٹی سی ہے'' انور نے جائزہ لیا۔

''ایک ہی دن کی ہے جی۔'' دلشاد آخر بھائیوں سے کیا کہے، کیا نہ کہے۔

''آخ تھو'' انور کو ابکائی سے آئی۔

''لاحول ولا قوۃ'' رشید کا جی متلایا وہ دونوں بھائی قے کرتے کرتے بچے، اور تیز تیز قدم وہاں سے چلے گئے۔''18

قدرت اللہ شہاب ناول ''یا خدا'' کے شروع میں ''اس کہانی کی کہانی'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں لارنس روڈ کے ایک بنگلے میں تھا۔ رات بھر داس کی روشنیاں جلتی رہیں اور رات بھر میں بیٹھا یہ کہانی لکھتا رہا۔ نعمت اللہ کی کہانی، اپنے گاؤں چکور کی کہانی، اپنے گاؤں کے ملا علی بخش کی بیٹی دلشاد کی کہانی، کیمپوں کا حال جو میں نے لکھا ہے، لاہور میں دیکھا۔ مہاجر بہنوں کا شکار کرنے والے بہت سے بھائی جن کے چہرے یا خدا میں نظر آئیں گے۔ مولوی خدام خلق، قوم کے لیڈر اور سیاست دان سبھی اصلی کردار ہیں۔''19

عبدالصمد نے ناول ''دو گز زمین'' لکھا اس ناول میں تمام حالات اور فسادات کی عکاسی کی ہے۔ اس ناول میں فسادات کی تفصیل اور سیاسی قائدین کے وقتاً فوقتاً قومی یکجہتی کے پیغام کو بھی صفحہ قرطاس پر اتارا گیا ہے:

''نوا کھالی میں ایک بڑا فساد ہو گیا۔ سارے ملک میں ہلچل مچ گئی۔ دیوالی آنے والی تھی لیکن نوا کھالی کے مرنے والوں کے سوگ میں گاندھی جی نے اپیل کی کہ لوگ دیوالی نہ منائیں۔ چنانچہ دیوالی نہیں منائی گئی اور جو تہوار گزرا، اس سے کالی دیوالی کا نام دیا گیا۔ گاندھی جی نے خود بھی نوا کھالی کا دورہ کیا۔ اس سے فضا بڑی حد تک نرم ہوئی۔ گاندھی جی لاٹھی ٹیکتے گاؤں گاؤں پیدل ہی گھومتے۔ لوگ اپنی

آنکھوں اور کانوں سے انہیں دیکھتے اور سنتے ۔نوا کھالی ابھی سنبھلا نہیں تھا کہ کلکتہ میں فساد ہو گیا جسے انگریزی اخباروں نے عظیم قتل عام کا نام دیا۔''20؎

متذکرہ ناولوں کے علاوہ فکر تونسوی کا چھٹا دریا، خدیجہ مستور کا زمین، جوگندر پال کا خواب رو بھی تقسیم سے پیدا شدہ فسادات اور ہجرت کے موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ فسادات اور اس سانحہ سے پیدا شدہ حالات نے بیشتر ادیبوں کو اس موضوع پر لکھنے کے لیے مجبور کیا جس کی وجہ سے فسادات کے سانحات اور حادثات ادب کی مختلف اصناف کا حصہ بنے۔ادیبوں نے فکشن کے پیرائے میں ان موضوعات کو جگہ دی جس کی وجہ سے قاری نے اس وقت کے بھیانک حالات اور درندہ صفت لوگوں کی حرکات سے نہ صرف واقفیت حاصل کی بلکہ عورتوں کی لٹتی عزتوں، بچوں کی گمشدگی، مردوں کے جبراً قتل اور عورتوں کے ساتھ آبروریزی کے واقعات کو محسوس بھی کیا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ تقسیم کے بھیانک اثرات سے ہندوپاک کی بڑی آبادی متاثر ہوئی۔اور امید کرنی چاہیے کہ آئندہ ایسے فسادات نہ ہوں۔کیونکہ ایسے حالات کے بھیانک اثرات کا تب پتہ چلتا ہے جب ایسے فسادات جنم لے لیتے ہیں۔

حوالہ جات:

1. Nehru, Jawhar Lal (1999). The Discovery of India (6th ed.). Niel O Brien, Oxoford Universiy Press, New Delhi, P. 527
2. Chandra, Bipin (1971). Modern India, Pulication Department, NCERT, New Delhi, p. 306
3. Chandra, Bipin (1971). Modern India, Pulication Department, NCERT, New Delhi, pp. 304.305
4. Gandhi, Mahatma (1994). An Autobiography or my experiments with truth (8th ed.). Navajivan Publishing House, Ahmdabad, p.489
5. Panwar, Sani H (2017). India wins Freedom: An Autobiographical narrative Moulana Abul Kalam Azad, PP.168-169
6. Khan, Yasmin (2013). Yale University Press, New Haven and London, PP. 109-110
7. ممتاز شیریں، معیار تنقید، نیا ادارہ سویرا آرٹ پریس، لاہور، 1962، ص 201-202
8. کرشن چندر، ہم وحشی ہیں، کتب پبلشرز لمیٹیڈ، ممبئی، 1949، ص 11

9. رامانند ساگر، اور انسان مرگیا، نوہید پبلشرز لمٹیڈ، ممبئی، 1948، ص284-285

10. رامانند ساگر، اور انسان مرگیا، نوہید پبلشرز لمٹیڈ، ممبئی، 1948، ص281-282

11. قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، روشان پرنٹرز، دہلی، 2019، ص515

12. کرشن چندر، غدار، اراولی پبلیشرز سیکٹر، روہنی، نئی دہلی، 2005، ص68-69

13. عبداللہ حسین، اداس نسلیں، علی پرنٹنگ پریس، دہلی، 1982، ص840

14. کشمیری لال ذاکر، کرماں والی، نعمانی پریس، دہلی، 1980، ص25

15. کشمیری لال ذاکر، کرماں والی، نعمانی پریس، دہلی، 1980، ص2019

16. انتظار حسین، بستی، مکتبہ جامع لمیٹڈ، نئی دہلی، 1980، ص131-132

17. علی امجد، کالی ماٹی، مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1999، ص172-173

18. قدرت اللہ شہاب، یا خدا، ص42-43

19. قدرت اللہ شہاب، یا خدا، ص9

20. عبدالصمد، دوگز زمین، خواجہ پریس، دہلی، 1993، ص31-32

❒ **Mr. Rehan Ahmad**

Research Scholar
Department of Urdu
Aligarh Muslim University, Aligarh
Mobile: 6398689773
Email: sheikhrehan906@gmail.com

ہمارے قلمکار

(ادب وثقافت کا اشاریہ۔شمارہ نمبر 1 تا 12)

نمبر شمار	نام	عنوان	شمارہ نمبر
1	پروفیسر شارب ردولوی	اقبال کے شعری ابعاد اور تعین قدر کا مسئلہ	01
		ایک درویش انقلابی: نیاز حیدر	02
		احمد ندیم قاسمی: ایک اہم افسانہ نگار	06
2	پروفیسر عبدالستار دلوی	سر تیج بہادر سپرو، اُردو اور قومی زبان کا مسئلہ	01
		مولانا آزاد کی فکر کے چند تکثیری زاویے	03
		لفظ ''میاں'' کی لسانی حیثیت اور تہذیبی معنویت	04
		دکنی شاعری میں عشق رسولؐ	06
		وجے تینڈولکر اور 'خاموش! عدالت جاری ہے'	09
		اورنگ آباد میں اردو: ولیؔ سے وجدؔ تک	10
		اردو رسم الخط کی لسانی اور تہذیبی معنویت	12
3	پروفیسر عتیق اللہ	ہندوستانی تہذیبی روایت اور اُردو شاعری	01
		عابد سہیل: جو یاد رہا	02
4	پروفیسر م۔ن۔سعید	ہاشمی بیجاپوری کی تہذیبی اہمیت	01
5	پروفیسر فیروز احمد	مشترکہ تہذیب، اُردو اور جگن ناتھ آزادؔ	01
		فرہنگ تحفۃ السعادات کا ایک نادر نسخہ اور اس میں شامل ہندوی مرادفات	07
		پنجابی آمیز اردو کے چند قدیم رسائل	08
		رانی کیتکی کی کہانی کا انگریزی ترجمہ	11
6	پروفیسر رحمت یوسف زئی	ثقافتی اور قومی یکجہتی کے فروغ میں اُردو زبان کا حصہ	01

01 12	انشائیہ نگاری میں تشبیہ کا عمل سفرشاہانہ دہلی ورام پور ولکھنو	پروفیسرعقیل ہاشمی	7
01 08 10	جنوبی ہند کا اولین تکثیری سماج اور صوفیائے کرام 1857 کے غدر سے قبل اردو کی غیرافسانوی نثری اصناف ولؔی کے بعد سرزمین اورنگ آباد کا اہم غزل گوشاعر۔داؤداورنگ آبادی	پروفیسرمجید بیدار	8
01 02 06 07 08 09 10 11	عصمت چغتائی کی ''دل کی دنیا'':ایک جائزہ راجندرسنگھ بیدی کے افسانوں میں عورت چکبست پر لکھے گئے دو نایاب اور اہم مقالات شارب ردولوی کا تنقیدی سفر(ولی دکنی سے جگرمرادآبادی تک) قمررئیس کا تنقیدی سفر(شاعری اورشاعروں کے حوالے سے) بعض دیگر کتابیں(تبصرے) گاندھی اور تقسیم ہند خاکہ نگاری کا فن اور مجتبیٰ حسین کے خاکے:ایک اجمالی جائزہ	پروفیسرعلی احمد فاطمی	9
01	بڑا ہے درد کا رشتہ.......(فیض احمد فیض)	پروفیسروہاج الدین علوی	10
01 09 12	اُردو رباعی:ایک جائزہ قاضی عبدالستار اوراُن کے تاریخی ناول داستان کا فن	پروفیسرابن کنول	11
01 04	حفیظ میرٹھی اوراُن کی غزل چاربیت(اُردو کی حکائی روایت کا ثقافتی شعری سرمایہ)	پروفیسرشہپررسول	12
01	اُردو کی منظوم داستانوں میں ہندوستانی تہذیب وثقافت	پروفیسرقمرالہدیٰ فریدی	13
01 07	دکنی مثنویوں میں قومی یکجہتی کے عناصر اردو میں بچوں کا ادب امیرخسرو سے مرزاغالب تک:ایک جائزہ	پروفیسرمحمد نسیم الدین فریس	14
01	ہندوستانی موسیقی کے فروغ میں امیرخسرو کا حصہ	پروفیسرحبیب نثار	1.
02 09 11	اُردو کا سماجی اور ثقافتی ڈسکورس حکیم منظور کی غزل:سخن ثقافت زاد شعری متن میں معنی کا عمل	پروفیسرقدوس جاوید	16

17	پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ	مسعود سعد سلمان کے ہندوی دیوان کے قدیم ترین حوالے اُردو قواعد نویسی کی روایت	02 03
18	ڈاکٹر محمد سرور الہدیٰ	کلیم عاجز کی خودنوشت 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی': ایک ثقافتی بیانیہ	02
19	محترمہ قمر جمالی	ترقی پسند اُردو غزل میں سماجی سروکار	02
20	ڈاکٹر سید محمود کاظمی	کلیم الدین احمد کے تنقیدی نظریات ('اقبال ایک مطالعہ' کے حوالے سے) منٹو کے افسانوں کا علامتی نظام اقبال کا ایک ممدوح بھرتری ہری: تبصرہ و تجزیہ	02 04 10
21	ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی	اُردو لغت کی تعین قدر	02
22	ڈاکٹر محمد ریاض احمد	اُردو کے اہم مکتوب نگار (غالب کے علاوہ) اُردو سیاست کا آغاز وارتقا اور اسماعیل میرٹھی	02 10
23	ڈاکٹر شاہ نواز عالم	وقت کی کہانی کبیرؔ، جوشؔ اور اخترؔ الایمان کی زبانی	02
24	ڈاکٹر مزمل سرکھوت	دکنی شاعری کا قطب شاہی دور: ادبی وتہذیبی تناظر میں فراقؔ گورکھپوری: ایک نفسیاتی مطالعہ	02 08
25	ڈاکٹر بدر سلطانہ	مثنوی 'گلشن عشق میں' دکنی تہذیب وثقافت	02
26	پروفیسر محمد علی اثر	دکنی شاعری میں قرآنی تلمیحات	03
27	جناب عارف حسن خاں	اوزانِ رُباعی میں تخنیق کی کارفرمائی 'بالِ جبریل' کی غزلیات کا شعریاتِ آہنگ: ایک تجزیاتی مطالعہ املے کے تعلق سے کچھ باتیں	03 07 09
28	پروفیسر ظفر حبیب	سید شاہ مسیح الدین حسن بخاری شطاری	03
29	پروفیسر محمد شاہد حسین	ضحاک: فکر وفن کے آئینے میں دبستان لکھنو اور اردو ڈراما آگرہ بازار: نقد کے میزان میں یہودی کی لڑکی: نقد کی کسوٹی پر	03 06 08 10
30	پروفیسر مظفر شہ میری	اُردو کے مسائل: تاریخ کی روشنی میں	03

31	پروفیسر کوثر مظہری	تہذیب و ثقافت سے ادب کا رشتہ	03
32	ڈاکٹر ابوبکر عباد	اُردو غزل کا ہندوستانی مجدد: غالبؔ	03
33	ڈاکٹر معزہ قاضی	اُردو داستانوں کی تہذیبی معنویت	03
34	ڈاکٹر آمنہ تحسین	ہندوستانی سماج، عورت اور منٹوؔ: تانیثیت کے تناظر میں آصف جاہی عہد میں خواتین کی ترقی کے اقدامات مسلم خواتین کی تعلیمی ترقی و بااختیاری میں اُردو یونیورسٹی کا رول اُردو میں صنفی مساوات پر ادبی ڈسکورس کے اوّلین نقوش	03 06 08 11
35	ڈاکٹر احمد کفیل	شعر غالبؔ کی نئی تعبیریں اور امکانات	03
36	ڈاکٹر عبدالحیٔ	زبیر رضوی اور ذہنِ جدید	03
37	ڈاکٹر عادل حیات	بچوں کے گیت: ایک تاریخی مطالعہ رُوحزن: ایک مطالعہ	03 11
38	پروفیسر شمیم حنفی	بدھ کی زندگی (پالی صحائف سے ماخوذ جستہ جستہ حقائق پر مشتمل بیانیہ)	04
39	پروفیسر اشرف رفیع	اقبالؔ کے تاریخی و تہذیبی تصورات	04
40	ڈاکٹر فیروز دہلوی	قصہ داستان گو کا	04
41	پروفیسر مولیٰ بخش	ٹیڑھی لکیر کا بیانیہ: بالیکا لیلا کا مظہر	04
42	ڈاکٹر صفدر امام قادری	صوفیہ بھکتی تحریک کے ادبی اثرات: ایک کثیر لسانی مطالعہ	04
43	ڈاکٹر امتیاز احمد	آلِ احمد سرور کے سفرنامے	04
44	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	کرشن چندر کے ناولٹ: انفراد و امتیاز	04
45	ڈاکٹر اقبال النساء	پریم چند کے تعلیمی تصورات کی عصری معنویت مقبول عام ادب ابن صفی اور صنفی مساوات	04 08
46	ڈاکٹر مشتاق قادری	جموں و کشمیر میں ادبی ترجمے کی روایت	04
47	ڈاکٹر فیروز عالم	ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'': کردار نگاری کے حوالے سے	04
48	ڈاکٹر عبدالغنی	جموں و کشمیر میں اُردو زبان و کلچر	04
49	ڈاکٹر ابراہیم افسر	اُردو فکشن کی عہد ساز ادیبہ: بانو قدسیہ گنجینۂ معنی کا طلسم رشید حسن خاں کی ادبی زندگی کا آغاز و ارتقا	04 07 10

50	پروفیسر افصح ظفر	کلچر، ادب اور جنگ	05
51	پروفیسر حسین الحق	ضمیر الدین احمد کا افسانہ 'پروائی': ایک تجزیاتی مطالعہ	05
52	پروفیسر نریش	جدید ہندی شاعری کی مختلف اصناف میں اُردو کے عناصر	05
53	پروفیسر علی رفاد فتیحی	لغت سازی صدماتی فکشن اور مرگ انبوہ کا بیانیہ	05 12
54	پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین	چند ہم عصر کہانیاں اور ان کے سماجی سروکار	05
55	جناب اسیم کاویانی	مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری: ایک جائزہ اُردو زبان میں خسرو شناسی کا اجمالی جائزہ	05 11
56	ڈاکٹر مصطفیٰ علی خاں فاطمی	مہاراجہ شاد اور علامہ اقبال کے خطوط	05
57	ڈاکٹر خالد اشرف	اختر الایمان کی شاعری کی قدر شناسی	05
58	پروفیسر اسلم جمشید پوری	ہندوستانی تہذیب اور اُردو شاعری بیگ احساس کے افسانوی ابعاد حب الوطنی اور اردو افسانہ (آزادی کے بعد)	05 07 09
59	ڈاکٹر محمد کاظم	ڈراما انارکلی: ایک مطالعہ	05
59	ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی	اقبال سہیل کا تصورِ غم	05
61	ڈاکٹر وسیم بیگم	علامہ شبلی کی شخصیت اور ان کی مختلف جہات	05
62	ڈاکٹر غلام حسین	عمیق حنفی کا عہد اور ادبی تناظر: ایک جائزہ	05
63	ڈاکٹر محمد جنید ذاکر	دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے سو سال مختلف اداروں میں اردو ترجموں کی صورتحال	05 09
64	ڈاکٹر الطاف انجم	کشمیری زبان کی تنقید پر اُردو تنقید کے اثرات	05
65	ڈاکٹر محمد مستمر	اُردو غزل میں ہندوستانی عناصر (1980ء کے بعد) اُردو شاعری میں گورونانک دیو کا تصور	05 07
66	پروفیسر خالد محمود	محمد شاہی عہد کے ترجمان شاہ مبارک آبرو اور ان کا رنگِ سخن	06
67	پروفیسر وہاب قیصر	ادب و ثقافت کی گمشدہ و تلف شدہ تحریریں	06
68	پروفیسر ارشد مسعود ہاشمی	ڈاؤڈے جنگ (فضائلِ عدم عمل) نصیر حسین خیالؔ: سوانحی کوائف	06 10

69	ڈاکٹر مسرت جہاں	عصری حسیت اور اردو افسانہ ترنم ریاض کی نظموں میں سماجی و تہذیبی شعور	06 09
70	ڈاکٹر عباس رضا نیر	اردو نثر کے ارتقا میں اودھ کی داستانوں کا حصہ	06
71	ڈاکٹر سعیدہ پٹیل	ڈاکٹر مومن محی الدین: فارسی کے ہمہ جہت استاد سورت کی کہانی۔ شاعروں کی زبانی	06 08
72	ڈاکٹر عطیہ رئیس	اکبرالہٰ آبادی کی ظرافت نگاری	06
73	جناب سلمان عبدالصمد	اردو میں نفسیاتی تنقید: ایک جائزہ	06
74	جناب غلام نبی کمار	جموں و کشمیر کی معاصر اردو شاعری اور چند اہم غزل گو شعرا (اکیسویں صدی کے تناظر میں)	06
75	پروفیسر صغیر افراہیم	ساحر لدھیانوی: چند یادیں اور کچھ باتیں	07
76	ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط	کلام غالب میں حروف ظرف کی معنویت	07
77	پروفیسر مختار شمیم	ظہیر دہلوی کی مرثیہ نگاری	07
78	ڈاکٹر بی بی رضا خاتون	مشتاق یوسفی کے مزاحیہ کردار: ایک مطالعہ	07
79	ڈاکٹر ابوظہیر ربانی	علی گڑھ تحریک کا کردار (نوآبادیاتی تناظر میں)	07
80	ڈاکٹر رؤف خیر	اقبال اور مادۂ تاریخ سکندر احمد: عروض کا سکندر اعظم اقبال اور منصور حلاّج	02 07 10
81	ڈاکٹر ثمر جہاں	عہد غالب اور تنویر احمد علوی	07
82	ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی	اردو اور میتھلی: لسانی اور تہذیبی رشتے مولانا مناظر احسن گیلانی کے تعلیمی افکار و نظریات	07 10
83	جناب عمران عاکف خان	شوکت پردیسی: فکر و فن	07
84	پروفیسر ظفر احمد صدیقی	مولانا آزاد اور علامہ شبلی نعمانی	08
85	پروفیسر شہزاد انجم	لسانی اور فنی ہنرمندی کا باکمال نمونہ فیاض رفعت کا ناول ''بنارس والی گلی''	08
86	پروفیسر سراج الدین اجملی	'1857' اور خواجہ الطاف حسین حالی	08

87	جناب ارمان نجمی	کہ زمانہ اُس کو بھلانہ دے	08
88	ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی	مولانا گیلانی اور سیرت رسولؐ	08
89	جناب فاروق اعظم قاسمی	علامہ سید مناظر احسن گیلانی کے محققین، ناقدین اور مبصرین: ایک تجزیاتی مطالعہ	08
90	ڈاکٹر نشاط احمد	قطب شاہی عہد کا تاریخی، تہذیبی و ادبی پس منظر	08
91	ڈاکٹر غضنفر اقبال	دکن کا شعری نابغہ: نصرتی	08
92	ڈاکٹر علی عباس	میر تقی میرؔ کی ایک غزل کی دو قرائتیں	08
93	ڈاکٹر سرفراز جاوید	غالب اور غالبیات: ایک مطالعہ	08
94	جناب محمد طارق	ترجمہ اور نظریۂ مداخلت	08
95	پروفیسر عبدالحق	کلام ولی کی بازآفرینی اور غیر مطبوعہ غزلیں	09
96	پروفیسر قاضی عبید الرحمان ہاشمی	کشمیر میں اردو غزل	09
97	پروفیسر بیگ احساس	جمیل مظہری کی شاعری میں فکری میلانات نصرتی کی قصیدہ نگاری	09 12
98	پروفیسر ضیاالرحمٰن صدیقی	قائم شناسی۔ایک تجزیہ تحریک آزادی کا تاریخی و سماجیاتی جائزہ :اردو صحافت کے تنقیدی تناظر میں	09 12
99	پروفیسر نامور سنگھ	کارل مارکس اور ادب (ترجمہ: ڈاکٹر رغبت شمیم ملک)	09
100	ڈاکٹر عبدالمالک	گل نغمہ کے آنگن میں دیوناگری ہنڈولہ (ہنڈولہ کا فنی ولسانی تجزیہ)	09
101	ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی	پروفیسر عبدالغفور: بچوں کے ایک اہم معمار شاعر	09
102	ڈاکٹر صبیحہ تبسم	مغربی بنگال میں اُردو شاعری	09
103	ڈاکٹر محمد انظر ندوی	سلیمان خطیب: دکنی زبان کا نمائندہ شاعر	09
104	ڈاکٹر ناہید فاطمہ	عہد برطانیہ کی لسانی سازشیں	09
105	ڈاکٹر نوشاد عالم	شہر آشوب کا ارتقائی سفر: ایک جائزہ	09

106	محمد منہاج الدین	پروفیسر اختر اور ینوی کا لسانیاتی سرمایہ	09
107	محمد نعمان علی	نظریاتِ ترجمہ بمقابلہ معیارِ ترجمہ: مشرقی و مغربی افکار کا اجمالی جائزہ	09
108	محمد شریف	لداخ میں اُردو	09
109	پروفیسر شافع قدوائی	سوانحی تنقید کا استرداد اور پنڈت ہری چند اختر	10
110	جناب انجم عثمانی	برقی مواصلاتی نظام اور اردو زبان	10
111	ڈاکٹر حلیمہ فردوس	مہجری نسائی شعری آوازیں	10
112	ڈاکٹر سید آلِ ظفر	منظر اعجاز کا امتیاز: بحیثیت شاعر و نقاد	10
113	ڈاکٹر ہمایوں اشرف	خواتین کے سفرناموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	10
114	ڈاکٹر مظہر کبریا	علامہ شبلی اور اُن کی چند تقاریظ	10
115	ڈاکٹر رضوان الحق	سنیما کی جمالیات	10
116	ڈاکٹر عمیر منظر	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اور ندوۃ العلما کے تعلقات کی ایک صدی	10
117	پروفیسر فاروق بخشی	اردو کا مکمل طنز و ظرافت نگار: مجتبیٰ حسین	11
118	ڈاکٹر گل رعنا	مجتبیٰ حسین کی مضمون نگاری	11
119	جناب محبوب خان اصغؔر	طنز و ظرافت کا شہریار، مجتبیٰ حسین	11
120	ڈاکٹر قسیم اختر	مجتبیٰ حسین کے خاکوں میں انفرادی رنگ	11
121	ڈاکٹر اسلم مرزا	مراٹھی ادب میں مرزا غالبؔ کی مقبولیت	11
122	پروفیسر محمد ظفر الدین	نصرت ظہیر: صحافت و ادب کا سنگم	11
123	پروفیسر سید حسن عباس	فہرست: دفتر ماتم (مرزا دبیر و دیگر شعرا کے مرثیوں، سلاموں، نوحوں اور رباعیوں کا مجموعہ) مخزونہ رامپور رضا لائبریری	11
124	پروفیسر غازی علم الدین	''یت'' کا لاحقہ...... کس حد تک جائز؟ (ایک لسانی مطالعہ)	11
125	ڈاکٹر معین الدین شاہیؔن	مخدومؔ محی الدین کی شاعرانہ عظمت	11
126	ڈاکٹر قطب سرشار	سفر آگہی: امعانِ غالبؔ سے پیامِ اقبال تک	11
127	ڈاکٹر محمد نہال افروز	دلت مسائل پر لکھے گئے اردو اور ہندی افسانوں کا تقابلی مطالعہ (1980 کے بعد)	11

128	ڈاکٹر ارشاد سیانوی	نئی صدی کا نیا ناول ''اوڑھنی'' ایک مطالعہ	11
129	پروفیسر محمد جہانگیر وارثی	اردو لسانیات: ماضی تا حال	12
130	ڈاکٹر شمس بدایونی	ڈاکٹر محمد ابو اللیث صدیقی: جامعات ہند اور شعبۂ اردو [اے ایم یو] کا پہلا پی ایچ ڈی	12
131	ڈاکٹر سلمان عابد	ہندوستان کا سپوت، ہندوستانی شاعر: ساحر	12
132	ڈاکٹر خان احمد فاروق	سر سید کی تعلیم: پس منظر اور پیش منظر	12
133	ڈاکٹر احمد خان	اودھ میں اردو زبان کے تہذیبی و ثقافتی ادارے (مشاعرہ، مرثیہ خوانی، داستان گوئی، قوالی، مجرا، سوانگ اور رہس)	12
134	ڈاکٹر شکیل احمد	اردو زبان میں اسلامیات کی تدریس و تحقیق: مسائل، مواقع اور اہداف	12
135	ڈاکٹر سید ابوذر علی	علی سردار جعفری کی ادبی صحافت	12
136	ڈاکٹر نشاں زیدی	خواتین ناول نگاروں کے یہاں مزاحمتی عناصر	12
137	جناب اطہر حسین	ماہنامہ معارف کے دکنی مباحث	12
138	محترمہ ضیا تسنیم	اقبال کے فلسفیانہ افکار: ایک جائزہ	12
139	جناب منظور حسین	خطہ پیر پنچال کے نثر نگاروں کی نثری تخلیقات میں مقامی معاشرت اور بولیوں کے اثرات	12
140	جناب اسلم عمادی	ڈاکٹر انور معظم کی تصنیف 'عندلیب گلشن نا آفریدہ ۔ غالب کی فکری وابستگیاں' ایک مطالعہ	12

فہرست مطبوعات

ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

نمبر	کتاب کا نام	مصنف/مدیر	مضمون	قیمت
1	توضیحی فرہنگ (حیوانیات وحشریات)	ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی	سائنس	330
2	توضیحی فرہنگ (غذا اور تغذیہ)	ڈاکٹر عابد معز	سائنس	230
3	توضیحی فرہنگ (ریاضی)	پروفیسر ظفر احسن	ریاضی	91
4	بنیادی اصول حشریات	ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی	سائنس	315
5	موجودہ ہندوستان میں اقلیت سماجی تشدد اور اخراجیت	ڈاکٹر شیخ طٰحہٰ / ڈاکٹر محسنہ انجم	سماجیات	300
6	ڈیجیٹل الیکٹرانکس اینڈ کمپیوٹر آرکیٹکچر	محبوب الحق	کمپیوٹر	140
7	پیشہ ورانہ سوشل ورک	پروفیسر محمد شاہد/ابواسامہ	سماجیات	185
8	پلانٹ اناٹومی اور ایمبر یولوجی	ڈاکٹر رفیع الدین ناصر	سائنس	96
9	عملی کام برائے حشریات	ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی	سائنس	45
10	تاریخ ادب اُردو (دکنی دور تا ترقی پسند تحریک)	ڈاکٹر ارشاد احمد	اُردو	175
11	صحافت کے بنیادی اصول	شمس عمران	صحافت	108
12	عربی (نصوص وقواعد)	پروفیسر سید علیم اشرف جائسی	عربی	305
13	اسلامک اسٹڈیز	ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ	اسلامیات	131
14	Proficiency in Urdu (PIU)	Prof. Taqi Ali Mirza / Prof. Syeda Jafar	Urdu	263
15	اکتساب اور متعلّم کی نفسیات	ڈاکٹر محمد مشاہد	تعلیم وتربیت	130
16	مطالعہ متون اور اُن پر اظہارِ خیال	ڈاکٹر نجم السحر	تعلیم وتربیت	45

17	تعلیم کی فلسفیانہ بنیادیں	پروفیسر صدیقی محمد محمود	تعلیم وتربیت	150
18	آرٹ ایجوکیشن	ڈاکٹر محمد مظفر حسین خان	تعلیم وتربیت	70
19	آئی سی ٹی پر مبنی تدریس واکتساب	ڈاکٹر ظفر اقبال زیدی	تعلیم وتربیت	100
20	اکتساب اور تدریس	ڈاکٹر تلمیذ فاطمہ نقوی	تعلیم وتربیت	160
21	تعلیم کی سماجیاتی بنیادیں	پروفیسر صدیقی محمد محمود	تعلیم وتربیت	105
22	احتساب برائے اکتساب	ڈاکٹر نجم السحر	تعلیم وتربیت	140
23	تدوین نصاب	ڈاکٹر محمد افروز عالم	تعلیم وتربیت	85
24	Communicative English	Dr. D. Vishwa Prasad	تعلیم وتربیت	120
25	تدریس ریاضی	پروفیسر صدیقی محمد محمود	تعلیم وتربیت	125
26	حیاتیاتی سائنس کی تدریس	ڈاکٹر انصار الحسن، ڈاکٹر محمد افروز عالم	تعلیم وتربیت	120
27	سماجی مطالعہ کی تدریس	ڈاکٹر محمد اطہر حسین	تعلیم وتربیت	130
28	تدریسیات اُردو	ڈاکٹر محمد مشاہد	تعلیم وتربیت	115
29	fgUnh Hkk"kk f'k{k.k	Mk- v'ouh	تعلیم وتربیت	120
30	Pedagogy of English-1	Dr. D. Vishwa Prasad	تعلیم وتربیت	170
31	طبیعیاتی سائنس کی تدریس	ڈاکٹر وقار النسا	تعلیم وتربیت	150
32	تعلیم میں عصری امور	ڈاکٹر بدر الاسلام	تعلیم وتربیت	120
33	آئی سی ٹی صلاحیتیں	پروفیسر نوشاد حسین	تعلیم وتربیت	110
34	اسکول کا نظم ونسق اور انتظام	ڈاکٹر مظفر اسلام	تعلیم وتربیت	95
35	تفہیم ذات	ڈاکٹر ثمینہ بسو	تعلیم وتربیت	45
36	ماحولیاتی تعلیم	ڈاکٹر انصار الحسن	تعلیم وتربیت	55
37	صحت اور جسمانی تعلیم	ڈاکٹر ذکی ممتاز	تعلیم وتربیت	70
38	شمولیت کی تعلیم	ڈاکٹر محمد مشاہد	تعلیم وتربیت	75
39	جنس، اسکول اور معاشرہ	ڈاکٹر نوشاد حسین	تعلیم وتربیت	60
40	اقلیتوں کی تعلیم	ڈاکٹر نجم السحر	تعلیم وتربیت	65

41	تعلیم امن	ڈاکٹر محمد طالب اطہر انصاری	تعلیم و تربیت	75
42	ریاضی کی تدریس	پروفیسر صدیقی محمد محمود	تعلیم و تربیت	100
43	حیاتیاتی سائنس کی تدریس	/ڈاکٹر انصار الحسن	تعلیم و تربیت	160
44	سماجی مطالعہ کی تدریس	ڈاکٹر محمد طالب اطہر انصاری	تعلیم و تربیت	125
45	اُردو کی تدریس	ڈاکٹر ریاض احمد	تعلیم و تربیت	120
46	fgUnh Hkk"kk f'k{k.k	Mk- v'ouh	تعلیم و تربیت	100
47	Pedagogy of English	Dr. D. Vishwa Prasad	تعلیم و تربیت	90
48	طبیعیاتی سائنس کی تدریس	ڈاکٹر وقار النسا	تعلیم و تربیت	100
49	مخدوم: شاعرِ نبض شناس	ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد	اُردو ادب	150
50	اُردو زبان- نئے اُفق	ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد	اُردو ادب	150
51	افکارِ آزاد	ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد	اُردو ادب	100
52	خواتین کی تحریریں، خواتین سے متعلق تحریریں	پروفیسر خالد سعید	اُردو ادب	200
53	سردار جعفری: کل اور آج	ڈاکٹر ارشاد احمد، ڈاکٹر بی بی رضا خاتون	اُردو ادب	150
54	سرّی ادب اور ابن صفی	پروفیسر محمد ظفر الدین، ڈاکٹر ارشاد احمد	اُردو ادب	150
55	کلاسیکی نثر	پروفیسر سید علیم اشرف جائسی	ایم اے عربی	175
56	قواعد-1	پروفیسر سید علیم اشرف جائسی	ایم اے عربی	197
57	کلاسیکی شاعری	پروفیسر سید علیم اشرف جائسی	ایم اے عربی	175
58	بلاغت وعروض	پروفیسر سید علیم اشرف جائسی	ایم اے عربی	150
59	ادبی تنقید	پروفیسر سید علیم اشرف جائسی	ایم اے عربی	140
60	اندلس میں عربی ادب	پروفیسر سید علیم اشرف جائسی	ایم اے عربی	150
61	اردو غزل	پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر فاروق بخشی	اُردو ادب	100
62	اردو نظم	پروفیسر اشرف رفیع، پروفیسر فاروق بخشی	اُردو ادب	125

63	مثنوی اور قصیدہ	پروفیسر اشرف رفیع، پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر محمد نسیم الدین فریس	اُردو ادب	115
64	مرثیہ اور رباعی	پروفیسر اشرف رفیع، پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر نکہت جہاں	اُردو ادب	115
65	اُردو زبان و ادب کی تاریخ	پروفیسر محمد علی اثر، ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی	اُردو ادب	200
66	اُردو تنقید اور تنقیدی نظریات	پروفیسر محمد ظفر الدین	اُردو ادب	110
67	اُردو میں تنقیدی تصورات	پروفیسر ابوالکلام	اُردو ادب	100
68	ترجمہ نگاری	پروفیسر ابوالکلام	اُردو ادب	110
69	ابلاغیات	پروفیسر محمد ظفر الدین	اُردو ادب	90
70	اُردو ناول اور افسانہ	ڈاکٹر سید محمود کاظمی، ڈاکٹر مسرت جہاں	اُردو ادب	130
71	اُردو داستان اور ڈراما	ڈاکٹر سید محمود کاظمی، ڈاکٹر مسرت جہاں	اُردو ادب	110
72	اُردو خطوط اور طنز و مزاح نگاری	ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال، ڈاکٹر بی بی رضا خاتون	اُردو ادب	120
73	اُردو میں خاکہ، انشائیہ اور سوانح نگاری	ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال، ڈاکٹر بی بی رضا خاتون	اُردو ادب	105

کتابوں کی قیمت پر رعایت کی شرح:

1. عام قارئین کے لیے 25% 2. طلبا، کالجز اور اداروں کے لیے 30%

کتابیں ڈاک سے بھی منگوائی جاسکتی ہیں۔ پتہ حسب ذیل ہے:

DTP Sale Counter
Directorate of Translation & Publications, Deccan Studies Building
Maulana Azad National Urdu University,
Gachibowli,Hyderabad-500032
M: 9394370675, 9966818593, Email: directordtp@manuu.edu.in

Account Name: DTP Sale Counter
Bank Name: Indian Overseas Bank
Branch: Gachibowli, Hyderabad
Account No.: 187901000009349
IFSC: IOBA00001879

نوٹ: -/500 روپے سے زائد کے بل پر ڈاک خرچ نہیں لیا جائے گا۔

فون دفتر کے دنوں میں اور دفتری اوقات کے دوران کریں تاکہ فوری کارروائی کی جاسکے۔

15 اگست 2021 : 75 ویں یوم آزادی کے موقع پر پرچم کشائی کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر سید عین الحسن، شیخ الجامعہ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔ ساتھ میں انچارج رجسٹرار پروفیسر صدیقی محمد محمود اور فنانس آفیسر ایم جی گوناسیکرن۔

15 اگست 2021 : 75 ویں یوم آزادی کے موقع پر شیخ الجامعہ پروفیسر سید عین الحسن کو این سی سی کے جوان گارڈ آف آنر پیش کرتے ہوئے۔ ساتھ میں انچارج رجسٹرار پروفیسر صدیقی محمد محمود اور پراکٹر پروفیسر ابوالکلام۔

ISSN : 2455-0248

Adab-o-Saqafat

(Bi-Annual Research & Refereed Journal)

Issue No.: 13 September, 2021

***Editor:* Dr. Ahamad Khan**

28 جولائی 2021 : مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے نئے شیخ الجامعہ پروفیسر سید عین الحسن کا استقبال کرتے ہوئے
پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، سابق انچارج شیخ الجامعہ۔

Centre for Urdu Culture Studies
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032, Telangana (India)
Email: adabosaqafatcucs@gmail.com
Website: www.manuu.edu.in, Mobile: 9868701491
Online: https://manuu.edu.in/university/centre/cucs/journal